جلد 46 • شمارہ 06 • جون 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول، مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

رمضان شریف مبارک۔ اس ماہِ مقدس کی آمد کے ساتھ سال گزر رہا ہے اور گرما گرمی میں جون کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ ایک ویرانے میں سب کچھ جل کر خاک ہوا مگر ایک عدد پاسپورٹ صحیح سلامت، دور پڑا ہوا مل گیا۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ نشانہ بنائے جانے والا کئی ملکوں کے سفر کرتا رہا۔ وہاں اسے نشانہ بنانے کے بجائے اس کے پاکستانی حدود میں داخلے کا انتظار کیا گیا۔ مقاصد نامعلوم سہی مگر یقیناً ہمارے لیے زہر آلود ہیں۔ اس وقت ملک کو عالمی سطح پر جن سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سامنا ہے، انہیں راز و نیاز سے بھرپور واقفیت رکھنے والے مسند نشین ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں اور عوام توقع رکھتے ہیں کہ وہ سب حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر ان مسائل سے نمٹنے کی بھرپور کوششیں کر رہے ہوں گے۔ عوام بے چارے اپنے مسائل کی چکی میں اس طرح پس رہے ہیں کہ انہیں ان عالمی خطرات پر دھیان دینے کا ہوش ہی نہیں۔ ملک بے شک ترقی کر رہا ہوگا لیکن عام آدمی کی آمدنی اور خرچ کا توازن مہنگائی کے سبب روز بروز خراب تر ہو رہا ہے۔ کہیں بجلی نہیں ہے تو بہت سے علاقے پانی سے محروم ہیں۔ گٹر ابلے پڑ رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر پہاڑوں کے رخ پر جا رہے ہیں۔ رہ رہ کر گیس کے بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ بنیادی ضروریات ہیں جن کا فراہم کرنا ہر کامیاب حکومت کا بنیادی فرض ہوتا ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کو چھوڑ دیں کہ وہ ایک سیاسی جماعت کا نعرہ ہے مگر مذکورہ بالا سہولیات کیا اس ملکِ خداداد میں عوام کا حق نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو اے سرکار والا تبار! بتائیے کہ ان سب کی فراہمی کے لیے بھاری مشاہرے لینے والے ہمارے قومی و صوبائی نمائندے اور گریڈ 22 سے لے کر نیچے تک کے سرکاری اہلکار کیا کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ان سب کو زرِ نقد اور مراعات کی صورت میں جو کچھ ملتا ہے، وہ کوئی حکمراں اپنی جیب سے نہیں دیتا۔ وہ ہمارے اور آپ کے اوپر لادے گئے ٹیکسوں سے بٹوری ہوئی دولت سے ادا کیا جاتا ہے۔ سہرا وہ اپنے سر سجا لیتے ہیں۔ دھاندلی، کرپشن، پناما لیکس اور دوسرے بہت سے معاملات پر حزبِ اقتدار و اختلاف یوں دست و گریباں رہتے ہیں کہ الامان مگر مالی فائدوں کی بات آئی تو سب شیر و شکر ہو گئے اور متفقہ قراردادیں آ گئیں۔ ایک بے چارے سینیٹ کے چیئرمین رضا ربانی نے اعتراض کیا تو کون سنتا ہے اس نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ ہاں، مزدوروں یا سرکار کے زیرِ کار عام لوگوں کی بات ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایسے ایسے دور از کار نکتے ایجاد ہوتے کہ کسی کا دھیلا بھی نہ بڑھتا۔ انہوں نے آنِ واحد میں اپنے ہزاروں بلکہ لاکھوں بڑھا لیے کیونکہ وہ خواص ہیں اور ہم عوام! ہم عالمی قوتوں کی نظر میں خارِ مغیلاں بنے ہوئے ہیں تو اپنی ہی عوامی قوت کی سیرابی میں بھی ناکام ہیں۔ آخر کیوں؟ اس گمبھیر سوال کے ساتھ ہم چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں سوال بھی ہیں اور جواب بھی۔

رانا بشیر احمد ایاز، ناظم آباد کراچی سے ”3 مئی کی چلچلاتی اور گرم سہ پہر کو کمپنی سے واپسی پر بک اسٹال کا چکر اس امید کے ساتھ لگایا کہ اب کی دفعہ ہمارے لیے سامانِ راحت موجود ہوگا۔ جب جاسوسی پر نظر پڑی تو یوں لگا گویا کوئی بادِ صبا کا جھونکا آ ٹکرایا ہو۔ کچھ دیہاتی مکان، گاؤں کا منظر، دور کہیں ابھرتے سورج کی روپہلی کرنیں، سرسبز درختوں کے جھنڈ میں ایک الھڑ مٹیار سر پر نیلے رنگ کے دوپٹے میں موجود تھی۔ نیلے رنگ میں سفید ستارے، سیاہ سرمگیں آنکھیں، دراز پلکیں، ریشمی عنبریں زلفیں جو کسی شرارت سے حسینہ کے چاند چہرے پر اٹکھیلیاں کرتی نظر آئیں۔ ساتھ میں ایک عدد خنجر بدست ہاتھ لیکن یہ کیا؟ مونچھوں والے صاحب خنجر سے خوف زدہ کم اور صرف ہاتھ کو دیکھ کر حیران زیادہ لگ رہے ہیں۔ بہرحال ٹائٹل اس دفعہ ذاکر انکل کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں قدم رکھا جہاں صدارت کی کرسی واہ گینٹ سے بلقیس خان نے سنبھال رکھی تھی۔ مبارک باد کے ڈونگرے ان کے نام۔ باقی تبصرہ نگاروں میں عبدالجبار رومی، معراج محبوب عباسی، سید شکیل کاظمی، سید عبادت کاظمی، محمد صفدر معاویہ، رانا حبیب الرحمن، سید محی الدین اشفاق بھی اپنے دلکش انداز میں موجود تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے سے آغاز کیا۔ شاہ زیب کا سردار سجاول کو چیلنج بہت مزہ دے گیا۔ سردار کی موروثی طاقت نے کیسا الجھن میں ڈال دیا ہے۔ شاہ زیب کا تاجور کے لیے اتنا فکرمند ہونا بہت اچھا لگا۔ شاہ زیب کی پچھلی زندگی سے بھی آہستہ آہستہ پردہ اٹھ رہا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ انگاروں کی تپش سے گھبرا کر کچھ آوارہ گردی کی۔ کہانی کا ٹیمپو بہت زیادہ تیز ہو گیا ہے۔ شہزی آخرکار یوٹ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن پھر آخر میں چندرکلا نے رنگ بدل لیا۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ نیکی کر دریا میں ڈال، منظر امام صاحب اس دفعہ پھر بازی لے گئے۔ منیر شامی نے جہاں ہنسایا وہیں پر کاشف زبیر کے نواب زادہ شاعر عرف شامی کی یاد دلا دی۔ دوسری چال اور سرورق کی کہانیاں بس گزارے لائق تھیں۔ کترنیں میں شبنم شفیق کا لطیفہ سب سے بہترین رہا۔ اس امید کے ساتھ اجازت کہ خط کو شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔“ (آپ تو پرانے قاری ہیں یا نام بدل لیا ہے؟)

میانوالی سے احسان سحر کی واپسی اور بے جا خدشات ”وہ گزرے زمانے یاد آئے، وہ دن سہانے پھر کبھی نہ آئے، بے چینی ہی بے چینی ہے۔ اب تو لفظ بھی گھبراتے ہیں۔ باہر آنے سے ڈرتے ہیں، دل میں ہی چھپے رہتے ہیں۔ دل روٹھا روٹھا ہو، پھر سکون کہاں آتا ہے۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر، جانے کی باتیں جانے دو، کچھ دوستوں نے فون پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ محبت بھری التجائیں کے مجبور نہیں کرتیں۔ نفرت کا مقابلہ محبت سے ممکن نہیں۔ پھول خوشبو کے بنا مکمل نہیں۔ ہم نے آپ سے اور کچھ نہیں کہنا بس عرض یہی ہے کہ کچھ تبصرہ نگار اور نام نہاد ادب کو سمجھنے والوں نے جو غلیظ زبانیں فیس بک پر استعمال کیں، فیک آئی ڈیز سے...... جو آپ لوگوں کو خطوط میں اپنی پارسائی کا رونا روتے نظر آتے ہیں بس ایسے غلیظ لوگوں سے مجھے نفرت ہے۔ کون سا ایسا رائٹر ہے جس کے خلاف انہوں نے وہاں نازیبا الفاظ کا استعمال نہ کیا ہو اور ان میں چند کیسل بھی شامل ہیں۔ میں نام کسی کا نہیں لوں گا بس اشارہ اتنا ہی کافی ہے کہ آپ لوگوں کے پاس شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے ہیں جو وہ غلے بن کر یہاں بھی گندگی پھیلانے آ جاتے ہیں۔ بس ان لوگوں کے درمیان رہنا مجھے قابلِ قبول نہیں۔ محی الدین نواب مرحوم جیسے

عظیم رائٹر کو جب ان لوگوں نے نفسیاتی مریض اور پتا نہیں کیا کیا بنا ڈالا۔ یہ وہ آدھے ادھورے الفاظ تھے جو ہم نے آپ تک پہنچا دیے باقی آپ لوگ جانیں، اور محفل میں آنے یا نہ آنے کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔ جاسوسی ایک گرم اور غصے سے بھرپور دن کو ملا۔ دو پہر بیٹے خالی ہونے کی خوشی جاسوسی کے ساتھ منائی۔ خوشی، تب خوشی لگتی ہے جب کسی اپنے کے ساتھ منائی جائے۔ ٹائٹل گرل کو دیکھ کر دل میں شادیانے بجنے لگے۔ خوب صورتی نے ہر دفعہ ہی دل کو تروتازہ کیا ہے۔ تجزا اور دیہاتی پس منظر اس ٹائٹل کی شان تھے۔ آگے بڑھنا بھی ضروری تھا۔ ملکی حالات پڑھ کر کڑھنا ہم نے چھوڑ دیا۔ اور سیدھی بات ہے دنیاداری کے دکھ پالنے کا شوق نہیں۔ اس عارضی دنیا سے چلے جانے کی جتنی ہمیں جلدی ہے شاید ہی کسی کو ہو۔ یہ بدصورت اور فنا ہو جانے والی دنیا جہاں صرف بو ہی بو ہے۔ بلقیس خان نے میدان مارا، اچھا لگا۔ آپ کا خلوص تھا، باقی سب دوستوں نے بھی اچھا لکھا۔ نام لیتے لیتے ان کی عمر ڈھل جائے گی۔ پہلا شاہکار برفیلا جہنم پڑھا۔ دلچسپی اور سنسنی شروع سے آخر تک برقرار رہی۔ لیز اور اینڈریا کا خلوص بھرا پیار جہاں ملا، وہیں میگ جیسے شاہکار نے بھی حیران کیا۔ دغابازیاں بھی عروج پر رہیں۔ نفرت اور دغا بازی کو جب عروج مل جائے تو سمجھو ان کے ختم ہونے کے دن آگئے۔ ڈھیر سارے کرداروں اور ڈھیر ساری الجھنوں کے ساتھ کہانی نے خوب مزہ دیا، گڈ اینڈ بیسٹ۔ پہلا رنگ، دولت کا نشہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور اندھے کو اپنے پرائے کہاں نظر آتے ہیں۔ زاہد اور حماد جیسے کئی کردار ہمارے معاشرے کے ناسور بن چکے ہیں۔ اچھا رہا۔ دوسرا رنگ دلدلی چہرہ، ہمارے بڑے اور غلیظ لوگ ممتاز شاہ جیسے کریہہ صفت لوگ۔ ہر طرف گندی گند ہے اور صاف کرنے والے نہ ہونے کے برابر۔ کس کس دکھ کا ہم احاطہ کریں۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بھی بحری سفر میں گم ہو گئی۔ کچھ نئے کرداروں کا اضافہ ہونے والا ہے۔ جیسے ایڈوانی اور بلراج سنگھ۔ ہیرے کی وجہ سے کہانی میں دلچسپی اور بھی بڑھ چکی ہے۔ انگارے پل پل رنگ بدل رہی ہے۔ کافی سنسنی خیز موڑ آچکے ہیں۔ منظر امام، حاتم طائی لائے۔ زبیر سلیمانی نے بھی اچھا اور سبق آموز پیغام دیا۔ تنویر ریاض نے بھی بور نہیں ہونے دیا۔ باقی کہانیاں مختصر ہونے کی وجہ سے کچھ خاص پسند نہیں آئیں۔ (جو یکھانہ ہو اس کے بارے میں وثوق سے کہنا درست نہیں۔ ہم نئے رائٹرز کی کہانیاں دیکھ رہے ہیں اور چھاپ بھی رہے ہیں۔ آپ بھی اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں، مگر کہانی بھیجنے کے بعد آپ میں سے انتظار کی زحمت کوئی نہیں کرتا)

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کا شاعرانہ انداز چھاؤ ''مئی کا جاسوسی 6 مئی کی گرم صبح کو ملا۔ سرورق پر مصطفیٰ قریشی اپنے مخصوص ولنی انداز میں براجمان تھا۔ ہیروئن کی آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا جبکہ ہیرو صاحب کا ہاتھ چاقو کے ساتھ اس بات کا غماز تھا کہ موصوف کسی بھی وقت سرپر اترفلمی انٹری دے سکتا ہے۔ اوار یے میں سابقے کے ساتھ لاحقے کا اضافہ تھا۔ اس قوم کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہیں آگ لگنے پر کنواں کھودنے کا خیال آتا ہے۔ بلقیس خان کی سمجھ بوجھ سے بھرپور باتیں ٹاپ شاپ پر تھیں۔ محترمہ میری عمر ابھی ہڈی نہیں، دانت ٹوٹنے کی ہے۔ دو بھی...... دودھ کے۔ اس بات پر شاعر نے کیا خوب کہا ہے، کیا کہا ہے وہ ابھی ذہن میں نہیں ہے۔ روبی انصاری آپ کے خط ہمیشہ بہتر سے اچھے ہوتے ہیں اور محبت بھی دل کو بھاتی ہے جب آگے بھی محبت ہو ورنہ منفی اور مثبت کا نتیجہ منفی ہی ہوتا ہے۔ یہ شاعر نے نہیں کہا، ریاضی کا قاعدہ ہے۔ شفقت محمود دکول کے خول میں اکثر کوئی دکھ بھی چھپا ہوتا ہے، ہاں پسندیدگی جمع تعریف کا شکریہ۔ شکیل حسین کاظمی مناسب انداز میں لکھنے کی جگہ چھپے کا لفظ زیادہ موزوں ہے کیونکہ غیر مناسب لکھ بھی دو تو چھپتا نہیں۔ عبادت کاظمی بھائی! وہ محترمہ آپ کی پڑوسن ہیں یا انڈر ٹیکر کی؟ وضاحت کرنا، کیونکہ اس بارے میں تو شاعر نے بھی کچھ نہیں فرمایا۔ شاید یہ بھی سیلف ڈیفنس کے باعث کیا گیا۔ سجاد خان میرے 50 فیصد بال سفید ضرور ہیں مگر دھوپ یا عمر کے باعث نہیں، ٹائیفائڈ کے باعث۔ مشال اینڈ نوال سسٹرز یہ تو واقعی کمال ہو گیا۔ کیونکہ اس دور میں جینا ہی بہت ہے وہ بھی اپنے خرچے پر حیرت ہے۔ میں اس بارے میں شعرا کی رائے لینے کی کوشش کروں گا۔ رانا حبیب صاحب اس دور نا گوار میں مسکرانا کمال ہے۔ صفدر معاویہ آخر بڑی دیر بعد شاعر نے کہہ ہی دیا۔ یہ نظام کب بدلے گا، ہم بدلیں گے تب بدلے گا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی چٹ پٹے، کھٹی میٹھی باتوں سے بھرپور زبردست تھے۔ اگر بات ہو جائے کہانیوں کی تو پہلے انگارے پڑھی۔ خیالات کی رو یک دم للکار پر جا پہنچی۔ یہاں ایسے ہی تابی نے بھی ایک ایسے سورما کو للکارا تھا جس کو اپنی قوت پہ بہت زعم تھا مگر عزم و حوصلے سے اس کو چت کر دیا۔ اب جارج کی جگہ چاول اور تابی کی جگہ بی صاحب! یہاں فرق صرف اتنا ہے کہ شاہی عام بندہ نہیں MMA کا چیمپئن ہے۔ انگارے کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ ایسا لگتا ہے کہ شہزاد احمد خان کو... جگہ جگہ پر اپنی عرفیت جتانے کا بہت شوق ہے۔ اب تو یہ عرفیت اتنی ازبر ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شہزاد احمد نام بتائے تو ہم فوراً ہی عرف شہزی کا لاحقہ جوڑ دیتے ہیں ساتھ۔ کوہارا کو پچھاڑنے کے بعد اب صورتِ حال کافی مزیدار ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ شہزی صاحب بی جی اور لولوش کا کیسے حشر نشر کرتا ہے۔ وش یو آل دی بیسٹ مسٹر شہزاد احمد خان عرف شہزی۔ دلدلی چہرہ میں خضر کے اغوا کا معما بالکل آخر میں حل ہوا۔ مکرم شاہ پر تو دھیان بکھر گیا ہی نہیں لیکن پھر وہی مجرم نکلا۔ چال میں آخر محمد فاروق انجم نے ایسی چال چلی کہ ان کی چال کے جال میں الجھ کر مجرم لڑکھڑاتی چال چلتے گر پڑے۔ زبیر کی تو کون ہے گا کروڑپتی کی لاٹری لگ گئی۔ پانچوں انگلیاں گھی میں سر کڑاہی میں۔ بیوی بھی مل گئی مالی مسائل بھی حل ہو گئے۔ جبکہ زاہد اور حماد ہاتھ ملتے رہ گئے۔ بلکہ حماد تو ہاتھ ملنے کے بجائے دھوبی بیٹھا۔ لب شناس میں ملزم کچھ زیادہ ہی ذہانت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر بقول نامعلوم شاعر نے کہا ہے ناں کہ سیانا کوا گندگی میں گرتا ہے۔ اسی لیے وہ بھی یہ بھول گیا کہ بھائی میں نے ملزم کا لہجہ نہیں بتانا کیونکہ میں تو گونگا بہرا ہوں مگر اب بے چارہ شاعر کس کس کو سمجھائے کہ ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے۔ گرانڈ فادر کلاک میں ناخلف بیٹے نے باپ کو ختم کر دیا۔ لگتا ہے ہمارا اثر گوروں پر بھی ہو رہا ہے۔ دوسری گواہی میں ہاشم مجبور تھا اس لیے اللہ نے اس کو بچالیا جبکہ ملیحہ میڈم کو بے وفائی اور اس کے شوہر نامدار کو قانون ہاتھ میں لینے کی سزا اگر کلوز سرکٹ کیمرا خراب نہ ہوتا اور چوکیدار کی گاڑی نہ چھوٹتی تو ہاشم کی زندگی کی گاڑی چھوٹ جاتی تھی۔ اسی لیے تو شاعر بھی بے اختیار بول اٹھا۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ قسمت کا حال میں دو علم نجوم کے پیروکار آپس میں ٹکرا گئے اور مقابلے کا اصول ہے کہ ایک کو ہارنا پڑتا ہے اور یہاں بھی لیز اجیت گئی اور بے چارہ جیف...... مکافات میں وکیل صاحب کا کیا بالآخر اس کے اپنے سامنے آگیا۔ اب اس مجرم کو کس عدالت میں مجرم ثابت کرے گا جس کو خود رہائی دلوائی تھی۔ اس بات پر شاعر نے کیا کہا ہے مجھے تو یاد نہیں اگر آپ کو یاد آئے تو مطلع کر دیں۔ آج کی شاعری سے اتنا ہی۔''

چوہدری محمد سرفراز کی تبصرہ نگاری جتوئی سے ''اس ماہ کا شمارہ چار تاریخ کو ہی مل گیا تھا مگر شومئی قسمت پرنٹنگ یا پھر بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے صفحات

آگے پیچھے تھے۔ شمارہ تبدیل کراتے کراتے سات تاریخ ہو گئی۔ ایک تو انگارے پڑھنے کی جلدی اور اوپر سے اس سب نے تین چار دن اچھی خاصی کوفت میں مبتلا کیے رکھا۔ گلے شکوے تو ہو گئے۔ اب بات کچھ سرورق کی ہو جائے۔ اس مرتبہ سرورق کی خوب صورتی کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ لگتا ہے ذاکر انکل نے سرورق دل سے بنایا ہے۔ چیکی نکتہ چینی کا رخ کیا تو وہ محفلِ جاں تھیں جن کے انداز تبصرہ کے ہم فین بنتے جا رہے ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو بلقیس خان صاحبہ، رہی بات متھا ویچے کی تو یہ میں نے محاورتاً استعمال کرنے کی جسارت کی تھی۔ اب بھی سمجھ نہ آئے تو اپنا خود کا تبصرہ پڑھ لینا۔ سب کچھ خود بخود سمجھ آ جائے گا۔ احسان خان نیازی صاحب، محفلِ یاراں کو چھوڑ کر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ چند ایک لوگوں سے گلے شکووں کی بنیاد پر سب کو چھوڑ دینا مناسب طرزِ عمل نہیں۔ مشال اینڈ نوال کا تبصرہ پڑھ کر یوں لگا جیسے کوئی انڈین ڈراما چل رہا ہو۔ سید عبادت کاظمی صاب ہمت سے کام لیں۔ اب تمام ذمے داری آپ پر ہی ہے۔ آپ ہی حوصلہ ہار جاؤ گے تو پیچھے کیا بچے گا۔ شفقت محمود صاحب کی تمک پاشی ماٹھی رہی۔ امید ہے اگلی واری کسر پوری کر دیں گے۔ کورنگی سے محمد خواجہ صاحب اور ملتان سے شیخ وقار، دونوں نے کہانیوں پر ہی توجہ مرکوز رکھی۔ بھائی جی! کچھ دوستوں کا بھی ذکر خیر کرنا تھا۔ آخر یہ چیکی نکتہ چینی کس مرض کی دوا ہے۔ (خط مختصر کرنے کے لیے دوستوں کی باتیں ایڈٹ ہو جاتی ہیں بسا اوقات) کہانیوں کی ابتدا مغل صاحب کی انگارے سے کی جو ردھم سے چھلانگ لگا کر ایک دم فل فارم میں آ گئی ہے۔ سارے معاملات کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ شاہ زیب کی ماضی کی جھلکیاں بھی نہایت دلچسپ رہیں۔ اب شدت سے انتظار ہے تو سجاول سے فائٹ کا۔ سرورق کے رنگوں میں روبینہ رشید کا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ابتدا اسی دوسرے رنگ سے کی۔ تحریر میں سسپنس عروج پر تھا۔ اسی سسپنس کی بنیاد پر رائٹر نے کہانی کے تانے بانے نہایت مہارت سے بُنے اور جب کہانی سمیٹنے کا ٹائم آیا تو یہاں بھی رائٹر نے پورا پورا انصاف کیا۔ پہلا رنگ جال کا پلاٹ اگرچہ کچھ نیا نہیں تھا مگر انداز تحریر کی وجہ سے کہانی میں کچھ جان پڑ گئی۔ انجم صاحب کی کہانیوں میں غیر فطری اتفاقات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ اب اسی رنگ کو لے لیں، زبیر کا نوکری کے لیے جانا وہاں حماد اور زاہد سے سامنا ہونا، اور پھر اغوا کے سارے سین کا حصہ بننا وغیرہ وغیرہ۔ برفیلا جہنم کسی اور وقت کے لیے بچا کر رکھ دی ہے۔ جب پڑھنے کو کچھ نہیں ہوگا تب سکون کے ساتھ پڑھیں گے۔ اب کچھ بات مغرب سے درآمد کہانیوں کی ہو جائے۔ گرانڈ فادر کلاک میں قتل کا معما آسانی سلجھ گیا۔ لب شناس میں بھی کچھ یہی سین تھا۔ یہاں بھی سراغ رساں کی ذہانت کام آئی۔ اگلی کہانی انوکھی واردات سے صحیح معنی میں لطف اندوز ہوئے۔ واپسی پر اچھی خاصی دماغ خوری کرنی پڑی۔ الٹی تدبیر میں وہی ہوا جو عموماً ایسی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ قاتل غلطی کرتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔“

آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی افسردگی ”مئی 2016ء کا جاسوسی 6 تاریخ کو جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا یا یوں کہہ لیں کہ بقول شاعر کیا لطف انجمن جب دل ہی بجھ گیا ہو۔ چار ماہ پہلے میرا تبصرہ جو شائع ہوا تھا اس میں شادی کی مبارک باد دی گئی تھیں۔ آپ اور تمام تبصرہ نگاروں نے بھی شادی کی مبارک دی تھی، اور آج چار ماہ دس دن بعد میری شریکِ حیات مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اللہ کے پاس چلی گئی۔ (اوہ، بہت افسوس ہوا، اچانک کیا ہو گیا تھا؟) آہ کیا کیا صورتیں ہوں گی جو خاک میں پنہاں ہوں گی۔ میری والدہ کے بعد دوسرا بڑا اور شدید جھٹکا میرے لیے۔ محی الدین نواب صاحب اور سر کاشف جیسے عظیم لکھاری بھی اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ دنیا میں آئے ہیں۔ ایک دن جانا تو ہے ہی۔ اللہ سب کی بخشش فرمائے، آمین۔ نکتہ چینی میں بلقیس خان پہلے نمبر پر رہیں۔ دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ عبدالجبار رومی، معراج محبوب عباسی، محمد خواجہ، محمد صفدر معاویہ، اور لیس احمد خان کے تبصرے پسند آئے۔ احسان خان نیازی، آپ اپنا فیصلہ واپس لیجیے۔ ورنہ کمی ہو جائے گی۔ شکیل حسین کاظمی کا مختصر تبصرہ اچھا لگا اور روش کنیا کا تکا بھی تیر ثابت ہونے کا پورا یقین ہے۔ کہانیوں میں برفیلا جہنم شروع کی ہوئی ہے۔ عزم و حوصلے کی عظیم مثال دیکھنے کو مل رہی ہے۔ امجد رئیس ہمیشہ کی طرح شاہکارے کر آئے ہیں۔ بقیہ کہانیوں کا ذکر اس لیے نہیں کر سکوں گا کیونکہ پچھلے مارچ، اپریل اور مئی یہ تین ڈائجسٹ پڑھنے ہیں۔ کچھ حالات کی ستم ظریفی نے موقع ہی نہیں دیا۔ بہرحال رب کی مصلحتیں، رب ہی جانے۔ ہمیں وہ جس حال میں بھی رکھے۔ ہم خوش ہیں اور خوش رہیں گے۔“ (انشاء اللہ)

نامعلوم مقام سے احرام زل حسین کی محبتیں ”مئی کا جاسوسی ملا لیکن کاشف زبیر بھائی کے بعد کچھ بھی پڑھا نہیں جا تا فی الحال تو...... ایسا لگتا ہے جیسے کوئی رنگ ہی نہیں رہ گیا جاسوسی میں...... حالانکہ باقی رائٹرز خصوصاً مغل اعظم تو کمال لکھتے ہیں اور ہمارے ہارٹ فیورٹ ہیں، لیکن وہ تو بیشتر قسط وار کہانیاں ہی لکھتے ہیں جبکہ کاشف بھائی کے مکمل ناول تو زبردست...... ڈائجسٹ کھولتے نگاہ سب سے پہلے کاشف بھائی کا نام ڈھونڈتی تھی لیکن اب...... یہ موت بھی تو بلا کی خوش ذوق ہے۔ یہ جاں گسل صدمہ ان کے گھر والوں نے کیسے سہا ہوگا؟ مریم بھابی کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی۔ ابھی تو ہم نے کاشف بھائی سے آٹو گراف لینا تھا۔ ابھی تو ان سے سسپنس میں شائع ہونے والی ”سات دن“ جیسی دل گداز اور ”عالی منصب“ جیسی ایمان افروز کہانی کی فرمائش کرنا تھی، لیکن اب کبھی شامی اور تیمور دکھائی نہیں دیں گے۔ اب کبھی جلیل اور راجہ ہمیں بے ساختہ ہنسانے نہیں آئیں گے۔ لکھنا تو بہت کچھ تھا مگر قلم ساتھ نہیں دے رہا۔ کہانی کے بارے میں بتا دیں۔ ہمایوں سعید راج کہاں گم ہیں، آپ؟“ (کہانی کا پلاٹ بہت پرانا ہے۔ اس موضوع و انداز کی بے تحاشا کہانیاں شائع ہو چکی ہیں)

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی عرق ریزی ”مئی 2016ء کا شمارہ اپنے شہر خانیوال میں ملا۔ سرورق کو صنفِ نازک صنفِ وجاہت اور ایک ہاتھ بدست خنجر سے مزین کیا گیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ موسم کی سختی پر بات کرتے نظر آئے بہرحال جو گرمی آئی ہے وہ آ کر رہے گی لیکن بہتر منصوبہ بندی سے اس سے بچا جا سکتا ہے جس بے رحمی سے درختوں کو کاٹا جا رہا ہے اس سے گرمی بڑھ رہی ہے۔ بہرحال اپنی محفل میں پہنچے جہاں پر بلقیس خان اپنے بہترین اور تیکھے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ رومی بھائی اس دفعہ مختصر تبصرے پر اکتفا کیا۔ معراج محبوب عباسی اور شفقت محمود بھی بہترین تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ احسان نیازی محفل کو چھوڑنے کی کوشش میں مصروف نظر آئے۔ نہ بھائی اے گلاں چنگیاں نہیں، سید عبادت کاظمی بھائی آپ کا صدمہ واقعی بہت بڑا ہے۔ اللہ پاک آپ کے والد صاحب کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ سجاد خان کا بھی کچھ ہنسی مذاق کے ساتھ اچھا تبصرہ تھا۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ اعجاز احمد، راحیل شوکت، شہریار مظہر، سلیم، روبیا اعجاز اور مجھے لکھنے کا حوصلہ دینے والے قیصر اقبال بھائی کدھر غائب

ہو، یار حاضری لگواؤ۔ کہانیوں میں انگارے سے شروعات کی۔ یہ قسط اسحاق اور عالمگیر کی آمد کی وجہ سے کچھ زیادہ سنسنی پیدا کر گئی۔ سجاول کا شاہ زیب پر مہربان ہونا سمجھ نہیں آرہا تاجور کو دونوں سے بچانے کے لیے بھاگ جانے کا ڈراما رچانا۔ بابا فیض بھی بھیڑیوں میں ایک انسان نظر آتا ہے۔ آوارہ گرد پر پہنچے جہاں پر اب شہزی نے دشمنوں پر غلبہ پالیا اور کچھ نئے باب کھلے۔ امجد رئیس کی برفیلا جہنم بہت ہی خوب صورت اور بہترین کہانی تھی۔ دو بہنوں میں نفرت کی دیوار گرا کر دوبارہ محبت کا بیج بونے والی تحریر بہت اچھی لگی۔ سرورق کا پہلا رنگ محمد فاروق انجم کی چال تھی۔ مصنف سے معذرت کے ساتھ کہ مجھے یہ کوئی خاص قسم کی تحریر نہیں لگی بس ایویں گزارہ تھا۔ کہانی میں بہت جھول نظر آئے۔ البتہ سرورق کا دوسرا رنگ دلدلی چہرہ کچھ بہتر تحریر تھی۔ جہاں وکیل صاحب کی دلیری اور شوہر سے محبت نے اسے کامیاب کیا وہیں بکرم کا مکروہ چہرہ بھی واضح ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا لیکن کچھ لوگوں کا کردار درندوں سے بھی گھناؤنا ہو جاتا ہے۔ منظر امام نیکی لے کر آئے۔ حاتم طائی نے بالکل اچھے طریقے سے نیکی کر کے دریا میں ڈالی پر آگے دریا نے نیکی قبول نہیں کی اور درزی صاحب بچ گئے اور حاتم طائی اور منیر شامی حوالات میں آرام فرما رہے ہیں۔ سلیم انور کی گرانڈ قادر کلاک اور ارشد بیگ کے قلم سے لب شناس مختصر پر اچھی تحریریں تھیں۔ جمال دتی کی انوکھی واردات بھی اچھی رہی۔ لوئیس فاکس کی شخصیت آخر تک معمائی رہی اور اس نے بہت خوب بدلہ لیا۔ سرور اکرام کی مکافات بہت عمدہ تحریر رہی۔ انسان اپنے غرور اور پیسے کے لالچ میں یہ بھول جاتا ہے کہ ایسا کچھ میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ بابر نعیم کی قسمت کا حال اچھی رہی۔ تنویر ریاض کی واپسی بھی بہترین رہی۔"

دراہن کلاں سے مرحا گل کے شکوے "مئی کا نیا نکور شمارہ 10 مئی کو ملا، آخری پیپر دینے کی خوشی اس وقت کافور ہوگئی جب محفل میں اپنا لیٹر دوسری مرتبہ غائب پایا مگر ہم ڈھیٹ بن کر انٹریاں دیتے رہیں گے اور گھنٹیاں بجتی رہیں گی جاسوسی کی محفل میں ہماری، ناتا نہیں توڑیں گے۔ (اوہ، خیر ہے شاباش) ہاں بھئی، خیر سے گھوم کر واپس ٹائٹل میں پہنچے۔ جہاں شاہ زیب کی تاجور یاقوتی لبوں سے مسکرا رہی تھی اور شاہ زیب (سجاول ڈاکو) کا کندھا اڑانے کی کوشش میں مصروف نظر آئے۔ سجاول ڈاکو بیل کی طرح ڈکراتے ہوئے اٹھنے کی کوشش میں ناکام نظر آیا۔ سب سے پہلے سجاد خان کے تبصرے کو گہرائی سے پڑھا۔ جہاں صاحب بہادر شکوہ کرتے نظر آئے۔ جی بالکل بجا فرمایا آپ نے، دو مرتبہ کی غیر حاضری کے بعد ہمیں بھلا دیا گیا۔ (کس نے کہہ دیا؟) نادر سیال پر اتنی چوٹ کیوں؟ تبصرے کے آخر میں آپ کا شعر دل کو چھو گیا۔ عبادت جی کا جاندار تبصرہ سراہے جانے کے لائق تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و صبر عطا فرمائے، آمین۔ پلیز جاسوسی سے رشتہ برقرار رکھیے گا۔ معراج محبوب کی روداد زبردست تھی۔ اس مرتبہ ماٹھا سا تبصرہ رہا آپ کا۔ بھئی ہم نے بھی امتحان کی مصروفیت میں لیٹر لکھا تھا مگر...... سید شکیل کاظمی کا تبصرہ سپر ہٹ تھا، ہے اور رہے گا۔ بھئی پھر وہ افواہیں سچی ہیں کیا...... ؟ جو گلہ کر بیٹھے ہیں آپ۔ احسان خان کا تبصرہ کیوں دکھی کر گیا۔ ایسی کیا خطا ہوئی ہم سے جو جاسوسی کی محفل چھوڑ رہے ہیں اتنا زبردست لکھنے والے تبصرے، پلیز محفل کا ساتھ مت چھوڑیے۔ مشال اینڈ نوال کا کھٹ پٹ تبصرہ پسند آیا۔ شیخ وقار کا پہلا تبصرہ محفل میں جگہ بنا گیا، ویلڈن۔ زبردست سا انداز تھا۔ صفدر معاویہ کا تبصرہ تو ہم کافی شوق سے پڑھتے ہیں۔ بھئی آپ خوش نصیب ہیں جو 2 اپریل کو جاسوسی مل جاتا ہے۔ ہمیں تو گاؤں میں دس سے پہلے کوئی بھی رسالہ نہیں ملتا۔ شہر سے آنے میں کافی ٹائم لگتا ہے اس لیے تبصرہ جلد از جلد لکھنا پڑتا ہے مگر پھر بھی شائع نہیں ہوتا۔ محی الدین اشفاق صاحب ہم اب کیا کہیں۔ صنف کرخت کا گلہ کر رہے ہیں آپ، بھئی اب ذرا دوبارہ سے لیٹر دیکھیے، اور ہم بھی صنف کرخت کو صنف کرخت ہی پکارا گیا۔ بھئی صنف کرخت کو صنف کرخت نہ پکاریں تو کیا صنف نازک پکاریں...... جبکہ صنف کرخت خود کو صنف وجاہت کہلانا پسند نہیں کرتے۔ بھئی صنف نازک آئندہ صنف کرخت، صنف وجاہت کہہ کر پکاریں۔ فاروق احمد کی دوسری لائن نے بے حد مزہ دیا، کمال ہے۔ محمد خواجہ کا تبصرہ پسند آیا کافی لمبا تھا، ہو چاہمارا بھی کبھی اتنا بڑا لیٹر شائع ہوگا۔ ادریس خان کا تبصرہ کافی خوشگوار تھا۔ بھئی کافی خوش نصیب ہیں آپ جو آنکھوں دیکھا حال بھی شائع ہوگیا جبکہ ہمارا آنکھوں پڑھا حال بھی شائع نہیں ہوتا۔ بہادر خان لغاری کا لیٹر ستارہ بن کر چمکا محفل میں۔ عابد حسین کو داد دینی پڑے گی۔ سیف الرؤف صاحب، ہم بھی آپ کی طرح مریم کے خان کی تحریروں کے منتظر ہیں۔ شفقت محمود اتنی احتیاط کرتے ہیں آپ ڈائجسٹ خریدتے ہوئے، ہم تو تین تین بھی خرید لیتے ہیں۔ روبی صاحب کی قلم نگاری سے لطف اندوز ہوئے۔ بھئی کس نے کہا کہ صنف وجاہت دل نہیں رکھتے، بہت احساس بھرا دل رکھتے ہیں تبھی تو گلہ کر بیٹھے ہیں خود کو صنف کرخت پکارنے پر۔ بلقیس خان کا گل چہرے والا تبصرہ ہمیں بھی بجھو بجھو دلا گیا۔ بھئی مبارک ہو بہت بہت مبارک ہو۔ بلقیس خان بالکل بجا فرمایا آپ نے کہ صنف نازک بہت زیادہ قوت برداشت کی مالک ہوتی ہیں جبکہ صنف وجاہت تو فوراً گلہ کر بیٹھتے ہیں۔ طاہرہ گلزار اس مرتبہ کیوں غیر حاضر رہیں۔ بالکل مزہ نہیں آیا۔ ملک شیر ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی جو آپ بالکل روٹھ گئے ہیں محفل سے۔ سب سے پہلے انگارے کو تپتی گرمی میں انگاروں کی طرح پڑھا۔ اف اتنی سپرہٹ تحریر...... لگتا ہے اس مرتبہ کچھ مختلف لڑائی ہوگی شاہی اینڈ سجاول کے بیچ۔ اس کے بعد برفیلا جہنم پڑھا۔ امجد رئیس اتنی زبردست مغربی کہانیاں کیسے لکھ لیتے ہیں۔ اینڈریا کے رنجھی والے واقعے کی داد دینی پڑے گی۔ بڑا دل گردہ تھا۔ آوارہ گرد کی قسط اس مرتبہ شاندار تھی۔ دوسری گواہی محمد زبیر سلیمانی کی کہانی ہم پہلے اخبار جہاں میں پڑھ چکے ہیں اس لیے نو تبصرہ۔ پلیز دوسری مرتبہ نہ شائع کیا کریں۔ نئی اسٹوری دیا کریں۔ سرور اکرم کی مکافات نے دل دکھی کر دیا۔ ناہید پر کافی افسوس ہوا۔ بے حس معاشرہ، اللہ غارت کرے صنف کرخت کی ایسی نوجوان نسل کو...... پہلا رنگ تھا تو زبردست مگر وہی پرانا انداز جو کافی مرتبہ لکھا جا چکا ہے۔ خیر ایک دم موسم نے چال چلی اور موسم کافی سہانا ہوگیا تھا ایک گھنٹے کے اندر اس لیے چال کہانی بھی چل گئی تھی حالانکہ پہلے گھنٹے میں موسم انگاروں کی طرح انگارے برسا رہا تھا۔ دوسرا رنگ روبینہ رشید کا کافی اچھا تھا۔ ہیتہ کی بہادری کام آئی اور سچی محبت رنگ لائی۔ بکرم شاہ کا مکروہ چہرہ دیکھ کر گھن آئی۔ غالب اور روبن نے دوستی نبھائی کافی اچھا لگا۔ کترنوں میں گھوڑی والا لطیفہ کافی اچھا لگا۔ کبیر عباسی اینڈ نہال خرم کا انتخاب بے حد پسند آیا اور ساتھ مرحا گل کی کترنیں بھی۔"

کراچی سے ایم عمران جونانی کی عرض "کچھ تحریریں اس قدر گہری چھاپ چھوڑتی ہیں کہ تبصرہ کے لیے شایانِ شان الفاظ نہیں ملتے، امجد رئیس کی برفیلا جہنم، ایبولا کی طرح طویل ناول کی تلخیص و ترجمہ ہے۔ خوب صورت رواں تحریر نے آخر تک چونکائے رکھا۔ گرفت ایسی مضبوط کہ انسان ختم کیے بنا اٹھ نہ سکے۔ اس کے بعد جاسوسی کے مخصوص رنگ میں رنگی گرانڈ فادر کلاک پڑھی، پسند آئی۔ ایسے دو تین تراجم شامل نہ ہوں تو تمک کم پڑ جاے۔ انگارے کی تپش بڑھتی جا رہی ہے۔ ابتدا میں شاہ زیب جسے چاہتا ہی تلی تک لگا کر بے بس کر دیتا تھا لیکن اب اس میں نارمل انسانوں والی خو بو نظر آ رہی ہے۔ کبھی ماضی کو یاد کرتا ہے کبھی مقابل

کے پینترے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قدر مضبوط پلاٹ اور اٹھان والی کہانی کو 30/40 اقساط میں سمیٹ لیا جائے تو گہری چھاپ چھوڑے گی ورنہ معاملہ پھیل جاتا ہے بوریت غالب آنے لگتی ہے۔ پورا عدالتی نظام، تھانوں کی راہداریاں، بڑے نامی اسپتال سب اسی کرپٹ معاشرے کا حصہ ہیں اور ان کے ساتھ شرافت کا نقاب لگائے وکیل فرقان اور سیٹھ راحت جیسے کردار بھی ہم ہی میں سے ہیں۔ سرور اکرم نے مکافات میں انہی مردہ ضمیروں کو جھنجوڑا ہے، ویل ڈن۔ لو جناب، بابر نعیم کی قسمت کا حال پڑھ کر یہ بات تو پکی ہوگئی کہ توہم پرستی ہر جگہ پنجے گاڑھے زندگی کی تاک میں ہے۔ اس مرتبہ ترجمہ کے لیے کہانیوں کا انتخاب اچھا ہے، تنویر ریاض کی واپسی بھی پسند آئی، سوال یہ ہے کہ آخر میں تیری نے کرائے کے قاتل کو مار کر کیا حاصل کر لیا۔ بڑی مچھلیاں ویسے ہی آزادی سے گھومیں گی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ منظر امام الفن کی گہرائی کے امام، آپ کے ٹی وی ڈراموں والے حوالے سے ہی ہم آپ کے فین ہیں، حاتم سیریز کا یہ ایڈیشن بھی اچھا ہے لیکن آپ کی مختصر تحریر تشنگی چھوڑ جاتی ہے۔ منظر نگاری عمدہ ہو تو یوں لگتا ہے تحریر نہیں پڑھ رہے کوئی دلچسپ موی دیکھ رہے ہیں۔ فاروق انجم کی چال نے دل خوش کر دیا۔ جاسوسی کا پہلا سرورق رنگ جماوے تو دوسرے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ روبینہ رشید، یقیناً عاجز کی کم علمی ہے کہ یہ نام کچھ نیا نیا لگ رہا ہے۔ (نہیں جی، بہت پرانی ہیں ہر تھوڑے عرصے بعد کہیں دبک جاتی ہیں) لیکن صاحب تحریر میں پختگی نمایاں ہے، ہلکا پھلکا مزاح، محبت، سسپنس کیا نہیں تھا اس میں۔ دلدلی چہرہ بارہ مسالے کی وہ چاٹ ہے جس کا ذائقہ جاسوسی کے قارئین کے منہ کو لگ چکا ہے۔ اب کچھ الفاظ چھپی نکتہ چینی کے نام۔ یقیناً ذیتے داران نے آپ کی بات سن لی۔ شارع فیصل کے گنے چنے درخت بھی کاٹے جا رہے ہیں۔ صاف کو تو کوئی مار دو صرف آب و ہوا بچ جائے، وہ بھی بڑی بات ہے۔ صدرِ محفل بلقیس کا جملہ کراچی کا عالمگیر جتنا بے لوث ہے، پورے خط کی جان ہے۔ رومی انصاری نے خط نہیں خوب صورت آزاد نظم لکھی ہے۔ رانا حبیب بات تو ٹھیک کی آپ نے اصل کہانی قتل سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ احسان خان! مطالعہ تبصرہ سب تفریح ہے اسے بس اسی حد تک رکھو۔ فاروق احمد خوش آمدید۔ سجاد خان، تبصرہ اچھا مگر منتخب شعر بہترین ہے۔ ایم خواجہ نے جن تحریروں پر تنقید کی وہ بجا طور پر اس کی مستحق تھیں۔ ادریس خان! سچ کہتے ہو کراچی سے باہر جاؤ خاص کر پنجاب سائڈ نکلو تو سب سے بڑی اٹریکشن سبزہ اور گندم و سرسوں کے کھیت ہیں۔ مجموعی طور پر شفقت محمود، شکیل کاظمی، عبادت کاظمی، مشال اینڈ نوال، ایم صفدر معاویہ اور بھائی محی الدین کے تبصرے پسند آئے۔ ارشد بیگ کی لب شناس، جمال دستی کی انوکھی واردات، ایس انور کی الٹی تدبیر اور زبیر سلیمانی کی دوسری گواہی ان میں سے کسی تحریر نے خاص متاثر نہیں کیا۔"

مانگی سے عابد حسین کی سادگی "مئی کا شمارہ 6 تاریخ کو مانگی بک اسٹال سے لیا۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی سرورق بہترین تھا عالم حسینہ کے پیچھے شاید چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دوستوں کی محفل میں آئے تو بلقیس خان کو کرسی صدارت پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپا جی میں عابدی نہیں، عابد حسین ہوں۔ ویسے آپ لکھتی بہت اچھا ہیں۔ دوسرے نمبر پر عبدالجبار رومی انصاری کی قلم نگاری رہی، انصاری بھائی اور رومی آپ کا تخلص ہے کیا؟ تیسرے نمبر پر معراج محمود کی نمک پاشی، سیف رؤف کی کارگزاری، سید شکیل حسین کاظمی کے دعائیہ کلمات، احسان خان نیازی کی دکھ بھری باتیں، فاروق احمد کی پسند نا پسند دل کو اچھی لگیں۔ ارے ماموں بہادر خان یہاں بھی پہنچ گئے۔ مبارک ہو ماموں جی آپ کا محبت نامہ شامل ہو گیا۔ سجاد بھائی کی تحریر و مشال اینڈ نوال کی کہانی بھی بیسٹ تھی اور دوستوں کے محبت نامے بہترین تھے۔ محمد معاویہ آپ حاضر ہوتے رہا کریں آپ کے آنے سے محفل میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ پاکستان ہے بھائی اور سب کو موقع ملتا ہے۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی، شاہ زیب اب تک خاموش... لگتا ہے اب ایکشن میں آ جائے گا۔ بس ذرا ہوش سے کام لے۔ آگے آوارہ گرد کو دیکھا اب شہزی ملک کے اہم دشمن سی جی بھجوانی سے لڑنے جا رہا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی چال اور دوسری کہانی دلدلی چہرہ دونوں زبردست بہترین تھیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔" (ایک ساتھ ہی بھیج دیا کریں)

ناظم آباد سے ادریس احمد خان کی خوش اطواری "مئی کا جاسوسی دیدہ زیب رنگوں سے سجا ہوا تھا جس میں ذاکر صاحب کے ہاتھوں کی مہارت نظر آ رہی تھی۔ گرمی کے موسم میں خوشگواریت کا احساس لیے تھا، ہم نے بھی بڑھ کر پذیرائی کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اداریے سے مستفید ہوئے۔ ناموں کی فہرست میں بلقیس خان کا نام سرفہرست تھا۔ تبصرہ بھی نپے تلے انداز میں لکھا ہوا تھا۔ دوستوں کی بھرپور شرکت نظر آ رہی تھی۔ امجد رئیس کی برفیلا جہنم بہت پسند آئی۔ اینڈریا اور اس کی بہن لزانے جہدِ مسلسل سے موت کو شکست دے دی۔ عزم و ہمت کی بہترین داستان، قدم قدم پر جان جانے کا خطرہ ہونے کے باوجود منزل پر پہنچنے کی لگن جس میں وہ کامیاب ہو گئیں۔ گرانڈ فادر کلاک میں چھوٹے سے نکتے نے قاتل کو پابند سلاسل کر دیا۔ لب شناس بھی موضوع کے اعتبار سے اچھی کہانی تھی۔ انوکھی واردات بھی پسندیدگی کا ذریعہ بنی اور پھر طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے پڑھی جو تسلسل کے ساتھ بڑی دلچسپی اور ذوق و شوق سے پڑھی جا رہی ہے۔ پڑھنے کے دوران قطعی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہیرو کے ساتھ نئے نئے معرکے پیش آ رہے ہیں جس میں وہ ثابت قدمی سے کامیابی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔ مکافات نے بھی بہت متاثر کیا۔ دوسروں کے لیے برا سوچنے والا خود ایسے انجام سے دوچار ہوا، جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔ دوسروں کو درد دینے والا جب اپنے اوپر پڑی تو دن میں تارے نظر آنے لگے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سبق آموز کہانی تھی۔ قسمت کا حال میں قسمت کی لکیروں پر یقین رکھنے والوں کا فسانہ جو یہ نہیں جانتے کہ قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا تو اوپر والا ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ہر ایک کی قسمتوں کا حال جانتا ہے۔ واپسی میں اداکارہ نے اپنی ناقابلِ شکست خود اعتمادی سے کام لے کر آسمان سے گر کر آسمان پر اپنی خود اعتمادی سے جگہ بنالی۔ آوارہ گرد بھی دلچسپی لیے جاری و ساری ہے۔ شہزاد احمد خان فل ایکشن میں ہے۔ الٹی تدبیر بھی اچھی لگی۔ دوسری گواہی بھی بہتر کہانی ثابت ہوئی۔ منظر امام کی نیکی کر بھی مزاح کا رنگ لیے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اجاگر کرتی تحریر تھی۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں بھی اچھی لگیں مگر روایتی کہانیوں کے برعکس۔"

"بہاولپور سے سعید عباسی کی پسند" مئی کا شمارہ 4 تاریخ کو ملا۔ اس دفعہ خط لکھنے کا کوئی موڈ نہیں تھا لیکن ٹائٹل کو دیکھا تو بے حد غصہ آ گیا۔ ہائے رے قسمت، اب یہ دن بھی دیکھنے تھے اس طرح کے ٹائٹل بنتے ہیں، کم سے کم ہمارا نہیں تو ہمارے جاسوسی کا ہی خیال رکھیں، دنیا ہنسے گی، اس طرح کی حسینائیں تو

جاسوسی کے ٹائٹل پہ نہیں ہوا کرتی تھیں اب کہاں سے آن ٹپکیں لڑکی کی پیشانی حد سے تجاوز کیے ہوئے تھی اور ہاں بالوں کی لٹ اس طرح بناتے ہیں، آنکھیں اس کی کھلے نہیں کھل رہی تھیں۔ گردن اس کی عجیب وغریب قسم کی تھی۔ کندھے اس کے کسی بیمار بگلے کے پروں کی طرح حد سے زیادہ اوپر کو نکلے ہوئے تھے۔ دوپٹے کا رنگ تو چلو مان لیا کچھ ٹھیک تھا پر قمیص کا رنگ پھیکا تھا۔ نوٹ فرمالیں کہ عورتوں پر شوخ کلر کے کپڑے خوب جچتے ہیں اور اس مونچھو بھائی کی مونچھ تو نہ ہوئی تا گویا چوہے کی پونچھ ہوئی، خنجر اس طرح بنائے جاتے ہیں اف ہو کیا گیا آپ کو؟ توجہ سے سن لیں اس دفعہ کے ٹائٹل میں اگر کوئی قابلِ غور چیز تھی تو وہ اوپر کونے میں بنی سینری تھی جو دیہی منظر پیش کررہی تھی۔ کچے مکان بڑے بھلے لگ رہے تھے اگر کچھ تیکھا لکھ دیا ہو تو اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ چیٹی نکتہ چینی میں بلقیس خان براجمان تھیں۔ شاندار تبصرے کے ساتھ۔ خوشامد کی بات نہیں آج کل کے دور میں طاہرہ گلزار سے سب پیچھے ہیں تبصروں میں اور ان کا اندازِ بیان بھی کیا خوب ہے۔ آمنہ پٹھانی، ماہا ایمان، نعمان پیارے یہ صاحبان کہاں کھو گئے ہیں؟ آج باقی سب باتیں چھوڑیں، صرف ایک پر تبصرہ کرتے ہیں، کچھ قاریوں کا کہنا ہے کہ آوارہ گرد بور کررہی ہے، کچھ کا کہنا ہے کہ کہانی بہت تیز طرار ہوگئی ہے۔ اب رائٹر بے چارے کس کی مانیں حالانکہ 12 اور 24،12 قسط میں نے آوارہ گرد کی ایک مہینے میں پڑھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہایت ہی باریک بینی اور محنت سے ایک ایک کردار کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اب دیکھ لیں رائٹر کہانی میں کرداروں کی اتنی بساط جو بچھاتا ہے، اس کے ہر ایک کردار کو سمیٹنا بھی تو ہوتا ہے نا۔ کہانی بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ ایک دم ونڈرفل۔ کہانیوں پر تو تبصرہ کیا نہیں، ہمیں پتا ہے ہر بار کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہیں اس بار ٹائٹل اور آوارہ گرد پر بس۔"

کندیاں سے نادر سیال کی سرخوشی "جاسوسی ڈائجسٹ حیران کن طور پر اتنی جلدی میری بانہوں میں میری دھڑکن میں میرے ہاتھ میں آیا اسی لیے سیانے کہتے ہیں اللہ رب العزت جب خوشیاں دیتا ہے تو بے حساب دیتا ہے۔ آپ دوستوں اور عزیز و اقارب کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے مجھے معافی دی اور میرے اسیری کے دن تمام ہوئے۔ ایک اذیت ناک قید سے چھٹکارا دیا۔ (مبارک ہو بہت بہت) جس طرح میں نے زندگی کے قیمتی دن قید میں گزارے ہیں اس پر میں کہانی لکھ رہا ہوں، آدھی لکھ لی ہے باقی انشاءاللہ رہا ہو کر گھر میں بیٹھ کر مکمل کروں گا۔ (انشاءاللہ) آپ ادارے والوں کا بے حد شکریہ اور جاسوسی کا بھی کہ آپ کی وجہ سے مجھے اتنے اچھے اور نفیس دوست ملے۔ سب دوستوں کو اپنی رہائی کی مبارک باد پیش کرتا ہوں، قبول فرمائیے گا۔ (آپ کیوں، سب آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں) اب ذرا حساب کتاب ہوجائے دوستوں کا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ سب سے پہلے بلقیس خان میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں آپ کی دعاؤں سے، اللہ رب العزت نے مجھے معافی دی اور دھمال کیمپ سے مخلص دوست آپ کا بھی شکریہ آپ نے جو اتنے قیمتی وظیفے مجھے خط کے ذریعے ارسال کیے۔ باقی تمام دوستوں کا شکریہ خاص کر اور لیس احمد خان، طاہرہ گلزار، سید عبادت کاظمی، محمد صفدر معاویہ، عبدالجبار رومی اور نوال اینڈ مشال، آپ سب کی دعاؤں کا شکریہ۔ ناصر علی میں حیران ہوں کیا آپ کو سچ مچ اردو نہیں آتی اگر نہیں آتی تو پھر تبصرہ کون لکھتا ہے۔ مشال و نوال، سید ھی سید ھی بات بتانا نوال کیا مشال جاسوسی، سسپنس اب بھی پڑھتی ہے یا پھر...... سید عبادت کاظمی، آپ کا تبصرہ دن بدن سکڑتا جارہا ہے، کیا ہوا۔ طاہرہ گلزار، استاد ماغ کہاں سے آیا یا پھر کوئی چیز کھاتی ہو ہمیں بھی تو بتاؤ نا۔ سر حاکل، ایسا لگتا ہے آپ منہ میں پان چبا کر تبصرہ لکھتی ہیں۔ پریزے خان! آپ کہاں گم ہو...... آپ بھی بہت اچھل کود کیا کرتی تھیں، کہیں کوئی ہڈی شڈی تو نہیں تڑوا بیٹھیں، محمد خواجہ مبارک ہو آج کل آپ کی دکانداری بہت چل رہی ہے۔ ایک اچھا سا نیا ٹھیلا خرید لو اور پانی تو ٹھنڈا رکھا کرو یار۔ سب سے پہلے تو اپنی فیورٹ کہانی پر تبصرہ۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی پڑھ کر اور شاہ زیب کا حلیہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ مغل صاحب نے روسن چیمپئن سے متاثر ہو کر کہانی لکھ دی۔ جس طرح سے روسن ریز اپنے نام کا سکہ منواتے ہیں۔ بالکل اسی طرح شاہ زیب نے بھی رِنگ میں اتر کر مخالفین کو دھول چٹائی ہوگی۔ اگلی دو، تین، اقساط میں پڑھنے کو ملے گا۔ شاہ زیب کا ماضی پھر مکمل تعارف ہمارے سامنے ہوگا کہ کیا کیا کام کیے ہیں جس وجہ سے شاہ زیب کو حلیہ تبدیل کرنا پڑا۔ تاجور کی محبت مجھے بہت اچھی لگتی ہے بالکل اسی طرح کی محبت محبت ہوتی ہے۔ سچی محبت بے داغ محبت۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سجاول سیالکوٹی کی اماں حضور اور اماں حضور کی لاڈلی ڈائن ان دونوں سے کیسے چھٹکارا پائے گا۔ جناب ایک اور کہانی بھی تو ہے جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد، ارے بے چارہ شہزاد احمد خان عرف شہزی بھی نئی نئی مشکلات میں پھنستا جارہا ہے۔ مشکل ہے کہ ایک جاتی نہیں دوسری تیار بیٹھی ہوتی ہے۔ للکار اور گرداب کی کہانی کی طرح شہزی بھی انڈیا میں داخل ہو کر دشمنوں کو لوہے کے چنے چبوائے گا۔ دونوں کہانیاں میری فیورٹ ہیں اب جا کر ہم کو لگا ہے کہ اب مکمل جاسوسی ہوگیا ہے۔"

پشاور سے طاہرہ گلزار کی غلط فہمی "سویٹ محبوب رسالہ جاسوسی 7 مئی کو ملا۔ بہت لیٹ ملا۔ خط کے لیٹ ہونے کی وجہ سے کہانیوں پر تبصرہ کم ہوگا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ میں آخری صفحے اور آخری لفظ تک جاسوسی نہ پڑھوں۔ میں کھانا پینا تو چھوڑ سکتی ہوں لیکن جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ ایک فارمولا ہے۔ جاسوسی، سسپنس، سرگزشت، محبت، طاہرہ گلزار، اور مجھے یقین ہے کہ میرے کافی دوست میری اس بات سے ہرگز انکاری نہیں ہوں گے۔ کھٹے میٹھے دوستوں کی محفل یعنی چیٹی نکتہ چینی میں دیکھتے ہیں کس نے کن الفاظ میں یاد کیا ہے۔ مئی کے گرم موسم میں اپنی صنفِ نازک بہن بلقیس خان کو دیکھ کے دل باغ باغ ہوگیا۔ بہت ہی شاندار اور تفصیلی تبصرہ تھا ویلڈن بلقیس۔ معراج محبوب عباسی بھی اپنی روداد لے کر حاضر تھے۔ دل کے دروازے جاسوسی کے لیے وا کرکے...... شفقت محمود تو دوسروں کے زخموں پر نمک پاشی کرتے کھوڑا سے حاضر تھے۔ اچھی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی مٹھائی کا شیرا کھایا کرو۔ میٹھا بول بولو گے۔ شفقت محمود صاحب آتے ہی ہم سے پنگا نہ نہیں بے چنگا سا کیں۔ سیف الرؤف بھی اب مکھن پروف باتیں کرنے لگے ہیں۔ ویسے حیرت ہے میں تو اب تک سمجھ رہی تھی کہ ادارے والے چار پائیوں والی کرسی پہ بیٹھ کے لکھتے ہیں۔ لیکن یہاں تو کچھ اور ہی سننے کو مل رہا ہے۔ ہیں کوا کب کچھ؟...... واہ واہ، اب تو وڈے شاہ جی خود کو تیس مار خان سمجھنے لگے ہیں۔ خود تو سارا دن کمپنی میں گاڑیوں سے مچھر بھگاتے اور شام کو پڑوسن کی فل اسپیڈ باتیں سننے میں مصروف رہتے ہیں۔ یا ہواؤں میں اڑتے ہیں کچھ عقل مندوں کے ہاتھوں۔ مجھے کیا جواب دو گے بھائی...... یہ کیا احسان سحر بھائی آپ کو کیا پتا ہم سب دوست اور ادارے والے آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ ادارے کا جواب تو آپ نے خود پڑھ لیا ہوگا باقی فون تو ہم

ضرور کریں گے۔ آپ کی ہم سب سے بس اتنی محبت تھی کہ اب یوں چھوڑ کے جا رہے ہو جیسے بیٹی شادی کے وقت میکا چھوڑتی ہے۔ نئے آنے والے فاروق احمد اور بہادر خان لغاری کو محفل میں ویلکم۔ عبادت کاظمی دنیا دکھ سکھ کی جگہ ہے۔ اللہ سب کو نیک اور پُرخلوص دوست عطا کرے، جو ہر چیز سے قیمتی ہوتے ہیں آمین۔ حوصلہ رکھو بھائی۔ ہم سب کو ایک دن جانا ہے۔ سجاد خان گلہ کرتے نظر آئے آپ۔ محبوب عباسی کی عمر 230 سال سے صرف 2 بٹا لیس۔ میری تعریف کرنے کا شکریہ۔ مشال اینڈ نوال اتنی محبت اور پیار کا بہت شکریہ۔ رانا حبیب مجھے اور تنولی کو یاد کرنے کا شکریہ۔ ہاں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ تنولی بہت غیر حاضر رہنے لگا ہے۔ ویلکم شیخ وقار احمد! بہت اچھا تبصرہ کرتے ہو۔ واہ محمد خواجہ بھی بہت تفصیلی اور شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ حسب عادت ایک بار پھر تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے واپسی کی درخواست کہ واپس آ جائیں۔ حسب عادت پہلے مغل اعظم کی تحریر انگارے پڑھی۔ بہت تیز ایکشن، بھرپور منظر نگاری، عالمگیر ایک بار پھر حاضر، سجاول کچھ عجیب سا کردار بنتا جا رہا ہے۔ شاہ زیب بھی اب آہستہ آہستہ اپنا ماضی کھول رہا ہے، ویلڈن مغل اعظم۔ دوسرے فیورٹ رائٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر آوارہ گرد۔ میں بھی شہزی آخر سمندر کی آوارہ گردی کرتے کرتے اب نکلنے کے لیے پر تولنے لگا۔ یعنی اب بھرپور ایکشن ملے گا۔ سلیم انور کی تحریر گرانڈ فادر کلاک واہ کتنی آسانی سے قاتل پکڑا گیا۔ کاش پاکستان میں بھی ایسا ہو۔ ارشد بیگ کی تحریر لب شناس، سراغ رساں کی عقل مندی کمال ہے۔ بابر نعیم کی تحریر قسمت کا حال بے چارہ جیف کیا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہو گیا۔ ہائے رے مغربی معاشرے کیا ہو گا تیرا انجام۔ ایس انور کی تحریر الٹی تدبیر بہت زبردست رہی۔ منظر امام صاحب کی تحریر نیکی کر، حاتم طائی، منیرم شامی، جشن بانو اور اس کا باپ پہلا اتنا سوال بہت ہی زبردست۔ ان حکمرانوں سے جان چھڑانے کا آسان نسخہ اب عمل کی دیر ہے۔ رنگوں میں پہلا رنگ محمد فاروق انجم کی تحریر چال بہت ہی زبردست تحریر۔ جوئے کی لت نے حماد اور زاہد کا جو انجام کیا وہ اسی قابل تھے۔ نعیم اور تیمور خان بھی اپنے اپنے انجام کو پہنچے۔ فرخ کو بھی اپنے سگے ماموں اور زاہد کا مکروہ چہرہ نظر آ گیا۔ عاشی بھی دولت کی چمک میں زبیر جیسا ہیرا کھو بیٹھی لیکن فرخ نے قسمت سے وہ ہیرا اپنے نام کر دیا۔ بہت شاندار اینڈ ہوا۔ روبینہ شید کی لاجواب تحریر دلدلی چہرہ، کاش خضر جیسی پولیس اور احید جیسی ایماندار وکیل ہمارے ملک میں ہوں تو مکرم شاہ اور انسپکٹر راحیل جیسے لوگ اس ملک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور زرین اور غالب جیسے دوست ہوں تو زندگی گلزار بن جائے۔ امجد رئیس کی مغربی معاشرے کی لازوال تحریر برفیلا جہنم واہ کیا منظر کشی تھی۔ ہر کردار اپنی جگہ فٹ، دو بہنوں کی لازوال محبت جیت گئی۔ اینڈریا کا بہن کو بچانا اور دوسری بہن لیزا سنگ کو بچانے کی خاطر کیا کیا تکلیفیں برداشت کرتی گئی اور آخر کار دونوں بہنیں جیت گئیں۔ پتا نہیں یہ تحریر پڑھتے وقت آخر تک یہ سوچ دل و دماغ میں رہی کہ یہ تحریر کاشف زبیر کی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ امجد رئیس کے نام سے بھی لکھتے تھے۔ (آپ نے غلط سنا ہے۔ امجد رئیس، کافی عرصے سے شاندار تحریر لکھ رہے ہیں)

محمد مرتضیٰ کی جھنگ سٹی سے دلربائی آمد ”انسان کی خوشیاں بھی انسان جیسی ہی ہوتی ہیں، پتا ہی نہیں چلتا کب روٹھ جائیں کب جدا ہو جائیں کب ہم سے علیحدہ ہو جائیں۔ اسی لیے اس خوشی کو دوبارہ حاصل کرنے کی خاطر اپنی پیاری سی چٹ پٹی اور من موہنی محفل میں حاضری دینے آیا ہوں۔ سرورق کو بڑی گہری اور عمیق نظر سے دیکھا۔ صنف نازک کی زلفیں، شادابی ہونٹ اور خوب صورت ہی طرح دار آنکھیں اپنا اثر جمانے میں کامیاب رہیں۔ بیلو کلر کا آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا ہوا دوپٹا اوڑھے اور اپنی پلکوں کو سنوارے ہوئے اور ہونٹوں پر اداسی بھری مسکراہٹ سجائے خاتون شاید اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایک شخص تیکھی مونچھوں والا جس کے کندھے پر تجخر رکھے کوئی کھڑا تھا، وہ رخ پھیر کے اپنے ہی کہانی دشمن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اپنی فیورٹ اور میٹھی سی محفل کی جانب بڑھے۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان کرسی صدارت پر بڑی شان سے براجمان تھیں۔ دل سے مبارک باد۔ زویا اعجاز لکھنے لکھانے میں مصروف ہیں، جان کر خوشی ہوئی۔ ادب کی دنیا میں ایک شاندار اضافہ کہانی کا انتظار رہے گا۔ وزیر اعظم کی سیٹ محترم عبدالجبار رومی انصاری کے نام رہی جو تمام تبصرہ نگاروں کے تبصروں کی تعریف کرتے ہوئے نظر آئے۔ آپ کا تبصرہ ہمیشہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ خوشگوار اور ٹھنڈے علاقے سے تعلق رکھنے والے معراج محبوب عباسی آپ کا خبرنامہ پہاں گیا۔ تمنگ کی سب سے بڑی کان کھیوڑا سے تعلق رکھنے والے شفقت محمود آپ فیصل آباد میں خیر سے موجود تھے ویسے آپ کا شہر دیکھنے کو بڑا دل کرتا ہے۔ پاکستان کے شہر مانچسٹر سے سیف الرؤف کا مخصوص لب و لہجے والا انداز تبصرہ نگاری سے خوب محظوظ ہوئے اور دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں۔ سید تشکیل حسین کاظمی صاحب آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ احسان خان نیازی فرام میانوالی نفرت کرنے والے نفرت کرتے ہیں اور محبت کرنے والے محبت۔ محبت کرنے والے تو تھکتے ہی نہیں بلکہ اپنی محبت سے وہ نفرت کرنے والوں کی نفرت کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ مایوس نہ ہوں اور اپنے محبت بھرے انداز سے تبصرہ نگاری کر کے اس محفل میں آتے رہا کریں۔ چوک سرور شہید سے فاروق احمد کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ سید عبادت کاظمی اللہ تعالیٰ آپ کے والد کے درجات بلند کرے۔ اور آپ کو آپ کی فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ جہلم سے مشال اینڈ نوال اور ہمارے پڑوسی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ سے حبیب الرحمن ان کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ شیخ وقار احمد فرام ملتان آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ اس ڈائجسٹ کے قاری زیادہ تر خاموش ہیں۔ ادریس خان فرام کراچی، لاہور اور راولپنڈی بہت پیارے شہر ہیں۔ مرحا گل ورا بن کلاں آپ کا تبصرہ شائع نہ ہو سکا، کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد کہانیوں کی جانب بڑھے۔ برفیلا جہنم امجد رئیس صاحب کے قلم سے ایک زبردست کہانی۔ مئی کی شدید گرمی میں اتنی ٹھنڈ کا ذکر ہونے پر جسم میں بھی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ لزا اور اینڈریا نے امید کا دامن ہاتھ میں تھامے رکھا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ گرانڈ فادر کلاک، سلیم انور نے مختصر اور جامع کہانی پیش کی۔ مجرم نے گفتگو میں غلطی کی اور پکڑا گیا۔ گریک کسلر ہی قاتل نکلا۔ لب شناس، کچھ خاص کہانی نہیں لگی۔ انوکھی واردات لوئیس فاکس پر اسرار شخص پر اسرار ہی رہا۔ دل کی رفتار کو تیز کر دینے والی۔ انگارے، طاہر جاوید مغل صاحب کے کہنہ مشق قلم سے لکھی ہوئی کہانی جسے ہر قاری ایک ہی نشست میں پڑھتا ہے۔ سسپنس، مہم جوئی، بہادری، مار دھاڑ، ڈر اور کرب کا امتزاج یہ کہانی کہیں ہماری جان نہ لے لے۔

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

عبدالجبار رومی، چوہنگ سٹی۔ شفقت محمود، کھیوڑہ۔ سید محی الدین اشفاق، لیہ۔ انور یوسف زئی، اسلام آباد۔ ادریس احمد خان، ملیر، کراچی۔

حق داروں اور نمک حق ادا کرنے والے کے درمیان جاری جنگ کا فیصلہ کن انجام

لہولہان رشتے

احمد اقبال

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں، ختم ہوئی بارشِ سنگ

سرپرستِ اعلیٰ کسی ... بھی خاندان کی بنیاد تصور کیے جاتے ہیں... ان کی تربیت... محبت... استحقاق... اگلی نسل میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے... اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کرکے سوچنا ممکن نہیں... کیونکہ اس میں گردوپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں... فردِ واحد کی ذات تمام تر محبتوں، کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی... بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے... اصل پیمانۂ زیست اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں... دکھ درد کے مشترکہ رشتے۔ غم ناک اور خوش کن واقعات سے جڑے... انہی خونی رشتوں کو نبھانے کے لیے انسان بڑے سے بڑا فیصلہ کر گزرتا ہے۔ خونی رشتوں میں اگر زر اور زن کی شمولیت زور پکڑ لے تو پھر خون سرخ کے بجائے سفید ہوتا چلا جاتا ہے... لالچ و ہوس کی طلب کا احساس بڑھاتی، سکوت، بے صبری و بے وفائی کی آئینہ دار داستان کے حیرت انگیز دوراہے...

اپنوں...... بیگانوں کی وحشتوں...... محبتوں اور خون کے رشتوں کی لہولہو داستان

چاندنی بھی کتنے بہروپ بدلتی ہے۔ اس نے کھلی کھڑکی سے سنسان آسمان کو دیکھا جس کی نیلاہٹ بھی رات کی سیاہی میں تحلیل ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار چودھویں شب کے اجالے کو تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ریت کے سمندر جیسے صحرا میں دیکھا تھا تو چاندنی ایک سحر آفریں دھند لگنے لگی تھی۔ اس وقت وہ سلمان کے ساتھ سعودی عرب میں تھی اور وہ اپنی دیو پیکر جی ایم سی میں شب بسری کا سامان لے کر آبادی سے ویرانے میں آ گئے تھے۔

کراچی کے بیکراں سمندر کی جھاگ اُڑاتی موجوں میں چاندنی مسلسل پھیلتی ہوئی دھند تھی۔ سلمان کے ساتھ ہی اپنے ہنی مون میں اس نے چاندنی کو برف پوش بھوربن کی وسعت میں بہت اجلا اور شیشے کی طرح منعکس ہوتا بھی دیکھا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے...... اس نے کھڑکی بند کر کے پردے برابر کیے۔

اس فائیو اسٹار ہوٹل کے چھٹے فلور پر "مون لائٹ لاؤنج" میں یہی چاندنی کیسا جادو جگا رہی تھی جہاں ڈنر کے بعد موم بتیاں بھی گل کر دی گئی تھیں۔ خاموش جوڑے اس چاندنی کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں جوت جگاتا دیکھ رہے تھے۔

اور اس ہوسٹل سے باہر بند دکانوں، سڑک کے کنارے کھڑے ٹھیلوں اور فٹ پاتھ پر صرف دھوتیاں اور نیکریں پہن کر سوتے بے گھروں کے لاشوں جیسے وجود پر اس چاندنی کی روشنی میں صرف ویرانی تھی۔ جیسے قبرستانوں میں کچی پکی قبروں پر یہ آسیب زدہ لگتی ہوگی تو پھر میں کیا کروں؟ بیالیس سالہ شہر بانو عرف شیری نے قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنے جھلملاتے آویزے اتارے اور پھر پہن لیے۔ اس کی گردن کے اجلے پن سے لپٹا آویزوں جیسا ستاروں کی طرح دمکتا ہوا ہار بھی مسکرانے لگا۔

اس نے ڈنر کے لیے منتخب کیے گئے سیاہ لباس کی سلیولیس شرٹ کو دیکھا جو اس کے بدن کے سارے نشیب و فراز اور پیچ وخم کو مزید سامنے لاتا تھا اور تضاد کو نمایاں کرتا تھا جو اس کے بدن کی چاندنی میں تھا۔ بیالیس سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔

اس نے آئینے سے کہا۔ اس میں کون سی بحث ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ آئینے کے سامنے ہی لباسِ شب خوابی پہننے سے قبل اس نے ہر زاویے سے اپنا بھرپور جسم دکھا کے آئینے سے تائید بھی حاصل کر لی۔ جیسا کہ معمول تھا اور آئینے نے اس سے کوئی جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ بس وہ اپنے موبائل فون کو بند کرنا بھول گئی تھی اور یہ بھی کہ آج سنیچر ہے...... جو اب اتوار بن گیا تھا۔

بیڈ پر لاوارث لاش کی طرح پڑے موبائل فون سے بے وقت کی راگنی چھڑی تو اس نے بیزاری سے کہا۔ ”ہیلو!“

”آپ سوگئی تھیں ماما......“ سات سمندر پار سے سام نے اپنی آواز میں محبت سمو کے کہا حالانکہ سرور کی کیفیت میں یہ ایک مشکل کام تھا۔

”سلیم...... پاکستان میں رات کے دو بجے اُلو جاگ رہے ہوتے ہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ہوسٹن میں دن کے دو بجے ہوں گے۔“

وہ ہنسا۔ ”اُلو پر یاد آیا۔ اس کی فیمیل کو کیا کہتے ہیں...... اِلّی یا کچھ اور......“

”شٹ اَپ، تم اپنی ماں سے بات کر رہے ہو، کیسے فون کیا؟ پیسے چاہئیں؟“

”اوہ ماما، ڈونٹ بی سو ظالم۔ آپ جانتی ہیں میں ہر ویک اینڈ پر کال کرتا ہوں، آئی فیل سو لونلی۔“

”اس کا اندازہ میں کر سکتی ہوں۔ دیکھ نہیں سکتی تو کیا...... سن تو سکتی ہوں۔“

”کیا مجھے پھر وہی کہنا پڑے گا کہ یہ ٹی وی چل رہا ہے۔ آج آپ اتنی خفا کیوں ہیں۔ تھک گئی ہیں یا بیمار ہیں۔ خدانخواستہ...... یہی کہتے ہیں نا...... یاد ہے ایک بار میں نے الحمدللہ کہہ دیا تھا۔“ وہ ہنسا۔ پس منظر میں ایک زنانہ ہنسی جیسے دبا دی گئی ہو۔

”میں ٹھیک ہوں، سوگئی تھی۔ کچھ سر میں درد تھا۔“

”کام بھی تو ایسا ہی ہے آپ کا، زندگی بھر پڑھتے رہو پھر پڑھاتے رہو۔ لائک اے ٹیپ ریکارڈر......“

”تمہاری اسٹڈیز کیسی چل رہی ہیں؟“ اس نے سلیم کی بات کاٹ دی۔

سلیم نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ ”آپ نے اپلائی کیا ویزے کے لیے؟ مشکل ہے ماما مگر ناممکن نہیں۔ ہائر اسٹڈی میں آپ یہاں......“

”سلیم...... کتنی بار بتا چکی ہوں کہ میں نہیں آسکتی۔ کوئی اور بات کرو، وجہ بھی جانتے ہو تم۔“

”او کے بائے ماما، آج موڈ خراب ہے آپ کا۔“ دوسری طرف سے لائن کٹ گئی۔

لائٹ بجھا کے وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی چھت کو دیکھتی رہی جو سینما اسکرین کی طرح تاریک تھی۔ پھر اس نے گزری شام کی فلم چلا دی۔ رات نو بجے پروفیسر زمان خان آفریدی کو اس نے لاؤنج میں سراپا انتظار دیکھا۔ وہ پچاس کے لگ بھگ اپنے زیادہ سفید اور سیاہ مگر گھنے بالوں اور بھاری بدن کے ساتھ بے حد گریس فل پرسنالٹی بن گیا تھا۔ ڈارک بلیو بلیک سوٹ اور پولکا ڈاٹ ٹائی میں اس کا گندمی صاف رنگ اور مضبوط قامت اسے نمایاں مردانہ وجاہت دیتا تھا۔ وہ مسکراتا آگے بڑھا اور آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس ماحول میں اگر وہ اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیتا یا اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اسے قریب کر لیتا تو کسی کی نظر نہ اٹھتی۔ یہاں نوعمر جو اپنی بے خودی کے واضح انداز سے لَو برڈز نظر آتے تھے، اس سے کہیں زیادہ بے باک ہو جاتے تھے تو کوئی حیران نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو لگتے ہی شادی شدہ تھے۔

حسبِ ضرورت اس نے شیری کو مخمور نظر سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”اب بتاؤ، جو تمہیں دیکھے گا، وہ کسی اور طرف کیوں دیکھے گا؟“

وہ خوش ہو کے مسکرائی۔ ”تھینک یو...... مگر سب زمان خان نہیں ہیں۔“

لفٹ کی خلوت کے ایک منٹ میں اس نے احتیاط

سے شیری کو چوما کہ اسے ٹاپ فلور پر نکلتے وقت دوبارہ لپ اسٹک نہ ٹھیک کرنی پڑے۔ تاہم شیری نے ایسا کیا۔ اس اعتراف جرم کا اپنا مزہ تھا۔

ویسٹ سائڈ سے شہر کی ساکت اور متحرک روشنیوں کا منظر احساس دلاتا تھا کہ وہ عام لوگوں سے بہت بلند اور الگ ہیں۔ اس میں اب کوئی نیا پن نہیں تھا کیونکہ وہ چودھویں شب کے علاوہ بھی یہاں کئی بار آکے بیٹھ چکے تھے اور تقریباً وہ سب باتیں کر چکے تھے جو ضروری تھیں۔ فیصلے کی گھڑی پھر بھی ٹل رہی تھی۔ زمان کی طرف سے تمام تصفیہ طلب امور پر شیری کے اطمینان کے مطابق فیصلہ ہو چکا تھا مثلاً یہ کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو صاف بتا چکا تھا کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ زمان کی ایک شادی شدہ بیٹی دبئی میں تھی۔

دو بیٹے اس کے ساتھ تھے۔ ایک نے ایم بی اے کرنے کے بعد بینکوں سے مایوس ہو کے جو بہت کم تنخواہ اور سالانہ کنٹریکٹ پر ملازمت دیتے تھے کوئی غیر ملکی پرائیویٹ کمپنی جوائن کر لی تھی۔ اس امید پر کہ قسمت نے ساتھ دیا تو یہاں سے اس کے لیے امریکا جانے کا راستہ آسان ہو گا۔ دوسرا سول انجینئر بننے کے بعد بے روزگاری کی فرسٹریشن سے گزر رہا تھا۔ یہاں مزدور ہی راج بن جاتے تھے اور پھر بلڈر...... وہ خود نقشہ بنا دیتے تھے یا کہیں سے لا دیتے تھے جو نیا گھر بنانے والے کو پسند آجائے تو کے ڈی اے سے پاس کرانے کے لیے اس پر کسی لائسنس یافتہ سول انجینئر سے مہر لگوا کے پاس بھی کروا لیتے تھے۔

''آج مجھے انتظار کی اذیت سے نہیں گزرنا پڑا۔'' زمان نے کہا۔ ''کیسی ہے گاڑی؟''

وہ چونکی۔ ''جیسی نئی ہنڈا سٹی ہوتی ہے۔''

''کسی نے پوچھا۔''

شیری نے ایک گہری سانس لی۔ ''سب نے پوچھا، میری اسٹوڈنٹس کولیگ اور پرنسپل...... اور مبارک باد بھی دی۔ شک کوئی کیسے کرتا، میں نے کہا کہ ماں نے بالآخر میری بات مان لی، تم نے کیا کیا؟''

''کچھ نہیں۔ بیوی تو سمجھتی نہیں ایسی باتیں۔ لڑکوں سے کہا کہ وہ ہنڈا سٹی کچھ پریشان کر رہی تھی۔ یہ ون اور نوے کی کورولا مجھے اچھی لگی۔ ظاہر ہے لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آئی یہ بات مگر کیا بولتے۔ چوائس تو میری ہے۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی۔''

''پرابلم؟ ابھی آتے ہوئے ایک سارجنٹ نے روکا تھا۔ کاغذات تمہارے نام پر تھے۔''

''پھر؟ کیا کہا تم نے؟''

اس نے نظر جھکا لی۔ ''کیا کہتی، یہی کہ میرے شوہر کی ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ ہونے والے شوہر کی ہے۔''

''دیر تم کر رہی ہو، ورنہ یہ رشتہ کب کا بن چکا ہوتا۔''

''زمان! تم مرد ہو، اپنا فیصلہ منوا سکتے ہو اور...... بیوی مجبور ہے۔ اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہو گا۔ مرد کا تو دوسری شادی کرنا نہ گناہ ہے نہ جرم...... شاید خاندان والے بھی اسی کو سمجھائیں گے۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''خاندان بھی اب کیا ہے۔ ماں باپ مر گئے۔ بھائی بہن اپنے اپنے گھر کے ہو گئے۔ یہ تو اس کی فطرت میں شامل ہے کہ مجازی خدا کے خلاف بغاوت کیا گستاخی بھی نہ کرے۔ وہ بس روتی رہی اور یہ پوچھا کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟ میں نے کہا کہ کوئی نہیں۔ میں آئندہ بھی اپنی ذمے داری نبھاتا رہوں گا۔ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''میرے بارے میں کیا بتایا؟ یہ تو نہیں کہا ہوگا کہ اس عمر میں مجھے لیلیٰ مجنوں والا عشق ہوا ہے۔''

''میں نے کہا کہ ایک بیوہ ہے۔ کالج کی لیکچرر ہے۔ یہ گھر سو فیصد تمہارا ہی رہے گا۔''

''یہ نہیں کہا کہ بیوہ سے نکاح سنت ہے؟''

زمان مسکرایا۔ ''ضرورت نہیں پڑی۔ اس پر وہ بولی تھی کہ یہ کہو نہ پڑھی لکھی مل گئی ہے اپنے جیسی...... میں تو جاہل تھی۔''

''اور بیٹوں نے؟ وہ ماں کی طرف سے بولے ہوں گے ضرور......''

''ہاں، ایک زیادہ غصے میں تھا۔ کہنے لگا کہ آپ ظلم کر رہے ہیں ماں پر...... ہم آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میں نے کہا کہ تم بالغ ہو اور خود مختار...... میں تمہارے کسی فیصلے کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتا۔ جہاں دل چاہے رہو۔ آسان بات تھی۔ ان کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ گھر سے وہ جا سکتے ہیں۔ مجھے نہیں نکالا جا سکتا۔ لیکن جوان گرم خون ہے...... ماں سے کہیں گے کہ آپ یہ گھر چھوڑ دیں۔ ہم کرائے کے چھوٹے گھر میں رہ لیں گے۔ مگر ماں ان کے ساتھ محل میں بھی نہیں جا سکتی شوہر کو چھوڑ کے...... نہ اس کی فطرت نہ مزاج اور نہ تربیت...... رہی بیٹی تو وہ دبئی میں ہے اور امریکا جانے والی ہے۔ پرابلم کہیں بھی نہیں ہے...... نہ تمہارے لیے نہ میرے لیے۔ ابھی ہم کسی اچھے علاقے میں کرائے کا فلیٹ لے کر بھی رہ سکتے ہیں۔ تم ڈر رہی ہو، ابھی

تک بیٹے سے بات نہیں کی حالانکہ وہ امریکا میں عیش کر رہا ہے۔ اسے خاک بھی پروا نہیں ہوگی تمہاری...... اور وہ لوٹ کر آنے والا بھی نہیں......'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''مگر...... میری ماں تو ہے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''بس...... اس پہاڑ کو سر کرنا تمہارا کام ہے۔ اس کے لیے کب تک سوچو گی آخر...... اچھا چھوڑو، دیکھو یہ تو ہو سکتا ہے ناکہ تم صبح چلی جاؤ اسی ہوٹل میں۔''

''بار بار ایک ہی بات کیوں کرتے ہو۔ تم جانتے ہو یہ کتنا ناممکن ہے۔ میں گرلز ہاسٹل کی وارڈن ہوں۔ لڑکیوں کے کمروں میں چھاپے مارتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کون کیا کر رہی ہے۔ دو کو میں نے پکڑا، بوائے فرینڈ بیڈ کے نیچے سے نکالے...... پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی ضرور دی...... مگر مجھے معلوم ہے ان لڑکیوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ چھوڑ دیا تحریری معافی نامہ لے کر...... لڑکیاں پھر بھی باز آنے والی نہیں۔ چوکیدار کو ایک ایک ہزار کی رشوت دیتی ہیں۔ پیچھے سے رسی کے سہارے اتر جاتی ہیں اور ادھر سے لڑکے بھی چڑھ جاتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ میں خود رات بھر اپنے کمرے سے غائب رہوں، یہ کیسے ممکن ہے؟''

''چھوڑ دو یہ ذمے داری۔''

''پھر خود کہاں جاؤں؟ کہیں اکیلی رہ سکتی ہوں میں کرائے کے فلیٹ میں؟ ماں کو چھوڑو...... کوئی اور رہنے دے گا مجھے؟''

زمان کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ ''گرمی کی چھٹیوں میں دو مہینے پڑے ہیں۔ پھر تم پنڈی چلی جاؤ گی۔''

''اس بار میں ماں کو منالوں گی، پر اس۔''

''پہلے بیٹے کی منظوری تو لے لو۔'' وہ بولا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ ایک منٹ نہیں لگائے گا۔ فوراً نانی کو فون کرے گا۔''

وہ پل صراط کے بیچ کھڑی تھی۔ یہ فیصلہ جیسے اس پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جنت میں رہے یا دوزخ میں...... محرومی اور تشنگی کی بے مقصد زندگی گزرتی جا رہی تھی۔ کاش اس کے پیروں میں یہ سونے کی زنجیر نہ ہوتی۔

زمان نے پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

وہ چونکی۔ ''کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے، میں چلتی ہوں۔ اس وقت میں اُن ٹین ایجرز سے زیادہ گلٹی فیل کر رہی ہوں جن پر میں اخلاق کی پہرے دار ہوں۔ خیر، ایک اور بات...... وہ جو میری گاڑی تم نے لے لی ہے اس کو رکھنا اپنے پاس...... وہ میری پیدائش پر ابا نے خریدی تھی اور میری ماں کو ابا سے زیادہ عزیز ہے آج بھی۔''

اپنے جیتے جاگتے وجود سے نکلتی خواہش کی آگ...... جو اس نے خود بھڑکائی تھی، اب سرد پڑ رہی تھی اور خواب اسے بلا رہے تھے۔ خواب میں سب ممکن تھا۔ زمان کی قربت بھی۔

اپنی بزدلی پر اسے کوئی شک نہ تھا۔ مگر اپنی اس بے رحمی خودغرضی اور ہمت پر وہ حیران تھی کہ کس طرح وہ محض اپنی ضرورت پر پچیس سال وفادار رہنے والی ایک عورت کے جذبات کو بلڈوز کر رہی تھی۔ اس کے شوہر پر قبضہ کرنا چاہتی تھی اور اسے جیتے جی بیوہ۔

☆☆☆

رضیہ بیگم ہر روز کی طرح فجر کی نماز پڑھ کر پھر سو گئی تھیں۔ ان کی آنکھ آٹھ بجے دوبارہ کھلی تو بیڈ کے سرہانے کی طرف والی کھڑکی پر پڑے بھاری شنیل کے پردوں کے پیچھے باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے شیشے روشن دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک پُرسکون رات کی نیند کے باوجود ان پر کچھ تکان سی غالب ہے۔ یوں جیسے جسم کا درجہ حرارت ایک دو ڈگری بڑھ گیا ہو۔ ایک ریموٹ سے انہوں نے بیڈ سائڈ کی لائٹ جلائی۔ پھر دوسرے سے اے سی کو آف کیا جو کمرے کو کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا کر چکا تھا۔ شاید باہر کا موسم ابر آلود تھا۔

پردے ہٹانے پر دھوپ نے شیشوں کو روشن نہیں کیا۔ کھڑکی کھول کر دیکھنے پر ان کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ باہر آسمان ابر آلود تھا اور مری کی سمت سے بارش برسانے والے بادل بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ تیز ہوا میں باغ کے درخت جھوم رہے تھے۔ پھر ایک بجلی کا کوندا سا لپکا اور بادل غصے سے غرایا۔ رضیہ بیگم کا رُواں رُواں تازگی سے سرشار ہو گیا۔

گھنٹی بجا کے خدا بخش کو طلب کرنے کے بجائے انہوں نے واش روم کا رخ کیا۔ منہ دھو کے انہوں نے لباسِ شب خوابی تبدیل کیا اور ڈریسنگ روم میں وارڈروب سے ہلکے زرد رنگ کا ایک سوٹ منتخب کیا۔ اس موسم میں یہ کھلتا ہوا رنگ اچھا لگے گا۔ وہ خود کو انتہائی خوش قسمت تصور کرتی تھیں کہ عمر کے ساتھ ان کے وزن میں زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ ان کے بھی بعد آنے والی بیشتر خواتین اب گوشت اور چربی کے بے ہنگم چلتے پھرتے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھیں اور آہ

بھر کے رشک سے کہتی تھیں کہ خدا ان پر مہربان ہے۔ وہ لاکھ احتیاط کریں۔ ہوا اور پانی پر زندہ رہیں تب بھی جسم تھا کہ پھیلتا جاتا تھا۔ ایک وہ تھیں کہ انہیں کچھ بھی منع نہ تھا اور وہ جوانوں کی طرح چاق چوبند تھیں۔ ان کو نہ سلمنگ سینٹر جانے کی ضرورت تھی اور نہ کسی ڈائٹ پلان کی۔ ان کی ٹانگیں آج بھی بہ آسانی ان کے وجود کو بہ آسانی ہر جگہ لے جارہی تھیں۔

"خدا بخش۔" انہوں نے برآمدے کی راکنگ چیئر پر بیٹھ کے آواز دی۔

خدا بخش نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا اور بولا۔ "بیڈ ٹی لا رہا ہوں بیگم صاحبہ۔"

ہوا میں بڑی تازگی اور فرحت تھی۔ صبح دم پڑنے والی بارش کے چھینٹوں نے لان پر شبنم سی بکھیر دی تھی۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ہموار تراشی ہوئی سرسبز جھاڑیوں کے ساتھ کیاریوں میں موسم گرما کے سارے شوخ رنگوں والے پھول مسکرا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ جھولتے ہوئے انہوں نے چائے ختم کی اور پھر اخبار اٹھانے گیٹ کے پاس چلی گئیں۔ ربر بینڈ میں ڈنڈے کی طرح لپٹے ہوئے اخبار کے ساتھ انہوں نے ...... ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ تک سو فٹ کا فاصلہ پھولوں کا معائنہ کرتے طے کیا اور بارش سے بھیگی گھاس کی ٹھنڈک کو شبنم کی طرح پیروں میں سرائیت کرتا محسوس کیا، مالی اور شوفر دونوں فرمانبردار اور فرض شناس تھے۔ دونوں کو سال بھر پہلے خدا بخش لایا تھا۔

واپس راکنگ چیئر پر بیٹھ کے انہوں نے سرسری نظر اخبار کی سرخیوں پر ڈالی اور بیزار ہو کے اسے میز پر ڈال دیا۔ سیاست، جرائم، بیانات یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں کہیں کچھ بھی اچھا نہیں ہو رہا۔ اخبار کو سطر سطر چاٹنے کا خبط عزیز صاحب کو تھا کہ چائے کی پیالی سامنے ہو یا ناشتا، بیوی کچھ بھی بول رہی ہو...... وہ ہوں ہاں کرتے جاتے تھے اور کمال یہ تھا کہ سب سنتے بھی تھے حالانکہ ساری توجہ ان کی خبروں پر ہوتی تھی۔ اب وہ نہیں تھے تب بھی اخبار اسی طرح آرہا تھا۔ پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے۔

ایک آواز پر خدا بخش نے ناشتا ان کے سامنے سجا دیا۔ انہی کا ہم عمر ہوتے کے باوجود وہ نوجوانوں سے زیادہ مستعد تھا۔ اس کے کان رضیہ بیگم کی آواز کا مطلب سمجھ لیتے تھے۔ وہ ان کا مزاج شناس اور زرخرید غلاموں جیسا فرمانبردار تھا کہ جائز ناجائز سب سن لیتا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں جو نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ان کے درمیان جو فاصلہ ضروری تھا، برقرار تھا۔ دنیا میں وہ بھی اکیلا تھا چنانچہ اس کی تنخواہ بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوتی جارہی تھی۔ کھانا، کپڑا اسے اچھا اور بن مانگے مل جاتا تھا۔

خدا بخش ناشتے کے برتن اٹھانے آیا تو رضیہ بیگم نے کہا۔ "دیکھو ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے بتاؤ کہ مجھے کچھ بخار سا لگ رہا ہے۔"

"آپ نے تھرمامیٹر سے چیک کیا بیگم صاحبہ؟"

"وہ خود دیکھ لیں گے۔" رضیہ بیگم نے چڑ کے کہا۔

پڑوس میں رہنے والے ڈاکٹر علی دس منٹ بعد نمودار ہوئے۔ بہتر سال کی عمر میں ان کی اچھی صحت کا راز ایک منتظم زندگی تھی۔ وقت پر سونا جاگنا، کم کھانا اور ورک...... سرخ پولو شرٹ اور کریم کلر کی پتلون میں وہ اسمارٹ لگ رہے تھے۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر نبض دیکھی۔ "لگتا تو نہیں...... لیکن میں دیکھ لیتا ہوں۔" انہوں نے بیگ سے تھرمامیٹر نکال کے منہ میں لگایا اور ایک منٹ بعد اعلان کر دیا۔ "کچھ نہیں، وہم مت کیا کرو۔" اور پھر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ "موسم اچھا ہے آج...... تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" رضیہ نے خدا بخش کو آواز دی۔ وہ چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا۔

"نہیں، یہ جو سارا دن تم ڈپریشن طاری کرنے والے زنانہ سیاست کے ڈرامے دیکھتی ہو، اس کا اثر ہے۔ میں نے دو فلمیں دی تھیں۔"

"دیکھ لیں...... بور...... میں نے کہا تھا، اکشے کمار یا سلمان خان کی جو نئی فلمیں لگی ہیں......"

"مائی گاڈ...... یہ مار دھاڑ چیخ پکار اور ناچ گانے والی فلمیں کیسے دیکھ لیتی ہو تم......؟"

"جیسے تم یہ روتی دھوتی آرٹ موویز دیکھتے ہو۔"

ڈاکٹر علی نے چائے ختم کی۔ "گھر سے نکلو...... اور ایسے ہر وقت بیٹھی مت رہا کرو۔"

"خدا کے لیے اپنا یہ لیکچر پھر مت شروع کر دینا۔ اس کے بغیر بھی ٹھیک ہوں میں۔ ہفتے میں دو بار اپنا اسکول دیکھنے جاتی ہوں، ایک بار دوائیں اور پھل لے کر اسپتال...... ہماری ہفتہ وار میٹنگ ہوتی ہے پیر کو...... میرا سوشل سرکل کافی ہے مجھے...... تم ہو جو سارا دن کمرے میں بند یا کتابوں میں غرق رہتے ہو یا فلموں میں۔"

"میرا کمرا ایک دفاعی حصار ہے۔ کسی کی بک بک

نہیں سنتا۔'' وہ ہنسا۔

ایک بچے نے درمیانی دیوار کے اوپر سے سر نکالا۔

''دادا، جلدی سے آ جائیں۔ ماما اور پاپا لڑ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر علی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جاتے ہی رشید آ گیا۔

حسب معمول وہ اکیلا ہی تھا اور وہ اندازہ کر سکتی تھیں کہ وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کے آیا ہوگا اور کوئی مقصد لے کر آیا ہوگا۔ سلام کر کے سامنے بیٹھ جانے کے بعد وہ میز پر رکھی مختلف سائز اور صورت کی شیشیاں دیکھ کے مسکرایا۔ ''کیسی ہے طبیعت ماں؟''

''تمہیں کیسی لگ رہی ہے؟'' رضیہ بیگم نے کہا۔

''اس خبطی ڈاکٹر علی کو ضرور کمیشن ملتا ہوگا ایک درجن ملٹی وٹامن کی گولیاں اور سپلیمنٹ کھانے پر لگا دیا ہے آپ کو۔''

''اس میں تمہارا تو کوئی نقصان نہیں، یہ سب میں خود خریدتی ہوں۔''

''اور آپ کو یقین ہے کہ آپ سو سال جی لیں گی یو جاسوسی ناول لکھنے والی اگاتھا کرسٹی نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا تھا۔''

رضیہ بیگم مسکرائیں۔ ''اور وہ ننانوے سال جی لی تھی۔''

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے پیاری امی جان......''

''یہ ٹھیک ہے پیارے بیٹے...... لیکن مجھے بتاؤ کہ دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک میں انسان کی اوسط عمر کیوں بڑھتی جا رہی ہے۔ جاپان میں ستر سے اوپر ہے اور اس کو وہ ننانوے کر لیں گے۔ یہ دعویٰ ہے ان کا۔''

''وہ لمبی عمر جیتے ہیں تو لائف کو انجوائے بھی کرتے ہیں۔''

''تم کو کیا معلوم کہ میں لائف کو کتنا انجوائے کر رہی ہوں...... اپنے طریقے سے۔''

وہ طنز سے بولا۔ ''اکیلی؟ چار کنال کے اس گھر میں ایک بڈھے کھڑوس نوکر کے ساتھ؟ آپ کو پتا ہے کہ لوگ کتنی باتیں کرتے ہیں۔''

رضیہ بیگم کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ''میں سب جانتی ہوں رشید کہ وہ کون لوگ ہیں۔ کیا تم اس وقت مجھے یہی بتانے آئے تھے؟''

رشید محتاط ہو گیا۔ ''سوری ماما اس عمر میں لوگ پوتے پوتیوں سے خوشی پاتے ہیں۔''

''چاہتی تو میں بھی یہی تھی بیٹا مگر جو قسمت میں نہ ہو نہیں ملتا۔''

رشید نے کہا۔ ''اپنے آپ کو خود آپ نے تنہا کیا ہے ماں...... ایک بیٹی ہے آپ کی...... وہ اکیلی لاہور میں نوکری کر رہی ہے بیوہ ہونے کے باوجود۔''

''اسے اپنی آزادی زیادہ عزیز ہے اور میں کسی کی زندگی میں دخل نہیں دیتی رشید...... جب تم میرے بچے تھے، میں نے اپنی ہر ذمے داری پوری کی۔ سب کو اعلیٰ تعلیم دلوائی جس کی وجہ سے آج سب باعزت اور خوش حال زندگی گزار رہے ہیں...... سب کی شادی کر دی۔ رہنے کو گھر فراہم کر دیے، گاڑیاں دلوا دیں...... اب کیا چاہتے ہو...... میں خوشی کی بھیک مانگنے پوتے پوتیوں کے پاس جاؤں؟''

''وہ آتے تو ہیں آپ کے پاس......'' رشید دبے دبے لہجے میں بولا۔

رضیہ نے طنز سے کہا۔ ''ہاں عیدوں پر عیدی لینے ہر سالگرہ پر گفٹ لینے اور پاس ہونے پر انعام لینے...... ورنہ سارا سال ایک فون کال نہیں کرتے...... ان کے سر کی قسم کھا کے بتاؤ کیا نانا نانی اور خالہ ماموں سے بھی ان کا اتنا ہی تعلق ہے؟''

''مگر آپ نے خود انہیں اپنے سے دور کیا ہے ماں۔''

''ہاں، اس لیے کہ میں نے تمہاری شادی کی تھی۔ اپنی عزت کا سودا نہیں کیا تھا۔ بہوؤں کو اس لیے گھر میں نہیں لائی تھی کہ وہ میری خدمت کرنے کے بجائے...... مجھے ذلیل کریں۔ تم رہو ان کے فرمانبردار بن کے...... وہ بھی خوش ہیں، میں بھی سکون سے ہوں۔ سب اپنی اپنی زندگی اپنی مرضی سے جی رہے ہیں۔''

''آپ ایک موقع اور دیں۔ ہم سب آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ خوش رکھنا چاہتے ہیں آپ کو......''

رضیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ غلطی میں دوسری بار نہیں کروں گی رشید۔ تم فکر مت کرو، میں خوش اور مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔ کوئی ضرورت ہے تو بتاؤ، تم کو دو بیڈ کا گھر چھوٹا پڑتا تھا۔ میں نے ایک کنال والا تین بیڈ کا گھر ویسٹرج میں خرید کے دیا۔ حمید بزنس کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بکس اینڈ اسٹیشنری کی دکان کے لیے سرمایہ فراہم کر دیا۔ وہ اچھی چل رہی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ انہیں سیٹلائٹ ٹاؤن والا دس مرلے کا گھر کافی ہے۔ بس اور کچھ نہیں کروں گی میں۔''

رشید احساسِ تذلیل سے مشتعل ہو کے اٹھا۔ ''ابا ہوتے تو یہ نہ ہوتا ماں۔''

وہ تلخی سے ہنسی۔ ''ہاں، یہ سب نہ ہوتا جو آج تمہارے پاس ہے ماں کا دیا ہوا......''

وہ رشید کو پیر پٹختا غصے میں گاڑی ریورس کرتا دیکھتی رہی۔ شاید جو بات وہ کہنے آیا تھا، وہ نہیں کہہ سکی۔ خیر، رضیہ بیگم نے گھڑی دیکھی۔ اس ڈرامے کی ''ری پیٹ'' ٹیلی کاسٹ کا وقت ہو گیا تھا جو رات کو ادھورا رہ گیا تھا۔ ''ماں تا کا روگ'' ان کو لگتا تھا کہ حمیرا خان نے ان کے روز و شب کی کہانی چرالی ہے۔ مگر ڈراما دیکھ کے ان کا ڈپریشن بڑھ گیا تھا۔

وہ عین ٹی وی کے اوپر لگی ہوئی عزیز احمد خان کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ والی تصویر کو دیکھتی رہیں۔ حالات جیسے بھی ہوتے عزیز خان ہوتے تو اسے یوں زندگی گزارنے کے لیے مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہ پڑتی۔ قدرت بھی کیسی ستم ظریف ہے، اتنا سب کچھ دے دیا اور جو سب کچھ تھا، اسی کو اٹھالیا۔

باہر ٹریفک کا رش ایک دم بڑھ گیا تھا کیونکہ اسکولوں کی چھٹی کا وقت تھا۔ بچوں کو لانے لے جانے والی وین، بسیں اور پرائیویٹ گاڑیاں ایک ہی وقت میں نکلتی تھیں تو ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔ پھر ان کے اپنے اپنے ہارن تھے۔ اس وقت گھر سے نکلنا بھی عذاب تھا۔ اس پوری سڑک پر اب انگلش میڈیم اسکولز کا قبضہ تھا۔ کچھ کے کیمپس بہت بڑے تھے جو انہوں نے پرانے گھر گرا کے تعمیر کیے تھے۔ باقی ایک دو یا چار کنال کے گھروں سے کام چلا رہے تھے۔ سڑک سے دائیں بائیں نکلنے والی گلیاں بھی ان اسکولوں سے بھر گئی تھیں۔

کیا وقت تھا جب وہ اپنا شاندار ہنی مون گزار کے پاکستان لوٹے تھے۔ شادی کے فوراً بعد وہ عزیز کے ساتھ لندن چلی گئی تھی جہاں وہ کسی اسپتال میں ہاؤس جاب کے ساتھ ایف آر سی کر رہا تھا۔ ہارٹ اسپیشلسٹ بن جانے کے بعد ان کے حالات پہلے جیسے سخت نہیں رہے تھے۔ عزیز کو سعودی عرب کے ایک اسپتال میں بہت اچھی تنخواہ پر اور بے شمار مراعات والی نوکری مل گئی تھی جہاں وہ ترقی کرتے کرتے اپنے شعبے کا سربراہ بن گیا تھا۔ اس نے لاکھوں کمائے اور کروڑوں بچائے تھے۔ وہ سال میں ایک بار لندن، پیرس، نیویارک کا چکر لگا آتے تھے۔ ان کے دو بچے بھی لندن میں زیرِ تعلیم تھے اور وہیں بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔

ان کی زندگی میں عیش ہی عیش تھی اور عزیز اس کا شوہر نہیں عاشقِ زار تھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ یار اب تو ختم کرو یہ سچی محبت کا ڈراما۔ مگر وہ ڈراما کہاں تھا، حقیقت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اس ملازمت کو جاری رکھتا یا برطانیہ کی شہریت حاصل کر لیتا اور وہ لندن ہی میں سیٹل بھی ہو جاتے۔ مگر اچانک اس پر حب الوطنی کا دورہ پڑا۔

ایک دن اس نے عزیز کو سوچ میں گم دیکھ کے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تم پریشان ہو؟''

وہ زبردستی مسکرایا۔ ''نہیں، اللہ کا شکر ہے پریشانی کیسی؟ اللہ کا بڑا کرم ہے۔''

''تم کچھ چھپا رہے ہو، میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ سوچتے رہتے ہو۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ میں سوچتا ہوں روزی...... کیا میرا بس یہی کام ہے، پیسا کمانا، مزید پیسا کمانا، اتنا پیسا کمانا جو خرچ نہ ہو تو میں عیاشی میں لٹاؤں؟ بزنس کلاس میں سفر کروں اور سیون اسٹار ہوٹلوں میں قیام کروں؟''

''یہ تو خوش ہونے کی بات ہے۔ ایسا سب کرنا چاہتے ہیں۔''

''جب میں ڈاکٹر بنا تھا۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تو سب کی طرح میں نے بھی ایک حلف اٹھایا تھا کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔ جیسے کہ سب اٹھاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا ہی میں سوچتا بھی تھا۔''

''یہ تو تم کر رہے ہو اور تمہارے علاج سے سیکڑوں شفایاب ہوئے ہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ سب میں نے بلامعاوضہ نہیں کیا۔ بہت بھاری فیس لے کر کیا تھا اور وہ عام لوگ نہیں تھے۔ سب دولت مند اور وی آئی پی تھے۔ عام آدمی تو مجھ سے مشورہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہیں یاد ہے میرے ابا کو جب ہارٹ اٹیک ہوا تو بھائی اسے کراچی کے سرکاری اسپتال میں لے گئے تھے اور انہیں سی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ جب میں پہنچا تو اس انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا اور ان کو بائی پاس کے لیے فوراً ایک پرائیویٹ اسپتال لے گیا تھا جو وہاں سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا مگر تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔''

''دیر خود انہوں نے کی تھی۔ ان کو بلڈ پریشر تھا لیکن وہ چیک نہیں کرتے تھے اور جب انہوں نے ٹیسٹ کروائے تو رپورٹس کتنی خراب تھیں۔ تم نے کیا کہا تھا اُن سے...... باقاعدہ علاج اور پرہیز...... پیسا بھی بھیجا تھا مگر انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔''

وہ سنتا رہا۔ ''ہاں مگر عام آدمی ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھائی

سے میں نے کہا تھا کہ وہ خیال رکھے۔ سختی سے علاج اور پرہیز کرائے مگر اس کو فرصت کہاں تھی۔ شاید وہ ایسا کر لیتا مگر ان کی عمر میں زبردستی بھی نہیں کی جاسکتی...... اب بھائی کا یہی مسئلہ ہے اسے روپے پیسے کی کمی نہیں مگر وہ بھی علاج اور پرہیز نہیں کرتا اور بچوں کے پاس وقت نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں عام آدمی کو جو طبی سہولیات سرکاری طور پر حاصل ہیں، وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آغا خان کیا وہ ضیاالدین جیسے اور لیاقت نیشنل اسپتال نہیں جاسکتا۔ بڑی بڑی ڈگریوں والے بڑے نام کے ڈاکٹر صرف گریڈ کے لیے اور مریضوں کو اپنا مریض بنانے کے لیے...... کسی اور کی بات کیا کروں...... بھائی نے مجھے ایک نامور ڈاکٹر کے بارے میں بتایا کہ سرکاری اسپتال میں وہ کتنی بدمزاجی اور ترش روئی سے باری آنے پر ابا کو دیکھ تو لیتا تھا مگر سرسری انداز میں۔ جیسے ان پر احسان کر رہا ہو۔ جب میرے کہنے پر بھائی اسے پرائیویٹ اسپتال میں لے گئے تو وہاں شام کو وہی ڈاکٹر تھا۔ بھائی نے کہا کہ وہاں وہ ایسی خندہ پیشانی اور مسکرا کے ملا کہ بھائی حیران رہ گیا۔ صرف چھ سو روپے روزی...... انسان کا رویّہ خرید لیتا ہے۔ پھر سرکاری اسپتالوں میں وارڈز کی حالت...... اسٹاف کا رویّہ اور اس سے بڑھ کر وہ دوائیں جو مفت دی جاتی ہیں...... بیشتر جعلی اور غیر معیاری...... اخبارات میں رپورٹس آتی رہتی ہیں۔''

''اب یہ تو حکومت کی بدانتظامی ہے۔ تم بھی کیا کر سکتے ہو؟''

''یہ بات نہیں...... کرنے والے کر رہے ہیں۔ تم نے ڈاکٹر ادیب رضوی کا نام سنا ہے نا...... اور بھی رفاہی اسپتال ہیں جو مفت یا برائے نام خرچ پر علاج کی سہولت فراہم کر رہے ہیں۔ وہ بڑے نامور ڈاکٹر ہیں اور چاہیں تو بہت کما سکتے ہیں مگر دنیا سے انسانیت اٹھی نہیں ہے۔''

وہ سمجھ گئی۔ ''تو تم بھی خدمتِ خلق کے لیے پاکستان جانا چاہتے ہو؟''

''ہاں، مجھ پر سب کا قرض ہے۔ انسانیت کا...... میرے دین کی تعلیمات کا...... آخرت کے لیے بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا ہمیں...... یہاں رہ کے کتنے حج اور عمرے کر لیے...... کیا یہی کافی ہے......؟ میرے وطن کا مجھ پر کوئی حق نہیں؟''

''عزیز! پاکستان کے حالات کا تو علم ہے نا تمہیں......''

''ہاں، حالات ان کے لیے خراب ہیں جو سیاست کرتے ہیں یا اقتدار کے کھیل میں شاہ پر قربان ہونے والے پیادے ہیں۔ میرا اس سے کیا لینا دینا...... کام کرنے والے اپنا کام کر رہے ہیں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''ہم رہ لیں گے کراچی میں...... ہم جب آخری بار گئے تھے تو خود تم نے کہا تھا معلوم نہیں لوگ کیسے جی لیتے ہیں یہاں۔ میرے لیے بھی بہت مشکل ہوگا۔ میرا تو اب کوئی بھی نہیں ہے وہاں۔''

اس نے رضیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں ہوں نا...... اور دوسری بات یہ کہ کراچی کیوں...... ہم اسلام آباد جائیں گے۔ پنڈی میں رہیں گے۔ وہ پُرسکون اور سرسبز اور چھوٹے شہر ہیں۔ مری، کاغان، سوات...... تم نے تو سب دیکھا ہے یہاں ہم جس ریگ زار میں ہیں ان کے مقابلے میں تو جنت...... وہاں بھی سرحد اور آزاد کشمیر تک عام لوگ رہتے ہیں۔''

''تو تم نے طے کر لیا ہے؟ تم اسپتال بناؤ گے وہاں؟''

''اگر بنا سکا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں اور صرف پیسے سے سب کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن وہاں سی ایم ایچ سے ریٹائر ہونے والے اچھے ڈاکٹر بہت ہیں۔ تجربہ کار اور ڈسپلن والے...... حکومت اتنا تو کر ہی سکتی ہے کہ اسپتال کے لیے زمین دے دے۔ انسان نیت کرے تو مدد خدا کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے خود کو عزیز پر گرا دیا۔

وہ اس کو بازوؤں کے گھیرے میں لیے بیٹھا رہا۔

''ایک بات اور ہے۔''

وہ سیدھی بیٹھ گئی۔ ''کہتے کیوں نہیں۔''

''میرا خیال ہے بچوں کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔''

وہ چونکی۔ ''کیا؟ لندن میں پڑھنے والے بچے اب پاکستان میں پڑھیں گے۔ خدا کے لیے عزیز، اپنی خواہش پر بچوں کا مستقبل تو قربان مت کرو، لوگ بچوں کو پاکستان سے باہر تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں کتنے جتن کر کے۔''

''کیا پاکستان میں اچھے اسکول کالج کم ہیں؟ کتنے ہی نام گنا سکتا ہوں میں جن کا معیار کسی طرح بھی کم نہیں اور وہاں انٹرنیشنل اسکول ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ان کو اس ماحول سے نکالنا چاہتا ہوں جس میں بچے اتنے مغرب زدہ ہو جاتے ہیں کہ سب رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں۔ وہ ماں باپ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور یہ آزادی

کہلاتی ہے۔''

''یہ زیادتی ہے عزیز، تم پر عمر کا اثر ہے کہ اب تمہیں مذہب، اخلاق اور وطن سب یاد آرہا ہے۔''

''کیا میں بوڑھا لگتا ہوں تمہیں؟'' اس نے برہمی سے کہا۔ ''ایک باپ کی حیثیت سے اولاد کی تربیت کا ذمے دار میں ہوں۔ اگر آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ بہت پیسا کمالیا، اب نیکی بھی کمانی چاہیے تو تم مخالفت کر رہی ہو؟ کتنی دولت اور چاہیے آخر تمہیں؟ بولو......؟''

وہ ڈر گئی۔ عزیز نے اس سے کبھی ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ''مخالفت کا میں سوچ بھی نہیں سکتی عزیز، میرے لیے سب کچھ تم ہو، صرف تم۔''

دو مہینے بعد وہ اسی دنیا میں لوٹ گئے جہاں سے آئے تھے۔ حالانکہ دنیا وہ نہیں تھی جیسی وہ چھوڑ کے گئے تھے۔

ابتدا میں یہ ایک اور ہجرت تھی۔ کراچی کی فضا میں جہاں اس کا بچپن سے جوانی تک کا وقت گزرا تھا، رضیہ کے لیے ناموافق حالات میں بھی مانوسیت تھی۔ ماں باپ اور بہن بھائی نہ سہی ان کے کزن اور دور پار کے سارے عزیز اب بھی وہیں تھے۔ لندن اور پھر سعودی عرب میں ملازمت کے دوران میں یہ تو یقین تھا کہ سعودی عرب میں قیام کتنا بھی طویل ہو، عارضی ہی رہے گا اور عزیز خان کو کسی دن کوئی مقامی اچانک کہہ دے گا کہ بس ہو چکی نماز، مصلیٰ اٹھایئے، تیس چالیس سال گزارنے والوں کو بھی قانونی شہریت ملنے کی وہاں گنجائش نہ تھی لیکن برطانوی شہریت لینا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

واپسی کا رضیہ نے کبھی سوچا نہ تھا۔ انہیں ابتدا میں خاصی مشکلات کا سامنا رہا۔ اسلام آباد سرسبز اور بہتر ڈسپلن والا شہر ضرور تھا مگر ابھی بس رہا تھا۔ رات ہوتے ہی سڑکوں پر ویرانی چھا جاتی تھی اور بازار یا ریسٹورنٹ بھی دس بجے تک بند ہو جاتے تھے۔ راولپنڈی بہتر تھا کہ شہری آبادی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ اسلام آباد کی طرح سرکاری ملازمین کا شہر نہیں تھا مگر یہاں فوجی ماحول غالب تھا اور آرمی کے جونیئر سے سینئر افسر تک راولپنڈی کو ترجیح دیتے تھے۔

انہوں نے عارضی طور پر جو مکان کرائے پر لیا، وہ اس محل کے مقابلے میں چھوٹا تھا جسے وہ چھوڑ آئے تھے۔ تھوڑے سے فرنیچر، گھر کے لیے ایک ملازمہ جس کا شوہر ڈرائیور تھا، ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا جس میں رضیہ کے لیے مایوسی اور اکیلے پن کا احساس تھا مگر عزیز ایک مشن لے کر آیا تھا اور بہت پُرجوش تھا۔ تاہم ایک مہینے بعد ہی اس نے بھی اسلام آباد کے بیوروکریسی والے خاموش ماحول کو چھوڑ کر راولپنڈی کو اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بچوں کے سامنے یہاں کی خوب صورتی اور پُرسکون زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ سال ختم ہونے کے بعد وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ لندن کے بجائے اسلام آباد کے ڈپلومیٹک اسکول میں جاری رکھنے پر راضی ہو گئے تھے۔ فون پر ان کے ردِعمل کا اندازہ بھی مشکل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ باپ کا فیصلہ انہیں ماننے بِنا چارہ نہیں...... لڑکی نے البتہ مزاحمت کی۔ وہ بڑی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ پاکستان میں اسے وہ آزادی حاصل نہیں ہوگی جو لندن میں تھی۔ ہاسٹل کے ڈسپلن کے باوجود......

عزیز کے فیصلے فوری اور اٹل ہوتے تھے۔ اچانک ایک دن اس نے اعلان کر دیا۔ ''میں نے راولپنڈی میں زمین دیکھ لی ہے۔ ہم اپنا نیا گھر چار کنال پر بنائیں گے۔ تقریباً دو ہزار گز سمجھ لو...... بلکہ ڈھائی ہزار۔''

''ڈھائی ہزار۔'' وہ دنگ رہ گئی کیونکہ لندن میں تو ایسے مینشن مضافات میں رئیسوں ہی کے ہوتے تھے۔ ''کیا کریں گے ہم اتنے بڑے گھر میں؟''

وہ ہنسا۔ ''بھئی اب بچے بھی ساتھ ہوں گے ہمارے...... اور پھر اس کا زیادہ حصہ لان، باغ وغیرہ ہوں گے۔ فوارے اور پالتو بطخ یا ہرن ہوں گے۔ لیکن ایک بات سب سے اہم ہے۔ تم کو یاد ہے میں نے لندن میں ایک جگہ دکھائی تھی ہارلے اسٹریٹ۔''

رضیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہت پرانی بات ہوگئی۔''

''وہاں سب ڈاکٹر رہتے تھے۔ بڑے بڑے گھر تھے ان کے اور پرائیویٹ کلینک...... تو ایک ہارلے اسٹریٹ یہاں بھی ہے۔''

''وہاں بھی ڈاکٹر رہتے ہیں؟''

''ہاں، ابھی آباد ہونے والے سب ڈاکٹر ہیں اور انہوں نے طے کیا ہے کہ یہاں صرف ڈاکٹرز کو رہنے کی اجازت ہوگی۔ بیشتر ملٹری اسپتال کے ڈاکٹر ہیں۔ بریگیڈیئر سے اوپر کے رینک والے۔''

لیکن ہارلے اسٹریٹ کو دیکھ کر رضیہ کو سخت مایوسی ہوئی۔ ایک ویرانے میں لے جانے والی سڑک کے کنارے کنارے دس بارہ کوٹھیاں کھڑی تھیں۔ سامنے لق و دق میدان تھا۔ بظاہر سب ایک دوسرے سے لاتعلق لوگ تھے۔ قریب میں نہ کوئی بازار تھا نہ تفریح کی جگہ۔ ایک میل دور فائرنگ رینج تھی چنانچہ ایک پہاڑی سی تھی جس پر زیرتربیت فوجی نشانے کی مشق کرتے تھے۔ آگے کہیں ٹالی

موری کا گاؤں تھا۔ قریب ترین بازار لاکھڑتی تھا ورنہ صدر بازار...... یہ اسلام آباد سے بھی زیادہ بے رونق اور غیر آباد جگہ تھی لیکن عزیز نے نام کی وجہ سے بھی اس جگہ کو رہائش بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس لیے بھی کہ یہاں ابھی زمین سستی تھی۔

پیسا وافر تھا چنانچہ گھر چھ ماہ میں بن کے مکمل ہو گیا۔

اب زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ دوسری کار خریدی گئی اس کے لیے دوسرا ڈرائیور بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میاں بیوی کا نیا جوڑا دوسرے سرونٹ کوارٹر میں آ گیا۔ دوسرا ڈرائیور بچوں کو اسکول لاتا لے جاتا تھا اور باقی وقت گھر میں ہر کام کے لیے حاضر رہتا تھا۔ چوکیدار بھی پارٹ ٹائم مالی بن گیا اور اس کا سارا وقت آرائشِ چمن میں گزرتا تھا۔ یہ معمول عزیز کے سوا سب کے لیے بیزار کن تھا۔ لیکن اب کسی کے اختلاف یا احتجاج کرنے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ بیٹی نے سب سے زیادہ ہنگامہ کیا جو مری روڈ کے کالج میں داخل ہوئی تو پہلے ہی روز اس نے کالج کو لڑکیوں کا اصطبل قرار دیا۔ لڑکیوں پر پابندیاں سخت تھیں۔ پردہ لازمی نہیں تھا مگر وہ اپنی مرضی سے کہیں آ جا نہیں سکتی تھیں۔ بوائے فرینڈ کا یہاں کوئی تصور نہ تھا۔ ڈرائیور کو عزیز کی سخت ہدایات نہ ہوتیں تب بھی وہ صوفی ٹائپ دیہاتی خود اسے کہیں آنے جانے نہ دیتا۔

عزیز نے دوسرے ڈاکٹرز سے رابطے کیے۔ حکومت سے زمین کی بات کی اور سرکاری افسران کے دفتروں کے چکر لگائے مگر یہاں نہ برطانیہ کی طرح کا قانون تھا جہاں جمہوریت مکمل تھی اور نہ سعودی عرب والا جہاں بادشاہ کا حکم قانون تھا۔ یہاں سفارش سے زیادہ رشوت کا چلن تھا۔ اس کے بغیر جائز کام بھی نہیں ہوتے تھے ورنہ قانون منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ عزیز سخت پریشان ہوا۔ انسانی فلاح صدقہ جاریہ اور حب الوطنی کے سارے جذبات دم توڑ گئے لیکن وہ ہار تسلیم کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اصول اور مذہبی تعلیم کا اثر اس پر غالب تھا لیکن یہ ایک مختلف دنیا تھی۔

دن رات کی دوڑ دھوپ، پریشانی، اعصابی دباؤ اور فرسٹریشن میں وہ بھول گیا کہ دل کا مرض ان کا خاندانی روگ ہے۔ ابا کے لیے عدم توجہی کا شکوہ کرنے والا خود اپنی صحت کا خیال نہ رکھ سکا۔ ایک رات سوتے میں اس کو اسٹروک ہوا۔ ایمبولینس کے آنے میں دیر لگتی۔ رضیہ اسے ڈرائیور کے ساتھ لے کر بھاگی۔ سی ایم ایچ کی مسافت دس منٹ کی تھی مگر وہ سویلین مریضوں کو نہیں دیکھتے تھے۔ اس نے ہار لے اسٹریٹ کے پڑوسیوں کا حوالہ دیا جن میں جنرل بھی تھے تو عزیز کو صرف یہ دیکھنے کے لیے ایمرجنسی میں جانے کی اجازت دی گئی کہ ڈی او اے...... ڈیڈ آن ارائیول...... وہ کہیں راستے میں ہی ختم ہو چکا تھا۔ اپنے خدمتِ خلق اور پاکستانیت کے سارے جذبات کے ساتھ اگلے دن اسے دفنا دیا گیا۔

اب رضیہ کی زندگی کا کٹھن اور آزمائشی دور شروع ہوا۔ یہاں بیوہ کا دوسری شادی کرنا گناہ کبیرہ جیسا تھا۔ حالانکہ یہ سنت تھی اور سعودی عرب میں عام رواج تھا۔ اس کی اجازت مذہب بھی دیتا تھا اور قانون بھی مگر معاشرتی پابندیاں سب پر حاوی تھیں۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ بقیہ زندگی اسے تنہا وہ ساری ذمے داریاں پوری کرتے گزارنا ہو گی جو عزیز کے ہوتے اس کا مسئلہ نہ تھیں۔ بچوں کو اور گھر کے سارے انتظامی معاملات کو کنٹرول کرنا ایک چیلنج تھا اور وقت نے اسے احساس دلایا کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو اسے ناممکن نظر آتا تھا۔ ماں اور باپ کا دہرا رول انتہائی صبر آزما تھا۔ اکثر اس کا حوصلہ جواب دے جاتا تھا اور وہ رات کو روتی تھی۔ عزیز یہ تم کہاں لا کے مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ اس کا رُواں رُواں فریاد کرتا تھا۔

فون کی گھنٹی پر وہ چونکی۔ خدا بخش نے ریسیور اٹھایا۔

”جی میں بتا دیتا ہوں۔“ اس نے سادگی سے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

”بیگم صاحبہ آپ کو لنچ ڈاکٹر علی کے ساتھ کرنا تھا۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔“

اس نے چونک کر فرش پر کھڑے آبنوس کی لکڑی کے سات فٹ اونچے .... بگ بین جیسے کلاک کو دیکھا جس کا تین فٹ لمبا پینڈولم بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ حرکت میں تھا۔ بگ بین جیسا ہی گھنٹا بجا کے اس نے ڈھائی بجے کا اعلان کیا۔ انہوں نے کتنے شوق سے یہ کلاک بنوایا تھا۔ رضیہ بیگم نے اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے دکھ سے سوچا۔ ایک معمول کے مطابق وہ باری باری ایک دوسرے کے ساتھ لنچ کرتے تھے اور بعض اوقات وہ بھول جاتی تھی کہ آج اسے جانا ہے۔

دھوپ تیز تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی گیٹ تک گئی۔ باہر کی سڑک پر اب نسبتاً سکون تھا اگرچہ بکرا منڈی کے چوک کی طرف جانے والی مسافر بردار ڈبا سوزوکیاں ہارن بجاتی گزر رہی تھیں۔ جس ویران سڑک پر گنتے چنے گھر تھے اس پر اب تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ گھروں کے ساتھ عام لوگوں

کے پانچ دس مرلہ والے ایک اور دو منزلہ مکان بھی کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ ان لوگوں میں سے اب کوئی نہ تھا جو کہتے تھے کہ وہ ڈاکٹرز کے سوا پارلے اسٹریٹ میں کسی کو آباد ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ڈاکٹر علی دو بیڈ کی الگ بنی انیکسی میں اکیلا رہتا تھا۔ سامنے کا گھر اس نے دونوں بیٹوں کے سپرد کر دیا تھا کہ جیسے چاہے رہو۔ وہ خود اپنی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت کا روادار نہیں تھا۔ اپنا ناشتا، کھانا خود بناتا تھا۔ بیٹوں کا کام کرنے والی ملازمہ اس کے برتن دھو جاتی تھی اور جھاڑو لگا جاتی تھی۔ انٹرکام پر وہ بیٹا بہو کو احکامات جاری کر دیتا تھا کہ اسے کیا چاہیے۔ صبح سے دوپہر کا وقت وہ اخبار پڑھنے میں، بہ آواز بلند موسیقی سننے یا کوئی فلم دیکھنے میں گزارتا تھا شام کو اس کا بھولا بھٹکا پرانا دوست یا مریض آجاتا تو اور بات تھی ورنہ وہ گھر اور انیکسی کی درمیانی جگہ کے لان پر پوتے پوتیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا اور وہ دھاچوکڑی مچتی تھی کہ آواز پڑوس تک رضیہ بیگم سنتی تھیں۔

''افوہ بھئی رضیہ...... میرا تو بھوک سے انتقال ہونے والا تھا۔ آج ایک نیا تجربہ کیا ہے میں نے۔'' وہ نئی ڈش کی تفصیل بتانے لگا۔

''سوری، میں کچھ اَپ سیٹ تھی۔''

''رشید کی وجہ سے؟'' وہ بولا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے اس کی گاڑی کو واپس جاتے دیکھا تھا اور وہ مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔ فارگیٹ رشید...... کھانا کھاؤ۔''

مرد کر سکتے ہیں۔ اولاد کا کنٹرول ہو یا اپنی زندگی پر اختیار حاصل کرنے کا مسئلہ...... عورت، بیٹی ہو تو مجبور، ماں ہو تو مجبور...... بیوی ہو تو مجبور...... اور کچھ بھی نہ ہو تو اس کا وجود صفر...... کوئی نہیں چاہتا کہ وہ جیے۔

''کافی اچھا پکانے لگے ہو تم اب۔'' رضیہ بیگم نے اخلاقاً کہا۔

اس نے ایک آہ بھری۔ ''مجھے پتا ہے کہ تم میرا دل رکھنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس خدا بخش جیسا ملازم ہوتا تو میں اس چکر میں نہ پڑتا۔ عادت خراب کر دی تھی مرنے والی نے...... اب یہ ایم ایس سی اور ڈاکٹر بہوئیں جو پکاتی ہیں جیسا پکاتی ہیں وہ ہر روز کھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔''

''ایسا تو ہوتا ہے۔ یہ جو لڑکیاں سائنس اور میڈیکل پڑھتی ہیں...... ماں باپ سمجھتے ہیں کہ ہمالیہ فتح کر رہی ہیں۔ ان پر گھر کے کام کاج کا بوجھ نہیں ڈالتے۔ کرنا وہی ہانڈی چولھا پڑتا ہے تو ہنر کہاں سے آئے۔''

''آدمی سیکھ لیتا ہے سب۔ مگر ان کو شوہر ملتے ہیں کاٹھ کے اُلّو...... صابر شاکر...... جو رکھ دو سامنے کھا لینے والے...... پھر رواج ہو گیا ہے باہر جا کے کھانے کا۔ فاسٹ فوڈ وغیرہ کا...... تو میں نے چھوڑ دیا تنقید کرنا۔ اپنی مرضی اور پسند کا پکوانے کے لیے بک بک جھک جھک...... اب سکون سے ہوں۔ پھر بھی موم یا ڈیڈ بولتے رہتے ہیں کہ آپ بچوں کو اسپوائل کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں، میرا تو حق ہے مگر دنیا کون سا ان کا اخلاق اور کردار سنوار رہی ہے۔ ورنہ بھرتی کرا دو کسی مدرسے میں۔'' وہ ہنسا۔

''میں ناکام رہی اس میں۔ ساتھ رہ کے کچھ نہیں کر سکی۔ پریشان تب بھی تھی۔ پریشان اب بھی ہوں۔''

''میں اسی لیے بریف کرتا رہتا ہوں۔ یہ پالیسی ٹھیک ہے۔ سمپل فارمولا...... تم اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیو، مجھے اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے دو۔ نو دخل اندازی...... نو شکایت...... نو توقعات۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سہ پہر کا وقت دونوں کے آرام کا تھا۔

☆☆☆

حمید نے شاہین کمپلیکس کی چھٹی منزل کی کھڑکی سے دیکھا جو مغرب کی طرف کھلتی تھی اور سمندر کی بھیگی ہوئی نمکین ہوا جو پوری آئی آئی چندریگر روڈ کو نہر کی طرح استعمال کرتی تھی۔ یلغار کرتی اندر آئی۔ دونوں جانب استادہ سیمنٹ، لوہے اور شیشے کی بلند عمارتوں نے جیسے ایک دیوار سی بنا رکھی تھی جس کی تہ میں بچھی ہوئی تارکول کی سڑک پر دونوں جانب آتی جاتی گاڑیوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ جاری تھا۔ دن کے مقابلے میں رات کو یہی سڑک تقریباً سنسان لگتی تھی جب بینکوں کے ہیڈ آفس، انشورنس کمپنیاں اور کارپوریٹ فرموں کے دفاتر خالی ہو جاتے تھے۔

کراچی کا واحد گھومنے والا ریسٹورنٹ اس عمارت کا ٹاپ فلور تھا۔ دوبارہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ ڈنر کرنے آیا تو اسے یوں لگا جیسے وہ پھر آفس آیا ہے۔ بچوں کا خیال تھا کہ یہ کلفٹن کے ساحل پر لگے جھولوں کی طرح گھومتا ہوگا۔ اس کی حرکت کی رفتار اتنی کم تھی کہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو بیٹھنے والوں کو چکر آنے لگتے۔ مگر بچے اس سلوموشن کو انجوائے نہیں کر سکے جس میں منظر دس پندرہ منٹ بعد بدلتا تھا اور اس بدلنے میں بھی نیا کچھ نہ تھا۔ عمارات، عمارات اور

عمارات...... وہ سوئٹزر لینڈ کا فلموں میں دکھایا جانے والا انداز کہاں ہو سکتا تھا کہ درخت...... پہاڑیاں، برف پوش نظارے یا آبشار تصویر کی طرح سامنے آتے رہیں۔

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ بھی اس منظر کی یکسانیت سے بیزار تھا لیکن سینٹرل ائر کنڈیشننگ والے کمرے کو ہر طرف سے بند رکھنا ضروری تھا۔ خاصا کشادہ ہونے کے باوجود اسے یہ آفس دن بھر کا قید خانہ لگتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اپنا آفس بنائے گا تو اس میں قدرتی پودے اور پھول ضرور ہوں گے جو موسم کے ساتھ بدلتے ہیں اور اندر کی آرائش کو بھی وہ تبدیل کرتا رہے گا۔

اس کی بانکی چھبیلی سیکریٹری نے اندر آ کے مطلع کیا۔

''سر! آپ کے مہمان آگئے ہیں۔''

''او کے، انہیں اندر لاؤ اور پہلے کافی دو۔''

''رائٹ سر۔'' وہ خاموشی سے غائب ہو گئی۔ پاگل کی بچی۔ کب تک اس خوش فہمی میں رہے گی کہ باس کو پھنسا کے شادی کر لے گی۔ ایسی نہ جانے کتنی آئی گئیں۔

اندر آنے والا اسی کی عمر کا خوش پوش ہنوز جوان نظر آنے والا شخص تھا جو ایک بزنس ڈیل کے لیے آیا تھا۔

''کیسے حال ہیں مسٹر آصف محمود؟ آپ کا دبئی کا دورہ کیسا گیا؟'' حمید نے مصافحے اور رسمی سلام کے بعد پوچھا۔

اس نے مسکرا کے آنکھ ماری۔ ''کاروباری اور نجی دونوں طرح سے......'' اس نے ہاتھ کا انگوٹھا بلند کیا۔

حمید ہنسا۔ ''پہلے نجی کامیابی کی بات کرو۔''

''یار اس دفعہ وہ مل گئی۔'' اس نے ایک ڈراما آرٹسٹ کا نام لیا۔ ''چند ڈراموں میں ہٹ ہوئی ہے۔ ماڈلنگ میں اِدھر اُدھر خوار پھرتی تھی۔ اب ہمارے پاکستانی ڈیزائنر وہاں خوب فیشن شو کر رہے ہیں۔ کسی نے اسے اٹھا لیا۔ جو ایونٹ منیجر ہے ایک یار ہے اپنا...... آج کل اس کے ساتھ ہے۔ ایم ایس وائی کے شو کا جھانسا دیا تھا لیکن اتفاق سے دوسرے برانڈ کے اشتہار کی شوٹ تھی۔ اس سے روٹھ گئی۔ اس نے میرے حوالے کر دی کہ بیٹا کل یہ اونچی ہواؤں میں اڑنے لگی تو گھاس نہیں ڈالے گی۔ تم سمجھتے ہو نا ان کی پی آر......''

''نہیں، میں بھولا بھالا معصوم شوہر ہوں۔ بالکل کاٹھ کا اُلّو۔''

سیکریٹری کافی کے دو مگ ان کے درمیان رکھنے آئی۔ اس نے بڑی ادا سے پوچھا۔ ''کیسے ہیں آپ آصف صاحب؟''

''پتا نہیں، تمہیں کیسا لگتا ہوں؟'' آصف نے اسے بھی آنکھ ماری۔ وہ بل کھا کے نکل گئی۔ ''یہ دانہ اچھا ہے تیرے پاس۔''

''پھر تو لے جا۔ دفتر کے سوا ہر کام کے لیے اچھی ہے دو سال ہو گئے میرے پاس...... میں بدلنا چاہتا ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے۔ میری والی تیرے حوالے آٹھ سال پرانا ماڈل ہے۔ کام کی بات ہو گئی، جگہ بھی فائنل کر لی۔''

حمید نے مسکرا کے کہا۔ ''گڈ یار، کتنا وقت ہے؟''

''بس دو ہفتے، دیر کا کوئی فائدہ نہیں۔''

حمید کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ ''دو ہفتے کم ہیں یار...... مجھے ٹائم چاہیے۔''

''حمید، قسمت صرف ایک بار دستک دیتی ہے۔ دیر کی گنجائش نہیں، ٹائم از منی۔''

''مجھے اندازہ ہے لیکن سارا مسئلہ ہے کیپٹل کا...... میں بھی سمجھتا ہوں کہ ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔''

آصف نے کہا۔ ''دیکھ یار، ایک تو معاملہ ہے دوستی کا۔ دوسرے پروفیشنل آدمی ہے تو جس پر میں ٹرسٹ کر سکتا ہوں ورنہ کیپٹل کے ساتھ تو چوائس بہت ہیں۔''

''بالکل ہوں گے۔ تیرے تو ابا کے بزنس کی گڈول کام آ گئی۔ مجھے لون میں پرابلم ہے۔''

''بھائی تیری تو اماں چلتا پھرتا بینک ہے۔ اس کے ایک دستخط کی بات ہے۔'' آصف نے کہا۔

''بالکل ہے لیکن وہ قائل ہوں تب......''

آصف ہنس پڑا۔ ''یار ماں کو قائل کرنا بیٹے کے لیے کیا مشکل ہے۔ بینک والے کمینے ہوتے ہیں۔ ایکسپلائٹ ہونے کے لیے ماں سب سے آگے آتی ہے خود...... خصوصاً یہ نانی، دادی جیسی مخلوق...... پرانے وقتوں کی......''

''بس وہ ذرا چالاک سمجھتی ہیں خود کو...... اِدھر اُدھر کے کچھ لوگ ٹانگ اڑا رہے ہیں...... مگر دو چار دن دے مجھے۔''

''او کے، آج کیا ہے۔ جمعرات، منڈے فائنل میٹنگ رکھتے ہیں۔'' آصف اٹھ کھڑا ہوا۔

حمید نے ہاتھ ملایا۔ ''منڈے۔''

آصف کے جانے کے بعد وہ خالی الذہن خالی میز پر طبلہ بجاتا رہا۔ اسے ایک آخری کوشش اور کرنی ہی ہوگی۔ یہ خوش قسمتی سے ملنے والا چانس ضائع ہو گیا تو پھر پتا نہیں زندگی کیا دکھائے۔ کیا زندگی ایسے ہی مڈل مینجمنٹ میں اِدھر

سے اُدھر بھٹکتے گزر جائے گی؟ یہ بھی قسمت کی ستم ظریفی تھی۔ کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے...... وہ دو لاکھ روپے ماہانہ کمار ہا تھا جس پر اکثریت کی آنکھیں رشک اور حسد سے کھلی رہ جاتی تھیں۔ سکس فیگر سیلری...... جہاں ایم بی اے کر کے لڑکے پندرہ بیس ہزار کی ملازمت تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ وہاں دو لاکھ تو خوش قسمتی کی انتہا اور قابلِ رشک ہوں گے۔

ابا کے زمانے میں پنشن والی سرکاری نوکری کرنے والا خوش نصیب تھا۔ پھر پرائیویٹ کمپنی کی تنخواہ اور شرائطِ ملازمت نے سرکاری نوکری کو لاحاصل غلامی بنا دیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ وقت آیا جب ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنے ملک میں لاگو شرائطِ ملازمت کی اور سہولیات کی ذمے داری چھوڑ کے پاکستان جیسے غریب ملک کے حالات سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ مستقل ملازمت ختم جس میں پنشن کی ذمے داری تھی۔ اس کی جگہ سالانہ کنٹریکٹ...... تجدید نہ ہو تو خدا حافظ۔ ہمارا آپ کا کل سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ملازمین پر لاگو قوانین کی پابندی بھی ختم۔ ایک کمپنی طے شدہ ماہانہ معاوضے پر ملازمت دے گی اور کہیں بھی بھیج دے گی اب وہ کتنی ہی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی ہو، آپ اس کے ملازم ہی نہیں۔ بس آپ ان کے لیے کام کرتے ہیں جہاں سے ٹھیکے پر آئے ہیں، جو بات کریں اس ٹھیکے دار سے کریں جس نے آپ کو بھیجا ہے۔ طبی سہولت چاہیے تو انشورنس کرالیں۔ یہ کام کوئی اور کرے گا۔ بیماری کا خرچہ وہ دے گا۔

حمید نے سب کچھ کر لیا تھا۔ وہ سب کے راستے کا تما جائز ناجائز کی پروا کیے بغیر اور دن رات ایک کر کے آگے نکلا تھا اور اب اس کے ماتحت اسی کی عمر اور صلاحیت والے یا اس سے زیادہ پڑھے لکھے اور تجربہ کاروں کی ایک پوری ٹیم تھی جس کی مجموعی کارکردگی اس کی ذمے داری تھی۔ خود حمید سے اوپر ڈائریکٹر...... ایگزیکٹو ڈائریکٹر...... سی ای او وغیرہ تھے جو اس سے جواب طلبی کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ دونوں طرف سے کھینچا جانے والا اسپرنگ ہو گیا تھا۔ ماتحتوں سے کام لینا آسان نہ تھا۔ سختی نرمی کا توازن رکھنے کے باوجود ماتحت اسے پسند نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ غیر مطمئن تھے۔ آمدنی سے کام کی زیادتی سے اور بہتر سے بہتر کے دباؤ سے...... اوپر والوں کی خوشنودی کے بغیر وہ خود آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

اور آگے بڑھنا کیسا، وہ ڈائریکٹر تو بننے سے رہا۔ اس کی تنخواہ دو سے ڈھائی لاکھ ہو جائے گی یا پھر کمی بیشی...... جو مہنگائی، اس کے معیارِ زندگی اور خواہشات کے مقابلے میں ہمیشہ ناکافی ہوگی۔ اسے آج کم سے کم پانچ لاکھ ماہانہ درکار تھے۔ پانچ سال بعد دس ہوں تو بات بنتی ہے۔ یہ بزنس کی بدولت ہی ممکن ہے۔ اپنا بزنس، چھوٹا بڑا، اچھا برا، جائز ناجائز، اس میں دن رات ایک کر دینے کا فائدہ بھی خود کو ہوتا ہے۔ اس کے لیے سرمایہ درکار ہے۔ صلاحیت اور چانس...... صرف ایک چیز اس کی دسترس میں نہیں تھی، سرمایہ، وقت کم تھا، اسے چانس نہیں گنوانا تھا۔

خوشبو کا جھونکا بن کے سیکریٹری اس کے سامنے آبیٹھی۔ اس نے اپنے حسن و شباب اور ناز و ادا کے اسلحہ خانے کو وقت کی مناسبت سے چمکا لیا تھا۔ دفتری وقت کے ساتھ دفتر کا پروٹوکول بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے زلفِ پریشاں کو رخ سے ہٹاتے ہوئے زورِ شباب کو ہاتھ اٹھا کے نمایاں کیا اور مسکرائی۔ ”اب کیا کرنا ہے سر؟ کیا پروگرام ہے؟“

وہ سنبھل گیا۔ سوال کے پیچھے سوالات کا مطلب کچھ اور تھا۔ ”بس، میں انتظار کر رہا تھا۔ دن میں جو کلائنٹ آیا تھا اس کے ساتھ میٹنگ ہے پھر......“

وہ کچھ مایوس ہوئی۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ حوصلہ افزا جواب کی توقع رکھتی تھی۔ مثلاً یہ کہ جیسا تمہارا موڈ ہو۔ یا واضح الفاظ میں...... کیا خیال ہے مری چلیں، ویک اینڈ کا رش تو ہوگا مگر شب بسری کا ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ حمید کا موڈ اپ سیٹ تھا۔ وہ کچھ فکرمند تھا۔ اس نے ساتھ بیٹھنے کے بعد پوچھا بھی تو حمید ٹال گیا۔ اسے راستے میں فلیٹ پر ڈراپ کر کے وہ گڈبائی کہے بغیر ہی نکل گیا۔ اس نے ایک آہ بھری۔ خیر، ہوجاتا ہے ایسا بھی۔ آفٹر آل وہ شادی شدہ ہے۔ ہر ویک اینڈ میرے نام کیسے کر سکتا ہے۔ پس منظر میں کہیں خطرے کی گھنٹی بھی بجی۔ کوئی اور ٹھکانا تو نہیں مل گیا اسے...... یہ بھی ہوتا ہے۔ ڈپریشن سے بچنے کے لیے اس نے ناموں کی فہرست دل میں دہرائی جن کو وہ رابطہ کر کے سلیقے سے مطلع کر سکتی تھی کہ ویک اینڈ کے لیے وہ دستیاب ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا افشاں سے سامنا ہوا جو اپنی دانست میں اس کے لیے ویک اینڈ کی خصوصی ڈش کے طور پر تیار تھی۔ حمید نے خود کو اینٹی کلائمکس کے لیے تیار کیا۔ وہ کوٹ کو صوفے پر ڈال کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

افشاں اس کے سرہانے یوں آبیٹھی کہ اس کے بال حمید کے چہرے پر اور اس کے جسم کا گداز حصہ حمید کے شانے پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ ”تم کچھ تھکے ہوئے ہو، چائے

لاؤں یا کافی؟''
''کچھ نہیں، اچھا کافی لے آؤ۔'' افشاں کو دور دھکیلنے سے دور کرنے کا یہ طریقہ بہتر تھا۔
وہ پانچ منٹ میں تیار کافی لے کر لوٹی تو وہ چینج کر کے صوفے پر آبیٹھا تھا اور ٹی وی پر خبریں دیکھ رہا تھا۔
افشاں کو مایوسی ہوئی۔ ''ہم پہنچ تو سکتے ہیں مری...... زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''
حمید کو یاد آچکا تھا کہ اس نے کیا وعدہ کر رکھا تھا۔ ''سوری افشاں، ابھی ہم مری نہیں جاسکتے۔''
''چلو صبح سہی...... ذرا جلدی نکل جائیں گے۔''
حمید نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مری نہیں، ہم امی کی طرف جائیں گے سب۔''
افشاں کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ ''حمید، اس سیزن میں یہ پہلا ٹرپ تھا۔''
''مجھے معلوم ہے ڈیئر لیکن بعض اوقات تفریح پر کام کو ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔''
''وہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم یہی کہو گے، کام زیادہ اہم ہے فیملی سے......''
حمید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہاں کیونکہ فیملی کو جو بھی میسر ہے...... کام سے ہے۔ لڑنے کی ضرورت نہیں۔ سکون سے بیٹھ کے میری بات سنو۔ مری کیا ہے ہمارے لیے...... پنڈی کا ایک محلہ...... میں تو چاہتا ہوں کہ تمہیں اور بچوں کو دبئی لے جاؤں، یورپ لے جاؤں۔''
''کب؟ دس سال بعد...... میں کل کی بات کر رہی تھی۔'' افشاں نے ہتھیار ڈال دینا بہتر سمجھا۔
''کل ہم امی کی طرف جائیں گے۔'' حمید نے دہرایا۔ ''اور بچوں کے ساتھ ویک اینڈ وہیں گزاریں گے۔ میری بات ذرا دھیان سے سنو، تم میری شریکِ حیات ہو۔ کامیابی کے سفر میں تمہاری سپورٹ ضروری ہے میرے لیے۔ ہمارے لیے، بچوں کے لیے تاکہ کل کو میں بھی کہہ سکوں کہ ہاں، ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور میرے پیچھے افشاں کا ہاتھ تھا۔''
اس کا وار کارگر رہا۔ افشاں کا سخت رویہ پگھل کے موم ہوگیا۔ ''تو کیا میں نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیا نہیں؟''
''اب ذرا دھیان سے میری بات سنو۔ مجھے ایک انویسٹمنٹ کا گولڈن چانس مل رہا ہے۔ اس پر پانچ لاکھ روپے ماہانہ کا منافع یقینی ہے۔ نوکری میں تو یہ ناممکن ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اسی ماہ میں نوکری پر لات ماردوں اور ہم دبئی شفٹ ہوجائیں۔''
''دبئی۔'' اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ''پھر سوچ کیا رہے ہو؟''
وہ مسکرایا۔ ''سویٹ ہارٹ...... انویسٹمنٹ کا مطلب ہوتا ہے سرمایہ کاری...... پچاس لاکھ کی سرمایہ کاری۔''
''یہ پچاس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟''
''ایک پارٹنر نے باپ کے کاروبار کی گڈول پر پچاس لاکھ کا بینک لون لیا ہے۔ نقد کس کے پاس ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ سرمایہ امی فراہم کرسکتی ہیں۔''
''وہ کبھی نہیں کریں گی۔ پہلے بھی صاف کہہ چکی ہیں کہ جتنا کرچکی ہیں، اس سے زیادہ کی امید مت رکھنا۔''
''اب اصل چیلنج یہی ہے۔ ان کا ارادہ بدلنا۔ ہم جس حال میں ہیں آج افشاں...... اس کے ذمے دار بھی ہم خود ہیں۔ رشید بھائی تو پھر بھی فائدے میں رہے کہ ایک کنال کی نئی کوٹھی ہتھیالی۔ بچوں کے نام پر...... ہم کہاں رہنے پر مجبور ہیں؟ بے شک ہمارے دو بچے ہیں اور جگہ کا مسئلہ نہیں۔ مگر یہ جگہ جہاں یہ گھر ہے۔ پچاس سال پرانی آبادی ہے۔ آس پاس کیسے لوگ رہتے ہیں؟ سب کاروباری...... کوئی بزنس ایگزیکٹو یہاں نہیں رہتا۔ نوکری میں کچھ بدلنے والا نہیں ہے۔ اگر اماں پچاس لاکھ فراہم کردیں......''
''وہ صاف بتا چکی ہیں کہ میرا بینک اکاؤنٹ دیکھ لو۔ اب اتنا ہی ہے جتنا میری ضرورت کے لیے درکار ہے۔''
''اُفوہ...... نقد کون مانگ رہا ہے۔ وہ صرف گارنٹی دینے پر راضی ہوجائیں۔ دیکھو نا...... کم سے کم پانچ کروڑ کی ہے وہ جگہ جہاں وہ اکیلی رہتی ہیں۔ اس پیرِ تسمہ پا کے ساتھ۔''
''اس کا تو نام خدا بخش ہے۔''
''ہاں وہی۔ اس پراپرٹی پر وہ وہیں رہتے ہوئے لون لے سکتی ہیں۔ کسی بھی بینک سے...... چار کروڑ تک...... میں تو صرف پچاس لاکھ کی بات کروں گا۔''
''میں نے سنا ہے۔ رشید بھائی نے بھی اتنے ہی مانگے تھے۔ ذلیل ہوکے واپس آئے۔''
وہ چونکا۔ ''کس سے سنا تھا؟''
''وہ...... بھابی کی ایک فرینڈ ہے۔ میری بھی...... اس نے بتایا تھا فون پر...... انہوں نے کہا کہ قرضہ ادا نہ کیا تم نے تو بے گھر مجھے کیا جائے گا۔''
''ہونہہ...... کون بے گھر کرسکتا ہے صرف ایک کروڑ

کے لیے..... بالفرض محال ایسا ہو تو جگہ نیلام ہوتی ہے ورنہ ایسے ہی کوئی پانچ کی جگہ چار میں کھڑے کھڑے نقد اٹھاتا ہے۔ ایک کروڑ بینک کے منہ پر مارو تین کروڑ میں اسلام آباد کی بہترین کوٹھی ملتی ہے۔''

''اس کے لیے کان کو ہاتھ گھما کے پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کوٹھی پانچ کی ہے۔ کیا پتا ساڑھے پانچ میں نکل جائے۔ پانچ بھی ملیں تو چار بچتے ہیں۔ بینک لون کو بیچ میں لانا کیوں ضروری ہے۔''

''دیکھو، پہلی بات تو یہ کہ جائدادوں کے اتنے بڑے سودے یوں کھڑے کھڑے نہیں ہوتے۔ بینک کی بات میں اور میرا پارٹنر دو ہفتوں میں طے کرا سکتے ہیں۔ لیکن افشاں...... سارا مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ جیتے جی اس جگہ کو فروخت کرنے کی بات ہی نہیں کرتیں۔ کہتی ہیں کہ تمہاری چیز ہے...... میرے بعد جو چاہو کرنا۔ ابا کی نشانی کو گلے سے لگائے بیٹھی ہیں۔''

''خود غرضی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔''

''ایسا مت کہو۔ ذرا ان کی پوزیشن میں خود کو رکھ کے دیکھو۔ اس عمر میں...... اور پھر قصوروار ہم ہی ہیں۔ جب میں نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی اور مجھ سے پہلے رشید بھائی نے۔''

''وہ اپنی مرضی تم پر زبردستی کیسے تھوپ سکتی تھیں اور تم نے بتایا کہ ایک ریٹائرڈ جنرل کی تنک چڑھی بیٹی تھی۔ وہ ایسے رہتی...... جیسے میں نے گزارا کیا؟''

حمید نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ ''میں نے بھی ان کی زبردستی کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں تم کو چاہتا تھا اور میں بھی اڑ گیا تھا کہ زندگی میری ہے۔ میں اپنی مرضی سے شادی کروں گا۔ یہ بھی برداشت کر لیا تھا انہوں نے...... خرابی تم نے کی۔''

وہ بھڑک اٹھی۔ ''میں نے؟''

''ہاں تم نے اور بھابی نے...... ہمارے سمجھانے کے باوجود تم نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا ان کے خلاف...... ہر وقت کا فساد...... ہر بات میں ضد...... ہر معاملے میں بک بک......''

''تو اور کیا کرتی میں۔ چوبیس گھنٹے ذلیل ہوتی جیسے میں زر خرید ہوں۔ غلام ہوں۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا ان کی مرضی سے کروں۔ کہیں آؤں جاؤں تو ان کی اجازت سے...... پہنوں تو ان کی پسند کا......'' افشاں لڑنے پر اتر آئی۔

''دیکھو، مصلحت اور ڈپلومیسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ان کی عمر کی عورت کو رعایت دینا پڑتی ہے۔''

''یہ رعایت کا مسئلہ نہیں تھا، ہر بیوہ یہی کرتی ہے۔ اولاد کا استحصال...... احسان جتاتی ہے ہر وقت کہ میں نے ماں کے ساتھ باپ بن کے پالا۔ زمانے کی باتیں سنیں۔ جوانی قربان کر دی۔ اب اس کے بدلے میری غلامی کرو۔ بیوی کو میری نوکرانی بنا دو۔ یہ تم خود کہتے تھے۔ کہتے تھے یا نہیں؟ تم نہ چھوڑتے ماں کو...... مجھے چھوڑ دیتے۔''

''یہ کیا فضول بات ہے۔ تم ہی دن رات روتی تھیں کہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ لعنت اس محل پر...... مجھے کرائے کا چھوٹا سا گھر چاہیے جہاں سکون ہو میرے لیے...... میں کیا کرتا، مجھے بھی گھر میں سکون کی ضرورت تھی۔ دفتر میں مغز کھپا کے آؤ تو گھر کی جنگ...... میں کیا کرتا۔''

''تو اب کیا کرنا ہے، یہ بتاؤ؟''

''ڈراما اور کیا بلکہ جا کے ان کے پاؤں پکڑ لیں۔ معافی مانگ لیں۔ کہیں کہ ہم نے غلطی کی تھی۔ ہم ان کے بغیر نہیں رہ سکتے اور ان کے پوتوں کو بھی دادی کی شفقت چاہیے۔''

افشاں تلخی سے ہنسی۔ ''اور تم کو یقین ہے کہ ان کا دل موم ہو جائے گا۔ وہ اتنی جذباتی ہو جائیں گی کہ فوراً تم کو گلے لگا لیں گی اور اگلے دن تمہارے کہنے سے وہ گھر گروی رکھ دیں گی۔ حمید...... کیا تم اتنے بے وقوف ہو یا ایسی بے وقوف ہے تمہاری ماں...... ان کو خود مختاری کے ساتھ اور اتھارٹی کے ساتھ جینے کی پٹی پڑھانے والا ہے ان کا بوائے فرینڈ...... ان کا پڑوسی ڈاکٹر علی۔''

حمید کے کچھ بولنے سے پہلے فون بولنے لگا۔ اس نے بھائی کا چہرہ دیکھا تو کال ریسیو کر لی۔ ''جی بھائی؟''

''کہاں ہو...... آفس میں...... گھر پر یا کہیں اور؟'' رشید کی آواز آئی۔

''گھر پر ہوں...... کوئی کام ہے؟''

''کیا تم نے دبئی میں شراکت داری پر کوئی بزنس کیا ہے؟ جس کے لیے تم کو پچاس لاکھ کا لون چاہیے؟''

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''آپ کو کس نے بتایا؟''

''تم ایسا کرو۔ میری طرف آ جاؤ سب...... کھانا یہاں کھا لینا...... بات کرنی ہے تم سے۔'' رشید نے کہا اور فون رکھ دیا۔

☆☆☆

شہر بانو عرف شیری زندگی میں دوسری بار شدید طوفانی بحران سے دوچار تھی۔ ان دو بحرانوں کے درمیان میں سال کا وقفہ حائل تھا۔ پہلا آغازِ شباب کے اس دور میں آیا تھا جب جذبات کے سمندر میں تلاطم ایک طوفان بن جاتا تھا۔ لیکن اس کو بلاخیز بنانے میں بغاوت کا ایک جذبہ بھی شامل تھا جو اس کے وجود میں یوں بڑھ رہا تھا جیسے پریشر ککر میں اسٹیم جمع ہونے لگے تو ایک حد کے بعد بم کی طرح پھٹ جاتا ہے اور ہر طرف تباہی پھیلا دیتا ہے۔ اس کے زخم مندمل ہو جانے کے باوجود شیری کی یادوں کے قبرستان میں پھرتے وہ بھوت تھے جو کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔

بلوغت یا ٹین ایج کی خودمختاری کا دور دہرا انقلاب لاتا ہے۔ اسی عمر میں فریق ثانی کے لیے دلکشی، چاہنے اور چاہے جانے کے جذبات سر اٹھاتے ہیں۔ شیری کے ساتھ کچھ انوکھا نہیں تھا مگر اس کے اندر ایک غصہ اپنے باپ اور کسی حد تک ماں کے خلاف بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے جو اپنے لیے سوچا اس پر بچوں کا مستقبل قربان کر دیا۔ پاکستانیت کا اجر کمانے کا جذبہ باپ میں جاگا تھا۔ یہ جذبات تب سر اٹھاتے ہیں جب بڑھاپا دستک دینے لگتا ہے مگر اس کو یہ دنیا کمانے کے بعد اگلی دنیا کی فکر قبل از وقت پڑ گئی اور اس نے قانونی اختیار استعمال کرتے ہوئے سب بچوں کو عرش سے فرش پر پٹخ دیا۔

لوگ کتنی مشکل سے کتنے جتن کر کے پاکستان سے برطانیہ، امریکا جاتے ہیں۔ واپس کون آتا ہے۔ لوگ یہاں سے بچوں کو اچھی تعلیم کے لیے باہر بھیجتے ہیں۔ وہ پہلا باپ تھا جس نے لندن میں پڑھنے والے بچوں کو واپس لا کے پاکستان کے اسکولوں میں ڈال دیا۔ بے شک اسکول اپر کلاس کے ماڈرن تھے لیکن اس کے بعد...... گدھے گھوڑے کالج یونیورسٹی میں برابر...... اولیول کا الٹا نقصان...... ایک سال ضائع اور نمبر بھی اصل سے کم لگا کے داخلہ......

کالج میں شیری کا دم گھٹتا تھا۔ مری روڈ کو چھوڑ کے وہ صدر میں گورنمنٹ کالج میں آگئی جہاں پروفیسر خواجہ مسعود کی وائف پرنسپل تھیں۔ ایک شفیق لائق فائق اور لبرل خاتون...... مگر کلاس روم تو وہی تھے۔ شکستہ ہلتی بینچوں والے...... نیم تاریک کمرے جن میں پچاس کی جگہ سو لڑکیاں ٹھونس دی جاتی تھیں۔ یہ تعلیم اور یہ گھٹن...... احساسِ جرم والے ماحول...... سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

وہ بہت چیخی چلائی۔ روئی پیٹی مگر ابا کا دماغ پلٹ گیا تھا۔ وہ مغرب کی آزادی اور بے حیائی والے ماحول میں بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ روزِ محشر ان کے اعمال کی ذمے داری پرورش کرنے والوں پر بھی عائد ہو گی۔ ابا بڑے تحمل سے بات کرتے تھے۔ بیٹا، ہم مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں۔ ہمیں اسی معاشرے میں رہنا ہے اور عزت سے رہنا ہے۔ خدا کی مرضی کہ اس نے تمہیں میرے گھر میں پیدا کیا۔ لندن کے کسی انگریز کی بیٹی نہیں بنایا۔

دونوں بھائیوں کا احتجاج بھی رائگاں گیا۔ بالغ ہو جانے کے بعد بھی خودمختاری صرف قانون کی کتاب تک محدود تھی۔ شیری نے ردِعمل کے طور پر وہ سب کیا جو ممنوع تھا۔ ڈرائیور سے ایک بار بات کر کے ذلیل ہونے کے بعد شیری نے بند راستوں میں سرنگ خود بنائی۔ آہستہ آہستہ اس نے ارد گرد کی لڑکیوں سے سب کچھ سیکھ لیا۔ اس نے بھی ایک برقع بنوا لیا جو وقتِ ضرورت ایک تھیلی لے آتی تھی۔ اس میں ہمت بہت زیادہ تھی جو لندن کے ماحول کا عطیہ تھی۔ یکے بعد دیگرے کئی خوش حال گھرانوں کے لڑکوں سے معاشقے میں شیری نے کسی جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اسے ہوٹلوں کے کمرے میں بھی لے گئے۔ دوستوں کے گھر بھی مگر نہ اسے کوئی شیئر کر سکا نہ بلیک میل...... جہاں خطرہ ہوا اس نے دھمکی دے دی کہ ابھی شور مچاتی ہوں...... میری فکر چھوڑو...... تم کو اندر کرا دوں گی...... ایک کے ساتھ سب جائز تھا جب تک کہ وہ خود نہ بھاگ جائے۔ جیسا کہ لندن میں ہوتا تھا۔ راضی خوشی دونوں اپنے اپنے راستے...... حفاظتی طریقے وہ یہاں کے لڑکوں سے بہتر جانتی تھی۔

موقع پاتے ہی اس نے ڈرائیور پر دست درازی کا الزام لگا کے اور آہ و بکا سے اپنے جھوٹ کو سچ بنا کے نوکری سے نکلوا دیا۔ سال بھر بعد آنے والے دوسرے ڈرائیور سے نمٹنا آسان ثابت ہوا۔ وہ غریب اور ضرورت مند تھا۔ پیسا اور دھمکی دونوں کام کر گئے۔ دیر سویر کی صورت میں وہ شیری کو مطلوبہ جگہ سے اٹھا لیتا تھا اور گاڑی خراب ہونے کا عذر بھی پیش کر دیتا تھا۔ اسے تنخواہ کے برابر انعام مل رہا تھا۔ کروڑ پتی ابا جیب خرچ کے معاملے میں بڑے فراخ دل تھے۔ اور ان کو کبھی شک بھی نہیں ہوا تعلیم کے ساتھ بیٹی کیا تجربات حاصل کر رہی ہے۔ اس کی رپورٹس بہترین ہوتی تھیں۔ اس نے ایک پرانی بات کو غلط ثابت کر دیا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اس کے بی اے کرنے تک درجن بھر عشق چھپے رہے اور دو چار "مشک" جیسے کیس بھی۔

بجلی اس روز گری جب بی اے کے بعد اس کی تعلیم کا

سلسلہ روک دیا گیا۔ اس کا لاہور جا کے ہوسٹل میں رہنے اور گورنمنٹ کالج سے ایم اے کرنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ ماں نے بتایا کہ اس کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔

اس پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ ”ایسی کی تیسی اچھے رشتے کی۔ میں ایم اے کروں گی... شادی نہیں۔“

”ایم اے شادی کے بعد کرنا۔“ ابا نے قطعی فیصلہ سنا دیا۔ ”ہم رشتے کو انکار نہیں کر سکتے۔“

”مت کریں۔ میں خود کر دوں گی۔ ذرا آئے تو سہی وہ میرے سامنے۔“

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک ہفتہ سخت ٹینشن میں گزار کے اس نے حکمتِ عملی طے کر لی تھی۔ دونوں طرف سے سرد جنگ میں چند دن کی خاموشی کے بعد ماں نے پھر اسے سمجھانے کے لیے ایک بریفنگ دی جو زیادہ دوستانہ تھی۔ پاکستان میں اچھے رشتوں کی کمی اور شادی کی مارکیٹ ویلیو رکھنے والی عمر گزر جانے کے نقصانات سمجھائے تھے۔ وہ خاموش رہی جسے اس کی نیم رضامندی سمجھ لیا گیا۔ مقررہ تاریخ پر لڑکا اپنے ماں باپ کے ساتھ آیا تو اسے منظوری کی رسمی کارروائی کے لیے پیش کیا گیا۔ لڑکا واقعی اچھا تھا۔ ہینڈسم، اعلیٰ تعلیم یافتہ، بزنس مین۔ اسے شیری پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر شیری نے اچانک بم پھینک دیا۔

”آپ نے تو قبول کر لیا مجھے..... مجھ سے بھی تو پوچھیے..... میں کیا سامان برائے فروخت ہوں۔“ اس نے کہا۔

ایک دم جیسے زلزلہ آ گیا۔ کس نے کس سے کیا کہا۔ شیری نے نہیں سنا۔

وہ چلاتی رہی۔ ”مجھے یہ قانونی حق حاصل ہے۔ شرع نے اجازت دی ہے۔ زبردستی کی تو میں بھاگ جاؤں گی۔ نکاح کے بعد بھی بھاگ جاؤں گی۔“

اسے ہوش آیا تو گھر پر قبرستان کا سکوت اور آسیب طاری تھا۔ اس پر نقاہت اور غنودگی طاری تھی۔ اس کی ماں ایک ڈاکٹر کے ساتھ آئی۔ ڈاکٹر نے اس سے مسکرا کے حال پوچھا۔ نبض دیکھی، بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کی ماں سوگواری چپ بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر پھر انجکشن لگا کے چلا گیا۔ اسے خود ماں کھانا دینے آتی رہی مگر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ دہرے عذاب میں تھی۔ ایک طرف بیٹی کی فکر تھی، دوسری طرف اس دنیا کی جس میں وہ سب رہتے تھے۔

طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد بھی گھر میں کوئی اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ باپ جس کی وہ از حد لاڈلی تھی۔ جو اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔ سب سے زیادہ اس کے بارے میں سوچتا تھا جیسے اسے بھول گیا تھا۔ حمید یار شید سے تو اسے یوں بھی کوئی امید نہ تھی۔ وہ اپنے کیے پر نادم ضرور تھی مگر اسے بغاوت پر مجبور کرنے والے تو وہ سب تھے جو اس کے ساتھ زبردستی کرنے میں ایک طرف ہو گئے تھے۔ مانا کہ پاکستان میں لڑکیوں کو وہ آزادی حاصل نہیں تھی جو یورپ، امریکا میں تھی مگر ان کے اپنے طبقے میں لڑکیاں خودمختار تھیں۔ وہ گاڑی لے کر گھومتی تھیں۔ فیشن کرتی تھیں، شاپنگ کے لیے جاتی تھیں۔ ڈاکٹر اور ٹیچرز تھیں۔ اور ایسا بھی نہیں کہ شادی کے معاملے میں ان کی مرضی بالکل نہیں چلتی تھی۔ ایسے واقعات ان گنت تھے جب انہوں نے اپنی مرضی بتائی اور ماں باپ مان گئے۔ اس سے تو کسی نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ ایک نام ضرور بتا سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کسی دن وہ ضرور اسے پرپوز کرے گا۔ ابھی وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا اور ان کا تعلق اب ایک سال سے زیادہ پرانا ہو چکا تھا۔

بغاوت اور پابندیوں کے ردِعمل میں اس نے جو کچھ کیا تھا وہ درست نہیں تھا۔ اس کا وہ دور کوئی خوش گوار یادیں بھی نہیں رکھتا تھا مگر اس نے سیکھا تھا۔ اسے انسانوں کی پہچان اور اس معاشرے کا چلن آ گیا تھا۔ وہ ایک سال سے مل رہے تھے اور ابھی تک اس نے وہ پیش قدمی نہیں کی تھی جو اس سے پہلے چند لڑکے کر چکے تھے۔ وہ اکٹھے گھومتے پھرتے تھے۔ وہ اس کو اپنے گھر اور ماں باپ کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اور ایک برتھ ڈے پارٹی میں ان سے ملوا بھی چکا تھا۔ اس نے شیری کو اپنی یونیورسٹی کی ساتھی بتایا تھا۔ وہاں بے حد کھلا ماحول تھا۔ اس کے ماں باپ فراخ دل لوگ تھے۔ وہ نوجوانوں کے ہلے گلے میں شریک نہیں تھے تو اس میں مخل بھی نہیں ہو رہے تھے۔ اپنی پسند اور پھر محبت کا اظہار وہ کر چکا تھا مگر شادی کی بات اس نے غالباً اس لیے نہیں کی تھی کہ یہاں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے پہلے لڑکے جو سیریس ہوں، ایسا نہیں کرتے تھے۔ وہ بھی اسے پسند کرتی تھی اور منتظر تھی کہ وہ کوئی بات کرے تو اسے کہے کہ اپنے ماں باپ کو بھیجو۔

اس وقت موبائل فون متعارف بھی نہیں ہوئے تھے۔ گھر میں دو فون تھے۔ ایک پاپا کی اسٹڈی میں جو ان کا آفس اور کلینک سب کچھ تھا۔ دوسرا گھر کے استعمال کا لاؤنج میں رکھا رہتا تھا۔ پہلے کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی کالج کی فرینڈز کے ساتھ ان سے بھی بات کر لیتی تھی جو فرینڈز

تھے مگر ابھی حالات مخالف تھے۔ کالج چھوڑنے کے بعد اس کے احتجاجی رویے نے اور اب شادی کے معاملے پر بغاوت نے اس کی حیثیت ایک مجرم جیسی بنا دی تھی۔ اس کو یہ احساس ضرور تھا کہ اس کا ردِعمل مناسب نہیں تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کو خبردار کر سکتی تھی کہ زبردستی کا نتیجہ برا نکلے گا یا اس کا رشتہ مانگنے کے لیے آنے والوں کے سامنے شرافت اور سنجیدگی سے بات کر سکتی تھی۔ نتیجہ اس کے حق میں ہی نکلتا۔

لیکن اب گھر والوں کا رویہ پھر اس کے اندر بغاوت کے جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ وہ پہلے بھی دیر سے سو کے اٹھتی تھی اور الگ ناشتا کرتی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر صرف ماں ساتھ ہوتی تھی جو اب خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھی۔ اس کی بات کا جواب ہوں ہاں میں دے دیتی تھی۔ رات کے کھانے پر سب آپس میں بات کرتے تھے مگر بے تکلفی اور ہنسی مذاق کی بات اب کوئی نہیں کرتا تھا۔

اسے گھر ایک قید خانہ لگنے لگا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس نے بڑے بھائی سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ کام کا بہانہ کر کے نکل گیا۔ ماں نے صاف کہہ دیا تھا کہ جو تمہارا دل چاہے کرو۔ جو پوچھنا ہے، اپنے باپ سے پوچھو۔ اب شیری کا دل واقعی یہ چاہتا تھا کہ اس گھر سے بھاگ جائے۔ پھر جو ہو سو ہو۔ مگر بھاگ کے وہ کہاں جائے گی؟ یہ سوال اسے روک لیتا تھا۔ جتنا وقت اس نے پاکستان میں گزارا تھا، اس سے وہ اندازہ کر چکی تھی کہ یہاں اکیلی عورت کتنی غیر محفوظ ہے۔ اس کو ایک گھر اور ایک مرد کا سہارا چاہیے تھا خواہ وہ باپ ہو بھائی یا شوہر...... پاپا کے پاس واقعی وقت نہ تھا۔ وہ صبح نکل جاتے تھے اور نہ جانے کہاں کہاں مصروف رہتے تھے۔ شام کو وہ ایک مشہور اسپتال میں بیٹھنے بھی لگے تھے تاکہ ان کا اپنے پروفیشن سے تعلق نہ ٹوٹے اور مریضوں سے رابطہ رہے۔

ایک ہفتے بعد اس کے چھوٹے بھائی کو بخار ہوا۔ وہ کالج نہ جا سکا تو اس کی طبیعت پوچھنے چلی گئی۔ اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ موقع پا کے اس نے کہا۔ ''حمید! یہ کیا رویہ اختیار کر لیا ہے سب نے میرے ساتھ؟''

''بہنا، اس کی ذمے دار تم خود ہو۔'' وہ بولا۔

''کیا اتنا سنگین جرم کیا ہے میں نے؟''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟ معلوم ہے وہ بات کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ کتنی بے عزتی ہوئی ہے پاپا کی۔ ماں بھی پریشان ہیں کہ آخر تمہارا ہو گا کیا۔ اب کون لے کر آئے گا تمہارے لیے رشتہ۔''

''تو نہ آئے۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔ اور کرنی ہو گی تو خود کر لوں گی۔'' وہ برہمی سے بولی۔

''بہتر ہے کر لو۔ ہماری جتنی بے عزتی ہونی ہے، ایک بار ہو جائے۔ ابھی تو ہم جہاں جاتے ہیں منہ سے کوئی کچھ نہ کہے سب کی نظریں ہمیں صرف سوال کرتی اور الزام لگاتی محسوس ہوتی ہیں۔ تمہارے کردار پر تو انگلی اٹھاتے ہی ہیں لوگ...... پاپا کی تربیت پر حرف آتا ہے۔''

''ساری غلطی پاپا کی ہے جو ہمیں اٹھا کے اس جہنم میں لائے۔''

''پاپا کی غلطی میں بھی مانتا ہوں مگر جب برا وقت آئے گا تو اپنے لیے اور فیملی کے لیے سارے فیصلے میں کروں گا کہ کیا اچھا ہے کیا برا۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ نہ اٹھارہ سال میں بچے گھر چھوڑتے ہیں اور نہ ماں باپ کہتے ہیں کہ اب جاؤ اپنی زندگی خود اپنے سہارے پر گزارو۔ یہاں وہ ہمیشہ ذمے دار رہتے ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں...... کہ اس کی زندگی محفوظ رہے۔ شوہر سے اختلاف نہ ہو۔ مالی پریشانی نہ ہو۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے مگر ڈر ہمیشہ رہتا ہے کہ داماد دوسری شادی نہ کر لے۔ طلاق دے کر واپس نہ بھیج دے۔ یہاں کا قانون برطانیہ والا نہیں۔ عورت کو کہیں سہارا نہیں ملتا۔ قصور ہو نہ ہو بدنامی اسی کی ہوتی ہے۔ کوئی اس سے دوسری شادی نہیں کرتا۔''

وہ حیرانی سے حمید کی باتیں سنتی رہی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ جو ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے۔

''پاپا نے ایک غلط فیصلہ کیا۔ اس وقت خود انہیں کب معلوم تھا کہ فیصلہ غلط ہے۔ وہ باہر بیٹھ کے یہاں کے حالات اور ماحول کا اندازہ نہ کر سکے۔ لیکن وہ بہت کامیاب آدمی ہیں۔ جو زندگی انہوں نے جی...... سخت جدوجہد کی تھی۔ اور جو زندگی ہمیں ملی عیاشی کی ہے...... دولت مندی کے سارے آرام والی زندگی...... مجھے معلوم ہے کہ میرا مستقبل اس تعلیم کے بغیر بھی کتنا محفوظ ہے جو مجھے لندن میں ملتی۔''

شیری کی زندگی دو متضاد قوتوں کے درمیان بٹ گئی۔ وہ اپنی زندگی جینے کا رسک لے...... جو غیر یقینی اور غیر محفوظ ہے۔ یا وقت کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دے۔ اس سے کیوں نہ پوچھ لے؟ وہ انجینئر بن جائے گا۔ بیک گراؤنڈ مضبوط ہے۔ اور وہ خود مختار بھی ہے۔ بے شک ایک لڑکی کے لیے یہ خود پوچھنا کہ تم مجھ سے شادی کرو گے؟ اپنی اہمیت کم کرنے والی بات ہے مگر اسے فیصلہ کرنا ہے۔ مستقبل کو دیکھے یا اہمیت کو...... ارادہ تو وہ رکھتا ہے بس وقت کی

بات ہے۔لیکن اس کو دو جواب ملنے کی توقع رکھنی چاہیے۔ ایک وہی کہ کروں گا مگر فوراً نہیں۔اس نے سال بعد کہہ دیا تو؟ سال کے دو سال بھی ہو سکتے ہیں اور...... سال بعد اس کے جذبات بدل بھی تو سکتے ہیں۔ وہ ایک سال اس زنداں میں کیسے گزارے گی؟ اور جذبات کی بات مختلف ہے۔ فیصلے کی گھڑی سامنے آگئی تو وہ انکار بھی کر سکتا ہے...... کہہ سکتا ہے کہ جب وقت آئے گا تب دیکھیں گے۔اس کی خود اپنی نظر میں دو کوڑی کی عزت ہو جائے گی۔

وہ کمرے میں چلتے چلتے تھک گئی تو اس نے قسمت کا فیصلہ ٹاس پر چھوڑ دیا۔فون کروں یا نہیں...... جواب کچھ بھی ملے......اور ٹاس فون کے حق میں آیا۔وہ آہستہ سے دروازہ کھول کے باہر آئی۔ کمرے کی لائٹ اس نے پہلے ہی آف کر دی تھی۔ لاؤنج میں باہر سے آنے والا تھوڑا سا اجالا تھا جو باہر سے آ رہا تھا۔ اس میں وہ ٹیلی فون تک اپنا راستہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کی مما پاپا کے بیڈ روم کا دروازہ بند نظر آتا تھا مگر بند نہیں تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ فون تک پہنچنے سے پہلے اس نے مما کی سرگوشی سنی۔ ان کی سسکی سنی۔

''کتنی مہنگی پڑ رہی ہے تمہاری غلطی......''

پاپا نے کہا۔ ''مجھے اندازہ ہے۔ لیکن حقیقت کا اندازہ تو مجھے یہاں آ کے ہوا۔ یہ ایک خود غرض، لالچی اور بھٹکی ہوئی قوم ہے۔ ماضی کے خواب دیکھنے والی اور مستقبل کے سراب میں مبتلا...... اسے تو قوم کہنا ہی غلط ہو گا۔ بیوروکریسی تو خیر کرپٹ ہے۔ میرے ہم پیشہ نہ ملک سے محبت کرتے ہیں نہ انسانیت کی خدمت سے...... وہ صرف پیسے سے محبت کرتے ہیں۔''

''تم اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے معلوم کر لیتے۔''

''دھوکا کھا گیا میں حب الوطنی کے بیانات سے...... اتنی منافقت میں نے اور کہیں نہیں دیکھی، لوگ جو کہتے ہیں اس کا الٹ کرتے ہیں۔ خود میرے ہم پیشہ ڈاکٹروں نے سب سے زیادہ مخالفت کی۔ صرف اس لیے کہ ایک بہترین معیار کا اسپتال بن گیا جہاں دل کے امراض کا علاج مفت ہو گا یا برائے نام خرچ پر...... تو ان کی پریکٹس کیسے چلے گی۔ ان کی لمبی چوڑی فیس دینے کون آئے گا۔ ان کے دوا ساز کمپنیوں اور لیبارٹریز کے درمیان جو لوٹ مار کا معاہدہ ہے، وہ کیسے برقرار رہے گا؟''

''یہ سب سن چکی ہوں میں پہلے بھی...... مجھے بتاؤ کیا اب ہم واپس نہیں جا سکتے؟''

''نہیں، اب ممکن نہیں۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ جس حمام میں سب ننگے ہیں، اس میں اپنے کپڑے بھی اتار دوں۔ دولت کی ضرورت ہے یا نہیں یہ بھول کے لوٹ مار میں شریک ہو جاؤں۔''

''سوال ہمارے مستقبل کا نہیں، بچوں کا ہے۔''

''دولت سب سے بڑی سیکیورٹی فراہم کرتی ہے اس معاشرے میں۔''

''مجھے شیری کی فکر ہے۔'' وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

''اللہ بہتر کرے گا۔ وقت خود اسے سمجھا دے گا کہ ہمارا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ چلو اب سو جاؤ۔''

دروازہ بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آوازیں بھی۔ شیری اسٹول پر ساکت بیٹھی رہی۔ ایسے کچھ بدلنے والا نہیں۔ یہ لوگ وقت گزار رہے ہیں مجھے بریک کرنے کے لیے۔ میری مزاحمت ختم کرنے کے لیے۔ بالآخر میں اپنی زندگی ان کے قدموں میں ڈال دوں گی۔

اس نے نمبر گھمایا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ فون اس کے بیڈ روم میں ہے۔ وہ لبرل لوگ تھے۔ ایک فون اس کی بہن کے کمرے میں بھی تھا۔ تیسرا اس کے ممی ڈیڈی کا نمبر تھا۔ چار بار گھنٹی بجی۔ پھر اس نے خوابیدہ لہجے میں ہیلو کہا۔

''خالد!'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''شیری......'' وہ بھونچکا رہ گیا...... ''اس وقت؟ خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں، مجھے تم سے ایک سوال کرنا ہے۔ تم ہاں یا ناں میں جواب دو گے۔ اس پر میری زندگی کا انحصار ہے۔''

''شیری ہوش میں آؤ۔ کیا ہوا ہے، مجھے بتاؤ؟''

''خالد! تم شادی کرو گے مجھ سے؟''

''یہ کیا سوال ہے۔ تم جانتی ہو جواب...... بالکل کروں گا...... میں کہہ چکا ہوں۔''

''فوراً میرے ماں باپ کی مرضی کے بغیر؟ کورٹ میں یا اور کہیں...... جہاں تم چاہو...... ہاں یا نہیں۔''

اس نے جواب میں چند سیکنڈ لیے۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ شیری ہسٹریا کا شکار ہے۔ ''ہاں۔''

''تو مجھے نکال کے لے جاؤ گھر سے...... میں خود نکل آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن اس وقت آدھی رات کو نہیں۔ مجھے وقت دو۔''

''وقت نہیں ہے میرے پاس...... میں تو بات بھی نہیں کر سکتی تم سے۔''

''میں خود رابطہ کروں گا...... کل، میں کوئی راستہ نکال

لوں گا۔ تمہارے والدین سے بات کرلوں گا۔''
''کوئی فائدہ نہیں۔ بے عزت ہو کے جاؤ گے۔''
''میں اپنے والدین کے ساتھ آؤں گا۔ وہ اپنی بات منوا لیں گے۔ اور ان سے میں اپنی بات منوا لوں گا۔ اوکے...... مجھے دو دن دو۔ صرف دو دن...... کل نہیں تو پرسوں...... میں لے آؤں گا تمہیں...... کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔''
''کھاؤ میری قسم۔''
''گاڈ...... تم قسم پر اعتبار کرو گی۔ میری زبان پر نہیں۔ اچھی طرح جانتی ہو مجھے پھر بھی۔''

بس اس کے بعد وہ ہوا جو نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ خالد کا اپنے والدین پر اعتماد غلط ہو گیا۔ اس کی ماں روایتی ماں بن گئی۔ کسی کو بتائے بغیر اس نے اپنی بہن کو زبان دے رکھی تھی۔ تیسرے دن اس کی ایک کلاس فیلو ملنے آئی تو خالد کا ایک خط دے گئی۔ ایک ہفتے بعد شیری آدھی رات کو گھر سے نکلی اور خالد کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ان کی شادی ایک دوست کے گھر پر شرعی طریقے سے ہوئی۔ خالد کے چند دوست موجود تھے جو گواہ بنے۔ نکاح ایک رجسٹرڈ نکاح خواں نے پڑھایا۔ انہوں نے اپنے اپنے گھر فون کر کے اطلاع دی اور ہنی مون کے لیے خاموشی سے مری میں روپوش ہو گئے۔ اپنے والد کے ہارٹ فیل سے انتقال کر جانے کی خبر اسے چہلم کے بعد ملی۔

اپنے گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے تھے۔ خالد کی ماں کو بیٹے کی ضد پر ہتھیار ڈالنا پڑے۔ لیکن اس کے گھر میں ساس بہو بالکل انڈیا پاکستان تھے۔ مسئلے کا حل خالد کے باپ نے نکالا۔ اس نے خالد کی نوکری کا بندوبست سعودی عرب میں کر دیا۔ وہ ملازمت بھی بری نہ تھی مگر خالد وہاں بھی خالی ہاتھ نہیں اترا تھا۔ باپ نے اسے معاشی طور پر محفوظ کر دیا تھا۔ یہ شیری کی پیدائش تھی جس نے دادا دادی کو آنے پر مجبور کر دیا۔ اس ملک میں شیری کے باپ کی اچھی گڈول تھی مگر وہ اس کا نام تک نہیں لے سکتی تھی۔

کسی دشواری کے بغیر اس نے اپنے بیٹے سلیم کو لندن کے اسی اسکول اور بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا جہاں وہ خود پڑھتی رہی تھی۔ ایک ٹیچر اب پرنسپل تھی۔ اس لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ چند پرانی کلاس فیلوز سے بھی ملی کہ اسکول چھوڑنے سے اب تک کی ''ونڈرفل لائف'' کی قابلِ رشک کہانیاں وہ بنا کے ساتھ لے گئی جو وہ ایسی روانی اور اعتماد کے ساتھ سناتی رہی کہ خود اسے وہی حقیقت لگنے لگی۔

زندگی جیسے بھی نشیب و فراز سے گزری تھی اب پھر ایک ڈگر پر آ گئی تھی۔ تقدیر نے جیسے اس کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس کے اندیشے جو شاید اس کے آج کے دشمنوں یعنی بہن بھائی اور ماں باپ کی دلی آرزو ہوں گے، غلط ثابت ہوئے۔ نہ خالد دھوکے باز مطلب پرست، ہوس پرست وغیرہ ثابت ہوا، نہ اسے مالی خوش حالی سے محروم ہونا پڑا جو اس کو والدین کی طرف سے حاصل تھی۔ یہاں وہاں سب ایک دوسرے سے لاتعلق اپنی اپنی زندگی جی رہے تھے اور اس وقت کو بھول چکے تھے جو انہوں نے ایک فیملی کی حیثیت سے ساتھ گزارا تھا۔ شیری کے لیے فیملی کا مطلب بدل چکا تھا۔

یہ پُرسکون خوش و خرم اور مطمئن زندگی کا شیش محل ایک دن اچانک ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گیا۔ یہی تو اس قابو میں نہ آنے والی قوت کا کھیل ہے جو قسمت کہلاتی ہے۔ خالد ایک امریکن کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ انجینئر تھا۔ اپنی ذہانت اور پی آر سے اس نے بہت کم وقت میں ترقی کی۔ وہ سعودی عرب کے روایتی سخت گیر شرعی نظام سے آزاد کمپنی کے کیمپس میں رہتے تھے جو ایک طرح سے ''منی امریکا'' تھا۔ جہاں وہ سب دستیاب تھا جو مملکت میں ممنوع تھا اور قابلِ گردن زدنی...... ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے محفوظ جزیرے غیر ملکی آقاؤں نے اپنی سہولت کے لیے بنا رکھے تھے۔ خالد کا پروڈکشن پلانٹ...... رہائش...... تفریح گاہیں سب چند کلومیٹر کے اندر تھیں۔ ایک صبح وہ معمول کے مطابق اسے سوتے میں کس کر کے گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ وہ باتھ ٹب میں لیٹی بیڈ ٹی کے نام پر بلیک کافی پی رہی تھی کہ شبِ گزشتہ کا خمار اتر جائے۔

اسی وقت ان کے بیڈ کے پرائیویٹ فون کی گھنٹی بجی اور وہ بلاتکلف اسی طرح نکل کے کال ریسیو کرنے چلی گئی۔ کسی اجنبی نے چند رسمی الفاظ کے بعد اسے مطلع کیا کہ خالد ایک حادثے کے نتیجے میں الیکٹرک بیلٹ میں الجھ کر فرنس یعنی بھٹی میں پہنچ گیا تھا اور نکلا تو ایک کوئلہ تھا۔ اس کوئلے کو شیری نے نہیں دیکھا کیونکہ فوری طور پر وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ہوش میں آنے کے بعد اس نے کہا کہ باڈی کو جنت البقیع میں دفن کر دیا جائے۔ خالد کے والدین کو اس کے بعد مطلع کیا گیا۔ سلیم کو بتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ شیری نے یہ کام بہت بعد میں خود لندن جا کے کیا۔ اب شیری کے لیے عذاب کا نیا

دور شروع ہوا۔

خالد کے سارے اثاثے اور واجبات سمیت کر اس نے دوسری بار وطن لوٹ کر مراجعت کی۔ لیکن وہ پُر اعتماد تھی اور طے کر چکی تھی کہ آنے والی زندگی کا انداز کیا ہوگا۔ رسماً اس نے سسرال میں قیام کیا۔ سارے کوسنے، بددعائیں اور خطابات وصول کرنے کے لیے..... فاحشہ، جادوگرنی، ڈائن، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے خندہ پیشانی سے ایک کان سننے اور دوسرا اُڑانے کے لیے استعمال کیا۔ ماں کے بیٹے پر ہر دعوے کو مسترد کر دیا۔ اب وہ صرف اس کا مرحوم شوہر تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ سعودی عرب میں دوسرے قیام کے دوران اس نے وقت گزاری کا ایک ذریعہ تعلیم کو بھی بنا لیا تھا۔ لاشعوری طور پر اپنی ایک خواہش پوری کرنے کا انتقامی جذبہ تھا کہ اس نے اعلیٰ تعلیم پوری کی۔ اب وہ بہتر طور پر کوالیفائڈ تھی۔ اسے ہر طرح کی زندگی کا تجربہ اور اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ وہ آزاد تھی۔

پہلی ضرورت رہائش کا انتظام تھا۔ سسرال کے بک بک خانے میں صبح سے شام تک سننا اور سنانا اعصاب شکنی کا کام تھا۔ اکیلے رہنے کا چیلنج سب سے بڑا تھا۔ اس کا حل اسلام آباد میں نکل آیا۔ یہاں لاتعداد گرلز ہوسٹل تھے۔ ورکنگ ویمن ہوسٹل تھے اور ماہانہ بنیاد پر دستیاب گیسٹ ہاؤس تھے۔

ابھی یہ تلاش جاری تھی کہ شیری کو ماں کا فون موصول ہوا۔ گھر سے اور ملک سے فرار ہونے کے بعد اس کا برسوں بعد چوری چھپے ماں سے رابطہ ہوا تھا۔ اس پر ناک کٹوانے والی کے ساتھ باپ کی قاتل کا لیبل اب بھی چپکا تھا مگر دھندلا پڑ گیا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ماں بھی اکیلی ہے۔ رشید اور حمید کو ماں نے گستاخ بہوؤں کی غلامی کے جرم میں نکال دیا ہے۔ نکل جانا یا نکال دیا جانا بات تو ایک ہی تھی۔

وہ ماں سے ملی۔ دو ایک جیسی جہاں دیدہ ستم رسیدہ عورتیں جو اَب خود مختار تھیں اور تنہا تھیں۔ وہ ماں کے گھر منتقل ہو گئی جہاں ایک بور، بیکار اور بے مقصد زندگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بہت جلد اسے لیکچرر شپ مل گئی اور وہ لاہور شفٹ ہو گئی۔

حیرت انگیز طور پر اس نے شوہر کھو دینے کے غم کو بھی اتنی ہی آسانی سے بھلا دیا جتنی آسانی سے باپ کا غم بھلا دیا۔ اس لیے کہ زندگی پر وہ اپنا اختیار رکھتی تھی۔ وہ لاوارث، بے کار اور کسی قابل نہ رہنے والی عام عورت کی طرح نہیں تھی جو غربت، بے گھری اور جہالت کے باعث ظلم کی چکی میں پستی ہے۔ اس نے ماں کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اس کا اکیلے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اور وہ رہی بھی نہیں۔

اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ مرد پر شوہر کا لیبل ہونا ضروری نہیں۔ اس نے تشہیر نہیں کی تھی لیکن پیسا اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے باعزت جاب بھی مل گئی تھی۔ پوچھنے والا کوئی نہ تھا کہ کالج کے بعد ہوسٹل کے کمرے کو لاک کر کے وہ ہر شام گاڑی میں کہاں جاتی ہے۔ کس سے ملتی ہے اور کب واپس آتی ہے۔ لیکن اس کی غیر نصابی سرگرمیوں کے چرچے شروع ہوئے تو پرنسپل نے بڑے دوستانہ طریقے پر تفتیش کی اور اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ بدنامی اس سوشل سیٹ اپ میں اسے اپ سیٹ کر سکتی تھی۔ خود کو باکردار ثابت کرنے کے لیے اس نے گرلز ہوسٹل کی وارڈن کا عہدہ قبول کر لیا۔ کردار کی ٹھیکے داری میں اپنے کردار پر حرف آنے کا سوال ہی نہ تھا۔

لیکن بہت جلد اسے ایک گھر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک گھر جو اپنا ہو۔ ایک مرد جو اپنا ہو اور ملکیت کا غرور جو اپنا ہو۔ زندگی کا راستہ آدھا طے ہوا تھا۔ وہ بیچ میں کھڑی تھی۔ پیچھے کی زندگی کے مقابلے میں اتنی ہی آگے کی زندگی زیادہ مشکل تھی جب وہ ماں کی عمر کو پہنچ جائے گی اور دولت مندی کی آسائش سے اکیلے پن کا یا بڑھاپے کے عوارض کا علاج نہیں ہوگا۔ قسمت نے پھر ٹانگ اڑائی اور اس کے سامنے زمان خان کو پیش کر دیا۔

☆☆☆

تیسری بے سدھ پڑی ہوئی لڑکی اسپیئر وہیل تھی۔ پانچواں پہیا جو کسی کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا تھا۔ وہ ذہنی اور جسمانی تھکن کے احساس سے دوچار تھیں۔ ان کے تن پر جیسے بھی تھوڑے بہت کپڑے تھے کسی وجہ کے بغیر ان کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ایک اور سنسنی سے بھرپور شب کی سحر تھی۔ جو سورج کے حساب سے تو بہت پہلے شروع ہو چکی تھی مگر ان کے لیے ویک اینڈ کی صبح اسی اینٹی کلائمکس کا نام تھا۔ وقتی طور پر صرف تھکن تھی اور بیزاری..... اندر کی آگ کے سرد پڑ جانے کے بعد راکھ کی طرح..... اب رفتہ رفتہ آنے والے چند روز میں حرارت پھر جاگے گی۔ خواہشوں کی سنسنی خیزی دوبارہ بڑھے گی اور پانچ دن بعد..... پانچ دن کام..... کام اور کام..... تفریح کے محدود دو وقفے۔

دو لڑکیاں اور ان کے بوائے فرینڈ تیسری کے ون بیڈ اپارٹمنٹ میں تھے۔ تیسری کا پارٹنر گم ہو گیا تھا جیسے کہ بوائے فرینڈز یا گرلز گم ہوتی ہیں۔ اس کا فون بند تھا۔ اور یہ

فرض کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی اسپتال میں یا مردہ خانے میں لیٹا ہے۔ لیٹا وہ ضرور ہو گا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے ساتھ...... مگر سن آف اے بچ یہاں نہیں آیا تھا۔ باقی دو لڑکیوں نے تھوڑی سی بد مزگی محسوس کی تھی مگر اپارٹمنٹ کی مالک کو آؤٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ان رہی۔ اور اس نے اپنی افادیت بچہ جمہورا کی طرح ثابت کی۔ اس نے انجوائے منٹ میں نئے پن کا عنصر شامل کیا۔ گڈ گرل...... اچھی میزبان بنی۔

پرنس سام نے بد مزگی سے اپنی گرل فرینڈ کو دیکھا۔ چھ مہینے بہت ہوتے ہیں۔ ”کیا تم بھی وہی سوچ رہے تھے جو میں سوچ رہا تھا؟“

”تم کیا سوچ رہے تھے؟“ جانی نے تلخ کافی نگل کے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

”ایک چینج...... کار کے ٹائروں کو بدلتے رہنا چاہیے۔ آگے والے پیچھے...... پیچھے والے آگے۔“

”میں ایسا بالکل نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھے نئے ٹائروں کی ضرورت ہے۔“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

”میرا کام بہت سخت ہے اور وہ سؤر کا بچہ...... ایک منٹ فراغت کا نہیں دیتا۔ یہ فی گھنٹا اجرت والا کام ہمارے ملک میں دو دن کا کام ہے۔ اور یہ اجرت بھی...... مجھے نئی جاب نہیں مل رہی۔“

”ابھی چلاؤ۔ گرمی کی چھٹیوں تک...... لیکن پرنس...... میری تو مجبوری ہے۔ تم پرنس ہو۔“

سلیم عرف پرنس سام نے بد مزگی سے گالی دی۔

”نام سے ہوں۔ کام سے نکما...... آج میرے پاس کچھ نہیں ہے اپنا۔ واپس میں جانا نہیں چاہتا۔ میں دیکھ چکا ہوں اپنی ماں کا انجام۔ وہ مجھ سے ایک زینہ اوپر ہے امیدواروں کی فہرست میں۔ جیسے تمہارے ملک میں بادشاہت کے امیدواروں کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے کہ کس کا نمبر کس کے بعد ہے۔ یہ سو سالہ بڑھیا مرے تو ستر سال سے زیادہ کا پرنس آف ویلز بادشاہ ہے۔ اور وہ خود کب مرے گا۔“

”یہ لوگ جلدی نہیں مرتے۔“ جانی نے اتفاق کیا۔ ”چاروں طرف بچانے والے ماہرین کھڑے رہتے ہیں۔“

”ان کی کیا بات کریں۔ میری گرینڈ ما کون سی کوئن الزبتھ ہے۔ اس کا بھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

جانی نے ایک آہ بھری۔ ”ساری دنیا میں تو جوانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ ان کے ضعیف دولت مند ماں باپ اپنی عمر کو لمبا کرتے جا رہے ہیں۔“

”یار قانون ہونا چاہیے جیسے گھوڑے کو گولی مار دیتے ہیں کہ اب تمہارا کوئی کام نہیں دنیا میں۔“

”ہاں، کام نہیں تو پھر جینے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر کیا تم مرنا چاہو گے ان کی عمر کو پہنچنے کے بعد؟“

سلیم ہنس پڑا۔ ”کیا کوئی الیکٹرک چیئر پر بیٹھنا پسند کرتا ہے، یا زہریلا موت کا انجکشن لگواتا؟“

”مگر پھر چوائس تمہارا تو نہیں ہو گا۔ تم سمجھتے ہو کہ نانی نے اپنی زندگی جی لی اور سارے کام کر لیے اور اب اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں تو وہ مر جائے۔ اپنا سب کچھ تمہیں دے جائے تاکہ تم اپنی زندگی کو بھی بنا سکو؟“

”دولت تو نانا نے کمائی تھی اور اب نانی اس کا استعمال بھی تو نہیں کر رہی ہے۔ وہی پرانا گھر، پرانی گاڑی، پرانا سامان، اور پرانا ملازم۔ نہ کھانا نہ پہننا۔ ہاں خریدے مرسیڈیز، اپنی ہر شام کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں گزارے، فارن ٹرپس کرے، دنیا دیکھے، کوئی کاروبار کرے، لیکن وہ تو بس بیٹھی ہے خزانے پر سانپ بنی۔“

”مار دے اس سانپ کو۔ لیکن پھر بھی تجھے ملے گا کیا۔ شاید وہی الیکٹرک چیئر...... جو اس کا ہے وہ تو جائے گا تیری ماں کی تحویل میں...... اور تیرے انکل اس سے دگنا لے جائیں گے۔ پھر تو انتظار کرنا کہ ماں مرے...... اور تب تک تو خود بوڑھا ہو جائے گا پرنس آف ویلز۔“

سلیم نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ”قابلِ رحم ہوں میں، ایک تو ہے...... کہیں سے کچھ ملنے کی توقع نہیں۔ تجھے کوئی فرسٹریشن بھی نہیں، میں بھکو پرنس۔“

”مجھے بتا تو کیوں پڑھ رہا ہے؟ کیا کرے گا ڈگری لے کے؟“

”پتا نہیں، ماں اور اس کی ماں سارے فیصلے کرتی ہیں۔ نہ مانوں ان کی بات تو یہ تھوڑا بہت جو خرچ ملتا ہے، یہ بھی بند ہو جائے گا۔“

”یہ پاکٹ منی اس سے زیادہ ہے جو میں کماتا ہوں یا تو کماتا ہے۔“

”مگر مجھے کم ہے۔ میں کیا کروں کہ میری ساری خواہشات پوری ہو سکیں۔“ سلیم نے کہا۔

”جوا کھیل، وہ کیسینو والا نہیں۔ زندگی کا جوا...... اپنے آس پاس دیکھ۔ کیا لوگ کسی ڈگری سے دولت مند ہوئے ہیں؟ کسی نے بڑا تیر مارا تو نوبل پرائز لے لیا ورنہ بزنس۔ جو جائز ناجائز...... جھوٹ سچ سب کو بھلا کے......

انجلینا جولی کے پاس حسن تھا اور جسم تھا۔"
سلیم نے جھلا کے کہا۔ "پاگل کے بچے، میرے پاس کیا ہے..... کیا نہیں۔"
"اسی لیے تو کہا کہ جوا کھیل..... زندگی کو داؤ پر لگا۔ ناجائز غیر قانونی کام کر، منشیات، اسلحہ، کرنسی کی اسمگلنگ، ڈاکا ڈال، جعلی نوٹ چھاپ..... تخت یا تختہ۔"
پرنس سلیم کی گرل فرینڈ اٹھ بیٹھی۔ اس نے لباس سے زیادہ جسم کی طلب کو محسوس کیا اور ایک سگریٹ جلالی۔ "میں کام دلا سکتی ہوں تمہیں..... میں بہت دیر سے تمہاری بک بک سن رہی تھی۔ ہمت ہے کام کی، بہت کماؤ گے۔"
"کام کیا ہے؟" سلیم نے دیکھا کہ وہ سیریس ہے۔
"کیریئر کا..... مجھے مل جاتا لیکن میرے کنٹیکٹ نہیں تھے۔ باعزت حوالے..... میرے ساتھ ایک انڈین تھا دو سال پہلے..... باسٹرڈ نے شادی کا چکر دے کر مجھے ماں بنا دیا تھا تقریباً..... مجھے ملا تھا۔ اتنی شاندار گاڑی اور اس کا رہن سہن دیکھ کے میں حیران رہ گئی۔ اس کے اچھے حوالے تھے۔ کچھ انڈین آرمی کے، کچھ سیاست دانوں کے..... وہ کیریئر بن گیا۔ کوئی ائر ہوسٹس اس کے ساتھ تھی۔ تمہارا ساتھ میں دے سکتی ہوں۔"
سلیم سوچ میں پڑ گیا۔ "کیریئر؟"
"ایک ٹرپ میں دس ہزار ڈالر..... اخراجات الگ..... خرچہ آمدورفت، رہائش..... واپسی میں کام مل جائے تو ڈبل ڈیل....."
"کیا لانا لے جانا ہوگا؟"
"جو بھی ہو..... یہ جاننا ضروری نہیں۔" وہ آدھی سگریٹ کو مسل کے واش روم چلی گئی۔
اگلے دن موٹر سائیکل پر گرم پیزا پہنچانے کی دوڑ میں اس نے دونوں طرف کی بکواس خندہ پیشانی سے سنی..... بیس منٹ کہا تھا۔ تم پچیس منٹ بعد آئے ہو..... میں انکار کر سکتی ہوں لیکن کیا کروں نرم دل ہوں۔ اس نرم دلی میں اس کو اچھی ٹپ ملتی تھی جو نقد بھی ہوتی تھی اور اندر مدعو کر کے ایک ڈرنک یا کافی کی پیشکش بھی..... وہ ایک ہینڈسم توانا مرد تھا۔ واپسی میں مالک کی باتیں..... کام چور سست بحر الکاہل..... اتنی دیر میں واپسی..... شٹ اپ..... ٹریفک جام کی مجھے پروا نہیں..... یہ تمہارا مسئلہ ہے راستہ بنانا۔ دو آرڈر تمہاری وجہ سے بک نہیں ہوئے۔ نقصان تمہارا باپ پورا کرے گا....."
اگلے دن دو باتیں ہوئیں۔ پہلے ٹریفک جام میں راستہ بناتے ہوئے اس کو ڈلیوری میں پندرہ منٹ کی تاخیر ہوئی۔ آرڈر دینے والی بڑھیا نے پیزا لینے سے انکار کے بعد اسے گالیاں بھی دیں کہ تم کالے پاکی ہوتے ہی حرام خور ہو..... وہ بددل ہو کے واپس گیا تو مالک نے پیزا کا نقصان اس کے حساب میں ڈال دیا۔ "اس کی قیمت اب تم دو گے خود کھاؤ یا میرے کتے کو کھلاؤ۔"
"لیکن یہ مائیکرو ویو میں گرم کر کے..... کام آ سکتا ہے۔"
"شٹ اپ..... مجھے عقل مت دو۔ گاہک جان لیتا ہے کہ یہ دوبارہ گرم کیا گیا ہے۔ میری گڈول خراب ہوتی ہے۔"
اس ہفتے میں تیسری بار اس نے پیزا انگلا پشام کو اس کی چھٹی کی درخواست مسترد ہو گئی۔ "تم پاگل تو نہیں ہو..... ویک اینڈ پر چھٹی؟"
سلیم کے لیے ریٹا سے نہ ملنا ایک سنہری موقع سے انکار کے مترادف تھا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "او کے میں اس جاب پر لعنت بھیجتا ہوں، میرا حساب کر دو۔"
"تم کو نوٹس دینا ہوگا؟" مالک دھاڑا۔
"وہ میں نے کل ہی دے دیا تھا۔ اب تم سیدھی طرح رقم دو گے یا میں نسلی امتیاز اور استحصال کا معاملہ اٹھاؤں.....؟"
رقم جیب میں ڈال کے وہ بڑی مشکل سے ریٹا تک پہنچا۔ "تھینکس کہ تم نے انتظار کیا، میں کچھ لیٹ ہو گیا تھا۔"
"کچھ؟ آدھا گھنٹا کچھ نہیں، بہت ہوتا ہے۔"
"سوری بے بی..... تمہارے لیے مجھے جاب کو لات مارنا پڑی۔"
"میرے لیے نہیں، لالچ نے تمہیں مجبور کیا۔ خیر میں نے بات کی تھی تمہارے لیے..... باس آٹھ بجے ملے گا۔ اس دوران میں ہم کچھ کھا پی سکتے ہیں۔ دوپہر کو کھانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔"
باس تقریباً پچاس برس کا صحت مند اور صورت سے کابل نظر آنے والا شخص تھا۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے دوسرے لوگ اسے پروفیسر کے نام سے پکارتے تھے۔ دو بیڈ کے اپارٹمنٹ میں سخت بے ترتیبی تھی۔ "جگہ بناؤ اور بیٹھ جاؤ۔" اس نے کہا۔
وہ دونوں ایک صوفے پر سے کتابیں، رسالے ہٹا کے بیٹھ گئے۔ "ریٹا نے تمہیں بتایا ہوگا....."
"ریٹا کو چھوڑو..... تم بتاؤ کہ پاکستان میں تمہارا کون

ہے؟''

''ایڈی...... اس کے بہت معتبر حوالے ہیں۔'' ریٹا نے کہا۔

وہ مسکرایا۔'' ذرا مجھے بھی امپریس ہونے دو۔''

سلیم نے کہا۔'' میرا نانا یہاں کا نامور سرجن تھا۔ مجھے یقین ہے آج بھی اسے بہت لوگ جانتے ہوں گے۔ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ تھا۔ یہاں سے وہ سعودی عرب چلا گیا جہاں وہ بیس سال رہا اور وہ ماہر کی حیثیت سے شیوخ اور حکمراں فیملی کے ساتھ رہا۔''

''بیس سال بہت ہوتے ہیں۔ یقیناً اسے آج بھی سب جانتے ہوں گے۔''

سلیم نے کہا۔''اس کے بعد میرا باپ انجینئر رہا۔ وہ ایک حادثے میں مر گیا۔ میری ماں اور اس کے دو بھائی یہاں پڑھتے رہے تھے۔ اس اسکول میں اب میں پڑھ رہا ہوں۔ وہاں کا پرانا اسٹاف میری ماں کو جانتا ہے۔ آج کل وہ پاکستان کے ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔''

''تمہارے نانا نے اور ماں نے برطانیہ کی شہریت کیوں نہیں لی؟''

''نانا وطن کے لیے جذباتی ہو گیا تھا۔ جیسے کہ بڑھاپے میں آدمی ہو جاتا ہے۔''

سلیم نے خدا کا شکر ادا کیا جب کسی نے نانا کی عمر کے بارے میں سوال نہیں کیا۔''اور ماں کیوں چلی گئی؟''

سلیم نے دوسرے جھوٹ کا سہارا لیا۔''نانا کے مرنے کے بعد نانی کی دیکھ بھال کے لیے۔''

''تمہارے پاکستان میں بھی اچھے کنٹیکٹ ہوں گے۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''وہاں اسے زیادہ شہرت ملی۔ پاکستان کے کیپٹل اسلام آباد میں اس کے نام کی شہرت تھی۔ وہ ہارلے اسٹریٹ میں رہتا تھا۔''

''وہاں بھی ہارلے اسٹریٹ ہے؟''

''ہاں...... مگر نانا کے ساتھ تمام سینئر آدمی ڈاکٹرز تھے۔ جنرل کے رینک کے...... نانی اب بھی وہیں ہے۔''

سلیم نے آج کی ہارلے اسٹریٹ کا نقشہ کھینچنے سے گریز کیا جو ایک پُرشور عام سی آبادی تھی جہاں اس کی نانی کو دو چار پرانے بڈھوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

''یعنی تم سعودی عرب، پاکستان اور برطانیہ میں اچھے کنٹیکٹ رکھتے ہو؟ پرنس سام...... تم ریٹا کے ساتھ اچھی ٹیم بنا سکتے ہو۔ پاکستان سے میں گارمنٹس اور لیدر گڈز منگواتا ہوں۔ پھر ان کو یہاں کے مشہور برانڈز بنا کے سعودی عرب بھیج دیتا ہوں۔ وہی چیز دس گنا سے سو گنا قیمت تک نکل جاتی ہے۔ کیا اس میں کچھ ناجائز ہے؟''

سلیم چونکا۔'' بالکل نہیں۔ اگر بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں مطمئن ہیں۔''

''بیچنے والا جانتا ہے کہ اس کی پروڈکٹ پر کون سا برانڈ لگے گا لیکن اسے غرض نہیں۔ خریدار کو خاک بھی تمیز نہیں۔ وہ انٹرنیشنل برانڈ کی قیمت جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں اسے لوٹ نہیں رہا ہوں۔ سب ایسے ہی کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش اور ملیشیا سے بھی گارمنٹس اور ہینڈ بیگ آتے ہیں۔ اب چائنا نے سوئس گھڑیوں کے برانڈز کا نمونہ بھیجا ہے۔'' وہ اٹھا اور ایک کارٹن میں سے چند چھوٹے باکس نکالے۔''کیا تم فرق محسوس کر سکتے ہو؟''

سلیم ہنسا۔''میں نے یہ نام بھی نہیں سنے۔ رولیکس اور اومیگا کے سوا مجھے کسی انٹرنیشنل برانڈ کا پتا نہیں۔''

''اس میں ایک ڈالر کے ایک ہزار ڈالر بھی مل جاتے ہیں۔ یہ سالہا سال خراب نہیں ہوتیں۔ دولت منداس سے پہلے ہی ان کو پھینک دیتے ہیں یا کسی کو بخش دیتے ہیں۔ یہ ہے میرا بزنس۔ بیشتر انڈین جو یہاں جاب یا تعلیم کے بہانے آتے ہیں، اچھے بیک گراؤنڈ کے مالک نہیں ہوتے۔ اسلام آباد کی ایک کلاس ہے...... حکمراں ڈپلومیٹ وغیرہ...... مجھے دو نام بتاؤ...... سینئر فوجی افسر یا وزیر وغیرہ ہوں۔''

سلیم چونکا۔''دو نام؟ کس لیے؟''

''یہاں سے دو شپ منٹ جائیں گی ان پر معتبر نام ہوں تو کلیئرنس آسان ہوتی ہے ورنہ رشوت دینا پڑتی ہے۔''

سلیم نے بہت سوچ کے نانی سے سنے ہوئے دو نام بتائے۔ زمانہ ہوا وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے مگر ایڈریس آج بھی موجود تھے۔ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ یہ لوگ لائن کلیئر رکھتے ہیں اور یہ ٹھیک تھا کہ نام مرعوب کرنے والا ہو تو کسٹم والے نظر ڈال کے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ ورنہ رشوت دے کے تو سب کام ہو ہی جاتے ہیں۔ ایڈی کی برانڈ والی بات سراسر بکواس تھی۔ وہ کیا منگوائے گا اور کیا بیچے گا۔ سلیم جانتا تھا مگر دس ہزار ڈالر فی ٹرپ اسی کام کے تھے۔ نو رسک نو گیم۔

☆☆☆

زمان خان نے پشاور یونیورسٹی سے انگلش میں ایم اے کیا ہی تھا کہ اسے لیکچررشپ مل گئی۔ اس کی تقرری میں

اس کے باپ سردار خان آفریدی کے اثر رسوخ کو بہت دخل تھا ورنہ اس جیسے بہت تھے جو ڈگریاں لے کر اسکولوں یا ٹیوشن سینٹرز میں پڑھا رہے تھے۔ سردار خان کوئی دولت مند آدمی نہیں تھا مگر اس کے مردان میں ایک سیاسی فیملی سے اور خیبر ایجنسی میں کچھ قبائلی سرداروں سے اچھے مراسم تھے۔ اگر افغانستان پر روس کا قبضہ نہ ہوتا تو شاید وہ بیٹوں کے لیے قابلِ ذکر اثاثے چھوڑتا۔

شیری واش روم سے لوٹی تو وہ بدستور اپنے خیالوں میں گم بیٹھا رہا۔ شیری نے اس کی ناک کے سامنے چٹکی بجائی۔ ''کہاں گم ہو؟''

وہ چونکا۔ ''تم میری فیملی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں، کیوں؟''

''میں نے بھی تو سب بتا دیا ہے۔ اب دیکھو، ہم کوئی ٹین ایجر تو نہیں ہیں نا، کوئی جذباتی فیصلہ نہ کریں کہ تماشا بنے۔ یہ عمر پچھتانے کی نہیں ہے۔ ویسے ہی باتیں تو بہت بنیں گی۔''

''شادی میری رواج کے مطابق چچا کی بیٹی سے بچپن میں طے تھی۔ وہیں ہوئی اور وہ اچھی ہے جیسی کہ بیویاں ہوتی ہیں۔ ذمے دار اور شریف فرماں بردار، مگر مسئلہ وہی ہے وہ اَن پڑھ ہے۔ اس کے اور میرے ٹیسٹ کیسے مل سکتے ہیں۔ میں اور تم انگلش لٹریچر کو سمجھتے ہیں۔ تم خوش ذوق بھی...... آسانی سے میرے ساتھ ہر جگہ آجا سکتی ہو۔ وہ گھر سے نہیں نکلتی۔ نکلتی ہے تو اسی شٹل کاک برقع میں۔ مجھے تو باپ نے سپورٹ کیا اور دھکیلا اعلیٰ تعلیم کی طرف۔ وہ خود اسلحہ بناتا تھا۔ ماہر کاریگر تھا۔ درّے میں ہماری دکان یا ورکشاپ تھی۔ مغربی اسلحے سے کسی طور کم نہ تھا۔ چنانچہ اچھے پیسے مل جاتے تھے لیکن ہاتھ کے کام کی رفتار کم ہوتی ہے۔ اپنا گھر چلانا اور کاریگروں کو دینا...... تاہم غریب نہیں تھے ہم۔ بس وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اسی قبائلی نظام کی روایات کا قیدی رہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں باہر نکلوں۔''

''وہ ترقی پسند تھا؟''

زمان ہنسا۔ ''ہاں، خاندانی روایات کے آگے وہ بھی بے بس تھا۔ کیونکہ اس کے بھی بچے تھے۔ ورنہ وہ کہتا کہ زمان جہاں چاہے شادی کرلو۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ مجھے یاد ہے ہمارا گھر اس سڑک کے کنارے تھا جو غیر علاقے میں شامل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس پر سے گاڑیاں اور بس، ٹرک گزر سکتے تھے۔ اس ضمانت کے ساتھ کہ ان کو نہ کوئی اغوا کرے گا نہ قتل...... لیکن سڑک سے اتر کے گاڑی رک گئی تو ضمانت ختم۔ ایک بار گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کی ڈیرہ اسماعیل خان جانے والی بس نے ایک بکری ماردی۔ وہ بس تو نکل گئی۔ اُدھر سے شام کو دوسری بس آئی تو اسے روک لیا گیا۔ لوگ ڈرائیور یا بس نمبر نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہی بس تھی۔ سب بسوں کا ایک ہی سلور کلر ہوتا تھا۔ بیچارہ ڈرائیور بہت چیخا چلّایا کہ صبح تو میں ڈیرے سے چلا ہوں۔ مگر ان کو بکری کی قیمت ادا کرنی پڑی ورنہ جی ٹی ایس کی کوئی بس گزر نہ پاتی۔ خیر، کرنا خدا کا یہ ہوا کہ روس نے افغانستان فتح کرلیا اور امریکا نے ہم سے کافروں کے خلاف جہاد شروع کرا دیا۔ اس میں اسلحہ بنانے والوں کا کام بہت بڑھ گیا لیکن بعد میں روسی اسلحہ آنے لگا جو مجاہدین کے ہاتھ لگا تھا۔ اس کے بعد امریکی اسلحہ پہنچ گیا تقسیم کے لیے...... میرے باپ نے کام کو پشاور منتقل کردیا اور کاریگر بھرتی کرلیے۔ کواٹی چھوڑ کے کوٹھی پر آگیا۔ اس کی آمدنی کئی گنا ہوگئی۔

میری بات لمبی ہوگئی۔ قصہ مختصر...... پہلے جو ہتھیار امریکیوں نے روسیوں کے خلاف جہاد کے لیے فراخ دلی سے تقسیم کیے تھے وہی اب ان کے خلاف استعمال ہونے لگے۔ اسمگل ہو کے پاکستان پہنچ گئے اور بازار میں فروخت ہونے لگے۔ مجھے حقیقت کا زیادہ علم نہیں، مگر میرے باپ نے دونوں طرف کا اسلحہ خریدا اور بیچا۔ وہ بتاتا تھا کہ امریکی اپنے دیے ہوئے میزائل مجاہدین سے گراں قیمت پر واپس لے رہے تھے تاکہ ان کے خلاف استعمال نہ ہوں۔ امریکی فوجیوں کے لیے جانے والے سامان سے پاکستان کی مارکیٹیں بھر گئیں اور میرا باپ امیر ہوگیا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی کا اسٹاک ختم ہوا تو وہ بھی زمینی سرنگ پر قدم رکھ کے جنت میں پہنچ گیا۔ اس کے پرخچے اُڑ گئے ہوں گے۔

اس کا چھوڑا ہوا مال ہم بہن بھائیوں کو ملا۔ یوں سمجھ لو اسی سے میں نے گلبرگ میں دس مرلے کا گھر بنا لیا جسے کوٹھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کار لے لی جو اَب تمہارے پاس ہے اور مجھے کچھ مالی فراغت حاصل ہوئی۔ بہن کابل میں ہے۔ اس کا شوہر گاڑیوں کے کام میں لاکھوں کما رہا ہے، بھائی نے پشاور حیات آباد میں گھر لیا تھا پھر بچوں کے ساتھ امریکا شفٹ کر گیا لیکن میرے ماموں اور چچا وغیرہ ہیں۔ وہ مجھ سے رابطہ رکھتے ہیں۔''

''مگر وہ ہماری شادی میں دخل انداز نہیں ہوں گے۔''

''ہوں گے۔ میری بیوی نے میرے تایا کو بلایا

ہے۔ اس کی بھی دو بیویاں ہیں۔ مجھے معلوم ہے وہ مجھے روک نہیں سکتا۔ بس بیوی کے آنسو پونچھے گا، اسے صبر کی تلقین کرے گا اور لوٹ جائے گا۔"

شیری نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ پوچھے گا نہیں...... کہ آخر وہ کون ہے؟"

زمان خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں پوچھ سکتا۔ میں اسے مطمئن کر کے بھیج دوں گا واپس۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔" شیری نے گھڑی دیکھی۔

"میرا دل تو کسی ٹین ایجر کی طرح مچل رہا ہے کہ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے کہ دل ابھی بھرا نہیں۔"

"یہ ہفتے میں ایک دن میں نکل آتی ہوں۔ کافی نہیں ہے؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ شیری کی کار کا دروازہ کھولے کھڑا رہا۔ "تم بہت ظالم ہو...... رک نہیں سکتیں؟"

شیری نے ہنس کے اور بل کھا کے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "وہ شادی کے بعد...... صبر کا پھل میٹھا۔"

زمان گاڑی کی ٹیل لائٹس کو دیکھتا رہا۔ اس عمر میں بے قراری کے یہ جذبات واقعی حیران کن تھے۔ اور اس کی وجہ کچھ بھی ہو، اس کی بیوی کے مقابلے میں شیری انتہائی حسین اور پرکشش تھی۔ وہ ہفتے میں تین بار جم جاتی تھی اور اس کا لباس رہی سہی کسر پوری کر دیتا تھا۔ ساڑی اس کے جسم پر ایسی سجتی تھی کہ وہ دم بخود رہ جاتا تھا۔ خود اس کی بیوی شادی کے وقت انتہائی خوب صورت تھی مگر پھر اپنے جیسی عورتوں کی طرح وہ خود سے بے پروا ہوتی گئی اور پھیلتی گئی۔ اب وہ گوشت کا تھل تھل کرتا ڈھیر تھی۔ اس کے لیے آج شیری نئی جوانی کا پیغام لے کر آئی تھی۔

اپنی گاڑی پارک کرتے وقت اس نے تیسرے بیڈ روم میں روشنی دیکھی جو مہمانوں کے لیے وقف تھا اور سمجھ گیا کہ اس کا تایا آگیا ہے۔ وہ سیدھا اس سے ملنے گیا اور اس سے گلے ملا۔ وہ ستر سال سے زائد عمر کا مضبوط کاٹھی والا شخص تھا۔ "زمان خان، کدھر تھا تو؟"

"وہ ایک میٹنگ تھی کاکا۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"وہ تو مجھے پتا ہے۔ کیا نام ہے اس کا شیری...... اس سے میٹنگ ہوگی۔ یہ کیا نام ہے زمان...... شیری تو شراب ہوتی ہے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "وہ تو حرام ہوتی ہے تایا...... لیکن دوسری شادی تو حرام نہیں ہے؟"

اسی وقت زمان کی بیوی اندر آگئی اور سامنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ "کاکا...... یہ صلہ دیا ہے اس نے مجھے پچیس سال کی خدمت کا......" وہ ایک دم رونے پر اتر آئی۔

"حوصلہ کر...... میں بات کر رہا ہوں نا۔" تایا نے سخت لہجے میں کہا۔ "بیچ میں مت بول۔"

زمان خان نے دلائل کا آغاز ہی نظریۂ ضرورت کے بجائے شریعت سے کیا۔ "دیکھو کاکا...... تم بھی جانتے ہو کہ نہ دوسری شادی گناہ ہے نہ جرم۔ یہ مرد کا شرعی حق ہے۔ اب میں نے اپنا حق پچیس سال استعمال نہیں کیا تو یہ ختم نہیں ہوا۔ اتنا عرصہ یہ اکیلی راج کرتی رہی اور اسے میں نے کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا، پوچھ لو اس سے۔"

تایا نے محض سوالیہ نظریں اٹھا کے فریادی کو دیکھا لیکن وہ صرف رو رہی تھی اور جواب دیتی تو اس کے خلاف جاتا۔

زمان خان نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب آپ یہ بھی دیکھو، وہ ایک بیوہ ہے۔ میں کسی سولہ سال کی کنواری لڑکی کے پیچھے دیوانہ نہیں ہو رہا ہوں۔ اس کا جوان بیٹا ہے۔ میرے بیٹوں کے برابر...... ماں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ بھائی ساتھ نہیں دیتے۔"

تایا نے جج کی طرح سامنے رکھے گئے حقائق پر غور کیا۔ "اچھا، یہ بات ہے۔"

"میں آپ کا بھتیجا ہوں۔ آپ کے چھوٹے بھائی کا غیرت مند خون ہے میری رگوں میں...... میں فائدہ نہیں اٹھا رہا ہوں اس بیوہ کی مجبوری سے...... وہ کالج میں پڑھاتی ہے ابھی...... بعد میں پردہ کرے گی۔ گھر بیٹھے گی۔ میں اس سے بغیر نکاح کے تعلق رکھ سکتا ہوں...... اسے تو پتا بھی نہ چلتا...... مگر میں شرعی طریقے سے سنتِ رسولؐ پر عمل کر رہا ہوں۔"

تایا جانتا تھا کہ بزرگی اس کے خودمختار بھتیجے کو روک نہیں سکتی اور وہ خود بھی دوسری شادی کرنے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ ابھی مزید دو کرنے کا شرعی حق ختم نہیں ہوا۔ شرط عدل کی ہے۔ تو وہ عادل بنے۔

"اس کے علاوہ کاکا......" زمان خان نے دم لے کر کہا۔ "میں نے مرجان سے کہا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی یا زیادتی نہیں ہوگی۔ نہ تمہارا گھر متاثر ہوگا۔ اس کا

الگ گھر ہوگا۔ جو اس کا ہے اسے پہلے کی طرح حاصل رہے گا۔ میرے سلوک میں فرق آئے تو آپ آ کے میری گردن پکڑ لینا۔''

سماعت ختم ہوگئی۔ جج نے مختصر فیصلہ صادر کر دیا۔ ''زمان خان کوئی غلط کام یا زیادتی نہیں کر رہا ہے۔ جھگڑا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ورنہ خدانہ کرے...... یہ تمہیں چھوڑ بھی سکتا ہے۔ ایک مسلمان عورت کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے۔''

لیکن اگلے دن تایا کے جانے کے بعد حالات مزید کشیدہ ہوئے جب مرجان اس کے لیے ناشتا لے کر آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زمان کے دونوں بیٹے فرید خان اور نور خان اندر آ گئے۔ ان کے درمیان صرف دو سال کا فرق تھا پہلے کسی وجہ سے وہ دونوں ایک ہی کالج میں اور ایک ہی کلاس میں تھے۔ اس کے بعد انہیں زمان خان کی ضمانت پر سپلائی کا ٹھیکا مل گیا۔ زمان نے اپنے باپ کی طرف سے ملنے والے ترکے میں سے پانچ لاکھ کا نقد زرِ ضمانت جمع کرا دیا۔ وہ خود ایک لیکچرر کی تنخواہ میں سے ایک لاکھ بھی نہ کر پاتا۔ دونوں مل کے کام کر رہے تھے اور بہت پُرامید تھے کہ وہ بیٹی یعنی چھوٹے کنٹریکٹرز کی حد سے نکل کے بڑے ٹھیکے داروں میں شامل ہو جائیں گے۔ علاقہ غیر سے آنے والے باپ کو دنیا میں آگے بڑھنے کے وہ گر نہیں آتے تھے جو انہوں نے لاہور میں زندگی گزار کے سیکھے تھے۔ اب ان کی ماں دونوں کے لیے مناسب بیوی تلاش کر رہی تھی۔

زمان خان نے ان کی صورت سے اندازہ کر لیا کہ وہ کیا بات کریں گے مگر وہ خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔

پہل فرید خان نے کی۔ ''بابا، ہم آپ سے فائنل بات کرنے آئے ہیں۔''

زمان نے ناشتا ختم کر کے اخبار رکھ دیا۔ ''ہاں، بولو۔''

نور خان نے کہا۔ ''یہ جو آپ کر رہے ہیں، ٹھیک نہیں ہے۔''

''میرے لیے کیا ٹھیک ہے، اس کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ کیونکہ تمہارا باپ میں ہوں۔ تم میرے باپ نہیں ہو۔''

''یہ ماں کے ساتھ ناانصافی ہے۔''

''ہم یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔''

''مرجان نے تایا کو فیصلے کے لیے بلایا تھا۔'' زمان خان بولا۔

''ہم تایا کے فیصلے کو نہیں مانتے۔'' فرید خان برہمی سے بولا۔

''تمہاری ماں تو مانتی ہے۔'' زمان خان سکون سے بولا۔

''اس کی مجبوری سے فائدہ مت اٹھاؤ بابا۔ اب وہ اکیلی اور بے سہارا نہیں ہے۔'' نور خان چلّایا۔

''ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اگر تم نے دوسری شادی کی تو ہم اس گھر سے چلے جائیں گے۔''

دوسرا بولا۔ ''اور ماں کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ اب ہم آپ کے محتاج نہیں ہیں۔''

زمان خان نے سر ہلایا۔ ''لے جاؤ اگر وہ جانا چاہے۔ وہ جہاں بھی رہے گی میری بیوی ہوگی پھر تمہاری ماں۔''

''اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا بابا۔'' نور خان چیخ کے بولا۔

''چلّاؤ نہیں۔'' زمان خان دہاڑا۔ ''میں بہرا نہیں ہوں۔ اور دھمکی مت دو مجھے۔''

نور خان بولا۔ ''یہ دھمکی نہیں۔ آپ دیکھ لیں گے۔''

زمان کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ''تم بھی دیکھ لو گے دربدر کون ہوتا ہے۔ میں یا تم...... دو دن میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ یہ جو عیاشی کی زندگی گزار رہے ہوتا......''

''مجھے پتا تھا یہی کہیں گے آپ...... ہماری نقد ضمانت واپس لے لیں گے۔''

''ہاں، یہ بھی کر سکتا ہوں۔ یہ ساری ٹھیکے داری اسی کے دم سے ہے۔ اور تم جو بڑے ٹھیکے دار بننے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ یہ ختم ہو جائیں گے تو ساری اکڑفوں نکل جائے گی۔ جاؤ جو کرنا ہے کرو۔ خبردار جو مجھ سے آئندہ اس مسئلے پر بات کی۔ اپنی زندگی تباہ کرو۔ ماں کی کر کے کوئی ثواب نہیں لے گا تمہیں۔'' وہ چیخ کر بولا۔

''تم طلاق کی دھمکی دے رہے ہو؟'' فرید خان چلّایا۔

''جو چاہو سمجھ لو۔ تم روک سکتے ہو مجھے؟''

مرجان نے ایک چیخ ماری اور صوفے سے منہ کے بل فرش پر گر گئی۔

☆☆☆

رضیہ بیگم دیکھ رہی تھیں کہ صرف بیٹوں کے نہیں ان کی

بیویوں اور بچوں کے رویّے بدلے ہوئے ہیں۔ مانا کہ امتحان کے بعد وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے تھے اور گرمی کی چھٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ تو گزشتہ کئی سالوں سے ایک معمول تھا۔ اس سے پہلے کبھی پوتا پوتی اپنی رپورٹ کارڈ کے ساتھ انعام لینے حاضر نہیں ہوئے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ شور مچا رہے تھے۔ دادی میرے نمبر زیادہ ہیں۔

''مگر میرے سب اے گریڈ ہیں دادی۔''

''دادی ٹاپ میں نے کیا ہے کلاس میں۔'' پوتی چلائی۔

دونوں بہوئیں بڑی سعادت مندی سے مسکراتی رہیں۔ بیٹے مطمئن انداز میں اس ڈرامے کو دیکھتے رہے جس کے اسکرپٹ کے ہدایت کار وہ خود تھے۔ ہر دادی کے جذبات کو بڑی آسانی سے ہوا دی جا سکتی ہے۔

رضیہ بیگم کا رُواں رُواں اس خوشی سے سرشار تھا جو اب تک فقط آرزو کی بات تھی۔ ''اچھا، اچھا...... سب کو ملے گا انعام۔ شورمت کو۔ یہ بتاؤ کسے کیا چاہیے؟''

بڑا پوتا چلایا۔ ''مجھے ریس والی سائیکل چاہیے۔ چار گیئر ہوتے ہیں اس میں۔''

پوتی نے اس سے اونچی آواز میں کہا۔ ''میں اسکیٹس لوں گی۔ پاکستانی نہیں...... امپورٹڈ...... پھر میں ہر ہفتے ممی پاپا کے ساتھ جاؤں گی جناح پارک کے اسکیٹنگ رنک (RINK) میں...... اور سب کے ساتھ اسکیٹنگ کروں گی۔ ایسی زبردست میوزک لگاتے ہیں وہ......''

''اچھا ممی پاپا کے ساتھ...... میرے ساتھ کیوں نہیں؟'' دادی نے کہا۔

''آپ کے ساتھ بھی۔'' پوتی نے ماں کی نظر کا اشارہ سمجھ لیا۔

سب سے چھوٹا سوچ کے بولا۔ ''مجھے وہ گیم لینا ہے پلے ہاؤس...... سونی کا پیتا......''

باپ نے اسے ڈانٹا۔ ''دادی کو تنگ مت کرو۔ پتا ہے وہ کتنا مہنگا ہوتا ہے۔''

رضیہ بیگم نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ ''اچھا بھئی...... سب لے لینا اپنی اپنی چیز...... شام کو چلیں گے۔ ٹھیک ہے؟ اب جاؤ کھیلو...... دیکھو پھول خراب مت کرنا۔'' پھر اس نے خدا بخش کو آواز دی۔

وہ دروازے کی اوٹ سے جن کی طرح نکل آیا۔

''جی بیگم صاحب۔''

''دیکھو پہلے تو بچوں سے پوچھو کیا کھائیں گے دن میں۔''

بڑے بیٹے رشید نے کہا۔ ''تم جاؤ خدا بخش...... آج آرام کرو۔''

بہوؤں نے مستعدی سے کہا۔ ''ہم بنائیں گے کھانا۔ آپ بتائیں کیا کھائیں گی۔''

رضیہ نے مسکرا کے کہا۔ ''میں کیا کھاؤں گی...... اب خوراک بہت سادہ ہو گئی ہے۔ عام طور پر دن میں پھل کھا لیتی ہوں یا سلاد وغیرہ...... اس کے ساتھ دہی......''

''میں لازانیا بناتی ہوں ماما۔'' بڑی والی نے کہا۔ ''آپ دیکھیے...... کسی اٹالین ریسٹورنٹ میں نہیں کھایا ہوگا ایسا۔''

چھوٹی نے فوراً چٹکی بجائی۔ ''میں چائنیز رائس بناتی ہوں اور چکن کارن سوپ۔''

رضیہ نے انہیں روک دیا۔ ''تم اپنے لیے بناؤ۔''

رشید نے کہا۔ ''ارے اماں...... ایک بار کھا کے تو دیکھیے، کیسی کمال کی شیف ہیں آپ کی بہوئیں۔''

رضیہ چپ ہو گئی۔ بچوں کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بہت کچھ بھول گئی تھی۔ یہی بہوئیں جانتے بوجھتے بدمزہ سالن اور کچے پکے چاول بنا کے سامنے رکھتی تھیں اور صاف کہتی تھیں کہ انہوں نے تو شادی سے پہلے کچن کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ ہم بھی جاہل رہ جاتے اگر ہانڈی چولھے میں لگ جاتے۔ کیا پتا تھا آگے نصیب یوں پھوٹے گا۔

بہوؤں کے چلے جانے کے بعد خاموشی کا ایک مختصر بوجھل وقفہ آیا۔ پھر رضیہ بیگم نے کہا۔ ''رشید! کیا ہے یہ سب؟''

رشید نے مسکرا کے کہا۔ ''کیا اماں؟''

''یہی...... اچانک پوتے پوتیوں کو یاد آ گیا کہ ان کی ایک دادی بھی ہے اور بہوئیں اتنی اچھی شیف ہو گئیں۔''

''وہ تو آج کل ٹی وی پر جو کھانے پکانے کے پروگرام آتے ہیں۔''

''تمہاری شادی سے پہلے تو ان کے ماں باپ بڑے دعوے کرتے تھے کہ ماشاءاللہ گھرداری میں ماہر ہیں بیٹیاں اور سب اتنا اچھا پکاتی ہیں۔''

حمید نے کہا۔ ''چھوڑیں پرانی باتیں اماں...... انت بھلا سو بھلا۔''

''یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے اماں...... ایک جذباتی غلطی کرنے کے بعد آدمی کو احساس ہو جائے، تو ٹھیک

ہے۔"

"اچھا؟ تو اب تم دونوں نے واپس آ کے میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔" رضیہ بیگم مسکرائیں۔

رشید نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "یہاں آ کے رہنے کا تو نہیں مگر ہم رہیں گے ایک ساتھ......"

"بزرگوں کا سایہ ہونا چاہیے سر پر...... اور ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ رکھیں گے اور کوئی شکایت نہیں ہونے دیں گے کبھی۔" حمید بولا۔

"ہم اسلام آباد کی کوٹھی میں رہیں گے۔ جدید طرز کی۔ باغات میں گھری ہوئی۔ جہاں بڑے بڑے بیوروکریٹس رہتے ہیں۔"

رضیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "اسلام آباد میں کوٹھی خریدی ہے تم نے؟"

رشید نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "نہیں، خریدی تو نہیں۔"

"پھر کیا کرائے پر لی ہے؟ وہاں تو دو لاکھ سے کم کرایہ نہیں ہوتا۔ اتنی بڑی کوٹھی کا۔"

"ہم خرید لیں گے اماں...... تین چار کروڑ میں بہترین کوٹھی۔ کسی سرسبز جگہ...... وہاں رہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ یہ جگہ تو اب کباڑ خانہ بن گئی ہے۔ ہر وقت کا شور...... اور آس پاس رہنے والے...... توبہ......"

"کہاں سے آئیں گے یہ تین چار کروڑ رشید؟"

"دیکھو ماں، کوٹھی آپ ہی خریدو گی اور آپ کے نام ہی ہوگی۔ اس جگہ کے بہ آسانی پانچ کروڑ مل جائیں گے۔ کمرشل ویلیو ہے۔"

رضیہ کی تیوری چڑھ گئی۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس جگہ کو بیچ دوں گی۔ جو تمہارے باپ کی نشانی ہے۔"

حمید نے جھلا کے کہا۔ "ان کی نشانی ہم نہیں ہیں؟"

"صاف بتاؤ تمہارا مقصد کیا ہے یہ بات کہنے کا؟" رضیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

اب اصل بحث شروع ہوئی۔ "اس میں سے پچاس لاکھ مجھے ملیں گے تو میرا مستقبل بن جائے گا۔"

"اور پچاس لاکھ مجھے نہ ملے تو یہ سنہری موقع میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ کیا منحوس اجاڑ جگہ پر پڑی ہیں آپ اس بڈھے کھڑوس کے ساتھ...... بیٹوں، پوتوں سے رونق ہوتی ہے اس عمر میں۔"

رضیہ کا رویہ اور سخت ہو گیا۔ "کیا سوچ کے تم آئے تھے یہاں...... ایک بڑھیا کو بے وقوف بنا لو گے؟ جذباتی استحصال کا ڈراما کر کے...... یہ جگہ جیسی بھی ہے...... میرے لیے جنت ہے۔ میں یہاں سے نکل کے کسی خوب صورت جہنم میں نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں خوش اور پُرسکون ہوں۔ تم بھی سکون اور خوشی کے لیے ہی گئے تھے نا؟ یہاں آنا چاہو تو گھر تمہارا ہے۔"

"یہ صرف ایک ڈائیلاگ ہے۔ گھر کی مالک آپ ہیں۔" رشید نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ یہ پہلے کئی بار ہونے والی گفتگو زیادہ تلخ ہو جاتی۔ گیٹ سے ڈاکٹر علی نے اندر قدم رکھا۔ وہ زردی شرٹ اور لال رنگ اور لانگ برمودا میں تھا۔ حمید نے ناگواری کا اظہار کیا۔ "دیکھو ذرا اس رنگین مزاج بڈھے کو...... نیکر پہن کے پھر رہا ہے۔"

رشید نے تائید کی۔ "ہمیں تو شرم آتی ہے گھر میں پہنتے ہوئے۔"

ڈاکٹر علی نے قریب آ کے خوش دلی سے کہا۔ "ہیلو...... گڈ مارننگ ایوری باڈی... بڑی رونق ہے آج تو......"

رضیہ مسکرائی۔ "اور آج لنچ کا بھی اسپیشل مینیو ہے۔ لازانیا...... چائنیز رائس اور چکن کارن سوپ...... میری بہوئیں بنا رہی ہیں۔"

اس نے آنکھیں جھپکائیں اور بیٹھ گیا۔ "مجھے صبح سے آوازیں آ رہی تھیں۔"

رشید نے کہا۔ "ڈاکٹر علی! کیا آپ کے خیال میں یہ ڈریس معیوب نہیں ہے؟"

وہ حیران ہوا۔ "معیوب؟ اس میں تو مولوی صاحب نے نماز باجماعت میں شامل ہونے پر اعتراض نہیں کیا۔ گھٹنوں سے نیچا اور ٹخنوں سے اوپر یہ لباس شرع کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ آپ کیسی ہیں مسز عزیز...... دوبارہ تو بخار محسوس نہیں ہوا؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"دراصل ہم ایک خالص فیملی ایشو پر بات کر رہے تھے۔" رشید نے کہا۔

"اوہ...... پھر تو میں نے مداخلت کی ہے۔" وہ کھڑا ہونے لگا۔

رضیہ بیگم نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ "وہی پرانا قصہ ہے ڈاکٹر علی...... بچے کہتے ہیں کہ اس جگہ کو بیچ کے اسلام آباد میں رہیں...... مگر اب اسے میری جذباتی وابستگی کہو یا کچھ اور...... مجھے یہ جگہ بہت عزیز ہے۔ میں نے خود کھڑے

رہ کے یہ گھر بنوایا تھا اور عزیز نے اس میں ایک ایک چیز میری فرمائش پر لگوائی تھی۔''
''لیکن یہ کتنی پرانی بات ہے اماں...... پچاس سال تو ہو گئے۔''
''جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے تو پرانی زندگی کی ہر یادگار تمہیں بھی عزیز ہو جائے گی۔ یہ تو گھر گھر کی کہانی ہے۔ اب میرے بچے کہتے ہیں کہ کینیڈا یا آسٹریلیا چلو، اتنی رقم انویسٹ کر کے شہریت آسانی سے مل جاتی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے یہاں کی مٹی میں دفنا کے تم چلے جانا مجھے پاکستانی ہی مرنے دو۔''
''یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔''
''زندگی ساری جذبات کا کھیل ہے۔ ورنہ آدمی اور مشین میں کیا فرق ہے جو تم بھی رکھتے ہو بیوی بچوں کے لیے...... اب دیکھو وہ میرے دوسرے پڑوسی کو...... بچے چلے گئے اسے چھوڑ کے...... اس نے ساری پراپرٹی ایک خیراتی ادارے کو دے دی۔''
''اس نے ظلم کیا اپنے بچوں پر۔'' رشید بولا۔
''اور بچوں نے ظلم نہیں کیا اس پر؟ جب اسے ضرورت تھی سہارے کی وہ ماں باپ کو چھوڑ کے چلے گئے تھے۔'' رضیہ نے تلخی سے کہا۔ ''وہ مستحق تھے اسی سزا کے...... ناخلف...... نافرمان اولاد سے تو اچھا ہے اولاد ہی نہ ہو...... جو صرف اپنا مفاد دیکھے۔''
''اماں کو سنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے وقت میں کیا والدین اپنا مفاد نہیں دیکھتے۔ پھر جب بچوں کا وقت آتا ہے تو ان سے کیوں توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنا مفاد نہ دیکھیں۔'' رشید بولا۔
ڈاکٹر علی نے بڑی ہوشیاری سے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ ''ارے بھئی یہ دنیا تو ایسے ہی چلتی رہے گی۔ ہمارے بعد بھی اور تمہارے بعد بھی...... یہ سناؤ کہ آج کل کر کیا رہے ہو؟''
''وہی دن رات گدھے کی طرح محنت...... لاحاصل محنت...... زندگی اسی طرح گزر رہی ہے کہ فراغت نصیب نہیں۔ اخراجات کسی طرح پورے نہیں ہوتے۔'' رشید نے کہا۔
''ایسا ہی ہوتا ہے شروع میں۔''
حمید نے کہا۔ ''کیسا شروع...... دس سال ہو گئے ڈاکٹر علی...... وہی غربت اور تنگ دستی ہے۔''
ڈاکٹر علی ہنسنے لگا۔ ''اگر تم غریب ہو، اس کار اور معیارِ زندگی کے ساتھ...... تو اللہ سب کو غریب کرے۔ تمہارے گھر میں اے سی، فریج، ٹی وی سب ہوں گے۔ کار بھی اچھی ہے۔''
حمید چڑ گیا۔ ''ہمیں اس معیارِ زندگی کا عادی کس نے بنایا۔ اب اسے برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر ہم لاوارث ہوتے کوئی آسرا نہ ہوتا تو اور بات تھی۔ اب ہمارے لیے مواقع ہیں ترقی کرنے کے...... ہماری زندگی بدل سکتی ہے۔ بس تھوڑے سے سرمائے کی ضرورت ہے۔''
''اور سرمایہ بھی ہے۔ لیکن ہمیں آج دستیاب نہیں۔'' رشید نے کہا۔
''میں سمجھا نہیں...... سرمایہ ہے تو کیوں دستیاب نہیں؟'' ڈاکٹر علی بولا۔
''اماں کہتی ہیں کہ یہ سب تمہارا ہی ہے لیکن میرے بعد...... ہم کہتے ہیں پانچ کروڑ ملتے ہیں اس جگہ کے تو بیچو اور نکلو اس کباڑ خانے سے اسلام آباد میں رہو۔ ایک کروڑ ہمیں دے دو آج...... کل نہ جانے کب آئے۔''
''جب میں نے بتا دیا ایک بار صاف صاف کہ میں یہ جگہ نہیں بیچوں گی جب تک میں زندہ ہوں۔ کیوں ڈاکٹر علی کے سامنے شور کر رہے ہو۔'' اماں بگڑ گئی۔ ''جاؤ دعائیں مانگو میرے مرنے کی۔''
''او کے، او کے...... نہ بیچیں...... اس کی گارنٹی پر بینک سے ہمیں ایک کروڑ کا لون کھڑے کھڑے مل جائے گا۔'' حمید نے معاملے کو سنبھالا۔ ''اس میں تو کوئی حرج نہیں۔''
''تمہارا مطلب ہے گروی رکھ دوں؟ اور تم لون ادا نہ کرو تو بینک مجھے نکال باہر کرے...... میں کہاں سے دوں گی ایک کروڑ کے قرضے کی قسط......'' اماں نے غصے میں کہا۔ ''میں اس معاملے میں اب بات ہی کرنا نہیں چاہتی۔''
ڈاکٹر علی نے کہا۔ ''تم زبردستی نہیں کر سکتے ماں کے ساتھ...... اور نہ بدتمیزی......''
''آپ مت بولیں ہمارے معاملات میں...... جائیں کھانا کھا کے۔'' رشید کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔
حمید نے بھی بھائی کو سپورٹ کیا۔ ''آپ جائز بات نہیں کر رہے...... اماں کو شہ دے رہے ہیں۔''
''میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا تھا لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اس پر خاموش بھی نہیں رہ سکتا۔'' ڈاکٹر علی نے سخت لہجے میں کہا۔
''ڈاکٹر علی کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ میرے مہمان

ہیں۔ تمہارے نہیں۔'' اماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... پھر ہم ہی چلے جاتے ہیں۔'' رشید کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ حمید کھڑا ہو گیا۔ ''ہم بھی یہاں ذلیل ہونے نہیں آئے تھے۔''

مہمان رخصت ہو گئے۔ خدا بخش نے جو کھانا میز پر لگایا تھا وہ پڑا ٹھنڈا ہوتا رہا۔

☆☆☆

عجب گل نے پتے میز پر پھینک دیے۔ ''ایسے کھیلنے کا کیا فائدہ...... تمہارا دھیان کہیں اور ہے۔''

اس کے پارٹنر نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ ''بھائیاں دی جوڑی آج پریشاں ہے۔'' اور اٹھ کھڑا ہوا۔

نور خان اور فرید خان اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئے۔ عجب گل کا پارٹنر شاہ زیب ان سے ہاتھ ملا کے اپنی جیپ میں بیٹھا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا ماڈل تھا جس کو زرد اور لال رنگ دے کر پیچھے دو سیٹوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس کھلی جیپ کے پیچھے موٹے فولادی پائپ کا فریم تھا جس پر دو بڑی بڑی سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں۔ شاہ زیب کی جیپ کو علاقے کی پولیس پہچانتی تھی۔

عجب گل نے کلائی کی راڈو گھڑی کو سامنے کے رخ کیا۔ ''ٹرک ابھی تک آئے نہیں۔'' اس نے جیب میں سے موبائل فون نکالا لیکن کوئی نمبر ڈائل کرنے سے پہلے اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ عجب گل نے رکھی انداز میں کہا۔ ''ہاں؟ اچھا...... ٹھیک ہے۔'' اور فون واپس جیب میں رکھ لیا۔

''جی ٹی روڈ پر ٹریفک جام تو اب روز کا معمول ہو گیا ہے۔ آؤ ادھر ہی بیٹھتے ہیں۔'' اس نے گودام کے سامنے والے حصے میں بنے ہوئے مختصر سے لان پر رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ ہماری زندگی کا ہے۔'' فرید خان نے سامنے بیٹھ کے سگریٹ جلائی۔

''تم نے بتایا تھا کہ تمہارا باپ دوسری شادی کر رہا ہے۔'' عجب گل بولا۔ ''یار کیا فرق پڑتا ہے اس سے تمہیں...... تم اتنے چھوٹے بچے نہیں ہو اور پھر ماں ہے تمہارے ساتھ...... اس عورت سے تعلق نہیں رکھنا تو نہ رکھو۔''

''بات اتنی آسان اور سادہ ہوتی عجب گل تو ہم پریشان کیوں ہوتے۔ علاقہ غیر سے ہمارا تایا آ گیا تھا۔ اب وہی قبیلے کا سربراہ ہے اور ابا کے حق میں فیصلہ دے کر چلا گیا۔

''اس نے سمجھ لیا ہو گا نا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا اور بیٹا...... ایسا وقت نہ آئے تو اچھا ہے لیکن کبھی تم پھنس گئے نا کسی کے جال میں...... شادی کے بیس تیس سال بعد...... تو تم بھی کسی کی نہیں سنو گے۔''

فرید خان نے کہا۔ ''ہماری ماں کچھ سمجھنے کو تیار نہیں۔ اس نے ابا کو صاف بتا دیا ہے اور ہم سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی جان دے دے گی۔ کسی دوسری عورت کو گھر میں برداشت نہیں کرے گی۔''

''تم اسے لے کر الگ ہو جاؤ...... کسی دوسرے گھر میں۔''

''یار کیسی بے وقوفوں والی بات کرتا ہے تو...... کون سا دوسرا گھر ہے ہمارا؟ ابھی آمدنی کیا ہے ہماری کہ ہم کرائے پر ہی ایسی جگہ لینے کا سوچ سکیں، ہمارا کام ابھی شروع ہوا ہے اور ہم لے لیں کوئی چھوٹا سا گھر تو ماں ہمارے ساتھ نہیں جانے والی...... باپ کا فیصلہ اٹل ہے کہ وہ شادی کر کے رہے گا۔''

''کون ہے وہ دوسری عورت؟'' عجب گل بولا۔

نور خان بولا۔ ''اس کے ساتھ کوئی لیکچرر ہے...... بیوہ ہے...... عمر کم نہیں...... ہمارے برابر کا لڑکا کہیں باہر پڑھتا ہے۔''

فرید خان نے کہا۔ ''کل اسی بات پر ابا سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ جہاں چاہو جا کے رہو...... پھر مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ مطلب بہت صاف تھا اس کا...... اس سے دشمنی کی تو وہ ہمیں برباد کر دے گا۔ ہمارے کاروبار کی ضمانت کی اس نے نقد جمع کرائی تھی۔ وہ واپس لے لی تو ہم اٹھنے سے پہلے بیٹھ گئے۔ کہاں جائیں گے۔ یہ کار بھی ہماری نہیں۔''

''یہ تو تمہارے باپ کی بھی نہیں۔'' عجب گل بولا۔

''ہاں، یہ اس عورت کی ہے جس کے چکر میں ابا پڑ گیا ہے۔ اپنی نئی ہونڈا سوک اسے دے دی ہے اور اس کی پرانی کرولا میں خود پھر رہا ہے۔ ہمارے پاس تو اپنی سائیکل بھی نہیں ہے۔ باپ کو اس شادی سے روکنا بہت ضروری ہے ورنہ مجھے تو یقین ہے کہ ماں خودکشی کر لے گی۔''

عجب گل نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیسے روکو گے تم......؟''

نور خان نے بھائی سے سگریٹ لے لی۔ ''عجب گل...... اب اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری...... اس عورت کو سمجھایا جائے کہ شرافت سے

پیچھے ہٹ جائے......ورنہ......"

عجب گل ہنس پڑا۔ "اور تم سمجھتے ہو وہ تمہاری دھمکی سے ڈر کے ہٹ جائے گی۔ وہ تمہارے باپ کو بتا دے گی۔"

"اس کو دھمکی دی جاسکتی ہے کہ امریکا میں اس کا بیٹا محفوظ نہیں رہے گا۔" نور خان بولا۔

فرید خان نے کہا۔ "اور نہ مانی اس کے باوجود......تو اسے بیچ بچ ہٹایا جاسکتا ہے۔ شیری نام ہے اس کا۔"

"وہ کیسے؟" عجب گل تشویش کا شکار ہو گیا۔

"ہے تو وہ ایک عام عورت......جو اکیلی پھرتی ہے۔ میرے باپ کی گاڑی لے کر......کیا وہ اغوا نہیں ہو سکتی؟"

عجب گل نے کہا۔ "اور اغوا کرنے کے بعد......تم کہاں لے جاؤ گے اسے؟"

"ہم اسے......اُدھر پہنچا دیں گے۔ گاڑ دیں گے کہیں......ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ ہمارے پاس چوائس نہیں ہے عجب گل......یا وہ نہیں یا ہماری ماں نہیں......ایک عورت کو مرنا ہو تو......"

عجب گل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پاگل ہو تم دونوں......خود تمہارا باپ تمہیں پکڑوا دے گا۔ اور بیٹا، ایک رات تو بہت ہوتی ہے۔ ایک گھنٹے میں تم سب بتا دو گے کہ کیسے مارا......کہاں مارا اور کہاں گاڑا۔ تم تو ماں کو بچا لو گے۔ ماں نہیں بچا سکے گی تمہیں پھانسی سے۔"

"تو ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟"

"میں؟ میں کیا مدد کروں تمہاری؟" عجب گل بولا۔

"دیکھو، ایک صورت اور بھی ہے۔ اس عورت کا بیٹا سلیم پاکستان آرہا ہے۔ کل میں نے اپنے باپ کو اس عورت سے فون پر بات کرتے سنا۔ شیری چاہتی تھی کہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے اس کا بیٹا اپنے ہونے والے نئے باپ سے مل لے۔ کسی امریکا میں رہنے والے نوجوان کو اس سے کیا غرض کہ پاکستان میں اس کی ماں کیا گل کھلاتی پھر رہی ہے جس ملک سے وہ آرہا ہے وہاں تو یہ عام بات ہے۔ کوئی بھی بڑھیا ایک کے بعد دوسرا کرے......زندگی اس کی اپنی ہے۔ وہ ماں کے ارادوں کی راہ میں مزاحم نہیں ہوگا۔ یہ احساسِ جرم صرف شیری کو ہے۔ میرے باپ نے کہا کہ وہ سلیم سے بات کرے گا۔"

نور خان بولا۔ "وہ دو دن بعد آرہا ہے۔ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ کس فلائٹ سے......وہ ہوسٹن میں رہتا ہے۔ فرض کرو ہم اسے ائرپورٹ سے اٹھالیں۔"

عجب گل چونکا۔ "اٹھالیں؟ وہ کیسے......تم جانتے ہو اسے؟ مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"دیکھو مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسے ریسیو کرنے کوئی نہیں جائے گا۔ کیونکہ وہ لاہور میں نہیں اترے گا۔ اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترے گا اور جائے گا سیدھا نانی کے پاس کیونکہ اس کی ماں تو رہتی ہے گرلز ہوسٹل میں......ماں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ طے یہ ہوا ہے کہ سلیم کا لاہور کے کسی ہوٹل میں انتظام کر دیا جائے گا۔ جب وہ ماں سے ملنے آئے۔ یہ سب میں نے اپنے باپ کی اور شیری کی گفتگو سے اندازہ لگایا ہے۔" نور خان نے کہا۔

"اپنے والد سے آخری بار بات ہونے کے بعد ہم نے اس عورت کے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، ڈر یہ بھی تھا کہ ہمارے باپ کو پتا چل گیا تو مزید خرابی ہوگی۔ حالانکہ خرابی اس سے زیادہ کیا ہوگی جو ہمارا مقدر ہے۔ وہ عورت ہوگی یقیناً چالیس سے اوپر، جس کا جوان بیٹا ہے مگر لگتی بہت کم ہے۔ یہ قدرتی ہے یا اس کے لیے وہ کوشش کرتی ہے۔ ڈائٹنگ اور جم جا کے......یہ نہیں معلوم۔ لیکن وہ ہے خوب صورت اور پُرکشش......مجھے شک تھا کہ وہ میرے باپ پر ڈورے ڈال کے اس کا سب کچھ ہتھیا لے گی۔ ہمارے باپ کے پاس کون سا خاندانی خزانہ تھا۔ وہ تو اس کے باپ یعنی ہمارے دادا نے افغان وار میں اسلحے کی اسمگلنگ اور فروخت میں بہت کمایا ورنہ وہ زندگی بھر درے میں اسلحہ بیچتا رہا جو وہ خود بناتا تھا۔ اس نے مرتے وقت بیٹے کے لیے کافی چھوڑا۔ اتنا کہ ہماری کوٹھی بن گئی اور یہ ہنڈا اسوک کار آگئی۔ نقد بھی کافی ہے اس کے پاس اور کوئی بھی حسین بیوہ اس دولت کے لیے اس پر ڈورے ڈال سکتی ہے۔ اس عمر میں آدمی آسان شکار ہوتا ہے اور پھر ایسی عورت جو بیوہ ہو اور جس کے پاس رہنے کو گھر نہ ہو مگر جو مجھے معلوم ہوا مختلف تھا۔ اس کا باپ راولپنڈی کا خاصا مشہور سرجن تھا جس نے سعودی عرب میں بہت دولت کمائی۔ اس کی ماں پنڈی میں چار کنال کی کوٹھی میں رہتی ہے۔ کسی ڈیفنس جیسے علاقے میں۔ اس کے دو بھائی الگ رہتے ہیں اور ان کے بھی ذاتی گھر اور کاروبار ہیں۔ امریکا والے نواسے کی تعلیم کے اخراجات بھی نانی کے ذمے ہیں۔ وہ لیکچرر گویا خود کفیل ہے۔ معاملہ لالچ کا نہیں۔ بس وہ اپنا گھر بسانا چاہتی ہوگی۔ آخر کب تک ہوسٹل میں رہے گی اور جب ماں مرے گی تو پیسا ضرور ملے گا مگر آج اپنے جیسا لیکچرر شوہر مل رہا ہے تو وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتی۔ ہمارا

باپ ہم پلّہ ہے ہر لحاظ سے...... اور اس کے لیے دیوانہ بھی ہے۔''

اب پھر نورخان نے بات آگے بڑھائی۔ ''پراپرٹی کی قیمت تم جانتے ہو کیا ہے۔ شیری کی ماں کافی عمر کی ہے۔ یہ اگر چالیس پینتالیس کی ہے تو وہ ساٹھ سے اوپر ہوگی۔ اس کے مرنے کے بعد جائداد ان تین وارثوں میں تقسیم ہو گی۔ دو بھائی اور ایک بہن۔ گھر اگر پانچ کروڑ کا ہوگا تو شیری کے ایک کروڑ کہیں نہیں گئے مگر وہ ابھی دور کی بات ہے۔''

''مجھ سے کیا مدد چاہیے تمہیں...... اس عورت کو اغوا اور قتل کرنے کا خیال چھوڑ دو۔ یہ تم نہیں کر سکتے اور میں بھی تمہیں ایسی بے وقوفی نہیں کرنے دوں گا۔''

فرید خان کچھ دیر بعد بولا۔ ''میں سوچتا ہوں اگر ہم نے علاقہ غیر نہ چھوڑا ہوتا تو یہ حالات کتنے موافق تھے۔ تم بھی افغان ٹرانزٹ ٹریڈ میں کتنا کما رہے ہو، ایسے مواقع روز روز کہاں ملتے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔'' عجب گل نے اعتراف کیا۔ ''ہر چیز جو امریکن فوجیوں کے لیے اور افغانستان کے لیے آتی ہے پاکستان سے گزر کے جاتی ہے۔ اس کاروبار میں ہمیں بہت فائدہ ہوا۔''

''ہم تو بیٹھے ہی ایسی جگہ تھے کہ جب چاہتے اس کاروبار میں شامل ہو جاتے لیکن میں اب اسے کیا کہوں...... اس نے بچوں کو پڑھایا۔ کیا وہ جانتا نہیں تھا کہ تعلیم میں کسی کا مستقبل نہیں ہو سکتا۔ پڑھ لکھ کے کوئی دولت مند بنا ہے؟ ایک نے پڑھا اور ایک نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا...... ہمارا ابا یا، اس نے باپ کا بزنس بھی نہیں سنبھالا اور پڑھا بھی نہیں۔ ہمارا باپ لیکچرر ہو گیا تو کون سا مستقبل سنور گیا ہمارا......''

عجب گل نے سر ہلایا۔ ''یار ماں باپ کو شوق ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جاہل رہے...... اولاد نہ رہے...... ٹرک ابھی تک نہیں پہنچے...... خیر، تمہارا پلان کیا ہے اب؟''

''اس عورت کو اغوا یا قتل کرنے کا ہم نے سوچا ضرور تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ بعد میں سوچا تو ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس میں کتنا خطرہ ہے۔ یہ ہم نہیں کر سکتے اور کیا تو کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔ نہ ہمیں، نہ ماں کو اور نہ ہمارے باپ کو۔ پھر بھائی کے دماغ میں یہ بات آئی...... ہمارا خیال ہے سلیم کو ائرپورٹ سے اغوا کر لیا جائے۔''

عجب گل نے ان دونوں کی صورت دیکھی۔ ''یہ تو اور بھی مشکل ہوگا اور پھر اس سے ملے گا کیا تمہیں؟''

''پہلے میری بات سن لے۔'' نورخان بولا۔ ''میں نے اپنے باپ کی گفتگو سنی۔ وہ ہر رات اس عورت سے گھنٹوں بات کرتا ہے۔ میری ماں اپنے کمرے میں لیٹی جاگتی رہتی ہے اور روتی رہتی ہے۔ دو دن جاسوسی کر کے مجھے پتا چلا کہ شیری کا بیٹا پنڈی جائے گا کراچی سے...... نانی اکیلی ہے اور اسے ریسیو کرنے نہیں جائے گی۔ ماں لاہور میں ہے واپس جانے سے پہلے وہ ماں سے ملنے بھی آئے گا۔ اسی وقت وہ عورت شیری اسے اپنی شادی کے بارے میں بتائے گی اور اپنے شوہر سے ملوائے گی۔ وہ ایک بار پہلے آیا تو ہوٹل میں ہی ٹھہرا تھا۔ یہ بات معلوم ہوگی تو شاید وہ خوش نہ ہو مگر کچھ بولے گا نہیں۔ اس کی طرف سے ماں جائے جہنم میں...... نہ وہ اس کی خاطر امریکا جا سکتی ہے اور نہ وہ ماں کے لیے پاکستان آئے گا۔ بڑھاپے کی لاٹھی بن کے...... یہ ان کی آخری ملاقات ہوگی۔''

''یار کام کی بات کرو۔ اس کو اغوا کیسے کرو گے اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟'' عجب گل نے بے چینی سے کہا۔

''اس کو ریسیو کرنے ہم ائرپورٹ پہنچ جائیں گے۔'' فرید خان بولا۔ ''تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ باہر سے اجنبی آئے جسے پہچانتا کوئی نہ ہو۔ تو ایک آدمی ہارڈ بورڈ پر مسافر کا نام لکھ کر اس راستے پر کھڑا ہو جاتا ہے جس پر چل کے مسافر آتے ہیں اور وہ اجنبی ریسیو کرنے والوں کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ کسی ہوٹل یا کسی اور جگہ جہاں اسے ٹھہرنا ہو۔ یہی ہم بھی کریں گے لیکن پہلے دیکھ لیں گے کہ کوئی اور تو موجود نہیں۔ سلیم کو گھر کا راستہ معلوم ہے۔ یہ معلوم ہوگا کہ نہ ماں آ سکتی ہے نہ نانی...... کوئی ڈرائیور آ سکتا ہے۔ ورنہ وہ ریڈیو کیب لے کر خود نانی کے گھر چلا جائے گا۔ وہ اپنا نام دیکھ کے ہمارے ساتھ چل پڑے گا۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد عجب گل نے پہلو بدلا۔

''اور تم کہاں لے جاؤ گے اسے؟''

''ہم اسے یہاں لے آئیں گے، تیرے گودام میں۔''

عجب گل کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''یہاں...... ؟ کس لیے؟''

نورخان نے فرید خان کی طرف دیکھا۔ ''اس لیے کہ یہ جگہ محفوظ ہے۔ نہ وہ بھاگ کے کہیں جا سکتا ہے نہ کوئی اس کا سراغ لگا کے یہاں آ سکتا ہے۔ لیکن یہ ہے ہمارے پلان کا پہلا حصہ...... اسے یہاں قید کر کے ہم اس کی نانی سے ایک کروڑ کا تاوان طلب کریں گے۔''

عجب گل باری باری دونوں بھائیوں کو دیکھتا رہا۔

''نانی ایک کروڑ ادا کردے گی؟''

''بالکل کرے گی۔ سلیم کی ماں دلوائے گی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے۔ اس کام میں تیری مدد چاہیے۔ یہ کام ہم نے کبھی کیا نہیں۔''

''اب تو ہم بھی نہیں کرتے۔'' عجب گل سوچ میں پڑ گیا۔ ''ایک کروڑ کا کیا کرو گے۔ ابھی نہ سہی...... بعد میں پکڑے جاؤ گے تم۔''

''ہم ایک کروڑ تجھے دے دیں گے۔''

''مجھے؟ اس لیے کہ بینک میں نہیں رکھوا سکتے؟'' عجب گل بولا۔

''نہیں، ایک کروڑ سے ہم تیرے کاروبار میں شامل ہو جائیں گے۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا، ہمیں بھروسا ہے تجھ پر۔''

عجب گل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تو بہت بڑا جوا کھیل رہے ہو تم جس میں کامیابی کا امکان تو ہے مگر بہت کم۔''

''اس میں تیرے لیے تو کوئی رسک نہیں۔ تو نے خود بتایا تھا کہ تیرے باپ چچا اغوا برائے تاوان کرتے رہے ہیں۔ اور تو بھی بعد میں ان کا شریکِ کار ہو گیا تھا۔''

''میں نے کہا نا کہ یہ بہت پرانی بات ہے۔ کئی سالوں سے ہم صرف افغان ٹریڈ میں شریک ہیں۔ اِدھر سے اُدھر مال لاتے لے جاتے ہیں۔ تمہیں کیا تجربہ ہے اس کام کا؟''

''اسی لیے تو تجھ پر بھروسا کر رہے ہیں۔ تیرے پاس تجربہ ہے، جگہ ہے اور لوگ ہیں۔''

وہ ان کی صورت دیکھتا رہا۔ ''اور میں تمہارا ایک کروڑ لے کر مکر گیا...... پھر......؟''

انہوں نے ایک ساتھ سر ہلایا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں تجھے۔'' نور خان بولا۔

''کاروبار میں دوستی کوئی چیز نہیں ہوتی۔''

''اعتبار تو ہوتا ہے۔ تمہارا تو سارا کاروبار زبان پر چلتا ہے۔ دیکھ عجب گل! ہم ایک آدمی تیرے حوالے کر دیں گے۔ اس کو یہاں لانا ہمارا کام ہے۔ اس کے بعد کے معاملات میں ہم اناڑی ہیں۔ اس کے بدلے میں ایک کروڑ کیسے وصول کرنا ہے، یہ ہم نہیں کر سکتے۔ اس میں تیرا تجربہ ہمارے کام آسکتا ہے۔''

''ایک کروڑ تو میں وصول کر لوں گا۔'' عجب گل نے کسی حد تک غرور آمیز یقین کے ساتھ کہا۔

''اس کے بعد بندے کو چھوڑ دینا، ہماری رقم تیرے پاس...... جیسے چاہے استعمال کر...... بس ہمارا منافع ملتا رہے...... سال دو سال...... چار سال...... ہم بالکل خاموش اور لاتعلق بیٹھے رہیں گے۔''

عجب گل نے سر ہلایا۔ ''چار سال میں رقم دگنی ہو جائے گی۔ لیکن اس سے تمہاری ماں کا مسئلہ تو حل نہیں ہو گا؟''

''ہاں، ابھی ہم کچھ کرنے کی پوزیشن میں جو نہیں ہیں مگر اس کے بعد ہم ماں کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

''کس ماں کے لیے...... وہ تو کہتی ہے کہ ابھی خودکشی کر لے گی اگر تمہارے باپ نے دوسری شادی کی۔''

''عجب گل، سب عورتوں کے جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں مگر ہم اسے منالیں گے کہ ہماری خاطر زندہ رہے۔ رو دھو کے...... اس کے پاؤں پڑ کے...... ڈراما کامیاب ہوگا ہمارا کیونکہ جب اولاد جوان ہو جائے تو عورت کے جذبات کا پلڑا ان کی طرف جھک جاتا ہے اور ہمارے معاملات میں شوہر کا ساتھ نہ دینا اب آسان ہوگا۔ یہ سب کے مسئلے کا حل ہوگا۔ باپ اپنی نئی بیوی کے ساتھ خوش۔ ماں اپنے جوان بیٹوں کے ساتھ خوش...... جن پر باپ کا کوئی اختیار نہیں۔ بیٹے اسے عیش کی وہ زندگی دیں گے جن کا وہ شوہر کے ساتھ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اور وہ آزاد ہوگی۔ حاکم ہوگی۔ اپنی مرضی سے بہوئیں لائے گی اور راج کرے گی۔''

''بس بس...... اتنی دور کے خواب ابھی مت دیکھو۔ یہ سوچ لو کہ پہلا کام پہلے...... اگر تم اس ایک کروڑ کی اسامی کو یہاں تک لے آئے تو باقی کام میرا۔ تم جا کے چین سے سو جاؤ۔ اس کو لانے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا میں۔ کامیابی اور ناکامی دونوں کے ذمے دار تم۔ لیکن ایک کروڑ وصول کر کے دینا میری ذمے داری۔ تمہیں بزنس میں شامل کرنا اور تمہارا منافع تم کو دینا میری ذمے داری۔''

انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ کامیابی کی بنیاد کامیابی سے رکھی جا چکی تھی...... اگر عجب گل انکار کر دیتا تو......

باہر سے ٹرک کا پریشر ہارن سنائی دیا۔ وہ دونوں اٹھے اور گاڑی باہر نکال لی۔

''عجب گل یاروں کا یار ہے۔ کتنی آسانی سے مان گیا۔'' نور خان بولا۔

''اور بھروسے کے قابل بھی۔ پٹھان ہے اور کاروباری۔'' فرید خان گاڑی چلاتا رہا۔

''سب سے بڑھ کر یہ کہ شریف آدمی نہیں۔ جو رسید

اور اسٹامپ...... حلف نامے اور قرآن کو ضامن بنا کے بھی مکر جاتے ہیں۔'' نور خان باہر دیکھتا رہا۔ اب ڈیفنس کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ بنگلوں کی وسعتِ آرائش اور جدید ڈیزائن دیکھتا رہا اور ان چیزوں کا تصور کرتا رہا جو مکینوں کو حاصل تھیں۔ کیا کبھی یہی لائف اسٹائل اس کو حاصل ہوگا؟ آخر خواب دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ خواب نہ ہوں تو تعبیر کا کیا تصور۔

☆☆☆

سفری دستاویزات میں وہ قانونی حیثیت کے حامل میاں بیوی تھے۔ اس میں کوئی بھی بات انوکھی یا شک وشبہ پیدا کرنے والی نہیں تھی۔ سلیم .... ایک پاکستانی طالب علم تھا۔ اس کی بیوی پیدائشی طور پر امریکن تھی۔ اس کا عمر میں زیادہ ہونا بھی عام سی بات تھی۔ صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی تھی۔ دولت سے تو خیر سب کچھ ممکن تھا کہ ستر سال کی بڑھیا کسی پچیس سالہ شوہر کی وفاداری خرید لے یا ستر سال کا بڈھا کسی ٹین ایجر کو اپنا لے مگر صرف چاہت کی بنیاد پر ایسی شادیاں ہوتی تھیں جن میں دونوں فریق وفاداری کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ امریکن معاشرہ فرد کی مکمل آزادی کا ضامن تھا۔ اب تو مرد کی مرد سے یا عورت کی عورت سے شادی ہو رہی تھی۔

سلیم نے آخری بار کوشش کی اور جب شیری نے کال ریسیو کی تو اس نے جھنجلا کے کہا۔ ''واٹ از دس ماما...... سو دفعہ کال کر چکا تھا میں...... ایک گھنٹے میں۔''

''سلیم ...... وہاں رات کے 9 بجے ہوں گے لیکن یہاں صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ میں کلاس روم میں تھی۔ میرا موبائل فون بند تھا۔''

''او کے، او کے۔ بتانا یہ تھا کہ ہمیں بورڈنگ کارڈ مل گیا ہے۔''

''ہمیں؟ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟''

''یہی بتانے کے لیے فون کر رہا تھا۔ میں نے شادی کر لی ہے۔''

شاک کا لمحہ گزر جانے کے بعد شیری نے پوچھا۔ ''کس سے؟''

''ظاہر ہے کسی لڑکی سے...... وہ امریکن ہے۔''

''جو تم پلان کر چکے تھے۔ شہریت حاصل کرنے کے لیے؟'' وہ تلخی سے بولی۔

''ہاں، سب کرتے ہیں۔ اس میں انوکھی کیا بات ہے۔ لوگ دگنی عمر کی کالی پیلی عورت کے شوہر بن جاتے ہیں۔ یہ تو میری ہم عمر اور اتنی خوب صورت لڑکی ہے کہ تم دیکھ کے حیران رہ جاؤ گی۔''

''مجھے اس کو دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔''

''ماما...... ڈونٹ بی سو میڈ۔ میں صرف اسے آپ سے اور نانی سے ملوانے کے لیے پاکستان آرہا ہوں۔'' سلیم خفگی سے بولا۔

''جب تم نے امریکا کو وطن بنا لیا ہے تو پھر پاکستان آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ماما، اس کے بعد میں آپ کو یہاں لانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اسلام آباد میں ریسیو کریں گی نا؟''

شیری نے تلخی سے کہا۔ ''اب تو بالکل نہیں۔''

''او کے، میں ائرپورٹ سے سیدھا نانی کی طرف چلا جاؤں گا مگر میں آپ سے ملنے لاہور ضرور آؤں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں ملوں گی تم سے۔'' شیری نے فون بند کر دیا۔

''گو ٹو ہیل۔'' سلیم نے فون بند کر دیا۔ ''یہ جھوٹ صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے بولا تھا ورنہ میں کب تم سے ملنے آرہا تھا۔ دس ہزار ڈالر مل جائیں گے مجھے...... تم نہیں ملو گی تب بھی۔''

ریٹا کو اس نے ایک قطار سے نکل کر اپنی طرف آتا دیکھا۔ اس کے سنہرے بال جو اس کے چہرے کے گرد جھولتے لہراتے مچلتے پھیلتے اور سمٹتے رہتے تھے بے ترتیب ہو رہے تھے اور اس کی مسکراہٹ میں بھی ٹینشن چھپائے نہ چھپتی تھی۔ ''تھینک گاڈ، سب ٹھیک ہوگا۔ تم کو اتنا نروس نظر نہیں آنا چاہیے۔ ڈونٹ فارگیٹ میں نے کیا بتایا تھا۔''

وہ چڑ کر بولا۔ ''میں بچہ نہیں ہوں اور یہ مت بھولو کہ یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔''

''تجربہ؟ مائی فٹ۔ تم صرف اپنی ماں اور گرینڈ ما سے ملنے پاکستان جا رہے ہو۔ جو تم کئی بار جا چکے ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

وہ ریٹا کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چلنے لگا۔ ''ایک ایسی حسین بیوی کے ساتھ کبھی نہیں گیا پہلے۔''

''تم نے پاکستان میں بات کر لی؟''

''کر لی، اچھا ہوتا کہ نہ کرتا۔ ماما نے مجھ سے ملنے سے ہی انکار کر دیا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہی بات جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ خوش نہیں ہیں کہ

میں نے ان کی مرضی کے بغیر تم سے شادی کر لی۔ اب میں ان کو کیسے بتاتا کہ شادی صرف ایک میرج سرٹیفکیٹ ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہم میاں بیوی کی طرح نہیں رہتے۔'' وہ شوخی سے ہنسی۔ ''ابھی گزشتہ رات......''

''سچ کہوں ریٹا...... اب تمہیں مان لینا چاہیے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ہم شادی کر سکتے ہیں اور تم میرے بچوں کی ماں بن سکتی ہو۔ یہ میری دلی آرزو ہے۔''

''واپس آکے بات کریں گے پرنس...... ابھی تک کوئی شادی نہیں کی میں نے...... اور تم...... اچھے ہو۔'' اس نے ترچھی نظر سے سلیم کو دیکھا اور ہنس پڑی۔

فلائٹ کے دوران میں وہ تقریباً سلیم کی آغوش میں سوتی رہی۔ ان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے سیاہ فام ڈپلومیٹ قسم کے مسافر نے انہیں قطعی نظر انداز کیے رکھا۔ سلیم کے اندر ایک انجانے خوف کا سانپ تھا جو بار بار پھن اٹھاتا تھا۔ ریٹا کی یقین دہانی کے باوجود کہ وہ دسیوں بار آجا چکی ہے اور کچھ غلط ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ جہاز بحراوقیانوس کی لامتناہی وسعت اور تاریکی میں رینگتا رہا۔ اس نے اپنی ماں کا تصور کیا۔ کسی جذباتی احساس کے بغیر۔ وہ مختلف دنیاؤں میں بستے تھے۔ ان کے درمیان جذباتی رشتہ تو پہلے بھی نہیں تھا، ایک جان پہچان کا رشتہ رہے نہ رہے، کیا فرق پڑتا ہے۔

باہر جانے سے پہلے شیری نے آئینے میں اپنے میک اَپ کو فائنل ٹچ دیا اور خود کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ پرفیکٹ، زیرِدام آیا ہوا زمان اب کہاں جا سکتا تھا۔ بس ایک آخری چھری پھیرنے کی دیر تھی اور زمان ہی کیا اتنی جارحانہ تیاری کے ساتھ وہ جس کو بھی نشانہ بناتی، اس کا زخمی دل پھڑکتا ہوا میرے قدموں میں نظر آتا۔ شکاری بندوق کے چھرّے سے زخم خوردہ پرندے کی طرح...... اس نے گردن پر پرفیوم کا ایک اور اسپرے کیا جو بقول زمان کے...... اس کے ہوش و حواس خبط کر دیتی تھی۔ کسی دن میں بے قابو ہو کے دیوانہ وار تم سے لپٹ جاؤں سرِعام تو قصور میرا نہیں ہوگا۔

حیرت انگیز طور پر اب وہ پُرسکون اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ سلیم سے بات کرنے کے بعد اسے صدمہ ہوا تھا۔ یہ بچے بھی کتنے بے مروت ہوتے ہیں جوان ہوتے ہی ماں کی آغوش سے نکل کے کسی اجنبی عورت کی آغوش میں گم ہو جاتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے جذبات پر عقل کا غلبہ ہوا تو اس نے سوچا، کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی تو اسے کرنا ہی تھی۔ بیوی یہاں وہاں کہیں سے بھی منتخب کرنا اس کا حق تھا۔ جغرافیائی فاصلے پہلے بھی ان کے درمیان دوری پیدا کر چکے تھے۔ اب جذباتی رشتوں کا محسوس نہ ہونے والا تعلق بھی ختم ہو گیا تو اچھا ہی ہوا۔ ہر بار جب وہ فون کرتا تھا تو اسے کتنا جھوٹ بولنا پڑتا تھا اور مجھے کتنا جھوٹ سننا پڑتا تھا۔ فون پر اس کی آواز کے پس منظر میں دوسری آواز کسی نہ کسی لڑکی کی ضرور ہوتی تھی۔ وہ تصور کرتی رہتی تھی کہ لڑکی کس حال میں ہو گی۔ لباس برائے نام ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا اور وہ کمرے میں ہوگی یا بیڈ میں اس کے ساتھ خوامخواہ اپنے تصور میں ایسے مناظر دیکھ کے فرسٹریشن کے سوا کیا مل سکتا تھا۔ آج ایک ترکِ تعلق کے رسمی اعلان کے بعد اس رشتے کا بار اٹھانا قطعی غیر ضروری ہو گیا ہے۔ اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے سوچا۔ اب کیا ضرورت ہے زمان کو اس سے ملوانے کی۔

سلیم نے تو خالص امریکی بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ اسے شادی کی خبر دے دی تھی۔ خود اسے سلیم کو بتاتے ہوئے گھبراہٹ ہوتی تھی کہ تمہاری ماں نے نیا باپ تلاش کر لیا ہے۔ اس عمر میں...... عمر؟ مائی فٹ...... عمر کا شادی سے کیا تعلق۔ یہ تو زبردستی کے معاشرتی بندھن ہیں۔ اخلاقی قدروں کی زنجیریں...... اب وہ بالکل آزاد ہے۔ اس کو اچھا شوہر مل گیا جو محافظ بھی ہوتا ہے۔ اس کا مستقبل محفوظ ہے۔ وہ اس پر فریفتہ رہے گا۔ اس کی پہلی بیوی تو اب گوشت کا چلتا پھرتا ڈھیر ہے۔

اس نے گاڑی کو پارک کیا تو زمان پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ساکت ہو کے وقت کے گزرتے لمحوں کی آواز سنتا رہا۔ ٹک ٹک ٹک...... جو اس کے دل کی دھڑکن تھی۔

شیری نے گھبرا کے کہا۔ ''خدا کے لیے زمان...... لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

زمان پیچھے ہٹ گیا۔ ''قصوروار میں نہیں۔ تم ہو، کیوں کرتی ہو یہ میرے ساتھ آخر؟''

شیری نے گاڑی کو لاک کیا۔ ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''کیا ہے۔ تم نے جادو کیا ہے مجھ پر...... پاگل کیا ہے مجھے...... تم نے اور اس خوشبو نے۔''

وہ زمان کے ساتھ چلنے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گے۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ''ٹھیک کہتی ہو تم، پاگل تو میں ہو چکا ہوں۔ کسی دن لوگ دیکھیں گے...... اگر تم راضی ہو تو

ہم آج ہی......"

"آج......" شیری کا دل دھڑکا۔ "آگے چلو، تماشا مت بناؤ مجھے سب کے سامنے۔"

"ہاں آج، مگر...... صبح تمہارا بیٹا آرہا ہے۔ اس سے بھی ملنا ہے۔"

وہ ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ "وہ...... وہ اب نہیں آرہا ہے۔" شیری نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ اور سارا جسم بخار جیسی کیفیت میں جل رہا ہے کیونکہ وہ اپنی رضامندی ظاہر کرچکی ہے۔

زمان نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "یعنی...... ہم آج ہی شادی کرسکتے ہیں۔"

شیری کا سانس اوپر نیچے ہونے لگا۔ "یہ...... یہ کیسے ممکن ہے زمان......"

"ناممکن کو ممکن بنانا میرا کام ہے۔"

اور شیری کو ہوش آیا تو وہ پی سی کے برائیڈل سویٹ میں تھی۔ زمان کے ساتھ...... گزرے ہوئے چار گھنٹے کسی فلم شو کی طرح تھے جس کا یہ آخری سین تھا۔ زمان نے کچھ فون کیے تھے۔ وہ گاڑی چلا کے کہیں لے گیا تھا جہاں آٹھ دس لوگ تھے۔ اس کے دوست...... وہ ڈیفنس کا کوئی گھر تھا۔ چار دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں ایک کسی بیوٹی پارلر کی مالک تھی۔ وہ اپنے ساتھ دلہن کا جوڑا لائی تھی۔ جو بے حد قیمتی نظر آتا تھا اور عین اس کے سائز کا تھا۔ اسی نے شیری کا میک اپ بھی کیا تھا۔ وہیں ایک قاضی آگیا تھا اور اس نے خواب کی کیفیت میں کہہ دیا تھا کہ مجھے قبول ہے۔ بس اس کے بعد مبارک باد کے شور میں وہ سب مختلف گاڑیوں میں بھر کے واپس پی سی پہنچے تھے جہاں دعوت کا انتظام تھا۔

اور اب زمان کے ساتھ اس کی زندگی میں آنے والی دوسری سہاگ رات دھیرے دھیرے نئی زندگی کی صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکیوں کے پردے تاریک کمرے میں روشن مستطیل کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ کیا وقت ہوگا؟ اس نے سوچا۔ اور اپنی کلائی کی گھڑی کو بیڈ سائڈ پر رکھے زیورات میں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اسے اپنے موبائل فون کا خیال آیا، مگر موبائل فون تک پہنچنے سے پہلے اس کے ہاتھ کو سارے وجود سمیت زمان کے بازوؤں نے سمیٹ لیا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ خوابیدہ مخمور لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں...... وقت......"

اس کی بات ہونٹوں پر ہی رہ گئی۔ "وقت کا یہاں کیا کام؟" زمان کے وجود میں سلگتا آتش فشاں بولا جو ابھی سرد نہیں پڑا تھا۔ باہر وہ دن جو گزرے ہوئے تمام دنوں سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھا، بہت پہلے طلوع ہوچکا تھا۔

☆☆☆

کراچی کے جناح انٹرنیشنل ائرپورٹ کے لاؤنج میں ایک ازدحام تھا جو شیشے کے کھلتے بند ہوتے دروازے کے پار امریکا سے پہنچنے والی فلائٹ کے مسافروں کا بے تابی سے انتظار کررہا تھا۔ وہ باری باری اپنے اپنے سامان کی ٹرالی یا کسی بھاری بھرکم سوٹ کیس کے ساتھ نمودار ہوتے تو ان کی متجسس نظریں اپنے سامنے پھیلے ہوئے ہجوم میں کسی آشنا صورت کا بے تابی سے جائزہ لیتی نظر آتی تھیں اور کسی مانوس چہرے کی ایک جھلک اُن کے چہرے کو روشن کردیتی تھی... پھر مسرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلاتے وہ اپنے پیاروں کے گلے لگ جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اندر سے باہر آنے والوں کی تعداد اور ان کو ریسیو کرنے کے لیے آنے والے ہجوم میں کمی آتی گئی۔

فلائٹ براستہ قطر آئی تھی جہاں اس کا اسٹاپ اوور خاصا طویل اور صبر آزما تھا۔ خصوصاً ان کے لیے جو رات بھر کے سفر سے بدحال تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ گھر سے صرف دو گھنٹے کی مسافت پر یہ طویل انتظار نہ ہوتا تو اب تک وہ اپنے گھر پہنچ کے سو چکے ہوتے۔ سامان لانے والی بیلٹ کے گرد صف بستہ مسافروں کی تعداد بھی اب گھٹ گئی تھی۔ وہ سب بیلٹ پر سے گزرتے اسباب میں سے اپنا سوٹ کیس یا بیگ اٹھا کے رکھتے تھے اور گیٹ کی جانب چل پڑتے تھے باقی کی نظر اس کھڑکی پر جمی ہوئی تھی جس میں سے ان کا بیگیج کسی وقت بھی نمودار ہوسکتا تھا۔

سلیم عرف پرنس سام پر تھکن اور کوفت کا شدید غلبہ تھا۔ ایک منٹ میں دسویں بار کلائی کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے اس پسماندہ نظام کو کوستا جہاں اس کے لیے انتظار کے آخری لمحات طویل سے طویل ہوتے جارہے تھے۔ آگے نہ جانے کتنے مرحلے طے ہونے باقی تھے۔ ریٹا کی یقین دہانی کے باوجود کہ یہاں ڈالر کا منتر راستوں کی رکاوٹ بننے والے پہاڑ کو بھی الٰہ دین کے چراغ والے جن کی طرح ہٹاتا ہے۔ وہ اپ سیٹ تھا اور اس کے اپ سیٹ ہونے کی وجہ اسباب ملنے میں تاخیر کے علاوہ قطر کا اسٹاپ اوور بھی تھا۔ ریٹا نے اسے بالکل بے خبر رکھا تھا کہ وہاں بھی ان کو ریسیو کرنے کے

لیے کچھ ''دوست'' موجود ہوں گے۔ دوست تین تھے جو دیکھنے میں سب ایشیائی تھے۔ ان کا تعلق پاکستان، بھارت سے بھی ہوسکتا تھا اور بنگلہ دیش یا سری لنکا سے بھی۔

ان کے نام سلیم کے لیے غیر اہم تھے۔ نام کچھ بھی بتائے جا سکتے تھے۔ ایک کے سوا ان سب کی گہری سانولی رنگت اور کالے بال تھے۔ چوتھا اپنی جلد اور بالوں کی یورپی رنگت کے باوجود اردو میں بات کر رہا تھا جسے وہ ہندی کہتا تھا۔ وہ سب تیس پینتیس کی عمر کے شریف نظر نہ آنے والے لوگ تھے۔ ریٹا نے سلیم کا تعارف میرے شوہر کہہ کر کرایا تو ایک بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں تمسخر تھا۔

''تم کو بھی شوہر کی ضرورت پڑ گئی بے بی؟'' اس نے بے ساختہ کہا۔

سلیم کا چہرہ کانوں تک گرم ہوگیا۔ ''شوہر کی ضرورت تو تمہاری ماں کو بھی پڑی ہوگی۔'' اس نے اردو میں کہا۔

یکلخت سب کے چہروں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور سلیم کے سخت جواب پر اکسانے والے نے فوراً معذرت کرلی۔ ''آئی ایم سوری...... میرا مطلب تھا......''

ریٹا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''چلو مطلب کو چھوڑو، میرا بھوک سے برا حال ہے۔''

وہ سب ائرپورٹ کی حدود میں واقع ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ ریٹا نے پہلے ریفریش کرنے والا ایک ڈرنک طلب کیا۔ ناشتا آنے تک ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ کاروباری تھی۔ اس میں مال کا ذکر تھا اور ادائیگی کا۔ کس کو کتنی کس ذریعے سے...... دی گئی ہے اور باقی کہاں دی جائے گی۔ سلیم اجنبی بنا سنتا رہا لیکن اس کے اندر چھٹی حس وہ خطرے کی گھنٹی پھر بجانے لگی جس کو اس نے دورانِ سفر بند کر رکھا تھا۔ اس کا ڈرنا حق بجانب تھا۔ یہ اس کا پہلا ''کام'' تھا۔ ویسے تو دس ہزار ڈالر بہت ہوتے ہیں لیکن زندگی کو لاحق خطرات دیکھے جائیں تو کتنے کم لگتے ہیں لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر نئے کھلاڑی کی طرح اس نے خود سے ایک وعدہ کیا کہ اس بار وہ خیریت سے واپس امریکا پہنچنے میں کامیاب رہا تو دوبارہ اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ ریٹا کے معاملے میں بھی اس کو اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مانا کہ وہ بہت خوب صورت ہے لیکن کس طرح اس نے اپنی خوب صورتی پر برائے فروخت کا اشتہار لگا رکھا ہے۔ یہ اس کے بیوی کے کردار کو سو فیصد غلط اور ناقابلِ قبول بنا دیتا ہے۔ وہ ایک وفادار گھریلو عورت کا کردار کیسے قبول کرسکتی ہے۔ ویسے بھی اب ریٹا کے ساتھ تعلق میں کوئی کشش، سنسنی خیزی کہاں رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ واپس جانے کے بعد دس ہزار ڈالر کی سرمایہ کاری سے کتنا کما سکتا ہے۔ کون سا چھوٹا موٹا بزنس کرسکتا ہے۔ ہر بزنس چھوٹے سے بڑا ہوتا ہے۔ جیسے وقت کے ساتھ وہ خود ہوا تھا۔

اس کے خیالات کو ایک کرخت آواز نے منتشر کر دیا۔ ''مسٹر سلیم؟''

اس نے پلٹ کے اے ایس ایف کی وردی میں ملبوس چار افراد کے چہروں پر نامہربان جذبات دیکھے۔

''واٹ از دی پرابلم...... سب کا سامان آگیا ہے...... میرا کیوں نہیں آیا؟''

ریٹا نے نرمی سے کہا۔ ''ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا سامان ان کی تحویل میں ہے۔ چیکنگ کے بعد مل جائے گا۔''

دو دو گارڈز ان دونوں کے دائیں بائیں ہوگئے۔ وہ ہال سے گزر کے ایک کمرے میں لے جائے گئے۔ اس کمرے میں صرف ایک میز کرسی تھی اور ان چاروں کا کوئی سینئر افسر بیٹھا تھا۔ اس نے ان دونوں کی صورت کا جائزہ لیا اور پھر سر ہلایا۔ ''لے جاؤ انہیں۔'' سلیم نے سنا اور سمجھا۔

ریٹا نے ایک بار خود کو چھڑا لیا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''ہم تمہیں گرفتار کر رہے ہیں۔'' افسر نے سرد مہری سے کہا۔

''کس جرم میں؟ اور خیال رکھو کہ میں ایک امریکن شہری ہوں۔'' ریٹا نے کہا۔

افسر نے پہلے اسے ایک فحش گالی دی جو صرف سلیم کی سمجھ میں آئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''یس، ہمیں معلوم ہے۔ تمہارا جرم کیا ہے، تم خود اچھی طرح جانتی ہو۔ باقی تمہیں سمجھا دیا جائے گا۔''

ریٹا بپھر گئی۔ ''مجھے امریکن کونصلیٹ سے رابطے کا حق ہے۔''

محافظوں میں سے ایک نے ریٹا کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ ''بھونکنا بند کر کتیا۔ بلا لینا اپنے اس امریکن سفیر کو بھی...... مگر اس سے پہلے ہم تجھے بتائیں گے کہ پاکستانی...... کیا زبردست ہوتے ہیں۔'' ریٹا نے ایک چیخ ماری اور فرش پر گر گئی۔

اس کی بات کو صرف سلیم نے سمجھا تھا مگر وہ دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ بڑی بے رحمی سے ریٹا کو اٹھانے والوں میں

سے ایک نے اس کو دھکا دیا۔ ''آگے لگ۔'' وہ گرتے گرتے بچا۔ ایک عقبی دروازے سے نکلتے ہی ان کو سامنے کھڑی ایک ٹویوٹا ہائی ایس میں پھینک دیا گیا جس کی کھڑکیوں کے شیشے سیاہ تھے۔ اندر موجود لوگ مختلف وردیوں والے تھے اور ان سب کے پاس اسلحہ تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی چل پڑی۔ ریٹا اب واضح طور پر خوف زدہ تھی اور رو رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ سرخ پڑ جانے والے گال کو سہلا رہا تھا۔ جب ان کی جیبوں سے تمام چیزیں نکالی گئیں تو ان کی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ ریٹا جانتی تھی لیکن سلیم نہیں جانتا تھا کہ آگے ان کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ ان کا یہ سفر زندگی کا آخری سفر بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

کروڑوں کی آبادی والے اس ملک میں جہاں ہر روز دن دہاڑے سڑکوں اور گھروں سے اٹھائے جانے والے لاپتا ہو جاتے ہوں اور پھر ان کی مسخ شدہ لاشیں کسی بوری میں بند ویرانوں میں ملتی ہوں، وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خود اس کے لیے امریکن شہریت بھی روشنی کی واحد کرن تھی جو مایوسی کے گھپ اندھیرے میں یوں لگتی تھی جیسے طویل تاریک سرنگ کے آخر میں دن کے اجالے کی خفیف سی چمک مگر اس روشنی تک پہنچنے سے پہلے اسے بہت کچھ برداشت کرنا تھا۔ مستقبل جو اَب تک کامیاب تھا، بے وجود ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پیسا دینے والے اب اسے پہچاننے سے ہی منکر ہو جائیں گے۔ پاکستان کے بعد امریکا میں زندگی ملنا بالکل غیر یقینی ہو گیا تھا۔

نور خان کا کردار ڈرائیور کا تھا۔ فرید خان مہمانوں کو ان کے سامان سمیت پارکنگ ایریا تک لاتا تو وہ تمام سامان گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھتا اور پھر معزز نواسے کو محترم نانی کی قیام گاہ واقع ہارلے اسٹریٹ لے جاتا...... یہ الگ بات تھی کہ سفر کا اختتام عجب گل کے گودام میں ہوتا۔ برسوں بعد راولپنڈی آنے والے مسافر کو راستوں کا کیا پتا۔ نور خان کے اندازے کے مطابق امریکا سے براستہ قطر آنے والی فلائٹ کے تمام مسافر نکل چکے تھے۔ وہ کافی حد تک خالی ہو جانے والے لاؤنج میں آہستہ آہستہ چلتا فرید خان کے پاس آیا جو اَب تک ایک ڈنڈے پر ہارڈ بورڈ سے بنا پلے کارڈ لیے کھڑا تھا۔ اس پر سیاہ رنگ سے انگریزی کے بڑے بڑے حروف میں ''مسٹر سلیم'' لکھا ہوا تھا۔ اس جیسے چار افراد جن میں سے دو کا تعلق کسی ہوٹل سے تھا اپنے اپنے مہمانوں کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے۔

''کیا ہوا بھائی؟'' نور خان نے تشویش سے پوچھا۔

''سلیم کہاں رہ گیا؟''

فرید خان نے نفی میں سر ہلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''کسٹم والے سودا کر رہے ہوں گے۔''

اسی وقت دائیں بائیں سے اے ایس ایف کی وردی والے نمودار ہوئے۔ کوئی سوال کیے بغیر انہوں نے فرید خان اور نور خان کو دونوں طرف سے جکڑ لیا۔ ان کا سوال کسی نے سنا ہی نہیں کہ ''کیا بات ہے...... کیوں پکڑا ہے ہمیں؟''

حیران پریشان دیکھنے والوں کی نظروں کی پروا کیے بغیر وہ دونوں بھائیوں کو بے رحمی سے دھکیلتے گھسیٹتے لاؤنج سے باہر لے گئے جہاں نیلے رنگ کی بغیر نمبروں والی ہائی ایس کھڑی تھی۔ اس کا انجن چل رہا تھا اور پیچھے سادہ کپڑوں اور سفاک صورتوں والے مسلح افراد بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو عملاً اٹھا کے اندر پھینکا گیا پھر ہائی ایس روانہ ہو گئی۔ ایسے مناظر اب نامانوس نہیں رہے تھے، کچھ دیکھ چکے تھے باقی سنتے رہتے تھے کہ ''قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ارکان نے فلاں جگہ سے کارروائی کر کے دہشت گردوں کو گرفتار کیا۔ بعض اوقات نہ کسی کا نام آتا تھا اور نہ کوئی خبر آتی تھی۔ ملک کے اندر تخریب کار ہر جگہ سرگرم عمل تھے۔ کچھ بیرونی کچھ اندرونی...... اللہ پاکستان کو محفوظ رکھے۔ ایک سفید ریش بزرگ نے زیر لب کہا۔

چند منٹ میں سب نارمل ہو چکا تھا۔ جیسے خلافِ معمول کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

صبح کے نو بج چکے تھے لیکن افشاں ابھی تک جاگی ہی نہ تھی۔ ظالم ساس کے گھر سے بے آبرو ہو کے نکلنے کے بعد اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ حمید نے مری جانے کا پروگرام کینسل کر کے بھی کم خرابی نہیں کی تھی کہ رضیہ سلطانہ نے سب کو بے عزت کر کے جلتی پر خوب تیل چھڑکا تھا۔ حمید کو آنے والے طوفان کا پہلے سے اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ اس نے تیاری مکمل کر لی اور جیسے ہی رات کو افشاں کے غصے کا سیلابی دھارا ابلا، اس نے بڑی مہارت سے پہلا ریلا گزر جانے دیا پھر اس کا رخ موڑ دیا۔ انہی پرانے معافی تلافی کے الفاظ سے جو کسی بھی آتش فشاں بیوی کو ٹھنڈے پانی کی جھیل میں تبدیل کر سکتے ہیں پھر اس نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔

اس نے کچن میں جا کے اپنے لیے چائے بنائی اور پھر باہر پورچ میں پڑا ہوا اخبار لے کر لاؤنج میں آ گیا۔ جھولے پر براجمان ہونے سے پہلے اس نے رات بھر کی خبروں کی

ہیڈ لائن دیکھنے کے لیے ٹی وی بھی آن کر دیا۔ اس کی نظر نے ابھی پہلے صفحے کی ہیڈ لائنز ہی دیکھی تھیں کہ ٹی وی کی ایک بریکنگ نیوز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس میں امریکا سے آنے والے ایک پاکستانی سلیم انصاری کے ائرپورٹ سے اپنی امریکن بیوی ریٹا کے ساتھ پکڑے جانے کی خبر تھی۔ نیوز ریڈر بڑے جوش و خروش سے بتا رہی تھی کہ گرفتار ہونے والا کسی انتہا پسند اور تخریب کار گروہ کا رکن ہے اور اس کے پاکستان آنے کا مقصد ایک تنظیم کو تخریب کاری کے لیے خطرناک اسلحہ، خودکش جیکٹس اور ٹائم کنٹرول بم وغیرہ فراہم کرنا تھا۔ اس کے ساتھ گرفتار ہونے والی غیر ملکی لڑکی سلیم انصاری کی بیوی بتائی جاتی ہے۔ باقی خبرنامہ بھی اسی سے بھرا ہوا تھا کہ کس طرح اطلاع ملنے پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے بروقت کارروائی کی اور ایک بہت بڑی تخریب کاری کے خطرے سے بچالیا۔

حمید چائے پیتے ہوئے یہی خبر مختلف چینلز پر تلاش کرتا رہا۔ کہیں سے اس کو اضافی معلومات نہ ملیں جن سے یہ تصدیق ہو سکتی کہ گرفتار ہونے والا سلیم انصاری اس کا بھانجا اور اس کی باغی بہن کا ہونہار سپوت ہے جو امریکا میں ”اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ابھی تک اس کی تصویر یا دیگر تفصیلات جاری نہیں کی گئی تھیں لیکن حمید کو شک نہیں تھا کہ سلیم انصاری دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیارے بھانجے کو اسی فلائٹ سے اسلام آباد اپنی پیاری نانی کے پاس پہنچنا تھا۔ ایک نامعلوم خطرے کے احساس نے اسے فون ملانے پر مجبور کر دیا۔

”بھائی، خبر دیکھی تم نے...... سلیم ائرپورٹ پر گرفتار ہوا ہے...... ٹی وی دیکھا؟“

”نہیں۔“ رشید نے ٹی وی آن کیا۔ ”اسے بھی تو آج ہی پہنچنا تھا نا، شیری کے بیٹے کو...... ہاں خبر چل رہی ہے لیکن یہ غیر ملکی بیوی کا کیا ذکر ہے؟“

”ہوگی کوئی کیریئر...... بیوی بن کے ساتھ آ رہی ہو گی۔“

”او مائی گاڈ...... یہ تو انسداد دہشت گردی والوں کی کارروائی لگتی ہے۔“

”ان کی یا فوج کے خفیہ اداروں کی۔“

اسی وقت بریکنگ نیوز کے دوران دوسری بریکنگ نیوز کا دھماکا ہوا... نیوز کاسٹر نے ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنا شروع کیا۔ ”اسلام آباد ائرپورٹ سے پکڑے جانے والے دہشت گرد کی ماں کو اس کے شوہر کے ساتھ لاہور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے برائیڈل سویٹ سے داد عیش دیتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ گرفتاری ملزم کے بیان کی روشنی میں عمل میں آئی۔ ملزم کی ماں ایک کالج میں انگلش کی لیکچرر ہے اور اس نے گزشتہ شام ہی لاہور کے ایک لیکچرر سے دوسری شادی کی تھی۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔“

حمید نے دیکھا کہ کال چل رہی ہے۔ اس نے چلّا کے کہا۔ ”بھائی، تم نے دیکھا۔“

”ہاں، سب دیکھ رہا ہوں۔ شیری ہماری بہن اور ہمارے محترم بہنوئی زمان خاں...... دونوں کی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔ کتنی بے پر کی اڑاتے ہیں ٹی وی والے بھی...... ہمیں خبر ہی نہیں کہ کل شادی تھی ہماری بہن کی...... ایسا ہو سکتا ہے؟ کتنی عزت افزائی ہو رہی ہے سب کی۔“

”عزت افزائی کو گولی مارو...... اپنی سلامتی کا

سوچو...... ضمانت قبل از گرفتاری لینا ضروری ہے ہمارے لیے۔''

رشید نے فکرمندی سے کہا۔ ''تفتیش کرنے والے تو اماں کے پاس بھی جائیں گے۔''

''بھائی وہ محفوظ رہیں گی۔ اپنی عمر کی وجہ سے بھی...... اور صرف یہ بتا کر کہ ان کا تو اپنی بیٹی سے بھی کوئی تعلق نہیں۔''

رشید نے کہا۔ ''لیکن نواسے کو تعلیمی اخراجات وہی بھیجتی تھیں۔ سلیم سب بتا چکا ہوگا۔''

''تمہارا وہ دوست ہے نا جو ہائی کورٹ بار کا سیکریٹری بھی تھا۔ اس کو پکڑو...... مجھے تو خطرہ ہے کسی بھی وقت دروازے کی گھنٹی بجے گی اور تفتیش کرنے والے ہمیں گرفتار کرنے اندر آجائیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں کہیں چلا جاؤں......''

رشید نے کہا۔ ''پاگل مت بنو۔ ہمارا کسی سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکتا۔ فرار ہو کے اپنی حیثیت مشکوک بنانے سے کیا فائدہ...... ضمانت کی بات میں کر لیتا ہوں۔ بس خیال رکھنا کہ میرے تمہارے بیان میں کوئی فرق نہ ہو۔ تم بھی وہی کہو گے جو سچ ہے اور میں بھی وہی بتاؤں گا...... تصدیق کرنے والے جیسے چاہیں معلوم کرلیں...... ہمارا نہ شیری سے تعلق ہے نہ اس کے بیٹے سے...... اور نہ نئے شوہر سے۔''

حمید نے فون بند کیا اور بیڈ روم میں جا کے بے سدھ پڑی افشاں کو جھنجوڑا۔ ''افشاں......''

وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ ''یا اللہ...... یہ کیا پاگل پن ہے؟''

حمید نے اسے کھینچ کر باتھ روم میں دھکیل دیا۔ ''جلدی سے باہر آؤ، بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں ہم سوال بعد میں کرنا۔'' واپس لاؤنج میں آکر اس نے کچھ دیر سوچا پھر ماں کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی پھر خدا بخش نے کال ریسیو کی۔

''خدا بخش...... فون اماں کو دو......'' حمید نے حکم دیا۔

''جی سر...... وہ ناشتا کرلیں تو دیتا ہوں۔''

حمید دہاڑا۔ ''ناشتے کے بچے...... اتنے جوتے لگاؤں گا ابھی وہاں آکے تیرے سر پر...... کہ اپنی اوقات بھول جائے گا۔ ابھی فون دے اماں کو الو کے پٹھے۔''

خدا بخش نے فون آف کر کے رضیہ بیگم کے پاس برآمدے میں پہنچا دیا۔ ''حمید صاحب کا فون تھا۔ میں نے کہا کہ آپ ناشتا کرلیں...... تو بہت گالیاں دیں مجھے۔''

رضیہ بیگم ناشتا کر چکی تھیں۔ خدا بخش کو جواب دیے بغیر انہوں نے فون اٹھا کے حمید کو کال کی۔ ''فون کیا تھا تم نے؟''

''جی، مگر وہ آپ کے سر چڑھے خبیث ملازم نے بات نہیں کرائی۔ میں سچ بتا رہا ہوں کہ وہ مارا جائے گا کسی دن میرے ہاتھوں......'' حمید نے آتش فشاں لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا؟''

''اماں...... میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا تھا...... خبریں دیکھیں تم نے...... ٹی وی لگاؤ۔''

''تم ہی بتا دو کہ کون سی قیامت آگئی ہے۔ وزیراعظم کا قتل ہو گیا یا مارشل لا نافذ ہو گیا ہے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''اماں...... میں خبردار کر رہا ہوں تمہیں...... کسی بھی وقت گرفتار ہو جاؤ گی تم...... تمہاری لاڈلی بیٹی کا ہونہار سپوت جو امریکا گیا تھا پڑھنے...... ائرپورٹ پر گرفتار ہوا ہے...... کسی غیر ملکی بیوی کے ساتھ۔''

رضیہ بیگم کا ہاتھ کانپنے لگا۔ ''کس جرم میں؟ اسے آج آنا تو تھا۔''

''اب تک اس نے بتا دیا ہوگا کہ یہاں وہ آپ سے ملنے آیا تھا۔ اس پر دہشت گردوں کی مدد کا الزام ہے۔''

رضیہ بیگم کھڑی ہوگئیں۔ ''یہ جھوٹ ہے۔''

''جھوٹ سچ کا پتا چلانے ہی آئے گی پولیس تمہارے پاس۔''

رضیہ بیگم فون وہیں رکھ کے اندر دوڑیں۔ ٹی وی کا اسکرین روشن ہونے تک وہ صوفے پر گر چکی تھیں۔ ان کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے خبر سنی۔ شیری کو بھی دیکھا۔ اس کے دوسرے شوہر کو بھی...... اچانک جیسے ٹی وی آف ہو گیا۔ کمرے کی ہر لائٹ بجھ گئی۔ ہر آواز معدوم ہو گئی۔

ان کی آنکھ کھلی تو وہ کسی اسپتال کے کمرے میں تھیں۔ پرائیویٹ روم کا اے سی سرسراہٹ کے ساتھ ٹھنڈک پھیلا رہا تھا۔ وہ اجلی سفید چادر پر سیدھی لیٹی تھیں۔ ان کے بائیں بازو میں پیوست سوئی سرہانے کی طرف اسٹینڈ پر لٹکی گلوکوز کی ڈرپ سے ملی ہوئی تھی۔ بالکل سفید یونیفارم والی ایک نرس قطرہ قطرہ گرنے والے توانائی بخش محلول کی رفتار کو ایڈجسٹ کر رہی تھی۔ سر گھمانے پر اس کے سامنے ڈاکٹر علی کا چہرہ آگیا۔

''علی...... تم لائے ہو مجھے یہاں؟''

ڈاکٹر علی مسکرایا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ شاک کا معمولی سا اثر تھا۔ خدا بخش نے مجھے بتایا۔''

"تم کو معلوم ہے...... سلیم گرفتار ہو گیا ہے۔"

"یہ تو کل کی بات ہے۔ پولیس آئی تھی تمہارا بیان لینے...... ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی۔" ڈاکٹر علی نے کہا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آج تمہارا وکیل بھی آجائے گا۔ ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست اس نے کل ہی منظور کرالی تھی۔"

"اور وہ دونوں...... رشید اور حمید......"

"ان سے پولیس نے تفتیش کی ہے۔ آج وہ بھی ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جو سچ ہے وہ پولیس کو بھی بتا دینا۔ وہ سارے خاندان کو ایک شخص کے جرم پر نہیں پکڑیں گے۔"

"شیری کا کچھ پتا چلا؟"

ڈاکٹر علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے لاہور میں ایک دوست کے بیٹے کو اس کام پر لگایا ہے۔ وہ رپورٹر ہے ایک اخبار میں...... لیکن وہ دونوں بھی رہا ہو جائیں گے ضمانت پر...... دونوں لیکچرر ہیں۔"

رضیہ بیگم کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔ "کتنی مبارک ہے میری بیٹی کی یہ شادی بھی...... نہ ماں کو پتا چلا نہ بھائیوں کو...... اور پتا چلا تو یہ کہ سہاگ رات کی صبح حوالات میں ہوئی اس کی۔"

"دیکھو، یہ وقتی پریشانی ہے۔ دور ہو جائے گی اور اگر سلیم امریکا میں رہ کے کسی کے غلط ہاتھوں میں پڑ گیا ہے تو وہ خود بھگتے گا۔ اسے نہ تم بچا سکتی ہو اور نہ اس کی ماں...... بس خود کو سنبھالو۔"

ایک ڈاکٹر دوسری نرس کے ساتھ اندر آیا۔ رسمی اخلاق کا مظاہرہ کر کے اس نے رضیہ بیگم کے ایک انجکشن لگایا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نیند کی پُرسکون آغوش میں چلی گئیں۔

☆☆☆

رشید بہت دل برداشتہ تھا۔ ایک بہت اچھا موقع جو اس کی زندگی بدل سکتا تھا، ہاتھ سے نکل گیا تھا اور صرف اس لیے کہ ماں نے اس کے مستقبل سے زیادہ اپنے ماضی کو اہم سمجھا تھا۔ اس سے جذباتی وابستگی ہر دلیل پر بھاری تھی جو اس سے بہت محبت کرنے والے شوہر نے اس کی خواہش کے مطابق بنوایا تھا اور اس کی آرائش میں بھی بیوی کی پسند کو مدِنظر رکھا تھا۔ وہ تمام چیزیں جو اَب بے مصرف اور کسی کباڑی کو دینے کے قابل ہو گئی تھیں رضیہ بیگم کو اتنی ہی عزیز تھیں جتنی اپنی منگنی کی انگوٹھی۔ اس کے قالین اور بھاری بھرکم وکٹورین اسٹائل کے صوفے اب کہیں استعمال نہ ہوتے تھے جو راولپنڈی میں چنیوٹی فرنیچر کے ایک ماہر کاریگر نے بنائے تھے اور ایسی لاتعداد چیزیں تھیں۔

لیکن اماں کچھ بھی بدلنے پر راضی نہ تھیں۔ ان کی زندگی کی یادیں انہی چیزوں سے وابستہ تھیں۔ کون سا ڈیکوریشن پیس انہوں نے کب اور کہاں سے لیا تھا۔ انہیں تاریخ اور قیمت تک یاد تھی پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ پورے گھر سے دستبردار ہو جائیں جو اُن کے ماضی کا مزار تھا اور کسی جدید گھر میں جا بسیں جہاں یہ سب کچھ نہ ہو۔ ان کے خوابوں کے گھر کو کوئی ٹھیکے دار بے حس لمبے لمبے آہنی ہاتھوں والے بلڈوزر سے اور کرین سے ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دے اور اس کے ڈھائی ہزار گز کے ہموار میدان میں کسی کثیرالمنزلہ عمارت کی بنیادیں کھود کے اس میں سریوں کے جال کھڑے کر دے۔

رضیہ بیگم کے خیال میں اس کے دونوں بیٹے خوش حال اور کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ اس سے زیادہ کی خواہش کرنا لالچ اور ہوس تھی جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ کامیابی کے بدل جانے والے تصور سے قائل ہونے والی نہ تھیں۔ "تمہارے باپ نے محنت اور قابلیت سے یہ سب حاصل کیا تھا۔ سفارش سے یا باپ کے ترکے سے نہیں۔ وہ پاکستان کے کیا دنیا کے نامور امراضِ قلب کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ تمہاری طرح ایک ایم بی اے کی ڈگری لے کر نہیں بیٹھ گئے تھے جو اَب ہر یونیورسٹی کسی بھی ایرے غیرے کو تھما دیتی ہے۔"

چنانچہ رشید نے اس دن کا انتظار بھی چھوڑ دیا تھا جب ماں بالآخر یہ سب چھوڑ کے اپنے دو گز کے گھر میں منتقل ہو جائے گی جس کے لیے اس نے شوہر کے پہلو میں زمین بہت پہلے سے خرید کے محفوظ کر لی تھی۔ اس میں پانچ دس سال لگ سکتے تھے۔ اس کے حصے میں آنے والے آج کے دو کروڑ تب تک تین چار کروڑ ہوں گے اور جیسے آج کم نہیں۔ اس وقت بھی بہت ہوں گے۔

حمید نے اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے پلان میں بھائی کو بھی شریک نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے دو ماہ کی مہلت مل گئی تھی۔ ایک خوش حال مستقبل کے خواب کی تعبیر ابھی اس کی دسترس میں تھی لیکن اس کے پلان کو دیگر عوامل نے بھی قابلِ عمل بنایا تھا۔

اس کی باغی بہن جس نے ایک دن پہلے ہی زمانے سے دوسری شادی کی تھی ضمانت پر چھوٹ گئی تھی کیونکہ بیٹے کے

جرم میں اس کی شراکت کسی طرح ثابت نہ ہوتی تھی۔ تاہم نام ایف آئی آر میں آنے کی وجہ سے میاں بیوی عدالتی فیصلے کی رو سے باعزت بری ہونے تک معطل تھے۔ رضیہ بیگم کا نام ایف آئی آر میں بھی نہ تھا اور ایف آئی اے کے ایک سینئر آفیسر نے جو حمید کے والد کو جانتا تھا خود ان کا بیان لے کر بات ختم کر دی تھی۔ اس افسر کے والد کی جان حمید کے والد نے اس وقت بچائی تھی جب اس کے والد پر حج کے فرائض کی ادائیگی کے دوران دل کا دورہ پڑا تھا اور حمید کے والد نے آپریشن کر کے انہیں بچا لیا تھا۔ اب ان کے انتقال کو بھی کئی برس بیت چکے تھے۔

اصل مشکلات زمان خان کے شوہر بننے کے بعد شروع ہوئیں جس کے دونوں بیٹے شریک جرم ثابت ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان کے جرم کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ سلیم کے ساتھی نہیں تھے۔ ان کا ارادہ سلیم کو ائرپورٹ سے اغوا کر کے لے جانے کا تھا۔ اس کو وہ ایک دوست کے گودام میں قید رکھتے اور رہائی کے لیے ایک کروڑ روپے کا تاوان طلب کرتے۔ انہیں یقین تھا کہ سلیم کے تعلیمی اخراجات اٹھانے والی نانی یہ رقم ادا کر دے گی۔ جب ایف آئی اے نے چھاپا مارا تو گودام سے وہ سامان پکڑا گیا جو افغانستان جانے کے بجائے پاکستان پہنچ گیا تھا۔ گودام کے مالک تو دوسرے لوگ تھے مگر وہاں سے ان کا بیٹا عجب گل گرفتار ہوا تھا جس کو باپ اور چچا کے اثر رسوخ اور دولت نے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت دلا دی تھی۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کا معاملہ تو ایف آئی اے نے دبا دیا تھا لیکن عجب گل نے اپنے دونوں دوستوں نور خان اور فرید خان کے سلیم کی نانی سے ایک کروڑ بطور تاوان وصول کرنے کے سارے منصوبے کو طشت از بام کر دیا تھا۔

معاملہ بہت سنگین تھا۔ چالان انسداد دہشت گردی کی عدالت میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک معمولی لیکچرر کے بیٹے تھے چنانچہ امید یہ تھی کہ ان کو عمر قید نہ کاٹنا پڑی تب بھی اگلے چند برس وہ جیل میں ہی گزاریں گے۔ عجب گل کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔ اس کے لیے پاکستان کے ایک نامور وکیل کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جس نے ایف آئی اے کی تفتیش کے نتائج کو تشدد کا نتیجہ قرار دیا تھا اور یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اول تو یہ نور خان اور فرید خان کا منصوبہ تھا۔ اس منصوبے پر بھی عمل نہیں ہوا چنانچہ جرم صرف نیت کا بنتا ہے۔ عجب گل نے محض دوستی نبھائی تھی۔ وہ شریک جرم بھی نہ تھا۔

کسی انتقامی جذبے یا کسی کے اکسانے پر سلیم نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ پاکستان میں نور خان اور فرید خان بھی اس کے پارٹنر تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پکڑا گیا اسلحہ وصول کر کے وہ کہاں لے جاتے۔ شاید عجب گل کے گودام میں رکھتے۔ اغوا برائے تاوان کی کہانی جھوٹ تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دونوں لڑکوں کا باپ ضرور لیکچرر ہے مگر ان کا دادا اسلحہ بناتا تھا اور بعد میں افغان جہاد کے اسلحے سے ہی دولت مند ہوا تھا۔ اسی دولت سے زمان خان نے یہ کوٹھی کھڑی کی تھی اور یہ کار خریدی تھی جو اس کی دوسری بیوی کے زیر استعمال تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نور خان اور فرید خان کا علاقہ غیر میں رہنے والے اپنے تایا سے اب بھی تعلق تھا جو کچھ عرصہ پہلے ان کے گھر بھی آ چکا تھا۔ وہ دونوں غیر ملکی اسلحہ اپنے تایا کے ذریعے ہی طالبان تک پہنچاتے۔

سلیم کے اس بیان نے زمان خان کو پاگل کر دیا تھا۔ اس کے گھر کے کاغذات اب ایف آئی اے کی تحویل میں تھے اور اس کی گاڑی بھی ضبط ہو چکی تھی۔ مقدمے کا فیصلہ ہونے تک وہ کنگال تھا۔ نہ جانے یہ ثابت کرنے میں کتنا وقت اور کتنا پیسا خرچ ہوتا کہ غیر قانونی ذرائع سے آمدنی حاصل کرنے والا اس کا باپ تھا۔ وہ نہیں جو محض ایک لیکچرر تھا۔ قانون اس کے باپ کے اثاثوں کو ضبط کرتا تو غلط نہ ہوتا مگر اس کے مرجانے کے بعد وارثوں کے اثاثے ضبط کرنا کس قانون، شریعت یا ضابطہ اخلاق کے تحت جائز تھا۔ وہ گھر میں رہ سکتا تھا لیکن اسے فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی عدالتی تحویل میں تھی اور اگرچہ وکیل نے یقین دلایا تھا کہ اسے واپس مل جائے گی لیکن سردست وہ پیدل تھا۔

شیری نسبتاً محفوظ رہی تھی۔ سلیم کی ماں ہونے کے سوا اب تک اس پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے تو سلیم کو امریکا بھیجنے اور اس کے تعلیمی اخراجات کے بارے میں بھی اپنی لاتعلقی ظاہر کر دی تھی۔ وہ امریکا میں کیا پڑھتا ہے کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے، اسے کچھ معلوم نہیں۔ اسے تو سلیم کے بارے میں یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ پاکستان آ رہا ہے تو اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔ اسے نہ شادی کا علم تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ وہ پاکستان میں کہاں قیام کرے گا۔ ایک نام اس کے باپ کا تھا جس کی گڈول کام آگئی۔ اس کا پیشہ تھا جو اب بھی عزت والا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے شاگرد تھے جن میں سے اب کئی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ چنانچہ وہ خاصی پُرامید تھی کہ معطلی کا زمانہ چھ ماہ گزرنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اب وہ ہاسٹل کی

نگراں نہ رہے یا اس کا ٹرانسفر ہو جائے لیکن قانونی معاملات کے مقابلے میں ان مسائل کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

ساری خرابی رشتوں کی وجہ سے تھی۔ ایک رشتہ خون کا تھا جو اس کی غلطی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ سلیم انصاری اب بالغ تھا اور اپنے قول و فعل کا خود ذمے دار تھا۔ تاہم اس حقیقت سے ایک ماں کے جذبات نہیں بدلتے تھے۔ وہ مجبور تھی کہ سلیم کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اور اسے قید و بند کی صعوبت سے بچانے کے لیے سب کچھ کرے۔ ایک دو مخلص شناسا وکیلوں نے اسے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ سلیم کے بیانات اور تفتیشی نتائج کے پیش نظر کوئی بڑے سے بڑا وکیل اس کو سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ بڑے وکیل ایک کروڑ بھی لیتے تھے مگر دس لاکھ سے کم کی تو بات ہی نہ تھی۔ عدالتی معاملات میں ہر قدم پر رشوت کے لیے جھولی پھیلائے پولیس اور جیل کے علاوہ عدالتی حکام الگ تھے۔ سلیم کی مدد کی کوشش کرنا بھی بیس پچیس لاکھ کا نسخہ تھا۔

افسوس اب اسے بار بار تقدیر کے ناگہانی فیصلے پر تھا۔ ٹوٹی کہاں کمند...... کیا تھا اگر وہ زمان کے ساتھ جاری پیار کے کھیل کو مزید کچھ عرصہ جاری رکھتی یا جسم کی طلب کسی شرعی رشتے کے بغیر ہی پوری کر لیتی۔ کس کو پتا چلتا اور کون تھا جو اس کے اخلاق و کردار کا ٹھیکے دار بن کے سامنے کھڑا ہوتا۔ اور کیا تھا اگر ایک دن...... صرف ایک دن اور گزر جاتا...... اس طرح جیسے دو سال گزر گئے تھے۔ وہ روایتی شب عروسی نہ آتی۔ وہ برائیڈل سوٹ میں اپنے دولھا کے ساتھ گرفتار نہ ہوتی۔ منہ تو کالا ہوا ہی تھا مگر سیاہی نہ چھٹنے والی تھی۔ اب وہ زمان کی بیوی تھی۔ اس حقیقت کے اعتراف سے پیچھے ہٹنا بھی ناممکن تھا۔ اب لاتعلقی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا مگر ایسا ہی تھا جیسے کھلے مین ہول میں آدمی شامت اعمال سے جا گرے لیکن بچ جائے تو باہر نکل کے پاک دامنی کا دعوے کرے۔

مجبوراً زمان کی پہلی بیوی کی مخاصمت کے باوجود اس کو زمان کے گھر میں منتقل ہونا پڑا۔ زمان کا الگ گھر لے کر دینے کا وعدہ ایک حادثاتی لہر نے ریت کی دیوار کی طرح گرا دیا تھا۔ وہ خود قلاش تھا۔ اس کو دو بیویوں کا خرچ اٹھانا تھا۔ ان کی پُرعداوت محاذ آرائی کے درمیان رہنا تھا۔ وہ گھر بھی ایک میدانِ کارزار بن گیا تھا جس میں اس کو صرف رہنے کا حق حاصل تھا۔ زمان کے پاس بھی جو پس انداز کی ہوئی رقم تھی اور جتنا شیری کا اندوختہ تھا، وہ اب احتیاط سے آنے والے وقت کے لیے بچانا ضروری تھا ورنہ زمان اس کے لیے فوری طور پر الگ کرائے کا مکان نہ لیتا تو شیری خود یہ کام کر سکتی تھی۔ لیکن اب ان دونوں کا پیسا ایک قانونی جنگ کے لیے تھا۔ اپنے اپنے بچوں کے لیے...... جن کو وہ ”ہمارے بچے“ نہیں کہہ سکتے تھے۔

ان کے درمیان قانونی زلزلے سے پڑنے والی دراڑ بڑھنے لگی۔ قانونی اور جذباتی معاملات کی تان بالآخر معاشی معاملات پر آ کے ٹوٹتی تھی۔ زمان نے دبے دبے الفاظ میں اور پھر دوٹوک مطالبہ کیا کہ اس کرائسس میں ضروری ہے کہ وہ اپنی کروڑپتی ماں سے مدد مانگے۔ وارث کی حیثیت سے اس کو ایک کروڑ روپے آج نہ ملے تو کس کام کے؟ سلیم کے ساتھ نور خان اور فرید خان کو جیل جانے سے بچانے کے لیے ہم اچھا وکیل بھی نہ کر سکے تو ہمارے ماں باپ کہلانے کا فائدہ؟ کیا ہم غیروں کی طرح لاتعلق ہو کے صرف تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی رسوائی کا اور بچوں کی اذیت کا۔ بے شک وہ بڑے ہو گئے ہیں مگر ہمارے لیے تو بچے ہی ہیں۔ اگر ہم ان کو...... خدانہ کرے...... سزائے موت سے نہ بچا سکے تو خود کیسے جئیں گے؟ کوشش سے صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ ان کو سزا کم سے کم ہو۔ سزا کے بعد ہم انہیں جیل کے اندر سہولتوں کی فراہمی کے لیے اور ان کی زندگی آسان بنانے کے لیے مسلسل رشوت کی فراہمی جاری رکھیں۔

شیری کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ کسی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ بس ایک امید کو زندہ رکھ سکتی تھی کہ جب مصائب کے اچانک پھٹ پڑنے والے آتش فشاں لاوا اگلنا بند کر دے تو وہ اپنے دکھ اور اپنی بدنامی کے ساتھ جینے کے قابل ہو جائیں۔ اسے یہ ناممکن نظر آتا تھا مگر آج وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ زمان کی ہر دلیل سے اتفاق کرتی تھی مگر اندر سے اس کا دل ہر دلیل کو مسترد کرتا جاتا تھا۔ جو ہونا تھا، اس سے زیادہ برا کیا ہوگا۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر...... عافیت اسی میں ہے کہ وہ تمام اخلاقی شرعی اور قانونی معاملات میں صرف اپنا مفاد دیکھے۔ محبت گئی بھاڑ میں، ایک رات کا ازدواجی رشتہ نہیں رہے گا تو کیا ہوگا؟ اس کو زمان کی غلامی سے آزادی مل جائے گی۔ وہ صرف سلیم کے معاملات کی ذمے دار ہوگی۔ اس کے پاس ملازمت بھی ہے جو جلد بحال ہو جائے گی تو وہ ایک کمرا کرائے پر لے کر بھی رہ لے گی۔ ورکنگ ویمن ہوسٹل اب ہر جگہ ہیں۔ اس کے پاس گاڑی اپنی ہے۔ ضبط ہونے والی گاڑی زمان کی تھی۔ وہ اپنا ٹرانسفر کرا کے اس شہر سے بھی دور جا سکتی ہے۔

شیری نے ماں سے مدد مانگی۔ روئی پیٹی۔ اسے خون کے رشتے کا نام لے کر ایکسپلائٹ کرنے کی پوری کوشش

کی۔ ذلیل ہوئی، بھائیوں کے سامنے بے حیا بنی، لیکن دنیا جو پہلے ہی بدلی ہوئی تھی، اب ہر پہچان کھو چکی تھی۔ کوئی اس کی مدد تو درکنار اس سے ہمدردی کرنے پر تیار نہ تھا۔ جو ایک نام کا رشتہ رہ گیا تھا، وہ بھی نہ رہا۔ ایک کروڑ کیا ملتے۔

حمید نے یہ سب پڑھا، دیکھا اور سنا تھا اور شیری کی واپسی کے بعد بھی اس کے ذہن میں ایک خیال نے جنم لیا تھا جس کو اس نے پرورش کیا تھا اور چھپایا تھا۔ حمید کا ذہن تمام اخلاقیات کی رکاوٹوں کو بلڈوز کرتا گیا۔ ذاتی مفاد کے تقاضوں کو قبول کرتا گیا۔ وہ قانونی مشکلات کا حل تلاش کرتا رہا جو اس کو درپیش ہو سکتی تھیں۔ اپنے پلان کو مکمل کرتا گیا۔ صرف ایک حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کہ اس کی صرف ایک زندگی ہے جس کی اہمیت خود اس کے لیے سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ کسی اور کی زندگی کو وہ کیوں اہمیت دے۔ جب کسی اور کے لیے اس کی اہمیت نہیں۔

بے شک شیری نے سب کے سامنے چلا چلا کے کہا تھا کہ آج سے وہ سب اس کے دشمن ہیں اور وہ کسی کو نہیں چھوڑے گی۔ وہ خودکشی نہیں کرے گی۔ ان سب کو مار ڈالے گی۔ اس وقت وہ ہسٹریا سے مغلوب تھی اور پاگل ہو رہی تھی۔ تاہم یہ الفاظ اس کے جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی مگر کرتی تو الفاظ کی گواہی شیری کے خلاف جاتی۔ الفاظ جو اس کے اپنے تھے۔

دوسری بات رشید نے کی تھی۔ شیری کے سارے قضیے میں ڈاکٹر علی نے رضیہ بیگم کے محافظ اول کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ عملاً اس گھر کا مالک بن رہا تھا۔ کون رضیہ بیگم سے ملے گا۔ کس وقت ملے گا۔ یا نہیں ملے گا۔ یہ سارے فیصلے ڈاکٹر علی کر رہا تھا۔ اس نے رضیہ بیگم کے گھر میں ڈیرا جما لیا تھا اور پہلے اپنا ذاتی محافظ دروازے پر کھڑا کر دیا تھا پھر انہیں بتا دیا تھا کہ وہ محتاط رہیں۔ ان کی گفتگو کا ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ وہ اپنی ماں کو بلیک میل کر کے مجبور نہ کریں۔ ایک گواہ وہ خود تھا۔ دوسرا رضیہ بیگم کا دائمی غلام اللہ بخش۔

یہ بات رشید نے کہی تھی کہ ”بڑھیا ضد میں آگئی ہے اور ڈاکٹر علی اسے سمجھانے کے بجائے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کے لیے اکساتا ہے۔ اولاد کے مقابلے میں وہ ڈاکٹر علی کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ شوہر کے نام سے منسوب گھر کے ساتھ جذباتی وابستگی تو محض بہانہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ڈاکٹر علی سے نکاح پڑھوا لے گی۔ وہ قانونی اور شرعی طور پر شوہر بن جائے گا۔ عملی طور پر بنے نہ بنے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھو سب ہاتھ سے گیا۔ وہ جو ان کے پرانے باپ کا تھا، نئے باپ کا ہو جائے گا۔

اور حمید نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔

☆☆☆

گورا قبرستان سے اگلے موڑ پر اس نے گاڑی کو ایک زیر تعمیر عمارت کی تاریکی میں چھوڑ دیا۔ جو عرصہ دراز سے نامکمل تھی اور ابھی تک اس لاوارث کھنڈر کو کسی فقیر، آوارہ گرد یا نشہ کرنے والے نے بھی اپنا مسکن نہیں بنایا تھا۔ دروازے، کھڑکیاں بھی خالی چوکھٹے تھے ورنہ لوگ کب کا نکال لے گئے ہوتے۔ جیسے رفتہ رفتہ حسب ضرورت اس کی اینٹوں کو لے جا رہے تھے۔

آگے کا راستہ محفوظ تھا۔ تقریباً دو سو گز کے بعد سڑک بائیں جانب مڑتی تھی۔ اس نے سڑک چھوڑ کے خالی میدان کو ترچھا عبور کیا۔ اس طرح وہ غیر متوقع طور پر آجانے والی کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس سے محفوظ رہا اور مسافت بھی کچھ کم ہو گئی۔ میدان میں گھاس تھی اور اس علاقے میں سب سے زیادہ پائی جانے والی خودرو بھنگ تھی جس کی تیز مہک یہاں غالب تھی۔ بھنگ کا پودا پنڈی سے مری کا غان اور گرد و نواح کے سارے علاقے میں ہر جگہ موجود تھا۔ حیرت انگیز طور پر یہاں بھنگ پی نہیں جاتی تھی۔

اس نے پھر سڑک عبور کی اور ساتھ والے خالی پلاٹ پر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بنگلوں کی ساری گیٹ لائٹس روشن تھیں۔ ہر بند گیٹ کے اندر کسی کیبن میں کوئی سکیورٹی گارڈ اپنا اسلحہ لیے اونگھ رہا تھا۔ کچھ لوگ ان کو بیٹھنے کے لیے کرسی دینے کے خلاف تھے تو اسی وجہ سے کہ گارڈ سو جاتے ہیں۔ دور کہیں کتے بھونکنے لگے تو کسی بنگلے کے کتے نے جواب میں کچھ کہا۔ وہ آہٹ کیے بغیر چلتا گیا۔ آخری دنوں کے چاند کا مدھم سا اجالا اسے راستہ دکھانے کے لیے کافی تھا۔ ایک بار پھر گھوم کے وہ گھر کے عقبی حصے میں آگیا۔

ایک جست میں اس نے آہٹ کیے بغیر بڑی صفائی سے دیوار کو عبور کیا اور پچھلی گلی میں اتر گیا جہاں ایک مختصر سا پائیں باغ موجود تھا۔ کچن کا فولادی پروف دروازہ اندر سے بند تھا۔ لکڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا تا کہ کچن میں تازہ ہوا کا گزر رہے۔ اس نے اوپر کی جالی کو دبایا تو وہ چوکھٹے سے الگ ہو گئی۔ زنگ نے اسے پاپڑ کی طرح خستہ بنا دیا تھا۔ اوپر والی کنڈی کھولنے کے لیے اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کچن میں سنک کے نیچے ایک کونے میں پرانے لوہے

کے پائپ پڑے تھے جو چوڑیاں گل جانے کے بعد لیک کرنے لگے تھے تو بدل دیے گئے تھے۔ کاٹھ کباڑ خریدنے والوں کا اس طرف سے گزر ہی نہ تھا چنانچہ گھر میں خراب ہو جانے والی بہت سی فالتو چیزیں جمع تھیں۔ اس نے ایک انچ موٹا اور تقریباً تین فٹ لمبا لوہے کا پائپ اٹھانے سے پہلے ہاتھوں پر وہ دستانے چڑھا لیے جو ڈاکٹر کوئی آپریشن کرنے سے پہلے پہنتے ہیں۔ جوتے بھی وہ اپنے اصل سائز سے بڑے پہن کے آیا تھا جن کو وہ واپسی میں پھر گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی ویران کھنڈر میں ڈال دیتا۔

اس نے دل کو مضبوط کیا اور آگے بڑھا۔ رستہ اس کے سامنے کھلا تھا۔ خدا بخش کے کمرے میں بھی تاریکی اور خاموشی تھی۔ اس سے اگلا کمرا رضیہ بیگم کا تھا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند نہیں ہوتا تھا تاکہ خدا بخش ان کی ایک آواز پر اندر پہنچ سکے۔ اس نے دروازے کو دھکیلا تو وہ چوں چرا کے بغیر کھل گیا۔ لیکن اندر نائٹ لیمپ کی روشنی میں اسے رضیہ بیگم کا بیڈ خالی نظر آیا۔ یہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ورنہ ان کو پتا بھی نہ چلتا کہ رات کو فرشتۂ اجل کے بھیس میں اس کی کمزور ہڈی والی بوڑھی کھوپڑی کو پاش پاش کرنے والا کون تھا۔ ایک ہی ضرب ان کو ایک دنیا سے دوسری دنیا میں اور اس قدیم گھر سے شوہر کی بغل والی خالی قبر میں پہنچانے کے لیے کافی تھی۔

فوری طور پر اس نے بیڈ کے ساتھ ہی لگے ہوئے پرانے صوفے کے پیچھے چھپ جانے کا فیصلہ کیا مگر اس کے روپوش ہونے سے پہلے واش روم کا دروازہ کھلا اور اندر سے روشنی کے ساتھ رضیہ بیگم باہر آگئیں۔ ان کی نظریں ملیں۔ وہ صرف ایک لمحہ تھا۔ ماں کی نظر میں بے یقینی تھی اور بیٹے کی نظر میں خوف۔

''حمید..... تو..... یہاں.....؟'' رضیہ بیگم نے اس کی نظروں کے عزائم بھانپ لیے۔

حمید بھوکے..... پاگل چیتے کی طرح جھپٹا۔ اس کی ایک ٹکر سے بڑھیا فرش پر ڈھیر ہوئی مگر گرتے گرتے بھی اس نے چلّا کے خدا بخش کو آواز دی۔ حمید نے اس پر دو تین وار کیے۔ پہلا اس نے ہاتھ سے روکا۔ دوسرا اس کی گردن پر پڑا، تیسرے میں اس کا سر ٹوٹ گیا۔ اسی وقت خدا بخش یوں نمودار ہوا جیسے پہلے سے دروازے کے اندر آچکا تھا۔ ''حمید صاحب.....؟'' وہ چلّایا۔

حمید پر اب خون اور جنون سوار تھا۔ ''تیری تو.....'' اس نے ایک جست میں خدا بخش کو جالیا۔ لوہے کے پائپ کے بھرپور وار نے خدا بخش کو چت کر دیا۔ اس غیر متوقع صورتِ حال نے حمید کو نروس کر دیا تھا۔ رضیہ بیگم کو خود اپنے وارث کے ہاتھوں مرنا ہی تھا۔ ملازم کی موت بھی مالکن کے ساتھ ہی لکھی تھی تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو ایک مقصد کے مطابق اپنا حقِ وراثت آج حاصل کرنے کا حق لینے آیا تھا کیونکہ ایک غیر معینہ کل تک انتظار میں اس کی زندگی ضائع ہوتی تھی۔

اس بات کو یقینی بنانے کی ضرورت اس نے محسوس نہیں کی کہ اس کو زندگی دینے والی ماں کو موت مل چکی ہے۔ اس کا خون سر سے بہہ کر قالین کو تر کر رہا تھا۔ اس کی گردن بھی ٹوٹ چکی تھی اور عجیب مضحکہ خیز انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ اس کا نمک خوار بھی ساکت تھا۔ ان دونوں کی عمر کے آخری حصے کے لوگوں میں مزاحمت کی قوت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔

پروگرام کے مطابق اس نے الماری کھول کے وہ سب قدیم زیورات نکالے، کچھ رضیہ بیگم نے دلہن بن کے پہنے تھے۔ پھر قدیم طرز کے بھاری بھرکم زیورات خالص سونے کے تھے۔ کچھ اس نے سعودی عرب میں قیام کے دوران بنوائے تھے۔ یہ بھی چوبیس قیراط کے مہر والے سونے کے تھے۔ اس نے زیورات کے ڈبوں کو خالی کرکے اِدھر اُدھر پھینکا۔ پھر الماری میں سے کپڑے نکال کے فرش پر اِدھر اُدھر ڈالے یوں جیسے کسی نے کپڑوں میں چھپے ہوئے زیورات یا کیش کو تلاش کیا ہو۔ الماری اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں باہر ڈال کے اس نے تمام زیور کو ایک شاپر میں ڈالا۔ یہ بھی اس کے اندازے کے مطابق لاکھوں کا تھا۔

دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے بے ہنگم طریقے پر ٹانگیں پھیلائے خدا بخش کو دیکھا۔ ایک نائٹ لیمپ کی مدھم سی نیلی روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا کہ بڈھے میں زندگی کی کوئی علامت نہیں۔ اس کے پاس رک کر نبض یا دل کی دھڑکن دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی سانس رکی ہوئی ہے۔ اس نے پائپ کو وہیں پھینکا اور جس راستے سے آیا تھا اسی سے باہر نکل گیا۔ دستانوں کا مقصد پورا ہو گیا۔ انہیں اس نے باہر کا میدان کراس کرتے ہوئے جھاڑیوں میں اچھال دیا۔

اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد حمید نے دو سائز بڑے جوتے اتار کے وہیں پھینکے۔ اپنے جوتے پہن کے اس نے گاڑی نکالی اور وقت دیکھا تو تین بجنے والے تھے۔ رات کے وقت ہر سڑک خالی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے میں وہ بڑے آرام سے مری پہنچ سکتا تھا جہاں وہ دو دن سے اپنی فیملی کے ساتھ

ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کشمیر پوائنٹ کے پرائیوٹ لاجز تھے جو ایک دائرے میں بنے ہوئے تھے دائرے کے وسط میں لان تھا جس پر کرسیاں پڑی تھیں اور بچوں کے جھولے تھے۔ یہاں ایک اور دو بیڈ روم کے لاجز تھے جن کا اپنا چھوٹا سا کچن تھا اور اس میں لگی ہوئی چار افراد کے کھانے کی میز...... حمید نے دو بیڈ والا لاج لیا تھا۔ وہاں قیام کرنے والے اپنی گاڑیاں گیٹ کے اندر ایک کنارے پر کھڑی کرتے تھے۔

حمید نے صبح کی اذان کا انتظار کیا اور جب گیٹ پر کھڑا ہوا چوکیدار نماز پڑھنے چلا گیا تو اس نے گاڑی اندر لے جا کر قطار میں کھڑی گاڑیوں کے درمیان پارک کر دی۔ جاتے وقت بھی اس نے خیال رکھا تھا کہ چوکیدار عشا کی نماز کے لیے چلا جائے تو گاڑی نکالے۔ باقی لاجز کے مکین ابھی سوئے پڑے تھے۔ سوائے افشاں کے...... وہ جانماز پر تسبیح لیے بیٹھی تھی۔

گاڑی کی آواز پر وہ اٹھ کے باہر آگئی۔ حمید کے قریب آتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی۔ ''سب ٹھیک رہا نا... مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔''

حمید نے اسے چوم کے تسلی دی۔ ''ایوری تھنگ از قائن...... انڈر کنٹرول۔'' اس نے انگوٹھا بلند کیا۔ ''بس اب کافی پلا دو مجھے...... میں بہت تھک گیا ہوں۔ ابھی نیند تو آئے گی نہیں...... اور ہاں یہ لو...... یہ سب تمہارا ہے۔''

افشاں نے شاپر میں مرحوم ساسو ماں کے زیورات دیکھے تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''میں کل ہی انہیں نئے ڈیزائن کے مطابق بننے کے لیے دے دوں گی۔''

حمید نے اسے خبردار کیا۔ ''سب ایک ساتھ نہیں...... اور تمہارے اس خاندانی سنار کو تو بالکل نہیں۔'' وہ مسکرائی اور بل کھا کے باہر نکل گئی۔

ایک بریکنگ نیوز کے انتظار میں وہ جاگ رہا تھا۔ کافی پینے اور درد کا احساس مٹانے والی گولیاں اس کے اندرونی اضطراب کو دور کرنے سے قاصر تھیں۔ ابھی تک اس کی نظروں میں ساٹھ کلومیٹر دور ایک پرانے گھر کے بیڈ روم کی فلم چل رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اور جوانی کے کچھ دن گزارے تھے۔ فرش پر بے ہنگم طریقے سے پڑی ایک دبلی پتلی بوڑھی عورت کی لاش اس کے تصور میں یوں ٹھہر گئی تھی جیسے بھی ٹی وی اسکرین پر چلنے والی کسی فلم کا ایک فریم دیوار پر لگی تصویر کی طرح منجمد ہو جاتا ہے۔ کمرے میں اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ اگر معمولی سی نیلی روشنی والا نائٹ لیمپ نہ ہوتا تو وہ لاش بھی نظر نہ آتی جو ستر سال سے زائد عمر کے ایک نمک خوار ملازم کی تھی۔ حمید نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اسے گھر میں موجود پایا تھا۔ ان گنت سوال کرتی آوازیں تھیں جو اس کے اندر سے اٹھ کر حمید کو پریشان کر رہی تھیں۔ مجھے خود کو پُرسکون اور پُراعتماد رکھنا ہوگا۔ اس نے خود سے یہ آواز بلند کہا۔

افشاں چونک پڑی۔ ''میں تو کب سے کہہ رہی ہوں کہ لیٹ جائیں۔ میں سر دبا دیتی ہوں۔ آپ سونے کی کوشش کریں۔''

''مجھے سکون آور گولی چاہیے۔'' وہ بولا پھر اسے یاد آیا۔ ''تم نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا؟''

افشاں نے سر ہلایا۔ ''دو بجے کیا تھا۔ ڈاکٹر کو نہیں، کاؤنٹر کلرک کو...... اس نے کہا کہ اس وقت تو ڈاکٹر صاحب کا آنا مشکل ہے۔ اس نے مجھے نمبر دے دیا تھا لیکن کال کسی نے ریسیو نہیں کی۔''

''کیا کہا تھا تم نے کاؤنٹر والے سے؟''

''یہی کہ آپ کو الٹیاں آرہی ہیں اور موشن...... فوڈ پوائزننگ لگتی ہے۔''

حمید سینٹر ٹیبل پر رکھے فون کو دیکھتا رہا جو ابھی تک خاموش تھا۔ اس کی نظریں پھر گھڑی کی طرف گئیں جو صبح کے ساڑھے سات بجا رہی تھی۔ اس کی بے چینی اور انتظار کو ختم کرنے والی کال نو بجے آئی۔ نمبر اس کے بھائی رشید کا تھا۔ گھنٹی بجتی رہی اور پھر بند ہوگئی۔ دوسری اور تیسری کال کو بھی اس نے نظرانداز کیا۔ چوتھی کال پر اس نے ریسیور اٹھا کے نقاہت والی خوابیدہ آواز میں کہا۔ ''ہیلو...... بھائی؟''

''تم کہاں ہو حمید...... اتنی دیر سے فون کر رہا تھا؟''

''میں تو مری میں ہوں۔ ایک سیمینار تھا۔ میں افشاں اور بچوں کو بھی ساتھ لے آیا۔ لیکن کل رات فوڈ پوائزننگ ہو گئی۔''

''اماں کا قتل ہو گیا ہے حمید......'' رشید نے جھنجلا کے کہا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

''کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم......؟''

''وہی جو کہہ رہا ہوں۔ مجھے بھی ڈاکٹر علی نے فون کر کے بتایا کچھ دیر پہلے......''

''پوری بات بتاؤ، کس نے کیا قتل...... اور کیوں......؟''

''قتل اسی نمک حرام خدا بخش نے کیا ہے لالچ میں...... اماں کی الماری سے سارے زیورات غائب ہیں۔

اور خدا بخش بھی غائب ہے۔''

حمید بے اختیار چلایا۔ ''کیا؟ خدا بخش غائب ہے؟''

''ہاں، پولیس نے سب دیکھ لیا ہے۔ میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ کیا زیور تھا۔ اس لالچی نمک حرام نے اماں کے سر پر کوئی بھاری چیز ماری۔ سر پھٹ گیا۔ ان کی گردن بھی ٹوٹی ہے۔ تم فوراً آجاؤ۔''

اس کے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

''ہاں...... آرہا ہوں میں......''

☆☆☆

حمید کی نظر اب حقیقت میں وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی جو اس نے تصور میں دیکھے تھے۔ لیکن بہت کچھ اس منظر سے غائب تھا۔ وہاں نظر آنے والے سارے چہرے جانے پہچانے تھے۔ شیری کو انہوں نے عمداً مطلع نہیں کیا تھا۔ حمید کا پلان اس قتل کی ساری ذمے داری اس پر اور اس کے برانڈ نیو مگر استعمال شدہ شوہر پر ڈالنے کا تھا۔ قطعی ناقابلِ فہم طریقے پر یہ پلان اس کہانی کی طرح ہو گیا تھا جس پر فلم نہ بن سکی ہو۔ قاتل وہ بن گیا تھا جو خود مقتول تھا۔ تدفین میں شریک لوگ اور پولیس کے سادہ لباس والے، گورکن، ڈاکٹر علی اور خود اس کا بھائی شید یہ بات نہیں جانتے تھے کہ خدا بخش مر گیا تھا۔ خود اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ بات اس سے بہتر کون جان سکتا تھا اور اماں کا سارا زیور تو اب انشاں نے اپنے گھر کے ایک باتھ روم کے فلیش ٹینک میں ڈال رکھا تھا۔ جہاں سے وہ اسے کسی بہتر اور محفوظ جگہ منتقل کر دینا چاہتا تھا۔

اس کے لیے یہ بات باعثِ اطمینان نہیں تھی کہ قتل کا الزام کسی تفتیش اور تحقیق کے بغیر خدا بخش پر آیا۔ اس کی طرف نہ کوئی انگلی اٹھی اور نہ شک کی نظر۔ حمید کے وجود میں زلزلہ آیا ہوا تھا۔ کیسے؟ آخر کیسے؟ اس نے تو خود دیکھا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ وہ پھر زندہ کیسے ہو گیا؟ کیا اس نے جلدی میں غلط دیکھا تھا؟ پوری طرح تصدیق نہیں کی تھی؟ خدا بخش پر الزام آنا حمید کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن رہا تھا۔ کیونکہ مردہ خدا بخش زندہ ہو کے ایک چشم دید گواہ بن گیا تھا اور نمک خواری کا آخری قرض ادا کرنے کے لیے تیاری کر رہا تھا۔

رفتہ رفتہ دن ڈھل گیا۔ سوگ کا رسمی اظہار کرنے والے بھی رخصت ہو گئے۔ اس نے رشید کے سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھا جس پر دکھ یا ملال کا کوئی سایہ نہ تھا۔ وہاں نظر آنے والوں میں واحد رنجیدہ شخص ڈاکٹر علی تھا جو کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ ہاتھ پیچھے باندھے گم صم نظروں سے رضیہ بیگم کو اس ظاہری قبر میں روپوش ہوتا دیکھتا رہا جو ایک اینٹ کے احاطے میں شوہر کی حقیقی قبر کے ساتھ برسوں سے موجود تھی۔ آئے وہ یہاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں...... غالب کا ایک مصرعہ کسی اٹک جانے والے ریکارڈ کی طرح تھا جو ڈاکٹر علی مسلسل سن رہا تھا۔ پر نہ خدا کرے کہ یوں...... پر نہ خدا کرے کہ یوں...... اسے یہ اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ رضیہ بیگم کا قاتل خدا بخش تھا۔

پھر اس وقت جب لوگ الگ الگ قبرستان سے نکل رہے تھے کسی نے بھی اس کی عدم موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا، کسی نے نہیں دیکھا تھا کہ اس کے کان میں ایک اجنبی نے سرگوشی میں کیا کہا تھا جس پر وہ چند سیکنڈ دم بخود کھڑا رہنے کے بعد خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا تھا اور قبر میں دو مٹھی بھر مٹی ڈالنے کا ثواب چھوڑ کے جھاڑیوں میں روپوش ہو کے گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھانے والوں میں وہ شامل نہیں تھا۔

عشا کی اذان کے بعد جب وہ ایک پڑوسی کے گھر سے آنے والی بریانی کھا رہے تھے، کسی نے کال بیل بجائی۔ پھر وہ اندر آگئے۔ وہ پولیس کی یونیفارم میں ایک انسپکٹر اور ایک سب انسپکٹر تھے۔ ڈاکٹر علی ان کے پیچھے تھا۔

''تم میں سے حمید کون ہے؟'' انسپکٹر نے غرا کے کہا۔

حمید کے کھڑا ہونے سے پہلے ڈاکٹر علی نے کہا۔ ''یہ جس کے ہاتھ میں مرغی کی ٹانگ ہے۔''

انہوں نے کالر سے کھینچ کر حمید کو بے رحمی سے پکڑا اور اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔

حمید نے مزاحمت کی۔ ''یہ کیا ہے؟ کہاں لے جارہے ہو تم مجھے......؟''

سب انسپکٹر نے اس کو پیچھے سے لات ماری۔ ''سیدھا پھانسی کے تختے پر۔''

انہوں نے حمید کو باہر کھڑی پولیس موبائل میں پھینک دیا۔ وہ فرش پر گرا تو آمنے سامنے لگی سیٹوں پر بیٹھے سپاہیوں نے اس پر پاؤں رکھ کے اسے جوتوں سے دبا لیا اور اپنی رائفلیں اس کی کمر پر رکھ دیں۔

پولیس کی پوری ٹیم نے اسے اسپتال کے احاطے میں بھی ہر طرف سے گھیر لیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑ دیے تھے اور اس کے چہرے پر کوئی بدبودار چادر ڈال دی تھی پھر وہ اسے ہنکاتے ہوئے اسپتال کے اندر لے گئے۔ اس پُرتجسس بھری ایک نظر ڈالنے والوں نے پولیس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ ہر مشتبہ مجرم کو اسی طرح لاتے لے

جاتے دیکھنے کے عادی تھے۔
سر سے چادر ہٹنے کے بعد حمید نے اسپتال کا وہ وسیع آئی سی یو جیسا کمرا دیکھا جس میں ایک بستر پر خدا بخش بے حس و حرکت سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے بازوؤں سے پیوست ٹیوبیں بیڈ سائڈ پر رکھے اسٹینڈز تک جارہی تھیں۔ اس کے سرہانے کی طرف لگے ٹی وی جیسے الیکٹرانک مانیٹر پر روشن ہندسے تیزی سے بدل رہے تھے۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے منسلک رنگ برنگے تار خدا بخش کے اندر تمام اعضا کی جدوجہد کا پورا نقشہ پیش کررہے تھے۔
وہاں سیدھے کھڑے ڈاکٹر کے پیچھے دو نرسیں تھیں۔ ان کے مقابل بیڈ کی دوسری جانب ایک کرسی پر ڈاکٹر علی بیٹھا تھا۔ دوسرے پر کوئی سرکاری افسر نظر آنے والا شخص...... پولیس کے ایک مسلح انسپکٹر کے سوا حمید کو یہاں لانے والے باہر ہی رک گئے تھے۔
سرکاری افسر نظر آنے والے شخص نے نفرت اور رعونت سے حمید کو دیکھا۔ ''اس شخص نے اپنے بیان میں تم کو اپنی ماں رضیہ بیگم کا قاتل قرار دیا ہے۔ میں نے عدالتی افسر کی حیثیت سے اس کا بیان ریکارڈ کرلیا ہے جس پر ڈاکٹر کی گواہی ہے۔''
حمید نے ہمت سے کام لیا۔ ''میں اس بیان کو نہیں مانتا۔''
''ٹھیک ہے۔ ہم وہ بیان دوبارہ لینے کی کوشش کریں گے۔ تمہارے سامنے...... خدا بخش ابھی زندہ ہے جیسے ہی اسے ہوش آتا ہے ہم اس سے دوبارہ بات کریں گے۔''
ڈاکٹر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اگرچہ ایک بیان کافی تھا مگر سعادت مند بیٹا بھی ماں کے قتل کی کہانی سن لے۔''
عدالتی افسر نے کہا۔ ''تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ نزع کی کیفیت میں دیا جانے والا بیان سچ سمجھا جاتا ہے۔''
تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ وہ چند لمحے کے لیے خدا بخش سے مل سکتے ہیں۔
عدالتی افسر تیزی سے اٹھ کے بیڈ کے سرہانے آیا اور اس نے خدا بخش کے کان میں آہستگی سے کہا۔ ''خدا بخش ...... تم میری آواز سن اور سمجھ سکتے ہو؟''
ایک نحیف سی آواز آئی۔ ''جی......''
''وہ سب دہرا سکتے ہو جو تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا؟''
اور خدا بخش نے نحیف کمزور اور مشکل سے سنائی دینے والی مگر صاف آواز میں وہ سب دہرا دیا جس میں صرف حمید کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔ شک کی اب کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ اس قدیمی نمک خوار نے حق نمک ادا کردیا تھا۔ اس نے بڑی عیاری سے اس وقت سانس روک لی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں دوسرا وار کرکے حمید اسے مار ہی نہ ڈالے۔ اس نے حمید کی ساری کارروائی دیکھی تھی۔ ماں کے قتل سے اس کے زیورات اکٹھے کرنے تک...... جب وہ فرار ہوتے وقت ایک لمحہ کے لیے رکا تھا تو خدا بخش نے سانس روک رکھی تھی اور وہ یقین دلانے میں کامیاب رہا تھا کہ وہ مرچکا ہے۔
بیان مکمل ہوتے ہی وہ آئی سی یو سے باہر آگئے۔ خدا بخش کی زندگی کا سفر مختصر سے مختصر ہوتا جارہا تھا...... وہ چند لمحوں کا مہمان تھا۔ ڈاکٹر علی نے کہا۔
''اچھا ہوتا اگر تم یہ قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتے۔'' اس نے جاتے جاتے حمید سے کہا۔ ''رضیہ بیگم کو بہت پہلے سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی جائداد کے حق دار اپنا حق حاصل کرنے کی جلدی میں ان کا قتل نہ کردیں۔ انہوں نے اپنے خوف کا اظہار ابھی کچھ عرصہ پہلے کیا تھا جب تمہاری بہن انہیں دھمکیاں دے کر گئی تھی اور ان کی خواہش پر وکیل کو بلا کے میں نے قانونی کارروائی مکمل کرا دی تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ تمہارے ساتھ زیادتی کررہی ہیں۔ مگر ماں سے زیادہ اولاد کو کون سمجھ سکتا ہے۔ تم ان کی توقعات پر پورے اترے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ حق دار ہونے کے باوجود اب کسی کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ رضیہ بیگم نے تمام پراپرٹی لاوارث بوڑھوں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ادارے کو دے دی تھی۔ اپنی زندگی میں وہ ایسا کرنے کی مجاز تھیں۔''
جاتے جاتے وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''ایک بات اور بتا دوں تمہیں...... حق دار تو تم اب صرف پھانسی کے ہو اس دنیا میں...... اور آخرت میں اس عذاب کے جو تم نے کمایا۔ اس حق نمک ادا کرنے والے کو دیکھو...... تمہاری ماں اس کی زندگی بھر کی خدمات کے بدلے میں اسے بہت کچھ دینا چاہتی تھی مگر اس نے انکار کردیا۔ اس نے حق نمک کی قیمت نہیں لی۔''
جب وہ باہر نکل رہا تھا تو اس نے رشید کو دیکھا جو نہ جانے کس وقت اندر آکے خاموشی سے ایک کونے میں کھڑا ہوگیا تھا۔ مگر اس میں اپنے ماں جائے سے نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔ ایک معمولی حیثیت کے ملازم نے حق نمک بیچنے سے انکار کرکے بازی جیت لی تھی۔ وراثت کا حق رکھنے والے بازی ہار گئے تھے۔

نئی منزل

سیریناراض

باضمیر کے لیے معمولی سے جرم کی چبھن بھی بہت ہوتی ہے... وہ اس چبھن سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا... مگر اس کے اثرات گھٹنے کے بجائے اس کے اعصاب اور اس سے منسلک رشتوں میں دراڑیں ڈال رہے تھے... ڈر و خوف کی فضا میں اندوہ ناک خدشات کو گھٹاتی بڑھاتی تحریر کے حیرت انگیز موڑ...

اس جرم کا شاخسانہ جس کی جڑیں ماضی میں دفن تھیں......

''میں چاہتا ہوں کہ اس ہفتے تم ہمارے گھر ڈنر کرو۔'' بریڈ نے کہا پھر کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔

''جان، تم سن رہے ہو؟''

میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ اس وقت میں اس کے برابر بینچ پر بیٹھا ہوا، اسکول کی پارکنگ لاٹ میں سکڑتے ہوئے مجمع کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن میرا ذہن اپنے بھائی یا اس کی دی ہوئی دعوت کے بجائے اس خبر میں الجھا ہوا تھا جو دس منٹ پہلے میں نے اپنے کار ریڈیو پر سنی تھی۔ اس خبر نے

مجھے حیران ہی نہیں بلکہ خوف زدہ بھی کر دیا تھا۔
''ہمیں اپنے بچوں کو قریب لانے کی ضرورت ہے۔'' بریڈ ایک سنہرے بالوں والی عورت اور دو بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی اور میرے اندازے کے مطابق وہ عورت کوئی ٹیچر تھی جو اسکول کے احاطے میں لگے ہوئے شاہ بلوط کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان بچوں سے بات کر رہی تھی۔
''بہرحال وہ آپس میں کزن ہیں اور صرف اسکول ہی میں ان کا ملنا کافی نہیں۔'' بریڈ نے کہا۔
میں اپنے خیالوں سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟''
''میں اپنے اور تمہارے بچوں کی بات کر رہا ہوں احمق۔'' وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہاری بینائی کمزور ہو گئی ہے؟''
میں نے ان تینوں پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی جو کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے اور بولا۔ ''وہ ٹومی اور کیٹی نہیں ہیں۔ یہ تو بہت چھوٹے ہیں۔ شاید کنڈرگارٹن میں پڑھتے ہوں جبکہ ہمارے بچے تو سیکنڈ گریڈ میں ہیں۔''
بریڈ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری نظر واقعی کمزور ہو گئی ہے۔''
''کیا مطلب؟''
اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے گھر جانا ہے جان۔'' پھر اس نے آواز دے کر کہا۔ ''کیٹی! آجاؤ، ہمارے جانے کا وقت ہو گیا۔''
میں نے دیکھا کہ وہ چھوٹی سی لڑکی ہماری طرف بڑھنے لگی۔ جب قریب آئی تو دیکھا کہ وہ واقعی میری بھتیجی کیٹی تھی اور اس عورت کے ساتھ کھڑا ہوا لڑکا یقیناً ٹومی ہی ہوگا۔ کیا میری آنکھیں اس حد تک دھوکا دے سکتی ہیں پھر اس کی وجہ میری سمجھ میں آگئی وہ بچے چھوٹے نہیں تھے بلکہ وہ عورت ضرورت سے زیادہ لمبی تھی۔ اب وہ بھی میرے بیٹے کا ہاتھ تھامے ہماری طرف آرہی تھی۔ اس کا قد سات فٹ کے قریب تھا۔ جب وہ قریب آئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بے حد پُرکشش اور جاذب نظر تھی لیکن اس سے بات کرنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت پڑتی۔
بریڈ نے کیٹی کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''ہفتے کو آنا نہ بھولنا۔''
''ایک منٹ۔'' میں نے ٹومی اور اس عورت کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''
بریڈ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''سنا ہے کہ پرنسپل نے اسے گزشتہ روز ہی ٹیچرز کی مدد کے لیے رکھا ہے۔ اس کا نام پینی مارٹن ہے۔''
''یہ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے؟ زیادہ تر لوگ تو جا چکے ہیں۔''
''میرا خیال ہے کہ اسے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا پسند ہے۔''
''بڑی عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب اس کی جسامت سے ہے۔ عام طور پر معاون ٹیچرز نوجوان ہوتی ہیں۔''
''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد یہاں تک پہنچی ہو۔''
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے ماضی میں کھو گیا۔ میری زندگی کا سفر بہت دشوار گزار تھا۔ ایک بار میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوا لیکن جلد ہی بحال ہو گیا۔ اس دوران مجھے بچوں کی جیل بھی جانا پڑا۔ اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے بوتل منہ سے لگائی۔ بہرحال جیسے تیسے گریجویشن کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مقامی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد میں نے اسٹوڈنٹ لون اور پارٹ ٹائم ملازمت کر کے چار سال تک تعلیمی اخراجات پورے کیے اور مجھے فنانس میں ڈگری مل گئی پھر میری ملاقات بیٹی اینڈرسن سے ہوئی اور ہم دونوں نے شادی کر لی۔ میں نے مختلف جگہوں پر ملازمت کی اور بالآخر ڈینوول کے مرکزی علاقے میں اپنا دفتر قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شادی کے ایک سال بعد میرا بیٹا ٹومی پیدا ہوا اور بیوی کو ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں ملازمت مل گئی۔ اس طرح زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آگیا لیکن بدقسمتی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دو سال بعد بیوی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ٹومی اس وقت صرف پانچ سال کا تھا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم دونوں بھی اس صدمے سے سنبھل گئے اور زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی۔ مالی تنگی اپنی جگہ تھی اور میں کچھ زیادہ ہی پینے لگا تھا لیکن دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ ہم ایک اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں۔
میرے بھائی کو یہ بات معلوم نہیں تھی اور شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں۔ میرا ماضی اس سے کہیں زیادہ تاریک تھا جیسا کہ نظر آتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں گرینیڈا کے قریبی قصبے کے ایک چھوٹے سے بینک میں کام

کرتا تھا اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ڈکیتی کا حصہ بننا پڑا۔ مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ شام کو جاتے ہوئے والٹ کو کھلا چھوڑ دوں لیکن مجھے اسی روز ملازمت سے نکال دیا گیا اور چھٹی ہونے سے بہت پہلے بینک سے چلا گیا اس طرح والٹ مقفل اور محفوظ رہا۔ اس سے بھی بری بات یہ ہوئی کہ میں اپنا غم غلط کرنے ایک قریبی بار میں چلا گیا اور مجھے بالکل یاد نہیں رہا کہ اپنے دونوں ساتھیوں کو جنہوں نے مجھے اس واردات میں شریک ہونے پر مجبور کیا تھا، بروقت مطلع کر کے آپریشن ملتوی کرنے کے لیے کہہ دوں چنانچہ پروگرام کے مطابق ایزون اور ارنسٹ گراؤ ٹھیک دس بجے بینک کی عمارت میں داخل ہوئے لیکن مقفل والٹ کو کھولنے کی کوشش میں پکڑے گئے اور انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اس شخص کا یعنی میرا نام بھی سامنے نہ آسکا جس کی وجہ سے ان کا منصوبہ ناکام ہوا۔ میں نے بھی کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی جتنا عرصہ وہ جیل میں رہے، ان کے بارے میں کچھ سنا۔

لیکن اب وہ رہا ہو چکے تھے اور یہی وہ خبر تھی جو میں نے صبح کار ریڈیو پر سنی تھی۔ اناڑی پن سے کی جانے والی ڈکیتی اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی خبر تھی اور ڈینئول کے باسیوں کو ان دونوں بھائیوں کا نام یاد تھا۔ نیوز کاسٹر کے الفاظ میں انہوں نے معاشرے کا قرض اتار دیا ہے لیکن اب انہیں بھی ایک قرض وصول کرنا ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ مقروض میرے علاوہ کون ہو سکتا ہے جس کی غلطی کی وجہ سے وہ جیل چلے گئے۔

میں اپنے خیالوں سے واپس آیا تو دیکھا کہ بریڈ اور اس کی بیٹی پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے اور وہ لمبی عورت یعنی مارٹن مجھ سے بیس فٹ کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ ٹومی پرجوش انداز میں کچھ بتا رہا تھا۔ شاید اس چیز کے بارے میں جو بچوں نے درخت پر دیکھی تھی۔ وہ برابر میں جھکی اس کے چہرے پر نظریں جمائے تائیدی انداز میں سر ہلا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔

میں بینچ سے اٹھا اور اس کے پاس جا کر اپنا تعارف کروایا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر لینگلے۔''

پھر اس نے ٹومی سے کہا۔ ''او کے، کل ملیں گے۔''

راستے میں ٹومی نے مجھے بتایا۔ ''اس نے مجھے اور کیٹی کو درخت پر گلہری کا گھونسلا دکھایا تھا۔''

''ہاں، تم اسی جانب دیکھ رہے تھے۔''

''اور کل اس نے ایک کتے کو اٹھا کر احاطے سے باہر پھینک دیا تھا۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''مس مارٹن لیکن میں نے صرف سنا ہے کیونکہ اس وقت اسکول کی عمارت کے اندر تھا۔''

''لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیونکہ وہ جیفری ویلس پر حملہ آور ہوا تھا اور اگر مس مارٹن نہ ہوتی تو وہ اسے کاٹ لیتا۔''

رات کے کھانے کے بعد ٹومی سونے چلا گیا۔ اس روز بھی میں نے معمول سے کچھ زیادہ پی اور تنہا بیٹھا اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ بیٹی کے مرنے کے بعد میری یہی کیفیت ہو گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میں نے گھر کی تمام بتیاں بجھا دیں اور اب صرف چاند کی مدھم روشنی ہی کھڑکیوں کے ذریعے اندر آ رہی تھی۔ یہ مکان بھی مجھے غیر متوقع طور پر مل گیا تھا۔ دراصل میرا ایک کلائنٹ سال میں چھ مہینے ایریزونا کے صحت افزا مقام پر گزارتا تھا اور گزشتہ دو سردیوں سے اس نے اپنی تعطیلات کے دوران ہمیں اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ مکان میرے وسط شہر والے اپارٹمنٹ سے سو گنا بڑا اور آراستہ تھا۔ کیونکہ ہم یہاں مفت میں رہ رہے تھے۔ اس لیے میں نے دوسرے مکان کے بارے میں نہیں سوچا جبکہ اس کے ساتھ ہی دو ایکڑ پر پھیلی ایک جھیل اور ایک کشتی بھی موجود تھی۔

ان آسائشوں کے باوجود میری پریشانیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اور آج کی رات ان میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا کیونکہ چار گھنٹے قبل ڈنر سے واپس آتے ہوئے جب میں اپنے گھر کے قریب ایک کونے پر پہنچا تو ٹومی نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈی، اس کار کو دیکھو۔''

میں نے اپنی نظریں سڑک پر دوڑائیں۔ وہ ایک پرانی سبز رنگ کی والوو تھی۔ اس کی روشنیاں گل تھیں اور اسے اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ ہائی وے سے نظر نہیں آتی تھی۔

''اس میں کیا خاص بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ گزشتہ رات بھی یہیں کھڑی ہوئی تھی۔''

''کیا؟''

''اور پرسوں رات بھی۔''

یہ اطلاع میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ کیا کوئی

ہماری نگرانی کر رہا تھا اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اگر ایسا ہے تو یہ کام کراؤے برادرز کا ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس کام کے لیے کسی کی خدمات حاصل کی ہوں۔ میں نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے گھر تک آنے جانے کے لیے صرف ایک ہی سڑک استعمال ہوتی تھی جس کے ذریعے نگرانی کرنا بہت آسان تھا۔ نصف شب کے قریب میں بستر پر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن میں آیا۔ مجھے یاد آگیا کہ اس سے پہلے پینی مارٹن کو کہاں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے بستر سے چھلانگ لگائی اور الماری کھول کر وہ لفافہ نکالا جس میں وہ پرانی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جنہیں کسی البم یا فریم کی زینت بننا نصیب نہیں ہوا تھا۔ دو منٹ بعد ہی مجھے وہ تصویر مل گئی جس میں میری مرحومہ بیوی بیٹی ریاستی جیل کے مہمان خانہ کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہفتے کے روز ڈھیروں پرانے رسالے لے کر وہاں گئے تھے تاکہ وہاں قیدیوں کو عطیہ کردیں۔ وہیں ایک عورت کھڑکی کے دوسری جانب وزیٹنگ روم میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رخ کیمرے کی جانب تھا اور پس منظر میں اس کے سنہرے بال واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ بلاشبہ وہ پینی مارٹن ہی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جیل میں کس سے ملنے گئی تھی۔ شاید میں اس سوال کا جواب جانتا تھا۔ مجھے یاد آگیا کراؤے برادرز میں ایک بھائی ایزدن عورتوں کا رسیا اور بھاری بھر کم تن و توش کا حامل تھا۔ اس کا قد چھ فٹ دو انچ اور وزن کم از کم دو سو بیس پاؤنڈ تھا۔ اسے سنہرے بالوں والی عورتیں پسند تھیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پینی مارٹن جسامت میں ہم پلہ اور اس کے معیار حسن پر پوری اترتی تھی۔ اگر وہ واقعی ایزدن سے ملنے گئی تھی تو اس کا اس شہر میں عین اس روز آنا معنی رکھتا تھا جب وہ دونوں رہا ہوئے۔ کیا وہ صرف اس لیے آئی تھی کہ ایزدن بھی یہاں موجود تھا حالانکہ کراؤے خاندان کافی عرصہ پہلے ڈینوول سے جا چکا تھا لیکن ایزدن یا ارنسٹ نے یہاں آنے کی وجہ مجھے معلوم تھی۔

دوسرے دن سہ پہر میں دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے بیٹے کو لینے اس کے اسکول گیا۔ میں چھٹی ہونے سے پندرہ منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا تھا اور عمارت کے باہر بینچ پر بیٹھنے کے بجائے اندر چلا گیا اور استقبالیہ کلرک سے پوچھا کہ کیا میں پرنسپل سے مل سکتا ہوں۔ تیس سیکنڈ بعد ہی پرنسپل ایلین وانکنز نے دروازے سے باہر نکال کر کہا۔

''اندر آجاؤ جان!''

میں ایلین کو کافی عرصے سے جانتا تھا۔ اس لیے بلاتکلف بولا۔ ''کیا تم مجھے مس مارٹن کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟''

وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا مطلب اس کے پس منظر سے ہے۔ میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی، اسے غیر معمولی حالات کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔''

''کیسے حالات؟ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں پرسوں پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔''

''ٹومی نے بتایا تھا کہ ایک کتا کسی بچے پر حملہ آور ہوا تھا۔''

''سات سالہ بچہ اتنا ہی بتا سکتا ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''میں سنجیدہ ہوں ایلین۔ بتاؤ پرسوں کیا ہوا تھا؟''

''بدھ والے روز صبح دس بجے میں اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک عورت بچے کی ملازمت کے لیے میرے پاس آئی۔ میں فوراً ہی اس کی جانب متوجہ ہوگئی کیونکہ وہ بے حد طویل قامت تھی۔''

''پینی مارٹن۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''ہاں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ حال ہی میں یہاں آئی ہے اور اس نے اس اسکول کی بہت تعریف سنی ہے۔''

''اور؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''اور بس۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا اس نے صرف یہی کہا تھا؟''

''ہاں، اسے صرف یہی کہنے کی مہلت مل سکی کیونکہ اسی وقت باہر سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔'' وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وقفہ کے دوران سب بچے کھیل کے میدان میں جا چکے تھے کہ اچانک ان سب نے دوڑنا اور چلانا شروع کردیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بھورے رنگ کا بڑا کتا اپنے مالک کی گرفت سے آزاد ہو کر بچوں کی طرف دوڑ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پوری طرح حملہ کرنے کے موڈ میں ہے۔ میں نے اتنا خوفناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

''کہتی رہو۔'' میں نے کہا۔

''اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتی یا کچھ سوچتی۔ پینی مارٹن اٹھی اور دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے کبھی کسی کو اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر کوئی کتے سے دور بھاگ رہا تھا اور یہ اس کی طرف دوڑ لگا رہی تھی۔ صرف اس بچے جیفری ویلس کے علاوہ جو جامد کھڑا اس عفریت کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈر کے مارے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ موت اس کی جانب لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔''

پرنسپل نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی آنکھ میں آنسو آگئے تھے۔ ''لیکن وہ کتا اس تک نہیں پہنچ سکا۔ پینی مارٹن اس لڑکے کے پاس سے دوڑتی ہوئی گئی اور اس کتے کو کان سے پکڑ لیا۔ پھر اس نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا جیسے کسی فٹ بال کو پکڑتے ہیں۔ اس نے پوری قوت سے کتے کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ وہ غصے میں لاتیں چلا رہا اور غرا رہا تھا لیکن پینی نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بالآخر اس کی جدوجہد ختم ہوگئی۔ اس کی زبان باہر نکل آئی اور ٹانگیں مڑ گئیں۔''

ایلین لحہ بھر کے لیے رکی اور کہنے لگی۔ ''پینی نے ایک مرتبہ بچوں اور ٹیچرز کی طرف گھوم کر دیکھا اور پوری قوت سے کتے کو احاطے کی دیوار سے باہر پھینک دیا۔ شاید وہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ یہ میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب وہ سڑک پر جا کر گرا تو اسی وقت وہاں سے گزرنے والے ایک وزنی ٹریلر نے اسے ٹکر ماردی اور اس کے اعضا سڑک پر بکھر گئے۔''

مجھے لگا جیسے کرسی کے ہتھے پر میری گرفت مضبوط ہوگئی ہے۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''واؤ۔''

ایلین کا چہرہ پُرسکون ہوگیا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''پھر وہ ننگے پاؤں زمین پر بیٹھ گئی اور جیفری ویلس کو گلے لگا لیا جب میں وہاں پہنچی تو وہ پُرسکون ہو چکا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس دوران اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور یہ خوفناک نظارہ دیکھنے سے بچ گیا لیکن وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسا چاہتا تھا۔''

میں اس کی بات پر یقین کرسکتا تھا کیونکہ مجھے یاد آگیا کہ اس نے کس طرح میرے بیٹے کو محبت سے دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کوئی بچہ تھا یا نہیں لیکن وہ ان سے پیار کرتی تھی۔

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے پرنسپل سے پوچھا۔

''میں نے اسے اپنے دفتر میں بلایا اور ملازمت دے دی۔''

''اسی وقت۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''کسی رسمی کارروائی کے بغیر۔''

پرنسپل نے اپنی ہتھیلی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم خود سوچو۔ اس نے ایک بچے کی جان بچائی جسے وہاں موجود درجن بھر ٹیچرز نے دیکھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس نے مجھے اور اسکول کو بدنامی سے بچا لیا اسی لیے میں نے اسے ملازمت دے دی۔ اس پر صرف میں ہی نہیں بلکہ ٹیچرز، بچے اور ان کے والدین بھی خوش ہیں۔''

جب میں اسکول کی عمارت سے باہر آیا تو دیکھا کہ ہماری ہیروئن ایک پرانی سبز رنگ کی والوو کار میں جا رہی

تھی۔ اس رات وہ کار ہمیں اپنے گھر کے باہر نظر نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم ڈنر کے بعد سیدھے گھر نہیں گئے بلکہ شہر میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں بالکل خاموش رہا۔ غالباً ٹومی بھی جان گیا ہوگا کہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پیٹی مارٹن ہی وہ عورت ہے جو ہماری نگرانی اور پیچھا کر رہی تھی۔ بظاہر مہربان نظر آنے والی یہ عورت لڑنے بھڑنے اور تشدد کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کرائے برادران نے مجھے قتل کرنے کے لیے اس کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس کو اطلاع کر دوں کہ ایک عورت مجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھ سے اس کی وجہ پوچھیں گے تو کیا بتاؤں گا۔ یہی کہ کئی برس پہلے میں ایک بینک ڈکیتی کے منصوبے میں شامل تھا جو میری وجہ سے ناکام ہوگئی۔ اب وہ لوگ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد رہا ہو گئے ہیں اور یہ عورت ان لوگوں کی آلۂ کار ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہوگا، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

مجھے خود ہی اس مسئلے سے نمٹنا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ٹومی کو کسی ممکنہ خطرے سے دور رکھا جائے۔ اسے کچھ دیر کے لیے بھائی کے پاس چھوڑوں پھر اپنے گھر جا کر ضروری سامان اپنی کار میں رکھوں اور ٹومی کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں۔ کتنے عرصے کے لیے؟ یہ میں نہیں جانتا تھا بس ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میرا منصوبہ بالکل مکمل تھا۔ میں ٹومی کو لے کر بریڈ کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے کہا کہ وہ میرے بیٹے کو کچھ دیر کے لیے اپنے پاس رکھ لے کیونکہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ میری پوری کوشش تھی کہ اسے بالکل شک نہ ہو پھر میں اپنے گھر واپس آیا۔ اس وقت مکمل تاریکی تھی اور مجھے وہ سبز کار کہیں نظر نہیں آئی۔

میں عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا تا کہ واپسی میں آسانی سے باہر جا سکوں۔ جلدی جلدی دو بیگ تیار کیے جن میں اپنے اور ٹومی کے کپڑوں کے علاوہ دیگر ضروری اشیا رکھ لیں۔ ابھی میں سامنے کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ میں نے پورچ میں بھاری قدموں کی آواز سنی۔ وہاں ایزون اور ارنسٹ کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔

”جان اینگلے۔“ ایزون نے کہا۔ ”بہت عرصے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔“

پورچ کی روشنی میں ان کے چہرے زرد نظر آرہے تھے اور وزن بھی پہلے سے کم ہو گیا تھا لیکن ان کی آنکھوں میں وہی پہلے جیسی چمک اور ہیبت تھی۔ میں الٹے قدموں چلتا ہوا لیونگ روم میں آیا اور وہ بھی میرے پیچھے اندر آگئے۔ ایزون نے دیوار پر لگا ہوا سوئچ آن کیا اور چھت میں لگی ہوئی واحد لائٹ روشن ہوگئی۔

میں نے دونوں بیگ زمین پر رکھ دیے۔ اس وقت میں اپنے آپ کو کافی کمزور محسوس کر رہا تھا۔

”تمہارا بیٹا کہاں ہے؟“ ایزون نے پوچھا۔

”وہ گھر پر نہیں ہے۔“ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایزون نے کہا۔ ”اس کا کمرا کہاں ہے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو ایزون نے گن نکال کر میرے سینے پر رکھ دی اور اپنا سوال دہرایا۔

”اوپر۔“ میں نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ میری آواز میں لرزش نمایاں تھی۔ ”دائیں ہاتھ پر تیسرا دروازہ ہے۔“

انہوں نے ایک بار پھر نظریں ملائیں۔ ارنسٹ نے سر ہلایا اور اپنی بیلٹ سے ایک پستول نکال کر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ ایزون وہیں کھڑا رہا۔ اس کی سیاہ آٹومیٹک گن کا رخ بدستور میری جانب تھا۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن خاموش کھڑا رہا۔ ایزون کی نظریں مجھ پر سے ہوتی ہوئی اب اس وسیع و عریض لیونگ روم کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں قیمتی فرنیچر اور دیگر آرائشی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تم نے کافی ترقی کر لی ہے لینگلے۔“ پھر اپنی گن مجھے چبھوتے ہوئے بولا۔ ”تھوڑا سا اور پیچھے ہٹ جاؤ۔“ میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے پیچھے ہٹا اور میری ٹانگیں کمرے کے وسط میں رکھی کافی ٹیبل سے ٹکرا گئیں۔ ایزون بدستور میرے سینے پر پستول تانے کھڑا رہا تھا، میرے سر کے عین اوپر چھت میں لگی ہوئی لائٹ تھی جبکہ دائیں جانب آتش دان اور بائیں جانب اوپر کی جانب دوسری منزل کی ریلنگ تھی اور کوئی بھی شخص وہاں کھڑے ہو کر پورے کمرے کا جائزہ لے سکتا تھا۔

کافی دیر گزر گئی تو ایزون نے بہ آواز بلند کہا۔ ”ایرنی، تمہیں وہ لڑکا ملا؟“

کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے دوبارہ کہا۔ ”میں

پوچھ رہا ہوں کہ کیا تمہیں وہ لڑکا مل گیا؟''
اس بار بھی خاموشی رہی پھر اچانک ہی میں اچھل پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی سایہ میرے اوپر سے گزرا ہے۔ پھر میں نے اپنی دائیں جانب آتش دان میں ایک دھماکا سنا جیسے کوئی ریفریجریٹر بلندی سے گر گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی آتش دان پر رکھی ہوئی اشیا اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ تانبے کا ایک گل دان میرے سر پر سے ہوتا ہوا بالکونی کے نیچے آئینے پر جا کر لگا اور وہ چکنا چور ہو گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایزون چلّایا۔ اس نے اپنا سر اس طرح جھکا لیا جیسے توپ کے گولے برس رہے ہوں۔ اس کے پستول کا رخ اب بھی میری جانب تھا لیکن وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور دوسرا ہاتھ اپنے چہرے کے سامنے لہرا رہا تھا۔ آتش دان کی راکھ کمرے کی فضا میں پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی پھر اچانک ہی کسی نے عقب سے اس کے منہ اور ناک پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گن پکڑ لی۔ پھر اس کے سینے کے گرد دباؤ ڈال کر اسے فرش سے اوپر اٹھا لیا۔ میں حیران کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایزون کراؤے کی آنکھیں باہر آ گئی تھیں اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے پاؤں زمین سے چھ انچ اوپر تھے اور وہ فضا میں معلق لاتیں چلا رہا تھا بالآخر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

پینی مارٹن اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سامنے کوئی مردہ کاکروچ پڑا ہو۔ اس نے جینز اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر نیلے رنگ کی بیس بال کیپ تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ میں نے زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بے ساختہ دل میں خواہش ابھری کہ کاش میرا قد دو فٹ زیادہ ہوتا۔

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا پھر میں نے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا..... کیا ہوا تھا؟''

''میں نے یہاں آتے ہوئے دیکھا تو اپنی گاڑی کی لائٹس بجھا کر ان کا تعاقب کرنے لگی۔ جب یہ اندر داخل ہوئے تو میں نے سنا کہ ٹومی کے بارے میں پوچھ رہے تھے پھر میں نے ان میں سے ایک کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنی، میں بھی اوپر چلی گئی۔'' پھر اس نے زمین پر پڑے ہوئے ایزون کو دیکھا اور بولی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ یہ تمہارے بیٹے کو قتل کرنے والے تھے۔''

''ہاں، اور مجھے بھی۔ ٹومی میرے بھائی کے گھر میں ہے، اگر تم یہاں نہ ہوتیں......'' میں نے مڑ کر آتش دان کی طرف دیکھا۔ راکھ کے بادل چھٹ چکے تھے اور ارنسٹ کراؤے کا مڑا تڑا جسم لکڑیوں اور شیشے کے ٹکڑوں کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ پینی مارٹن نے اسے بالکونی سے نیچے پھینکا تھا۔ ارنسٹ کا سر پیچھے کی طرف مڑا ہوا تھا۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے اس کی گردن توڑ دی؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم نے اسے آتش دان میں کیوں پھینکا؟''

''تاکہ نیچے والے کی توجہ ہٹ جائے اور میں سیڑھیوں سے اتر کر اس پر ہاتھ ڈال سکوں۔''

''تم صرف اس کی گن بھی چھین سکتی تھیں۔''

''میں اچھی نشانے باز نہیں ہوں۔''

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم بھی ان کی ساتھی ہو اور ان کے کہنے پر مجھے قتل کرنے آئی ہو۔''

''شاید تم نے میری کار دیکھی ہو گی۔'' وہ سر کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''وہ میری حماقت تھی کہ میں نے اس جگہ کار کھڑی کی، آج میں نے دوسری جگہ کا انتخاب کیا ہے۔''

''تم ہماری نگرانی کیوں کر رہی تھیں؟''

پینی ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''یہ ایک لمبی کہانی ہے اور اس میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو شاید تم نہ سننا چاہو۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین ہے لیکن بہرحال تمہیں بتانا ہوگا۔''

''ہاں۔'' اس نے آتش دان اور فرش پر پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے انہیں ٹھکانے لگانا ہو گا۔''

''تمہارے ذہن میں کیا تجویز ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پورے چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری جھیل کتنی گہری ہے؟''

وہ جھیل میرے اندازے سے بھی زیادہ گہری تھی۔ اس کی تصدیق میں نے چپّو والی کشتی میں بیٹھ کر کی اور اسے ناپنے کے لیے مچھلیاں پکڑنے والے بانس کا سہارا لیا جبکہ پینی مارٹن ان کی کیڈی لک کار کو چلا کر مکان کے عقب میں لے آئی اور دونوں لاشیں اس کی ڈکی میں رکھ دیں۔ میں

نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ جھیل کنارے کے قریب ترین سب سے گہری جگہ کون سی ہے۔ اس کے بعد ہم نے کار کا رخ ڈھلوان سطح کی جانب کیا۔ ایمرجنسی بریک لگایا۔ اگلے پہیوں کے نیچے لکڑی کے دو بلاک رکھے اور گاڑی کو نیوٹرل گیئر میں ڈال دیا پھر بریک اور دونوں بلاک ہٹا دیے۔ گاڑی ڈھلوان سطح پر پھسلنے لگی اور ایک اینٹ کے مانند جھیل کی گہرائی میں ڈوب گئی۔

دس منٹ بعد میں اور چینی کچن ٹیبل پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی جبکہ وہ بوربن کا گلاس تھامے بیٹھی تھی۔ میں اپنے بھائی کو پہلے ہی فون کر کے ٹومی کی خیریت معلوم کر چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ ٹومی اور کیٹی اسٹار وارز کی ڈی وی ڈی دیکھ رہے ہیں اور ٹومی کو گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے کیونکہ اگلے روز ہفتہ تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ صبح جا کر ٹومی کو لے آؤں گا۔ اس وقت تو میری اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اور ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ جو کچھ ہوا، وہ ٹھیک ہے؟'' میں نے چینی سے کہا۔

''اگر یہ نہ ہوتا تو ان کے بجائے ہم دونوں جھیل کی تہ میں پہنچ چکے ہوتے۔''

اس نے صحیح نکتہ بیان کیا تھا۔ میں نے کافی کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ہتھیار کہاں ہیں؟''

''وہ بھی کار کے ساتھ ہی جھیل میں چلے گئے۔''

''یہ بھی اچھا ہی ہوا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اور اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو لیونگ روم کی بڑی کھڑکیوں میں سے کسی ایک کا شیشہ توڑ دیتی اور ٹومی کو بتاتی کہ تیز ہوا چلنے سے ایک درخت کی شاخ ٹوٹ کر اس پر گر گئی تھی۔ یہی بات مالک مکان کو بھی بتائی جاتی اور انشورنس کمپنی سے اس نقصان کا معاوضہ طلب کیا جاتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب اعتراف کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

اس نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم بتاؤ کہ مجھ پر شبہ کیوں ہوا؟''

میں نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''مجھے شبہ تھا کہ ایزون نے مجھے قتل کرنے کے لیے تمہیں بھیجا ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ میرا خیال غلط تھا لیکن میں اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا۔ تم نے اسکول کی پرنسپل کو بتایا تھا کہ تم حال ہی میں یہاں آئی ہو۔ یعنی عین اس روز جب کراؤے برادران جیل سے رہا ہوئے۔ تم نے اس اسکول کا انتخاب کیا جہاں میرا بیٹا پڑھتا ہے۔ تمہاری کار تین مرتبہ میرے گھر کے باہر کھڑی دیکھی گئی اور تین سال پہلے میں تمہیں اس جیل کے وزیٹرز روم میں بھی دیکھ چکا تھا جہاں کراؤے برادران قید کاٹ رہے تھے۔ کیا یہ سب باتیں تمہیں مشتبہ سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟''

چینی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ محض اتفاقات ہیں ورنہ حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔'' اس نے گلاس میز پر رکھا۔ کیپ اتاری اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں ایزون کراؤے سے ملنے جیل نہیں گئی تھی بلکہ جب تم نے مجھے وہاں دیکھا، اس سے پہلے میں ان دونوں بھائیوں کو جانتی بھی نہیں تھی۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولی۔ ''کیا تم نے فرینک ایلسٹر کا نام سنا ہے؟''

''ہاں۔'' وہ ایک وکیل ہے لیکن اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ ٹیکس چوری کے الزام میں پکڑا گیا اور ایک سال پہلے جیل میں کسی نے اسے مار ڈالا۔''

''اسے چاقو سے ایک درجن زخم آئے لیکن کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔''

''تم اسے کیسے جانتی ہو؟''

''وہ میرا شوہر تھا۔''

میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا شوہر؟''

''مارٹن میرا ابتدائی نام ہے جب میں کنواری تھی۔''

''گویا تم اس روز اپنے شوہر سے ملنے کے لیے جیل گئی تھیں؟''

''ہاں، کافی عرصے سے یہ میرا معمول تھا۔ میں ہر ہفتے اس سے ملنے جاتی تھی۔''

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر سوچتے ہوئے بولا۔ ''دیگر اتفاقات کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''دراصل تمہارا شبہ کسی حد تک حقیقت سے قریب تر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں واقعی تمہاری تلاش میں یہاں آئی۔ اس اسکول میں گئی جہاں تمہارا بیٹا پڑھتا ہے۔ تمہارے گھر کی نگرانی کرتی رہی لیکن کراؤے یا کسی اور کے کہنے پر نہیں۔''

''پھر کیا وجہ تھی؟''

''کیونکہ ایزون کراؤے نے میرے شوہر کو قتل کیا تھا۔''

میں اپنی جگہ بیٹھا اسے گھورتا رہا۔ اس نے جو کچھ کہا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''یہ سچ ہے۔ فرینک کے قتل سے ایک ہفتے پہلے جب میں اس سے ملنے گئی تو اس نے بتایا کہ کراؤ ے نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی اور کہا ہے کہ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ فرینک نے بتایا کہ اس نے محافظوں سے مدد کی اپیل کی اور وارڈن کو بھی پیغام بھیجا لیکن کسی نے اس پر یقین نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو اس کی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد دونوں بھائی وہاں نظر نہیں آئے۔ ایک درجن سے زیادہ لوگوں نے گواہی دی کہ جس وقت فرینک کا قتل ہوا، وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو خرید لیا گیا تھا؟''

''بہت ممکن ہے یا انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ دراصل کراؤ ے برادران جیل میں رہ کر بھی اپنی غیر قانونی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور انہوں نے وہاں بھی اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ وہ تمام معاملات کو کنٹرول کرتے تھے جیسے منشیات، سگریٹ اور موبائل فون کی فراہمی، قیدیوں کے کام کی نوعیت اور ان کا کھانا وغیرہ سب شامل تھا جس قیدی کو جو چیز چاہیے، وہ فراہم کرتے تھے۔ اگر کسی کو تنگ کرنا یا مارنا ہوتو وہ اس کا بھی انتظام کر دیتے تھے۔ شاید انہوں نے جیل میں رہ کر باہر والے ساتھیوں کی نسبت زیادہ پیسا کمایا ہوگا۔ یہاں تک کہ کئی محافظ بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔''

مجھے ان باتوں کو ہضم کرنے میں کچھ وقت لگا پھر میں نے پوچھا۔ ''انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ انہوں نے میرے شوہر کو کیوں قتل کیا اس لیے کہ وہ ان کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ وہ ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے واقف تھا اور اس نے کئی ثبوت اکٹھے کر لیے تھے۔ اس کی کوٹھری کے ایک قیدی کو زیادہ مقدار میں منشیات دی گئی اور دوسرے کی اتنی پٹائی ہوئی کہ وہ تقریباً موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا۔ شاید اس کی زندگی کے کچھ دن باقی تھے جو وہ بچ گیا۔ فرینک جان گیا تھا کہ یہ کراؤ ے برادران کی حرکت تھی۔ وہ پانچ مہینے پہلے پیرول پر رہا ہونے والا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ جیل سے باہر آنے کے بعد اس پورے گروہ کو بے نقاب کر دے۔ اس طرح شاید وہ خود بھی مشکل میں پڑ جاتا۔''

اس نے چند لمحے رک کر گہری سانس لی اور بولی۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ فرینک خود بھی اچھا آدمی نہیں تھا لیکن بہرحال کراؤ ے برادران سے لاکھ درجے بہتر تھا۔''

میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری

شگوفے

''تم نے شادی کی انگوٹھی غلط انگلی میں پہنی ہوئی ہے۔''

دوست: ''ہاں میں نے شادی بھی تو غلط آدمی سے کی ہے۔''

☆☆☆

ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا: ''قواعد کی رو سے وقت کے تین درجے ہوتے ہیں۔''

بیوی نے پوچھا ''کون کون سے؟''

شوہر نے کہا: ''اچھا، بہتر، بہترین اور تم ایک بہترین عورت ہو۔''

یہ سن کر وہ غصے سے بولی۔ ''اور باقی دو عورتیں کون تھیں؟''

☆☆☆

میاں بیوی اتفاق سے دونوں غیر حاضر دماغ تھے۔ ایک دن گھر میں دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اپنی جوانی کی شادی کی۔ اتنے میں باہر سے کسی نے دستک دی تو بیوی نے گھبرا کر کہا۔

''اف میرے شوہر آ گئے۔''

یہ سنتے ہی اس کے شوہر کھڑکی سے باہر ''اچھا'' کہہ کر کود گئے۔

ثمینہ یاسمین جعفری، جھنگ

بات پر یقین ہے۔''

''میں خود بھی تھوڑی بہت ان جیسی ہوں۔ کم از کم قرض کی وصولی کی حد تک۔''

''گویا تم نے حساب برابر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔''

''ہاں اور جانتی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کراؤ ے برادران نے ایک دفعہ فرینک سے قانونی مشورہ مانگا تھا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اس بینک ڈکیتی کے دوران کیا ہوا تھا اور تم نے انہیں پھنسوا دیا۔''

میں نے دوبارہ تائید میں سر ہلایا۔ ''میں نے کسی کو نہیں پھنسایا تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کی کوئی زیادہ اہمیت تھی۔''

''مجھے فرینک سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دونوں جیل سے رہا ہونے کے بعد تمہارے پاس آئیں گے۔ لہٰذا میں بھی یہاں آ گئی۔ پہلے بھی ٹیچنگ کر چکی تھی۔ اس لیے تمہارے بیٹے کے اسکول میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی، میں نے تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ

معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی کہ تم کیا کرتے ہو اور تمہارے گھر میں کون کون ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی کار بیچ کر اس کی جگہ ایک پرانی کار خرید لی تاکہ کسی کو یہاں میری موجودگی کا علم نہ ہو۔''

''اس معاملے میں تم سے غلطی ہو گئی۔''

''بظاہر ایسا ہی ہے۔ دراصل میں نے سوچا تھا کہ اگر تم مل گئے اور میں تمہاری نگرانی کرتی رہی تو اس طرح ان دونوں تک بھی پہنچ جاؤں گی۔'' پینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں، سمجھ رہا ہوں۔ گویا تم نے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا۔''

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، میں مانتی ہوں۔''

''تم کس طرح انہیں قتل کرنا چاہ رہی تھیں، کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''نہیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر میری نظر اس کے غیر معمولی طور پر بڑے اور مضبوط ہاتھوں پر گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

''تم مجھے بتا سکتی تھیں تاکہ میں اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست کر لیتا۔''

''ہاں، مجھے بتا دینا چاہیے تھا لیکن میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ تم تک پہنچیں، میں انہیں گھیر لوں۔'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''اور میں نے ایسا ہی کیا۔''

''میں اس پر کوئی بحث نہیں کر سکتا۔''

وہ خاموش بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس مسکراہٹ میں شوخی کا عنصر پنہاں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی ہیں۔

''اب تم کیا کرو گی؟''

''یہ شہر چھوڑ کر اپنے گھر چلی جاؤں گی۔'' پھر اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے کیپ سر پر رکھی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''کافی کی میز پر ایک شاپنگ بیگ رکھا ہے جو تمہارے لیے ایک بونس ہے۔ تم یہ ضرور چاہو گے کہ ٹومی کے گھر آنے سے پہلے اسے کہیں چھپا دو۔''

''بونس؟ کیسا بونس؟ میں سمجھا نہیں۔''

''جب تم جمیل کا معائنہ کرنے گئے تھے تو میں نے ان کی کار کی ڈکی چیک کی۔ اس میں بھاری مقدار میں کوکین، آتشیں ہتھیار اور نقدی سے بھرا ہوا ایک گتے کا ڈبا موجود تھا۔ میں نے وہ تمام رقم نکال کر ایک شاپنگ بیگ میں ڈالی اور بقیہ تمام چیزیں مع ان کی لاشیں ڈکی میں ہی چھوڑ دیں۔''

میں پوری طرح اس کی بات نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''نقدی؟''

''زیادہ تر گڈیاں سو سو کے نوٹوں کی ہیں۔ یقیناً یہ ناجائز طریقے سے ہی حاصل کی گئی ہوں گی لیکن اب انہیں اس کی ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی مجھے یہ پیسے چاہئیں۔ فرینک میرے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے۔''

''تمہارے خیال میں کتنی رقم ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت زیادہ۔ میں نے گنتی نہیں کی۔ اس کے علاوہ ان کے والٹ سے بھی کچھ رقم ملی ہے۔'' اس نے کرسی پیچھے کھسکائی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ تمہیں مارنے کے لیے آئے تھے اس لیے یہ رقم تمہاری ہے۔ اسے مالِ غنیمت سمجھ کر رکھ لو۔''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور کچن سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ رکی، دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تک مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ کیا تم ان کی آمد کے بارے میں جانتے تھے۔''

''ہاں، مجھے شک تھا کہ وہ میری تلاش میں یہاں آ سکتے ہیں۔''

''تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''اور تمہارے بھائی کے پاس؟''

''وہ شکاری ہے۔ اس کے پاس کئی ہتھیار ہیں۔''

''پھر تم نے اس سے مدد کیوں نہیں مانگی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے لمحہ بھر کو سوچا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔''

''کیوں؟''

''میں نے یہی مناسب سمجھا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

''کیا میں تم سے ایک سوال کرسکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''یہ ساری منصوبہ بندی کرنے کے بعد تمہیں لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟''

''میں جب سڑک پر نکلتی ہوں تو جسمانی ساخت کی وجہ سے لوگ میری جانب متوجہ ہوجاتے ہیں۔''

''میرا مطلب ہے غیر ضروری توجہ۔''

''تمہارا اشارہ اسکول میں پیش ہونے والے واقعے کی جانب ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''شاید مجھے اس وقت یہی مناسب معلوم ہوا۔''

میں نے سر ہلایا۔ وہ مجھے دیکھ کر شوخی سے مسکرا رہی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور ایک بار پھر اطراف میں دیکھنے لگی جیسے سب کچھ اپنی یادوں میں محفوظ کرلینا چاہتی ہو۔ اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔ اس بار اس کے چہرے پر سنجیدگی نظر آرہی تھی۔

''میری طرف سے ٹومی کو خدا حافظ کہہ دینا اور اسے جھیل سے دور رکھنا۔'' یہ کہہ کر وہ رات کی تاریکی میں گم ہوگئی۔

اگلے روز ہفتے کی شام ہم سب بریڈ کے گھر کھانے پر جمع تھے۔ اس کی بیوی جینیفر نے ٹومی اور میری پسندیدہ چیزیں بنائی تھیں۔ کھانے کے دوران بریڈ نے کہا۔ ''میں نے جینی کو نئی ٹیچر کے بارے میں بتایا تھا۔ کیا ہمارے آنے کے بعد تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تھی؟''

''ہاں، میں اس سے ملا تھا۔ مجھے تو وہ اچھی عورت لگی۔''

''واقعی وہ بہت اچھی ٹیچر ہے۔'' ٹومی لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''وہ ہم سے اس طرح باتیں کررہی تھی جیسے ہم بڑے ہوگئے ہوں۔''

جینیفر بولی۔ ''تم دونوں اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟''

ٹومی خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس کا فون نمبر معلوم ہے۔''

سب لوگ کھانا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ میں چونکتے ہوئے بولا۔ ''کیا؟''

ٹومی نے اپنی جیب سے ایک براؤن رنگ کا کاغذ نکالا۔ اس پر زنانہ طرز تحریر میں لکھا ہوا تھا۔ پینی مارٹن اور اس کے نیچے ایک فون نمبر درج تھا۔ ٹومی نے فخریہ انداز میں اسے بآواز بلند پڑھا۔

بریڈ بولا۔ ''اس کا ایریا کوڈ تین صفر پانچ ہے۔ یہ کہاں کا ہوسکتا ہے؟''

''شاید یہ اس کے سیل فون کا نمبر ہے۔'' جینیفر نے کہا۔ ''ٹومی، یہ نمبر اس نے تمہیں کب دیا تھا؟''

''اس نے نہیں دیا۔ یہ کاغذ آج لنچ کے دوران مجھے کچن کی میز سے ملا تھا۔''

بریڈ اور جینیفر کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ دونوں شاید ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ میں نے ٹومی کو گزشتہ رات ان کے گھر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کی وجہ نہیں بتائی تھی۔

میں نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید میں اسے کچن کی میز پر رکھ کر بھول گیا تھا۔ مس مارٹن نے مجھے یہ نمبر اس وقت دیا جب اس سے ملاقات ہوئی تھی، اس کا کہنا تھا کہ اگر ٹومی کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں اسے فون کرسکتا ہوں۔''

''اچھا۔'' جینیفر نے اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھ رہے تھے لیکن مجھے ان کے تجسس سے کوئی غرض نہ تھی بلکہ میں اس کاغذ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً پینی نے ہی وہ کاغذ وہاں رکھا ہوگا جب ہم دونوں کچن ٹیبل پر بیٹھے اپنے اپنے مشروب سے دل بہلا رہے تھے۔

ٹومی کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ بولا۔ ''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مس مارٹن نے اس روز تمہیں کوئی کاغذ دیا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس وقت تم درخت پر گلہری کا گھونسلا دیکھ رہے تھے۔''

جینیفر دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ''تم اس پُراسرار عورت پینی مارٹن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔

کیٹی نے اپنی نظریں پلیٹ پر سے اٹھائیں اور بولی۔ ''اس نے کتے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر احاطے سے باہر پھینک دیا تھا۔''

میں نے بریڈ اور اس کی بیوی کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جو اپنی بیٹی کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے بلکہ میرا ذہن اس کاغذ پر لکھے فون نمبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ایریا کوڈز کے بارے میں معلوم تھا اور تین صفر پانچ یقیناً میامی کا ایریا کوڈ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں نئی منزل کی جانب سفر کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

جڑواں

منظر امام

کبھی کبھی زیادہ ہوشیاری بھی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ایک خوب صورت... وجیہہ نوجوان کی ذہنی قلابازیاں... فلسفیانہ گفتگو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی... جو سامنے والے کو مرعوب اور متحیر کردیتی تھی... شائستہ اطوار رکھنے والے ایک شریف... مجبور اور خوش ذوق امیدوار کی دکھ بھری داستاں...

کشیدہ و دل گرفتہ ماحول میں ہلکی ہلکی پر مزاح تحریر کے دل ربا رمز......

وہ مجھے ایک پارٹی میں ملی تھی۔

بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ طرح دار اور دلکش۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دولت مند بھی دکھائی دے رہی تھی۔

کسی کو بھی دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہوگا۔ آپ خود اس کا تجربہ کرسکتے ہیں۔ آپ کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو قیمتی سے قیمتی کپڑے پہنادیں تو بھی اس کو اپنے لباس کے برتنے کے انداز پر قابو نہیں ہو

گا۔

اس کی چال بتا دے گی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز بتا دے گا کہ اس بے چاری نے ایسا لباس زندگی میں پہلی بار پہنا ہے۔

اس کے برعکس کسی دولت مند گھرانے کی لڑکی کو عام سا لباس بھی پہنا دیں پھر بھی اس کے چلنے اور بیٹھنے کا انداز یہ بتا رہا ہوگا کہ ایسا لباس اس نے شوقیہ یا کسی مجبوری میں پہن رکھا ہے۔ ورنہ اس کا پس منظر کچھ اور ہے۔

شاید اسی کو باڈی لینگویج کہا جاتا ہے۔

بہرحال تو وہ لڑکی بہت اچھی تھی جو پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی۔ اس پارٹی میں اگرچہ اور بھی لڑکیاں تھیں لیکن اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اب یہاں میں اپنے بارے میں بتا دوں۔ میرا نام پرنس خرم ہے۔ حالانکہ میں خرم تو ہوں لیکن پرنس کہیں سے بھی نہیں ہوں۔ البتہ میرے جاننے والے اور دوست مجھے پرنس ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔

اس کی وجہ میرا رنگ روپ ہے۔ سرخ و سفید رنگت، طویل قامت، خوب صورت کسرتی بدن، اس پر میری ڈریسنگ۔ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر کوئی بھی مرعوب ہو سکتا ہے۔

میرے آباؤ اجداد کا تعلق کسی ریاست سے تھا۔ اس زمانے میں وہ نواب کہلاتے تھے۔ ان کی نوابی تو مجھے نہیں ملی۔ لیکن ان کا رنگ و روپ اور ان کی وجاہت مجھ میں ضرور آ گئی تھی۔

میں نے بھی اپنے آپ پر بہت دھیان دیا تھا۔ مفلسی کے باوجود ہمیشہ برانڈڈ کپڑے پہنا کرتا۔ پرفیوم استعمال کیا کرتا۔ سلیقے سے گفتگو کرتا۔ چونکہ تعلیم اچھی حاصل کر لی تھی اس لیے انگریزی بھی بولتا رہتا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر مجھے پرنس کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔

ابا نے اپنی ایک ڈائری مجھے پڑھنے کو دی تھی جس کو پڑھ کر مجھے پتا چلا تھا کہ میرا تعلق ایک نواب خاندان سے ہے۔

ابا تک نوابی ختم ہو گئی تھی۔ صرف ابا رہ گئے تھے اور یہ بھی غنیمت تھا کہ ابا نے ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا تھا اور مجھے اچھی تعلیم دلوا دی تھی۔

ابا کا یہ خیال تھا کہ شاید میں عملی زندگی میں آ کر گورنر وغیرہ ضرور بن جاؤں گا۔ شاید دنیا کے ہر باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے۔

میرے بھائی بہن نہیں تھے۔ صرف میں تھا۔ اس لیے بھائی بہنوں کی پرورش کی ذمے داریوں سے فارغ تھا لیکن انسان کی خود اپنی زندگی بھی تو ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا لیکن اس کے علاوہ کئی خرچے تھے۔ گیس، بجلی، پانی، راشن، ہوٹل میں کھانا، کپڑے اور دوستوں کی محفلیں وغیرہ۔

ان سب کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔

اور جب انسان کے حالات ایسے ہوں تو پھر کسی کی زلفوں کا سایہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ویران اور بنجر زندگی ہوا کرتی ہے۔

ایسے میں ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ مختلف تقریبات میں اچھی ڈریسنگ کے ساتھ شرکت کرتا۔ میں نے اپنے اچھے وقتوں میں کچھ سوٹ سلوا لیے تھے جن سے میرا بھرم قائم تھا۔

بہرحال اس شاندار پارٹی میں بھی کسی نہ کسی طرح شرکت کا دعوت نامہ مل گیا تھا۔ میں اپنے نیلے رنگ کے سوٹ میں وہاں پہنچا تھا۔

میرا انداز ہی ایسا تھا کہ بہت سے لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ خاص طور پر لڑکیاں۔ لیکن میں نے بے نیازی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔

پھر وہ لڑکی دکھائی دے گئی۔ وہ اپنے ہی جیسی کسی لڑکی سے بات کر رہی تھی۔ وہ دوسری لڑکی بھی اس کی ہم رتبہ دکھائی دیتی تھی۔ یعنی ان کا لباس بھی بہت قیمتی تھا۔ اس کے بھی انداز شاہانہ تھے۔

دوسری لڑکی جب کسی طرف چلی گئی اور وہ لڑکی تنہا کھڑی رہ گئی تو میں نے اس تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے ایک میز سے ایک گلاس اور کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل اٹھا لی اور گلاس بھر کر اس لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

”مس......“ میں نے بڑے ادب اور مہذب انداز میں اس کو مخاطب کیا۔ ”کیا میں آپ کی خدمت میں یہ گلاس پیش کر سکتا ہوں؟“ یہ میں نے انگریزی میں کہا تھا۔

”اوہ شیور، تھینک یو۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔“

”یہ آپ لے لیں، میں اپنے لیے دوسرا لے لوں گا۔“

وہ تحسین آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور ایسی نگاہوں کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ساتھ والا متاثر ہو چکا

ہے۔

میں نے گلاس اس کے حوالے کیا اور خود وہاں سے ہٹ گیا۔ یہی ایک گر ہوا کرتا ہے، ایسے موقعوں پر چپک نہیں جانا چاہیے بلکہ اِدھر اُدھر ہو جانا چاہیے۔ ایک تو اس سے امپریشن اچھا ہوتا ہے پھر یہ کہ وہ اگر بات کرنے کی خواہش مند ہوئی تو ضرور متوجہ کرتی ہے۔

میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ گلاس لے کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ میں نے دوسرا گلاس اپنے لیے بھرا اور چسکیاں لیتا ہوا اس کی میز کے برابر سے گزرنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں نے اس کو دیکھا ہی نہیں ہو۔

میری توقع کے عین مطابق اس نے مجھے آواز دی۔

''بات سنیں۔'' میں رک گیا۔

''اگر آپ اکیلے ہیں تو آجائیں میرے ساتھ۔ میری دوست ابھی گئی ہوئی ہے۔''

میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ''دراصل اس قسم کی پارٹیز مجھے بہت بور کرتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بہت رسمی اور مخصوص فضا ہوتی ہے یہاں۔''

''جی ہاں، یہ بات تو ہے۔ ویسے آپ کا تعلق......''

''بس ایک چھوٹی سی فرم چلا رہا ہوں، پرنس خرم نام ہے میرا۔''

''پرنس خرم۔'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''سوری، نام تو خرم ہے لیکن چونکہ ہر وقت اپنے لیے پرنس پرنس سنتا رہتا ہوں۔ اسی لیے بے دھیانی میں پرنس خرم کہہ گیا۔''

''پرنس کی وضاحت کریں گے آپ؟''

''ارے چھوڑیں اس ذکر کو، پرانی بات تھی۔ اب تو میں اس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ بہت آکورڈ سا لگتا ہے مجھ کو۔''

''پھر بھی میں اپنی دلچسپی کے لیے جاننا چاہتی ہوں۔''

''محترمہ...... اب کیا بتاؤں، میرے آباؤ اجداد کا تعلق ریاست گول کنڈی سے تھا۔ ریاست تو اب رہی نہیں۔ صرف نام رہ گیا ہے۔''

''اس کی بھی بہت اہمیت ہے جناب۔ ورنہ اس دور میں ایسے لوگ ملتے ہی کہاں ہیں جن کا بیک گراؤنڈ بہت اعلیٰ ہو۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''شکریہ، اب تو میں آپ کا بھی نام جاننا چاہوں گا۔''

''کیوں نہیں، میرا نام غازیہ ہے۔ آپ نے اسٹار انٹرپرائز کا نام تو سنا ہوگا؟''
''جی ہاں، بہت اچھی طرح۔''
''وہ میرے ڈیڈی کی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ڈیڈ تو اب نہیں رہے۔ لہٰذا وہ انٹرپرائز میں چلا رہی ہوں۔''
اس لڑکی کے بارے میں میرا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔
وہ ایک بڑی اور مشہور فرم کی سربراہ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار خود میں نے بھی اس فرم میں جاب کی درخواست دی تھی لیکن کام نہیں بنا تھا۔
اسی وقت اس کی دوست بھی وہاں آگئی۔ اس نے غازیہ سے پوچھا۔ ''کیا میں جوائن کر سکتی ہوں؟''
''کیوں نہیں، یہ پرنس خرم ہیں۔'' غازیہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''شاہی خاندان سے تعلق ہے ان کا۔''
''اوہ۔''
''اور یہ شائلہ ہے میری دوست۔'' غازیہ نے بتایا۔ ''اتفاق سے ہم دونوں کی کہانی ایک جیسی ہے۔ اس کے فادر بھی بہت بڑے بزنس مین تھے۔ آپ نے لکی موٹرز کا نام تو سنا ہوگا؟''
''جی ہاں۔'' وہ بھی سن چکا ہوں۔'' میں اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔
''وہ ان کے فادر کی ہے۔ ان کی موت کے بعد اب یہ اس کی ڈائریکٹر ہیں۔''
میرے خدا، دو سہیلیاں اور دونوں ہی کروڑپتی۔ دونوں ہی خوب صورت اور دلکش اور ان دونوں کے حالات بھی تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔
شائلہ بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت میرے بولنے کی صلاحیت میرے کام آرہی تھی۔ میں نے ایسی ایسی فلسفیانہ اور صوفیانہ باتیں کیں کہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔
''پرنس خرم صاحب!'' شائلہ نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ نے بتایا کہ آپ کو شکار کا بھی شوق ہے۔ تو بزنس کی مصروفیت کے بعد اتنی فرصت مل جاتی ہے؟''
''دراصل کاروبار میرا بھائی دیکھتا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''پرنس اسلم۔ اور ایک بات یہ بھی بتا دوں کہ وہ میرا جڑواں بھائی ہے۔''
یہ پلاننگ اسی وقت میرے ذہن میں آئی تھی۔
''اوہ، بہت دلچسپ۔ جڑواں بھائی۔'' غازیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''پھر تو آپ ہی کی طرح ہوگا؟''
''جی ہاں، بالکل میری طرح۔'' میں نے کہا۔ ''ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قد، رنگ، چہرہ اور آواز تک ایک ہے۔''
''واؤ۔'' شائلہ چہک اٹھی تھی۔ ''کسی دن ملواؤ اپنے بھائی سے۔''
''کیوں نہیں، ضرور ملواؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم دونوں کی ذہنی سطح اور تعلیم بھی ایک جیسی ہے۔ یعنی جیسی گفتگو میں کر لیتا ہوں ویسی ہی گفتگو وہ بھی کر لیتا ہے۔''
''کوئی تو فرق ہوگا آپ دونوں میں؟'' غازیہ نے پوچھا۔
''ایک معمولی سا فرق ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دیکھو، میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر کوئی تل نہیں ہے جبکہ اس کے ہاتھ کی پشت پر تل ہے۔''
''مائی گاڈ، یہ تو کوئی فرق ہی نہیں ہوا۔''
''جی ہاں، اکثر جاننے والے دھوکا کھا جاتے ہیں۔''
میری پلاننگ بہت سیدھی بھی تھی اور بہت ٹیڑھی بھی۔ میں ان دونوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ فرض کیا اگر میں ان میں سے کسی ایک سے شادی کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو دوسری ہاتھ سے نکل جاتی جبکہ مجھے ان دونوں پر جال ڈالنا تھا۔
اور اس کا طریقہ یہ سمجھ میں آیا تھا کہ میں خود کو جڑواں ثابت کروں یعنی میرا جڑواں بھائی ''پرنس اسلم'' بالکل میرے ہی جیسا ہے۔
خدا گواہ ہے کہ میں کوئی چار سو بیس یا دھوکے باز وغیرہ نہیں ہوں لیکن مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے۔ ایک مجبوری تو بے روزگاری کی تھی اور دوسری مجبوری کسی حسینہ کے قرب کی تھی۔ اسی لیے میں نے یہ پلاننگ کر لی تھی۔
اب اگر میں اس کو سلیقے سے نبھا پاتا تو پھر زندگی آسان بھی ہو جاتی اور رنگین بھی۔
پارٹی کے خاتمے تک ان دونوں سے اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ پلان کے مطابق پرنس خرم کو غازیہ سے اور پرنس اسلم کو شائلہ سے بھڑانا تھا۔ اس لیے میں نے غازیہ پر زیادہ توجہ دی تھی۔
اس شام کی پارٹی میرے لیے تو بہت کامیاب رہی تھی۔
میں نے شائلہ سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں اسے اپنے جڑواں بھائی پرنس اسلم سے ضرور ملواؤں گا۔ دونوں نے

اپنے اپنے موبائل نمبرز بھی دے دیے تھے۔ میں نے بھی اپنے دونوں نمبرز دے دیے تھے۔ ایک سم میں ذرا کم ہی استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کو پرنس اسلم کا نمبر ظاہر کیا تھا۔

اب پرنس اسلم کو شائلہ سے ملاقات کرنی تھی۔

اس کی کار کمپنی سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ کئی بار رکشے میں اس طرف سے گزرا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے میں نے اپنی ہتھیلی کی پشت پر تل کا نشان بنایا اور اس کے لکی موٹرز کے عالیشان دفتر میں پہنچ گیا۔

اس کے سکریٹری کو بتایا کہ پرنس اسلم ملنے کے لیے آئے ہیں۔ اس نے اطلاع دی اور مجھے فوراً اندر بلا لیا گیا۔

شائلہ اپنی شاندار ریوالونگ چیئر پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اس کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔

''کون ہیں آپ؟''

''پرنس اسلم۔'' میں نے بتایا۔ ''شاید بھائی نے آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا۔''

''جی ہاں، میرے خدا اتنی مماثلت...... یقین ہی نہیں آتا کہ آپ پرنس خرم نہیں ہیں۔''

''یہ دیکھیں۔'' میں نے تل دکھاتے ہوئے کہا۔

''شاید بھائی نے بتایا ہو کہ ہم دونوں میں بس اس تل کا فرق ہے۔''

''جی ہاں، بتایا تھا انہوں نے۔''

میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب تک میری اسکیم بہت شاندار اور کامیاب جا رہی تھی۔ واقعی انسانی ذہن کے کارنامے بھی عجیب ہوتے ہیں۔

''انتہا یہ ہے کہ آپ کی آواز بھی بالکل آپ کے بھائی جیسی ہے۔'' شائلہ نے کہا۔

''یہی تو قدرت کے کھیل ہیں۔ اگر میرے ہاتھ پر تل نہیں ہوتا تو شاید ہم بھی ایک دوسرے کو نہیں پہچان پاتے۔''

شائلہ ہنس پڑی۔ وہ بھی بہت اچھی تھی غازیہ کی طرح۔

اس نے اپنے آفس میں ہی لنچ منگوا لیا تھا۔ لنچ کے دوران ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے پاس بھی بہت کچھ تھا۔

شاندار کاروبار، شاندار گھر، شاندار گاڑی، کمی بس ایک بات کی تھی کہ اب تک کوئی اسے سمجھنے والا نہیں ملا تھا۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے وہ بہت تلخ ہوگئی تھی۔

''پرنس اسلم صاحب! اب شاید پوری دنیا میں صرف ایک ہی قدر رہ گئی ہے اور وہ ہے پیسوں کی، ایسا نہیں ہے کہ

خود غرضی

ایک شخص کی دو بیٹیاں تھیں، وہ انہیں بے حد پیار کرتا تھا۔ اس نے ایک کی شادی مالی سے اور دوسری کی کمہار سے کردی۔ دونوں سکون سے زندگی بسر کرنے لگیں۔ ایک دن وہ مالی کے گھر گیا اور بیٹی سے پوچھا۔ اسے کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔

لڑکی نے جواب دیا۔ ''اللہ کا شکر ہے بس بارش کے لیے دعا کیجیے تاکہ ہمارے پودے خوب پھلیں پھولیں۔''

پھر اس نے دوسری بیٹی کے ہاں جا کر حال پوچھا۔ جواب میں وہ کہنے لگی۔

''دعا کیجیے کہ ابھی چند روز تک بارش نہ ہو تاکہ ہمارے بنائے ہوئے برتن اچھی طرح سوکھ جائیں۔''

پنڈدادن خان سے تجمل حسین حیدری کا شگوفہ

عزت

گاہک: ''آج کے بعد میرا کتا بھی دکان پر آئے تو تمہیں اس کی بھی عزت کرنی ہوگی۔''

دکاندار: ''بہت بہتر جناب آپ کا کتا آئے گا تو میں سمجھوں گا آپ ہی آئے ہیں۔''

شگوفہ

ایک دن استاد محترم نے کلاس میں بچوں کو یہ ہدایت کی کہ اگلے روز ہر بچہ انگریزی کے تین لفظ یاد کر کے آئے گا۔ کلاس میں سے ایک لڑکے نے مندرجہ ذیل لفظ یاد کر لیے اسے ان لفظوں کے معنی کا بالکل علم نہ تھا۔

نوسر (No Sir) شٹ اپ اور سکس ملین ڈالر مین۔

اگلے روز جب کلاس لگی تو استاد نے اس لڑکے کو کھڑا کیا اور کہا۔

استاد: ''حامد کیا تم نے وہ تین لفظ یاد کیے ہیں؟''

حامد (شاگرد خوشی سے): ''نوسر (No Sir)۔''

استاد (غصے سے) ''آخر تم نے وہ لفظ کیوں نہیں یاد کیے؟''

حامد: ''شٹ اپ۔''

استاد (غصے میں گرجتے ہوئے): آخر تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟''

حامد (معصومیت سے): ''سکس ملین ڈالر مین سر۔''

ملک امیر خان اعجازی، نرگھی، حلہ گنگ

لوگ میرے پاس نہیں آئے، یا مجھ سے نہیں ملے، ملتے رہے۔ لیکن مجھ سے نہیں، میرے بینک بیلنس سے، میرے کاروبار سے۔ ان کی نگاہیں میرے خلوص اور میری شخصیت پر نہیں تھیں۔ میرے پیسوں پر تھیں۔ اس لیے بددلی ہوگئی۔ انسان پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔''

''ہاں ایسا تو ہوتا ہی ہے جب خودغرضی کی یہ انتہا ہو تو کس پر بھروسا ہو سکتا ہے۔''

اس وقت میں نے اپنے دل میں تھوڑی سی شرمندگی بھی محسوس کی۔ میں بھی تو اسی چکر میں اس سے مل رہا تھا بلکہ جڑواں بن کر اتنا بڑا دھوکا دے رہا تھا۔

پھر میں نے ایسے صوفیانہ خیالات کو فوراً ہی اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ میں زندگی بھر مفلس ہی رہوں۔ جو خوشیاں پیسوں سے حاصل ہو سکتی ہیں، وہ میرے پاس کبھی نہ آسکیں۔ نہیں، اس دنیا پر میرا بھی حق ہے۔ چاہے کسی طرح بھی ہو، مجھے حاصل کر لینا ہے۔

''اسلم صاحب!'' شائلہ نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ کیا سوچنے لگے؟''

''کچھ نہیں، بس یہ سوچ رہا تھا کہ انسان آخر ایسا کیوں ہو گیا ہے؟''

''کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہم دونوں سہیلیوں کا خاندانی پس منظر بھی ایک جیسا ہے۔ اور شاید قسمت بھی ایک جیسی ہے۔ غازیہ بھی ایسی باتوں کا رونا روتی رہتی ہے۔''

''جی ہاں، بھائی نے بتایا تھا کہ غازیہ صاحبہ بھی کچھ پریشان رہتی ہیں۔''

''اب میری ایک خواہش ہے۔'' شائلہ نے اچانک کہا۔ ''آپ دونوں کل شام کی چائے میرے گھر پر پئیں۔ آپ دونوں آسکتے ہیں نا؟''

''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں۔'' میں گڑبڑا کر جلدی سے بولا۔ ''کیوں نہیں آسکتے۔''

''یہ لیں۔'' اس نے اپنا کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اس پر میرا ایڈریس ہے۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''پریشانی ہو بھی جائے تو کبھی کبھی ایسی پریشانیاں خوب صورت بھی ہو جاتی ہیں۔'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بہت رومینٹک سا ہو گیا تھا۔

وہ شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پرابلم یہ تھی کہ میں اپنا دوسرا بھائی کہاں سے لاتا۔ اگر پرنس اسلم کو لے آتا تو پرنس خرم کا کیا کرتا۔ اور اگر پرنس خرم کو لاتا تو پرنس اسلم کا کیا ہوتا۔

میں شاید اپنے جال میں خود ہی پھنس گیا تھا۔

میں اب اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ غازیہ بھی اسی طرف آنکلی۔ وہ مجھے شائلہ کے پاس دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''ارے خرم صاحب! آپ یہاں؟''

''غازیہ، تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خرم نہیں، ان کے بھائی پرنس اسلم ہیں۔'' شائلہ نے بتایا۔

''کیا؟'' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''ناممکن، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہاں محترمہ، بھائی نے بتایا ہوگا کہ ہم دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بتایا تو تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی مماثلت بھی ہو سکتی ہے۔''

''فرق بس اس تل کا ہے۔'' میں نے ہتھیلی کی پشت پر تل دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ بھی نہ ہوتا تو بہت پریشانی ہو جاتی۔''

''میں تو واقعی دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی ہوں۔''

''غازیہ، میں نے کل شام دونوں بھائیوں کو چائے پر بلا لیا ہے۔ میں تم کو بھی فون کرنے والی تھی کہ تم خود ہی آگئیں۔''

''ارے یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوں گے تو دیکھنے کا سین ہوگا۔''

دونوں باتیں کرتی رہیں۔ میں وہاں سے اٹھ کر آگیا۔

اس حماقت سے میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ کیا ضرورت تھی ایسی بکواس کرنے کی۔ اب کہاں سے دوسرا بھائی لے کر آتا۔ غازیہ سے دوستی ہو گئی تھی۔ اتنا ہی بہت تھا۔ میں نے خوامخواہ دوسرے بھائی کا شوشہ چھوڑ دیا۔

اب اس ناٹک کو نبھانا تو تھا۔ اس کے لیے بہت ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ شطرنج کے مہروں کی طرح چالیں چلنی تھیں۔

دوسری شام تو آ ہی جاتی۔ لیکن اس سے پہلے اپنا بھرم رکھنے کے لیے مجھے کسی گاڑی کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ اگر انہیں یہ شبہ ہو جاتا کہ میں بالکل کنگال ہوں تو شاید مجھ سے دور ہو جاتیں۔

لیکن نہیں۔ یہ ایک اور فراڈ ہوتا۔ بہتر یہی ہوتا کہ اپنی پوزیشن بتا دی جائے۔ ان سے یہ کہہ دیا جائے کہ ہم دونوں بھائی بہت غریب ہیں۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم صرف نام کے پرنس رہ گئے ہیں۔ گول کنڈی کی

ریاست باپ دادا کے پاس تھی۔ ہمارے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔ بہت بڑا کاروبار تھا ہمارا لیکن سب تباہ ہو گیا (تباہی کی کوئی داستان سنائی جا سکتی تھی)

اب ہم جس حال میں ہیں جیسے بھی ہیں، تم دونوں کے سامنے ہیں۔ اس طرح ایک فائدہ یہ ہو سکتا تھا کہ خود کو کروڑ پتی ثابت کرنے کے چکر سے بچ سکتا تھا۔ اس کے بعد دیکھا جاتا کہ ان دونوں کا کیا رویہ ہوتا ہے۔

یہ سب سوچ کر اور فیصلہ کر کے میں پرنس اسلم بن کر رکشا کر کے شائلہ کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ ہاں، میں حلیہ بنانا نہیں بھولا تھا۔

شائلہ اور غازیہ دونوں ہی گھر پر تھیں۔ شائلہ کے شاندار سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر ان دونوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان کے ساتھ کتنا بڑا فراڈ کر رہا ہوں تو میری کیا پوزیشن ہو گی۔

دونوں نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا تھا۔

''میں اسلم ہوں۔'' میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا۔

''اور وہ.....خرم نہیں آئے؟'' غازیہ نے پوچھا۔

''بھائی آ رہا ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ تھا۔ کہہ رہا تھا کہ پہلے ان دونوں کو ساری صورتِ حال بتا دو، پھر میں آ جاؤں گا۔''

''کیسی صورتِ حال؟''

''شاید بھائی نے یہ بتایا ہو گا کہ ہمارا تعلق گول کنڈی کی ریاست سے ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے اپنے ذہن میں پوری کہانی تیار کر رکھی تھی۔

''ہاں ہاں بتایا تھا، پھر؟''

''پھر یہ کہ اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''صرف نام رہ گیا ہے۔ خاندانی بیک گراؤنڈ رہ گیا ہے اور شرافت رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے گھر میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے کہ جس پر ہم فخر کر سکیں۔ بھائی نے تو نہ جانے کیا کیا کہہ دیا ہو گا، لیکن سچائی یہی ہے۔''

ایک گہری خاموشی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد غازیہ نے کہا۔ ''لیکن یہ سب بتانے کے لیے خرم کیوں نہیں آئے؟''

''اسی شرمندگی کی وجہ سے۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں سامنا نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو کیا ظاہر کیا ہے جبکہ حقیقت بہت تکلیف دہ ہے۔''

دونوں پھر خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

کچھ دیر بعد غازیہ نے کہا۔ ''شاید آپ دونوں بھائیوں نے ہمیں بہت غلط سمجھا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''اسلم صاحب! اب دولت اور اسٹیٹس کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ دولت تو ہمارے پاس بہت ہے۔ ہم دونوں کو تو ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو صرف دولت کے لیے ہمارے پاس نہ آئیں۔''

''غازیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' شائلہ بھی بول پڑی۔ ''ہم دونوں نے اتنی سی عمر میں زندگی کے بہت سے تجربے حاصل کر لیے ہیں۔ ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ لیکن سب دولت کے بھوکے نکلے۔''

''بلکہ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ دونوں کے پاس کچھ نہیں ہے۔'' غازیہ نے کہا۔ ''دولت مند نہیں ہیں آپ یقیناً مخلص ہوں گے۔ ہمدرد ہوں گے۔ آپ کو دولت کا لالچ نہیں ہو گا۔ بس ہم بھی چاہتے ہیں کیونکہ ہم نے بہت سوں کو پرکھ لیا ہے۔''

اس وقت میرے دل کی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ یہ معاملہ خود ہی حل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ رہ گیا جڑواں کا مسئلہ۔ تو بس ایک بار دونوں سے شادی ہو جائے اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

''آپ دونوں بہت کمال کی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ساری حقیقت جان لینے کے باوجود آپ کا رویہ قابلِ تعریف ہے۔ ورنہ اس دور میں تو ہر لڑکی دولت دیکھتی ہے۔''

''ہاں، لیکن وہ لڑکیاں دولت دیکھتی ہیں جن کے پاس خود کچھ نہ ہو۔ ہمارے پاس تو خدا کے فضل سے اور والدین کی مہربانی سے بہت کچھ ہے۔''

''بلکہ ہم نے تو یہ سوچ رکھا تھا کہ ہم نے اگر شادی کی تو کسی ایسے سے کریں گے جن کے پاس کچھ نہ ہو اور ہم انہیں اپنے پیسوں سے بزنس کروا دیں گے۔'' غازیہ نے کہا۔

''پہلے ہم ایسے نہیں تھے۔'' شائلہ نے بولنا شروع کیا۔ ''بلکہ ہماری سوچ بھی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ تھی لیکن جب کچھ واقعات نگاہوں کے سامنے آئے تو دنیا کی حقیقت کھلنے لگی۔ احساس ہوا کہ دولت وغیرہ تو ثانوی چیز ہے۔ بنیادی چیز ہے محبت اور اعتماد۔''

''آپ یقین کریں ہم دونوں بھائی اس معیار پر پورے اُتریں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں یقین ہے۔'' غازیہ جلدی سے بولی۔ ''اب آپ جلدی سے خرم کو بلوالیں۔ وہ کہاں رہ گئے۔''
میں نے یونہی کسی کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ پھر بتایا۔ ''اس کا نمبر بند مل رہا ہے۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے، میں جا کر دیکھتا ہوں۔''
''کہاں دیکھیں گے؟''
''اس کے دو چار دوستوں کے پاس۔'' میں نے کہا۔
''اس کے دوستوں کے نمبر نہیں معلوم ہیں۔ ورنہ یہیں سے فون کر کے معلوم کر لیتا۔ لگتا ہے خود ہی جانا پڑے گا۔''
اس دوران ناشتے اور چائے کے لوازمات بھی آ گئے تھے۔ شائلہ نے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ بہر حال ان دونوں کو اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ ہم دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکیں۔
''کوئی بات نہیں، اب تو ہم ملتے ہی رہیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع بھی ملتا رہے گا۔'' میں ان سے اجازت لے کر چلا آیا۔
آج ایک بہت بڑا معرکہ سر ہو گیا تھا۔ دونوں دولت مند لڑکیاں شادی کے لیے تیار تھیں لیکن یہ جڑواں ہونے کا ناٹک زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتا تھا۔
اس سے بچنے کی صرف ایک ہی ترکیب تھی کہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو مار دیتا۔ یا تو خرم کو یا پھر اسلم کو۔ گھر آ کر میں بہت دیر تک اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ سوچتا رہا کہ دونوں میں سے کس کو مارا جائے۔
پھر یہی مناسب سمجھا کہ اسلم کو مار دیا جائے۔
اس کی موت میں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ کب تک تل کی حفاظت کرتا۔ کبھی بے دھیانی میں تل بنانے سے رہ گیا تو شائلہ کو پتا چل جاتا۔
اور دوسری مصلحت یہ تھی کہ دونوں جڑواں کو ایک ساتھ نبھائے رکھنا ناممکن تھا۔ یہ کوئی فلم نہیں تھی کہ تین گھنٹوں میں ختم ہو جائے بلکہ یہ ساری زندگی کا معاملہ تھا۔
تیسری مصلحت یہ تھی کہ اسلم کے ابھی شائلہ سے اتنے تعلقات نہیں ہوئے تھے کہ وہ اسلم کا سوگ منانے بیٹھ جاتی۔ رہ گیا خرم، تو اس کے لیے اکیلی غازیہ ہی بہت تھی۔
رات کے وقت میں نے غازیہ کو فون کیا۔
''کون بول رہا ہے۔ خرم یا اسلم؟'' اس نے پوچھا۔
''ارے بابا میں خرم ہوں۔'' میں نے بتایا۔
''او گاڈ، تم کہاں رہ گئے تھے؟'' اس نے کہا۔ ''ہم سب تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہو رہے تھے۔''

لطائف

انشورنس

''ممی! میں بھی تالاب میں نہالوں؟''
صاحب زادے نے اپنی مغرب زدہ ماں سے پوچھا۔
''نہیں سویٹی، تالاب بہت گہرا ہے۔'' ماں نے جواب دیا۔
''مگر ابو بھی تو......''
''اوہ! بیٹے ان کی تو انشورنس ہو چکی ہے۔'' ماں نے جواب دیا۔

☆☆☆

مشہوری

عالم سکرات میں شیخ صاحب نے وصیت لکھوائی۔
''جس ملازم نے بھی میری 20 سال سے زیادہ خدمت کی ہے۔ اسے میرے ترکے میں سے 50 ہزار روپیا دیا جائے۔''
''لیکن جناب والا، 20 سال تو آپ کو بزنس کرتے نہیں ہوئے۔'' وکیل نے جواب دیا۔
''مجھے علم ہے لیکن مشہوری تو ہو جائے گی۔'' شیخ نے مرتے مرتے کہا۔

امداد اللہ، سوکڑی کریم خان، بنوں

''یار، کیا بتاؤں، میرے ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، اس کو اسپتال لے جانا پڑا تھا۔''
''کم از کم بتا تو دیتے۔ تمہارا بھائی بھی کتنا پریشان ہو رہا تھا۔''
''ہاں، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔''
''بہر حال، آئندہ سے خیال رکھنا۔ جب اس قسم کی کوئی سچویشن ہو تو اطلاع ضرور دے دیا کرو۔''
''اچھا بھئی سوری، غلطی ہو گئی۔ آئندہ سے ضرور خیال رکھوں گا۔''
اس کے بعد ہمارے درمیان بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔
آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تینوں طرف۔ یعنی میں اور وہ دونوں لڑکیاں۔
اب صرف اشارہ گیا تھا کہ میں پہل کر جاؤں۔ لہٰذا

سب سے پہلے پرنس خرم نے پہل کی تھی۔
ہم اس شام ایک پارک میں تھے۔ یعنی پرنس خرم اور غازیہ۔ غازیہ بہت خوش تھی۔ میں اسے لطیفہ سنا رہا تھا۔ ہم بچوں کی طرح پارک میں دوڑتے پھر رہے تھے۔
پھر جب تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تو غازیہ نے کہا۔ ''خرم! تم یقین کرو، میری زندگی میں کبھی حقیقی خوشی کے لمحے نہیں آئے ہیں۔ ہر جگہ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے لیکن آج تمہارے ساتھ میں دل کھول کر ہنسی ہوں۔ انجوائے کیا ہے۔''
''بہت شکریہ کہ تم نے اس ساتھ کو پسند کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم ایسے لمحوں کو ہمیشہ کے لیے قید نہیں کر سکتے۔''
''وہ کس طرح؟''
''ایک دوسرے کو اپنا کر۔'' میں نے کہا۔
غازیہ کے ہونٹ کانپنے لگے۔ پھر وہ دھیرے سے بولی۔ ''خرم! سچ تو یہ ہے کہ میں خود تم سے یہی کہنے والی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے کہوں۔''
''چلو، تمہاری یہ مشکل تو آسان ہوگئی۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''ہاں خرم، تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے سچی خوشی دی ہے۔''
اس کے بعد ہم جتنی دیر پارک میں رہے، ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، ہنستے رہے، بولتے رہے، ایک بہت بڑا مرحلہ آسانی سے طے ہوگیا تھا۔ اب پرنس اسلم اور شائلہ کا مسئلہ تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ اس میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ شائلہ خود پرنس اسلم سے یہ سب سننے کے لیے بے چین ہو رہی ہوگی۔
دوسرے دن غازیہ کا فون آگیا۔ وہ مجھے گھر پر بلا رہی تھی۔
''کیوں نہ ہم باہر مل لیں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں، تمہارا گھر آنا ضروری ہے۔''
میں شام کو اس کے گھر پہنچ گیا۔ اب اس کے چوکیدار اور محافظ وغیرہ مجھے پہچاننے لگے تھے۔ غازیہ گھر پر تنہا تھی اور بہت الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔
''خیریت تو ہے۔ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''خرم! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم دونوں ایک نہیں ہوسکیں گے۔'' اس نے کہا۔
''وہ کیوں؟'' میں بوکھلا گیا تھا۔ ''کیا بات ہوگئی؟''
''میرے ایک انکل بہت بڑے ڈاکٹر ہیں، امریکا میں پریکٹس کرتے ہیں۔ آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ میں نے آج جب تم دونوں کا ذکر کیا تو انہوں نے اس شادی سے صاف منع کر دیا۔''
''وہ کیوں؟''
''وہ کہہ رہے تھے کہ دونوں ہم شکل ہیں یعنی بالکل ایک جیسے۔ اور اس قسم کے جڑواں بھائیوں یا بہنوں میں ایسی اندرونی پیچیدگیاں ہوجاتی ہیں جس کا پتا شادی کے بعد چلتا ہے اور ایسے بھائیوں کی بیویوں کو یا ایسی بہنوں کے شوہروں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔''
''ارے، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
''نہیں خرم، میں ان کے مشوروں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس سبجیکٹ پر بہت کام کیا ہے۔ پی ایچ ڈی کی ہے انہوں نے۔ میں اپنی اور تمہاری زندگی کے لیے یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ اس لیے سوری۔''
میرا دل چاہا کہ میں اپنا سر دیوار سے ٹکرانا شروع کر دوں۔
''چلو، یہ تو میری اور تمہاری بات ہوگئی۔ لیکن اسلم تو شائلہ سے شادی کر سکتا ہے نا؟''
''وہ کیسے کر سکتا ہے۔ وہ بھی تو تمہارا ہم شکل ہے۔'' غازیہ نے کہا۔ ''میں نے تو شائلہ کو بھی فون کر کے سچویشن بتا دی ہے۔''
میرا دل چاہا کہ میں ابھی جا کر اس کم بخت ڈاکٹر کو گولی مار آؤں جس نے بنا بنایا کھیل خراب کر دیا تھا۔
''خرم! کاش آپ جڑواں نہ ہوتے۔'' غازیہ نے کہا۔ ''پھر تو ہمارے ایک ہونے میں کوئی دشواری ہی نہیں تھی۔ کون روک سکتا تھا ہمیں، لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''
اور اس وقت میرا دل چاہا کہ میں خود اپنے آپ کو گولی مار لوں۔ میں نے خود کو جڑواں کہہ کر چالاکی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن خود اپنے جال میں پھنس گیا تھا۔
میری ساری ہوشیاری ہوا ہوگئی تھی۔
اب پھر وہی دوستوں کا حلقہ ہے... اور میں ہوں۔ اور ہاں میں نے اپنے نام سے پرنس ہٹا دیا ہے۔ میں صرف خرم ہوں۔
میرا کوئی جڑواں بھائی وائی بھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور شاید اکیلا ہی رہوں گا۔

ڈیٹکٹیو میکس ہیرنگٹن مقتولہ کے لیونگ روم کے دوسرے حصے میں چلا گیا اور اس جرم پر ایک نئے زاویے سے غور کرنے لگا۔

برتھا شارپلز کی لاش بھی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اگر وہ مردہ نہ ہوتی تو اپنے دور کی حسین ترین عورتوں میں سے ایک قرار پاتی۔ اس کی ہلکی سنہری لمبی زلفیں صوفے کی پشت پر اس طرح لٹکی ہوئی تھیں جیسے کوئی جھلمل کرتا ہوا آبشار۔ اس کے ساکت چہرے کا سنگار نہایت مہارت سے

حُسن پرست

جمال دستی

حسن و رعنائی کا اپنا جادو ہے... جو سامنے والے کو اپنے طلسم میں جکڑ لیتا ہے... وہ دونوں بہنیں بھی سحر انگیز حسن کا مرقع تھیں... دلکشی و خوبصورتی کو کسی ایک کا خراج چاہیے تھا...

حسد ورقابت کے جال میں الجھی ایک تیکھی حسن پرور کہانی......

کیا گیا تھا جیسے کہ وہ کسی اسپیشل ڈیٹ کے لیے تیار ہوئی ہو۔ تشدد کے باوجود جب کسی نے اس کے سر پر عقب سے وار کر کے اسے قتل کر دیا تھا، اس کا لباس صاف ستھرا، تازہ استری کیا ہوا، خوش وضع اور نفیس دکھائی دے رہا تھا۔

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی خاص موقع کے لیے تیار ہوئی تھی اور انتظار کر رہی تھی۔

جب سراغ رساں پہلی بار جائے واردات پر پہنچے تھے تو مقتولہ کے بوائے فرینڈ کارل لیگٹ نے انہیں بتایا تھا کہ مس برتھا شارپلو نے اس شب ایک ریسٹورنٹ میں اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب وہ وہاں نہیں پہنچی اور اس کی متعدد فون کالز کا جواب بھی نہیں دیا تو اسے فکر لاحق ہوگئی۔ تب وہ اس کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا اور جب اسے دروازے کی گھنٹی بار بار بجانے پر بھی جواب نہیں ملا تو وہ ٹاؤن ہاؤس کی اپنی چابی سے دروازے کا تالا کھول کر اندر چلا آیا۔ وہاں برتھا کی لاش موجود تھی۔ تب ہی اس نے پولیس کو فون کر دیا۔

اتنے میں میکس ہیرنگٹن کی پارٹنر مینڈی اسمتھ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے نزدیک پہنچ کر ہلکے سے بڑبڑائی۔

''یہ سمجھنا مشکل ہو رہا ہے کہ مقتولہ کا بوائے فرینڈ اس سانحے پر زیادہ غم زدہ کیوں دکھائی نہیں دے رہا ہے؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ جذباتی ٹائپ کا نہ ہو۔'' میکس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''بہت سے لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔''

''کیا تمہیں اس کا انٹرویو کرنے میں کوئی عار تو نہیں ہے؟'' مینڈی اسمتھ نے پوچھا۔ ''شاید تم درست ہو۔ شاید وہ ایک عورت کے رُوبرو کھلنے میں کسی مرد کے رُوبرو زیادہ بہتر طور پر کھل جائے۔ تم یہ کام کرلو جب تک میں تازہ نظروں سے جائے واردات کا جائزہ لے لیتی ہوں۔''

''بے شک۔''

جب سراغ رساں ہیرنگٹن ٹاؤن ہاؤس کے کچن میں داخل ہوا تو برتھا کا بوائے فرینڈ کارل عقبی دروازے کی دہلیز پر کھڑا تھا اور ایک عورت اس کے سینے سے چمٹی رو رہی تھی۔ وہ کارل کے مقابلے میں کہیں زیادہ اپ سیٹ دکھائی دے رہی تھی۔

سراغ رساں کی آمد پر وہ اپنے بازوؤں میں موجود عورت سے پیچھے ہٹ گیا اور اپنے ہاتھ عورت کے شانوں پر رکھتے ہوئے سراغ رساں ہیرنگٹن کی جانب گھوم گیا۔ ''ڈیٹیکٹیو ہیرنگٹن میں آپ کو برتھا کی بہن سے متعارف کراتا ہوں۔'' اس نے عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ برنٹی شارپلو ہے۔''

جب برنٹی شارپلو نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں والا چہرہ سراغ رساں کی جانب گھمایا تو ہیرنگٹن نے دیکھا کہ وہ اپنی حسین و جمیل بہن سے جسمانی طور پر بے حد مشابہت رکھتی تھی۔ لیکن پھر اس نے غور سے دیکھا تو اسے نہ صرف اس عورت کی آنکھوں کے اطراف میں ہلکی سی جھریوں کا جال سا دکھائی دیا بلکہ اس کی پیشانی کی لکیریں بھی نمایاں تھیں جو اس بات کا مظہر تھیں کہ وہ برتھا سے عمر میں کئی سال بڑی تھی۔

''پولیس کو فون کرنے کے فوراً بعد کارل نے مجھے فون کر دیا تھا۔ میں اس سے زیادہ جلدی یہاں نہیں آسکتی تھی۔'' برنٹی نے کہا۔

اتنے میں سراغ رساں مینڈی بھی کچن میں آگئی۔ ہیرنگٹن نے دونوں خواتین کو ایک دوسرے سے متعارف کرا دیا۔

''کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟'' مینڈی اسمتھ نے برنٹی سے پوچھا۔

برنٹی شارپلو نے اپنے نفاست سے تراشیدہ ناخنوں والے ہاتھ اپنے خوب صورت اسکرٹ پر پھیرتے ہوئے اپنے ساٹن کے بلیزر کو درست کیا اور بولی۔ ''میرا خیال ہے کر سکتے ہیں۔'' پھر اپنے سونے کے نیکلس کی بھاری چین کو اپنے بلاؤز کے کالر پر ایڈجسٹ کرنے لگی۔ ''لیکن کیا میں پہلے چند منٹ کے لیے تازہ دم ہو جاؤں؟''

''یقیناً۔''

جب چند منٹ بعد برنٹی شارپلو پاؤڈر روم سے نمودار ہوئی تو یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے نہ صرف آنسوؤں سے تر اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے تھے بلکہ چہرے پر دوبارہ مکمل میک اپ بھی اپلائی کیا تھا۔

پھر برنٹی نے کارل کی کلائی اپنے ہاتھ میں جکڑ لی اور اسے زبردستی کچن کی میز پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ پھر وہ کارل کی جانب گھومی اور اس کے کوٹ اور ٹائی کو یوں صاف اور درست کرنے لگی جیسے کوئی قریبی دوست یا خاندان کا فرد اپنائیت کا اظہار کرتا ہے۔

جبکہ دوسری جانب کارل لیگٹ برنٹی کے اس رویے پر بے دلی، بے پروا اور اکتایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''آل رائٹ۔'' برنٹی نے بالآخر کہا۔ ''میں تیار ہوں۔ کیا تم سراغ رساں مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ آخر کار یہاں ہوا کیا ہے؟ آخر کو برتھا تو جوانی کے اس عالم میں اور صحت کے عروج پر کیوں کر مر سکتی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ تم ہو... جو ہم سب کو یہ بات بتا سکتی ہو۔'' مینڈی اسمتھ نے کہا۔

مینڈی کے اس جملے پر سراغ رساں ہیرنگٹن حیرانی سے اپنی پارٹنر کا چہرہ تکنے لگا۔ انہیں کام کے سلسلے میں اپنی جوڑی

بتائے صرف چند ہی ہفتے ہوئے تھے۔ سراغ رساں کے عہدے پر وہ ابھی نئی تھی۔ اس سے قبل وہ اپنے ساتھیوں سے مینڈی اسمتھ کی حیران کردینے والی چھٹی حس کے بارے میں کئی افواہیں سن چکا تھا۔ شاید وہ لوگ حسد میں یہ بات کہا کرتے تھے، ہیرنگٹن نے سوچا۔ کیونکہ وہ لوگ کئی ماہ کی مدت میں چند ایسے کیس حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے جنہیں مینڈی اسمتھ نے چند ہفتوں کے اندر ہی اندر حل کرلیا تھا۔

مینڈی اسمتھ نے اپنے ساتھی سراغ رساں کے تکنے پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ برتنی شارپلو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورتی رہی حتیٰ کہ اس بڑی عمر کی عورت کی جلد تمتمانے لگی اور وہ خود کو سنوارنے کے تفصیلی عمل میں مصروف ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بال سنوارے، اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگی۔ پھر اپنے اسکرٹ کو درست کرتے ہوئے اپنے بلاؤز پر طائرانہ نظر ڈالی اور نیکلس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''مجھے کیا پتا؟'' اس نے بالآخر غراتے ہوئے کہا۔

برتنی کے اس طرح اچانک پھٹ پڑنے پر کارل لیگٹ بے ساختہ چونک گیا اور اس کی جانب گھوم گیا۔

سراغ رساں ہیرنگٹن نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ کارل لیگٹ کا چہرہ اچانک تن گیا تھا اور وہ دکھی سا ہو گیا تھا۔ آخر کو یہ شخص بھی اپنے دل میں درد رکھتا ہے۔ اس نے سوچا۔

برتنی کارل کی جانب گھوم گئی۔ کارل کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہی برتنی کا اعتماد پارہ پارہ ہو گیا۔

''تم کارل لیگٹ سے پیار کرتی ہو ہے نا؟'' سراغ رساں مینڈی اسمتھ نے برتنی سے نرم لہجے میں کہا۔

''یقیناً میں پیار کرتی ہوں۔'' برتنی نے سرگوشی کے انداز میں اقرار کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی اپنی آنجہانی بہن کے محبوب کو والہانہ نظروں سے دیکھے جارہی تھی۔ ''میں کارل کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔''

''تمہیں یہ بات گوارا نہیں ہوئی کہ وہ تمہاری بہن کا ہو جائے۔'' سراغ رساں مینڈی نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑتے ہوئے نرمی سے کہا۔

برتنی اپنے محبوب کی جانب سے گھوم گئی۔ اس کی آنکھیں جذبات سے بری طرح جھلس رہی تھیں۔ وہ اپنی مٹھیاں میز پر بجاتے ہوئے چیخی۔ ''یہ کوئی انصاف نہیں تھا... قطعی نہیں... کہ برتھا کو تمام تر جوانی، تمام تر حسن مل جائے اور ساتھ کارل بھی۔''

''تو تمہیں اس سے حسد تھا؟''

''یقیناً میں اس سے حسد کرتی تھی۔ وہ کارل کی مستحق نہیں تھی۔ کارل کی ضرورت مجھے تھی۔''

''تم نے اس بارے میں کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تھا؟''

سراغ رساں ہیرنگٹن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مینڈی اسمتھ نے یہ جو آخری جملہ کہا تھا، اس کے بارے میں اس نے کوئی اندازہ لگالیا تھا یا وہ صرف جھوٹی دھونس جمارہی تھی۔

لیکن جو کچھ بھی تھا، اس نے برتنی کو پھٹ پڑنے پر آمادہ کردیا تھا۔

''جانتی ہو کہ میں نے اس بارے میں کیا کرنے کا فیصلہ کیا، میں نے اس چالباز فاحشہ کو قتل کردیا۔ اور پھر اس قتل کو اس طرح سے سیٹ کیا کہ۔ کارل اس قتل کے جھوٹے الزام میں پھنس جائے۔ اسے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں اس کے لیے کس قسم کا تحفہ بننے کی خواہش رکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ساتھ ہی بڑبڑانے لگی۔ ''میں نے اسے قتل کردیا۔ میں نے برتھا کو مار ڈالا۔ میں نے ہی اسے قتل کیا ہے... میں نے اسے قتل کیا ہے... میں نے اسے قتل کیا ہے۔''

کارل سمٹ کر برتنی سے دور ہو گیا اور یوں لگا جیسے وہاں سے اٹھنا چاہ رہا ہو۔

''کوئی بھی پولیس اسٹیشن کے سوا کہیں اور نہیں جائے گا۔'' سراغ رساں ہیرنگٹن نے کہا۔ ''سمجھ گئے؟''

کارل نے اکتائے ہوئے انداز میں سر ہلا دیا۔ برتنی کا رونے کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بڑبڑاتے ہوئے اعتراف جرم کا اقرار کررہی تھی۔

ہیرنگٹن نے مینڈی اسمتھ کو اشارہ کیا کہ اب انہیں پولیس اسٹیشن لے جایا جائے۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک سوال کلبلا رہا تھا۔ جب وہ کچن کے ایک گوشے میں آگئے تو ہیرنگٹن اپنا سوال زبان پر لے آیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ کام اسی نے کیا ہے؟''

''میں نے سوچا کہ یہ بات بالکل ہی واضح ہے۔'' مینڈی اسمتھ نے جواب دیا۔ ''برتنی شارپلو ان عورتوں میں سے ایک ہے جن کے لیے زندگی میں سب کچھ ظاہری نمود و نمائش اور بناؤ سنگار ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کو خوب صورتی کے قالب میں ڈھالنا چاہتی ہیں تاکہ دیکھنے والا ان سے متاثر ہو جائے۔ اس نے اپنے جرم کو بھی نہایت خوب صورت روپ عطا کردیا تھا تاکہ اس کی دلکشی کے سحر میں کھو کر کوئی اس پر یقین نہ کرسکے۔ لیکن بہرحال...'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا۔ گر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی ہوئی ایک لہو رنگ اور
دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال تشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "غلطی" کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈہ صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راستے گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور کرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں کرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں کرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ رام پیاری کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے بلوائیوں کے ڈھاٹے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یاسر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سانتا جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگی محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ آ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ میرے اور سجاول کے مقابلے کا منظر تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا مگر مطلع ابر آلود تھا اور تیز ہوائیں بدستور چل رہی تھیں۔ کبھی ان کی شدت کم ہو جاتی تھی مگر ان کا سلسلہ کل سے رکا نہیں تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ احاطے کے بیچوں بیچ ایک بڑے دائرے کی شکل میں کم و بیش دو سو افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب سجاول کے ساتھی اور کارندے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے پاس آتشیں اسلحہ تھا۔ باقی جو تھے وہ کلہاڑیوں یا لمبے چھروں سے مسلح تھے۔ ان کے لباس اور گرم چادریں ہوا کے زور سے پھڑ پھڑاتی تھیں مگر وہ اپنی جگہوں پر جمے ہوئے کھڑے تھے۔ بالکل جیسے پتھر کے بت ہوں۔

ایک جانب پانچ کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر بڑے بڑے پگڑوں والے وہی مہمان بیٹھے تھے جو بہت کم بولتے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی عقابی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ان پانچوں افراد کو اس لڑائی کے لیے منصف کا کردار ادا کرنا تھا۔ ان میں سے چار نے سفید کلف دار شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ ایک کی شلوار قمیص کا رنگ سیاہ تھا اور اس کی پگڑی بھی سیاہ تھی۔

میدان کی جگہ نیم پتھریلی تھی۔ یہاں کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سیاہ شلوار قمیص والے مہمان کے سامنے ایک گول نقارہ پڑا تھا۔ ایسے ہی تین چار چھوٹے نقارے تماشائیوں کے درمیان بھی رکھے تھے۔ یہ نقارے مسلسل بجائے جا رہے تھے۔ بالکل جیسے کسی جنگ سے پہلے، لڑنے والوں کا جوش و خروش بڑھانے کے لیے رجز پڑھے جاتے ہیں یا ڈھول اور طبل وغیرہ سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔

میں میدان میں آچکا تھا۔ میں سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ جسم پر جین کی ایک پتلون اور صرف ایک بنیان تھی۔ تھوڑی دیر بعد سجاول بھی میدان میں نمودار ہو گیا۔ اس کے داخل ہوتے ہی نقارے زیادہ زور سے پیٹے جانے لگے۔ تماشائیوں میں غیر معمولی جوش و خروش دکھائی دینے لگا۔ سجاول اسی لباس میں تھا جو قریباً ڈیڑھ برس پہلے کی وڈیو میں نظر آیا تھا۔ اس نے ایک ایسا جانگیا پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک جاتا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا اور فولاد کی طرح دمک رہا تھا۔ جانگیے میں ایک چوڑی پیٹی بھی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پیٹی کسی جانور کی کھال کی ہے۔ شاید...... وہی جانور جو اس قبیلے کے لوگوں کے لیے زمانہ قدیم سے ایک خاص حیثیت رکھتا تھا...... یعنی باگھ...... جس کا بدبودار جگر چباتے ہوئے میں نے کل رات سجاول کو دیکھا تھا۔ وہ سارے مناظر ابھی تک میرے حافظے میں تازہ تھے اور دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرتے تھے۔ سجاول کا تیندوے کا جگر چبانا۔ پھر گھوڑی کے شکم سے برآمد ہونے والے کچے گوشت کے لوتھڑے سے رطوبت نکالنا اور اسے کہنہ شراب میں ملا کر پینا۔ وہ سب کچھ کسی سفلی عمل کا ہی حصہ لگتا تھا۔ اس عمل کا کچھ حصہ میں نے آتش دان میں دبک کر دیکھا تھا...... اور کچھ شاید...... میری نگاہوں سے اوجھل رہا تھا۔

سردار سجاول کا چہرہ دیکھ کر دل پر ہیبت سی طاری ہوئی لیکن ایسا صرف چند سیکنڈ کے لیے رہا پھر میں سنبھل گیا۔ سجاول کا چہرہ اس طرح تمتمایا ہوا تھا جیسے اس کی جلد کے اندر سے ابھی خون ٹپک پڑے گا۔ اس چہرے پر آنکھیں دو دہکتے انگاروں کی طرح تھیں اور ان پر نگاہیں جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ کسی انسان کی آنکھوں سے زیادہ کسی جانور کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔ تماشائیوں میں سے کئی افراد سجاول کو دیکھنے کے بعد رکوع کی سی حالت میں جھک گئے، باقی لوگ پُرجوش نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کے نعروں میں ایک طرح کی ہیبت کی بھی جھلک دکھائی تھی۔

وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہمارے درمیان بس آٹھ دس فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ سیاہ لباس اور سیاہ پگڑی والا شخص اپنی رنگین پایوں والی کرسی سے اٹھا اور ہم دونوں کے قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ ٹھہرے ہوئے بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ ''اس لڑائی میں کوئی ہتھیار استعمال نہیں ہوگا۔ لڑائی اگر دس منٹ تک جاری رہی تو پھر اس میں پانچ منٹ کا ایک وقفہ ہوگا۔ لیکن اس پانچ منٹ میں کوئی بھی اس دائرے سے باہر نہیں جا سکے گا......'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لڑائی کے دوران میں اگر کسی کو اپنے شدید زخمی ہونے کا خطرہ ہو یا اس کو لگے کہ اس کا ہاتھ پاؤں ٹوٹ سکتا ہے تو وہ آواز دے کر یا زمین پر ہاتھ مار کر یہ لڑائی رکوا سکتا ہے۔ کسی ایک کے زخمی ہونے یا پھر جان چلے جانے کی ذمے داری تم دونوں میں سے کسی پر نہیں ہوگی۔'' اس مرتبہ کالے کپڑوں والے نے یہ بات سجاول کی طرف دیکھ کر کہی تھی۔ سجاول نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے توانا بازوؤں کی مچھلیاں جیسے پھڑک رہی تھیں اور پتلی کمر کے اوپر صندوق جیسا سینہ سنگلاخ چٹان کے مانند دکھائی دینے لگا تھا۔

کالے لباس والے نے کہا۔ ''یہ لڑائی آج یہاں اور

اسی وقت ختم ہو جائے گی۔ کسی کے زخمی ہونے یا جان چلے جانے کی صورت میں کسی طرح کا کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا...... اور نہ بدلہ لینے کا ارادہ رکھا جائے گا۔ اگر لڑائی دس منٹ سے زیادہ چلی اور پانچ منٹ کا وقفہ ہوا تو وقفے کے بعد یہ لڑائی دونوں میں سے کسی کی ہار جیت تک جاری رہے گی۔ مطلب یہ کہ اب اسے برابری پر نہیں چھڑایا جاسکتا۔''

سیاہ لباس والے نے اس لڑائی کے کچھ مزید قواعد و ضوابط بتائے اور اس کے بعد نقارچیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا ردھم بدلا اور نسبتاً بلند آواز میں نقارے بجانے لگے۔ جوش کی ایک لہر تھی جو چاروں طرف لہراتی اور گونجتی محسوس ہوئی۔ ایک عرصے بعد میں نے آج پھر خود کو MMA کے رنگ میں کھڑا محسوس کیا۔ ہاں، آج پھر میں ایسٹرن کنگ تھا اور میرے سامنے ایک انوکھا و پُراسرار حریف تھا۔ اگر میرے پاس خونی لڑائیوں کا طویل تجربہ نہ ہوتا تو شاید میں اس جنونی شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر ہی آدھی لڑائی ہار جاتا۔

سیاہ کپڑوں والا واپس اپنی رنگین کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے حاضرین کی طرف دیکھ کر بڑے نقارے پر ایک زوردار چوٹ لگائی اور اس کے ساتھ ہی ہماری لڑائی کا آغاز ہو گیا۔

سجاول نے دونوں بازو پھیلائے اور بڑے نپے تلے قدموں سے میرے گرد ایک چکر لگایا پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ یہی وہ طوفانی گھونسا تھا جس کے بارے میں، میں اب تک بہت کچھ سن اور دیکھ چکا تھا۔ اگر میں پہلے سے تیار نہ ہوتا تو شاید یہ مقابلہ جس کی تیاری ہفتوں سے جاری تھی، پہلے پانچ سیکنڈ میں ہی ختم ہو جاتا۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے خود کو اس گھونسے سے بچایا۔ یہ گھونسا اچٹتا ہوا سا میرے کندھے پر لگا اور اس نے مجھے بتا دیا کہ جو کچھ کہا اور سنا جاتا ہے، وہ ہرگز غلط نہیں ہے۔ میرے شانے سمیت میرا پورا جسم جھنجھنا اٹھا اور بالکل یہی لگا کہ کسی شہ زور شخص نے ایک وزنی ہتھوڑا پوری قوت سے گھما کر میرے شانے پر رسید کیا ہے۔ اگر یہ کہا جاتا تھا کہ سجاول کا یہ گھونسا مدِمقابل کی گردن توڑ ڈالتا ہے تو غلط نہیں تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ابھی اس گھونسے کا پورا ''امپیکٹ'' میں نے نہیں جھیلا۔ یہ ایک اچٹتی ہوئی ضرب تھی۔ اس کے باوجود کچھ دیر کے لیے شانہ اور پورا بازو سن ہو کر رہ گئے۔

اس کا دوسرا گھونسا بائیں ہاتھ کا تھا۔ یہ وار بچانے میں مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ تیسرا وار میں نے کیا۔ یہ دائیں ٹانگ سے لگائی جانے والی ایک برق رفتار ضرب تھی

جو سجاول کے صندوق جیسے سینے پر پڑی۔ یہ MMA کے چیمپئن کی ضرب تھی۔ سجاول تین چار قدم تک لڑکھڑایا۔ تماشائیوں کے شور و غل کو جیسے دو تین سیکنڈ کے لیے بریک لگ گئے۔

اس چوٹ کا ردِعمل میری توقع سے زیادہ تھا۔ سجاول نے کسی خونی جانور کی طرح پھنکارتے ہوئے مجھ پر حملہ کیا۔ بالکل یہی لگا جیسے کوئی بھوکا درندہ اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے شکار پر جھپٹ پڑے۔ اس نے اپنے چاروں ہاتھوں پاؤں کو اتنی تیزی اور اتنے تواتر کے ساتھ حرکت دی کہ مجھے لگا، میرے جسم پر پتھروں کی بارش سی ہو گئی ہے۔ کچھ وار میں نے خالی دیے مگر کچھ سہنا پڑے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سجاول کے طرزِ لڑائی میں کسی طرح کے خاص ہنر یا مشق وغیرہ کا دخل نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کا دخل تھا تو وہ اس کا دیوانہ پن تھا اور وہ بے پناہ غضب تھا جو اس کے اندر سے نیلے شعلوں کی طرح لپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے اپنی ساری توجہ دفاع پر مبذول کر دی۔ کیونکہ میں جان گیا تھا کہ اس طوفانی حملے میں اگر اس وحشی کا ایک دایاں گھونسا بھی ٹھکانے پر لگ گیا تو میرا سارا ہنر و فن دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

تماشائی للکار رہے تھے۔ ''مارو سردار...... مارو سردار...... سردار زندہ باد۔''

تیز ہواؤں کے شور میں نعروں کی صدائیں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ سردار مجھ پر دیوانہ وار حملے کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حیرت زدہ بھی ہو رہا تھا۔ شاید حیرت اس بات پر تھی کہ میں ابھی تک اس کے سامنے کھڑا کیونکر ہوں۔ میں نے اس کے ایک نسبتاً ڈھیلے وار کو خالی دیا تو اس کا جسم میرے نزدیک آ گیا۔ جب مدِمقابل کا جسم زیادہ نزدیک آ جائے تو گھونسا اور کک وغیرہ زیادہ کام نہیں کرتے۔ یہ موقع سر سے ضرب لگانے کا ہوتا ہے اور میں نے یہ ضرب اس کے سینے پر لگائی وہ ایک بار پھر لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا۔

''ماردوں گا۔'' وہ چنگھاڑا اور دگنی رفتار سے میری طرف آیا۔

ہم اوپر نیچے سنگلاخ زمین پر گرے۔ اور یہ وقت تھا جب مجھے پہلی مرتبہ اپنی مشکلات کا احساس ہوا۔ جس کندھے پر سجاول کا طوفانی گھونسا لگا تھا وہ پہلے ہی سے کسی حد تک چوٹ زدہ تھا۔ اب اس میں سے ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں۔

میں نے سجاول کے بھاری بھرکم جسم کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی مگر کندھے کی وجہ سے ناکام رہا۔ سجاول کی غضب ناک پھنکاریں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کے جسم میں سے کسی درندے کی سی بو اٹھ رہی تھی۔ جب حریفوں کے جسم بہت قریب ہوں تو گھونسوں میں وہ طاقت نہیں ہوتی۔ زوردار گھونسا یا گھٹنا وغیرہ رسید کرنے کے لیے کچھ پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ اپنا مہلک گھونسا میرے چہرے پر رسید کرنے کے لیے سجاول کچھ پیچھے ہٹا تھا۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے بڑے اطمینان سے اسے اپنے اوپر سے اچھال پھینکا۔ وہ کالے لباس والے کے ساتھیوں کے قریب گرا۔

اب کی بار اس کا اٹھنا اور جھپٹنا مزید خطرناک تھا۔ اگلے قریباً دو منٹ میں میرے اور اس کے درمیان زوردار رن پڑا۔ زیادہ تر حملے وہی کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے کچھ ضربیں لگائیں۔ ان میں سے کچھ شدید تھیں۔ تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سجاول کی جنونی کیفیت نے اس کی قوتِ برداشت میں بھی بے پناہ اضافہ کر رکھا ہے۔ میری تمام تر توجہ اس بات پر تھی کہ میں سجاول کے مہلک گھونسے سے خود کو بچائے رکھوں۔ اس دوران میں میرے کندھے کو مزید ضعف پہنچا۔ دوسری طرف میرے ایک مکے سے سجاول کی دائیں ابرو بھی پھٹ گئی اور اس کا پورا تھوبڑا اس زخم کے خون سے سرخ نظر آنے لگا۔ تیز ہواؤں کے شور میں بڑے نقارے پر ایک گونج دار چوٹ پڑی اور وقفے کا اعلان ہوا۔

سیاہ لبادے والا دراز قد شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور ہم دونوں کے درمیان آگیا۔ اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ”اب پانچ منٹ کا وقفہ ہوگا۔“

وہ سجاول کو سنبھالتا ہوا اپنی منقش کرسی کی طرف لے گیا اور اسے وہاں بٹھا دیا۔ دوسرا شخص سجاول کے چہرے پر آنے والے زخم کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے بیٹھنے کے لیے بھی لکڑی کا ایک اسٹول میدان میں رکھ دیا گیا۔ پہلوان حشمت ذرا جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور میرا حال احوال دریافت کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ کہنے لگا۔ ”تم نے کمال کر دیا ہے شاہ زیب! سردار جس طرح لڑ رہا ہے، کوئی اور ہوتا تو اس کے پرزے اُڑ جاتے تھے، شاباش۔“

”میرے کندھے پر چوٹ آئی ہے۔“ میں نے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے بھی یہ لگتا ہے کہ تمہارا کندھا ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ لیکن اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ بس تم کندھے کو ٹھنڈا نہیں ہونے دینا۔ اس کو ذرا ہلاتے جلاتے رہو۔“

میں نے دیکھا، سجاول اپنے زخم پر دوا لگوانے سے انکار کر رہا تھا۔ اس نے دوا لگانے والے کو دھکا دے کر دور گرا دیا۔ تب میں نے ایک اور تعجب خیز منظر دیکھا۔ اس نے اپنے ابرو کے زخم پر دو تین مکے رسید کیے اور اسے مزید خونچکاں بنا دیا۔ چہرہ جو کپڑے سے صاف کر دیا گیا تھا، ایک بار پھر لہولہان دکھائی دینے لگا۔ وہ بے انتہا طیش میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس اثنا میں بادل زور سے گرجے اور تیز ہوا میں بارش کی بوچھاڑیں بھی شامل ہونے لگیں۔ ہجوم میں تھوڑی سی ہلچل ضرور نظر آئی مگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

اسی دوران میں سجاول کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ابھی پانچ منٹ کا وقفہ مکمل ہونے میں ایک ڈیڑھ منٹ باقی تھا کہ وہ دہاڑتا ہوا سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنی طرف لپکتا دیکھ کر میں نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ وہ غلیظ گالیاں بکتا ہوا کسی خونی جانور ہی کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ اس کی گالیوں کا جواب میں نے تابڑتوڑ ضربوں سے دیا۔ ہر ضرب پر اس خبیث کا غیظ و غضب مزید بھڑک اٹھتا تھا۔ ہم گتھم گتھا ہوئے اور لڑتے ہوئے تماشائیوں پر جا گرے۔ سجاول جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک ایسی قاتل مشین کی طرح تھا جس کا سوئچ آن کرنے کے وقت سوئچ ٹوٹ گیا ہو اور اب مشین کو روکنا ناممکن ہو۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا، تماشائیوں کا دائرہ ٹوٹ گیا۔ ہم اندھا دھند لڑتے لڑتے رہائشی حصے کی طرف چلے گئے۔ لوگ ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ بڑے بڑے پگڑوں والے منصف حضرات نے بھی اپنی کرسیاں چھوڑ دی تھیں۔ بارش نے ہر ایک کو لت پت کر دیا تھا۔ یہ لڑائی اس قدر خوفناک تھی کہ کسی کو موسم کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

میں بس دفاع کر رہا تھا اور پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں نے اب تک جتنی بھی لڑائیاں لڑی تھیں، یہ ان سب میں سے انوکھی تھی۔ دو بدو مقابل لڑائی کے فن سے تو زیادہ آشنا نہیں تھا مگر اس کے دیوانے پن نے اس کے اندر ایک ایسی آگ بھر دی تھی جس کا سامنا کرنا بے حد دشوار تھا۔ ”مار دے اس کو...... جان سے مار دے۔“ وڈا سردار اعظم بار بار چنگھاڑ رہا تھا۔

ہم لڑتے لڑتے لکڑی کے ایک کیبن سے ٹکرائے اور

اسے چکنا چور کرتے ہوئے اندر جا گرے۔ یہاں برتن تھے اور شراب کی بہت سی بوتلیں رکھی تھیں۔ کئی بوتلیں چکنا چور ہو گئیں اور ان کے ٹکڑے کیبن میں بکھر گئے۔ یہ ٹکڑے زخمی کرنے لگے لیکن لڑائی ایسے مرحلے میں تھی کہ ان زخموں کی پروا سجاول کو تھی اور نہ مجھے۔ سجاول نے مجھے اوندھے منہ گرا لیا اور میری کمر پر سوار ہو کر میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی۔ شاید وہ پلک جھپکتے میں میری گردن توڑ ڈالتا لیکن MMA کے بنیادی اصول کے مطابق میں اس کے بازو کے شکنجے میں اپنا ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اس شکنجے کا سارا زور میری گردن پر نہیں تھا بلکہ کچھ زور میرا ہاتھ بھی جھیل رہا تھا۔

ناکامی سجاول سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے ایک ٹوٹی ہوئی چوکھٹ کی موٹی لکڑی اٹھالی اور میرے سر پر ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ یہ قاعدے کے خلاف تھا۔

بارش کی بوچھاڑوں میں سیاہ لباس والے نے چلا کر کہا۔ ''نہیں سردار، لکڑی چھوڑ دو......''

''پیچھے ہٹ جاؤ۔'' سجاول چنگھاڑا۔ اس کی آواز میں بے انتہا درندگی تھی۔

شاید فیض محمد، مانی اور دیگر لوگوں نے درست ہی بتایا تھا کہ ایک بار لڑائی شروع ہونے کے بعد سجاول کو روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس بات کا شدید اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حریف کی جان لے لے۔

وہ فاؤل کر رہا تھا۔ اب مجھے بھی اختیار تھا کہ میں اپنے دفاع کے لیے کوئی حربہ اختیار کروں۔ میرے اردگرد لکڑیاں اور شیشے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے موجود تھے مگر میں نے خود کو جذبات کی رو میں بہنے نہیں دیا اور اپنی توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھی۔ ایک تو سجاول میرے سر پر لکڑی کی کوئی کاری ضرب نہ لگا سکے، دوسرے وہ غیر متوازن ہو اور میں اسے اپنے اوپر سے ہٹا سکوں۔ یہ دوسرا موقع مجھے جلد ہی مل گیا۔ میں نے اپنی گردن چھڑائی اور پھر اپنے سر کے پچھلے حصے کی ضرب اس کی ناک پر لگائی۔ وہ ڈگمگایا تو میں نے پلٹ کر اسے اپنے نیچے کر لیا۔

ایک بار پھر میرے اور اس کے درمیان فرشی لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ عجیب منظر تھا۔ ٹوٹے ہوئے کیبن کا ملبا چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ لکڑی کی چھت بھی گر چکی تھی۔ طوفانی ہوا اور تیز بارش نے سب کو غتربود کر دیا تھا۔ میری ناک میں الکحل کی بو تھی اور ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے ٹکڑے جسم کو مزید لہولہان کر رہے تھے۔ یہی خونچکاں کیفیت سجاول کی بھی تھی۔ وہ اب میرے نیچے تھا۔ اس کی انگارا آنکھوں میں مجھے غضب کے علاوہ جو سب سے نمایاں چیز نظر آ رہی تھی، وہ حیرانی تھی۔ یقیناً وہ غیر شعوری طور پر اس بات پر حیران تھا کہ میں اب تک اس کے مقابل کیونکر کھڑا ہوں۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج اس کا سامنا مار دھاڑ کے ایک پروفیشنل سے ہے۔ اب اس لڑائی کی طوالت اس کے شعلوں پر تیل چھڑک رہی تھی۔

اچانک مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ اس کے مہلک گھونسے سے خود کو دور رکھنے کی کوشش میں، میں نے اپنے بالائی دھڑ کو اتنا پیچھے کر لیا کہ سجاول کو نیچے لیٹے لیٹے میری ٹانگ گرفت میں لینے کا موقع مل گیا۔ یہ خطرناک گرفت تھی میری پنڈلی ٹوٹ سکتی تھی۔ میں نے تڑپ کر خود کو پیچھے کی طرف گرایا اور جوابی کارروائی کے طور پر اس کی ٹانگ گرفت میں لے لی۔ اس موقع پر یہ زیادہ سے زیادہ فائدہ تھا جو میں حاصل کر سکتا تھا اور یہ میں نے کیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہم پہلو بہ پہلو لیٹے تھے۔ میرا چہرہ سجاول کے پاؤں کی طرف اور اس کا میرے پاؤں کی طرف تھا۔ میری پنڈلی ایسی پوزیشن میں آ گئی تھی کہ وہ اپنی کہنی کے زوردار دباؤ سے اسے توڑ سکتا تھا۔ اور وہ کب کا توڑ بھی چکا ہوتا اگر میں نے اس کے بائیں گھٹنے پر اپنا تسلط نہ جما لیا ہوتا۔

کھیل ختم ہو چکا تھا اور بڑے عجیب اسٹیج پر ہوا تھا۔ وہ میری پنڈلی توڑ سکتا تھا اور میں بھی اس کے گھٹنے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں تھا۔ مجھے اپنی پوزیشن کا پتا تھا لیکن اسے شاید اپنی پوزیشن کا اتنا زیادہ پتا نہیں تھا۔ اس نے میری پنڈلی پر دباؤ بڑھایا تو میں نے اس کے گھٹنے کو بیدردی سے TWIST کیا۔

''نہیں سجاول، تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

''ماردوں گا تجھے...... ماردوں گا۔'' وہ زہریلے ناگ کی طرح پھنکارا۔

''تو مار دے، اگر مار سکتا ہے۔''

اس نے ایک بار پھر پنڈلی پر زور مارنا چاہا۔ میں نے گھٹنے پر دباؤ خطرناک حد تک بڑھا دیا۔ میری تیز سرگوشی پھر اس کے کانوں تک پہنچی۔ ''تو پنڈلی توڑ سکتا ہے تو میں بھی گھٹنا توڑ سکتا ہوں۔ اور تجھے پتا ہی ہو گا گھٹنا ٹوٹنا کیسا ہوتا ہے۔''

یہ بڑی کانٹے دار صورتِ حال تھی۔ فری ہینڈ کی حقیقی

لڑائیوں میں ایسی سچویشن کم کم ہی آتی ہے۔ زمین کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ یہ بڑے فیصلہ کن لمحے تھے۔ میری بات بڑی اچھی طرح سجاول کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ بے شک وہ جنونی ہو رہا تھا مگر اس جنون میں بھی اتنا پتا تو اسے چل ہی رہا تھا کہ پنڈلی ٹوٹ جانے سے گھٹنا ٹوٹ جانا کہیں زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ''میں نے تجھ سے اسی لیے گزارش کی تھی کہ یہ لڑائی بند کمرے میں ہو تو اچھا ہے......''

اس نے ایک بار پھر پنڈلی پر دباؤ بڑھایا، میں نے اس کے پاؤں کو TWIST کیا، گھٹنا کڑکڑا اٹھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ میں نے تیز سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ''سجاول! یہ اس لڑائی کا فل اسٹاپ ہے...... لیکن میں اپنی ہار مان رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا دایاں ہاتھ تین دفعہ زور سے زمین پر مارا۔

سیاہ لباس والا لپک کر آگے بڑھا۔ اس نے لڑائی روکنے کا اشارہ کیا۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے اس کے چاروں ساتھی بھی آگے آئے۔ انہوں نے میری پنڈلی سجاول کی گرفت سے آزاد کروائی۔ میں نے بھی اس کا گھٹنا آزاد کر دیا۔ تماشائیوں نے شور سے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ نقارے پورے زور سے بجنے لگے۔ سجاول کے ساتھی اور کارندے خوشی سے ناچنا شروع ہو گئے۔ وہ بھڑکیں مار رہے تھے اور خوشی سے بھرپور آوازیں بلند کر رہے تھے۔

لیکن دوسری طرف سجاول کے تاثرات مختلف تھے۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ سرتاپا شعلۂ جوالہ نظر آتا تھا۔ وہ دہاڑا۔ ''میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔''

وہ پھر مجھ پر جھپٹا لیکن اب میرے اور اس کے درمیان درجنوں افراد تھے...... اور ان میں وہ بڑی پگڑیوں والے بھی تھے جنہوں نے یہاں ''ریفریز'' کا کردار ادا کیا تھا۔ ان سب نے مل کر سردار سجاول کو سنبھال لیا۔ ان میں سے زیادہ تر یقیناً یہی سمجھ رہے تھے کہ سردار ابھی تک اپنے غیظ و غضب کو سنبھال نہیں پا رہا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ صرف غیظ و غضب ہی نہیں ہے، اس میں شدید جھلاہٹ بھی شامل ہے۔ سردار جانتا تھا کہ وہ یہ لڑائی جیت نہیں سکا۔

لوگ مجھے تمسخر اور حقارت سے دیکھ رہے تھے۔ فیض محمد اور اس کے دو چار قریبی ساتھیوں نے مجھے اپنے حصار میں لیا اور بارش کی بوچھاڑوں سے گزار کر احاطے کی طرف لے گئے۔ میں نے اپنے زخمی کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔ ''مجھے حشمت پہلوان کی ضرورت ہے۔''

''کیوں؟'' فیض نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے میرے کندھے میں گڑبڑ ہے۔''

فیض نے بوجھل انداز میں کہا۔ ''شکر کرو تمہارے صرف کندھے میں گڑبڑ ہے۔ تمہاری گردن ٹوٹنے سے بچ گئی ہے۔''

اس نے رخ تبدیل کیا اور مجھے پہلوان حشمت کی کوٹھری کی طرف لے چلا۔ وہ ہم سے پہلے ہی اپنی کوٹھری تک پہنچ چکا تھا۔ میری بنیان پھٹ چکی تھی۔ پورے جسم پر شیشے کی کرچیوں سے لگنے والے چرکے تھے۔ بالائی دھڑ ان چرکوں کے سبب خون میں لت پت ہو چکا تھا۔ تیز بارش کے بعد اب بادل کہیں کہیں سے چھٹ چکا تھا اور سہ پہر روشن دکھائی دینے لگی تھی۔ پہلوان حشمت نے یہاں کے معالج کی حیثیت سے جلدی جلدی میرے زخموں کو صاف کیا۔ جہاں کہیں شیشے کی کرچیاں موجود تھیں، وہ نکالیں۔ دو چار جگہ بینڈیج کی ضرورت تھی۔ پہلوان کو یہاں فرسٹ ایڈ کا سامان مہیا تھا۔ اس نے بینڈیج کی اور میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ پھر وہ میرے کندھے کا معائنہ کرنے لگا۔

فیض محمد کی آنکھوں میں، میں نے نمی دیکھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''ہم میں سے شاید کسی کو توقع نہیں تھی کہ تم سردار کے سامنے اس طرح جم کر لڑ پاؤ گے...... اور اپنی زندگی بھی بچا لو گے۔ میں تم کو نئی زندگی کی مبارک دیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' میں نے کندھے کے درد کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

درحقیقت اس پوری لڑائی میں سجاول کے خوفناک گھونسے کی فقط ایک ضرب ہی میرے جسم کو سہنا پڑی تھی اور یہ یہی کندھے والی ضرب تھی۔ اس نے جیسے میرا کندھا اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر اس کے گھونسے کو گردن توڑ کہا جاتا تو شاید ٹھیک ہی کہا جاتا تھا مگر غیر جانبداری سے بات کی جائے تو حقیقت یہی تھی کہ آج یہاں اس موسلا دھار بارش میں میرا مقابلہ ایک زبردست حریف سے ہوا تھا۔ وہ کوئی ماسٹر فائٹر نہیں تھا لیکن اس کی اندھا دھند لڑائی میں ایک ایسا ''قاتل جوش'' تھا جس کا مقابلہ کرنے میں مجھے مزہ آیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے سجاول سے نہیں وادیٔ سون کے کسی قدیم قبیلے کی ''پُراسرار توانائی'' سے مقابلہ کیا ہے۔

بارش تھم گئی تھی۔ ہوا کا زور بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ شام نکھر

آئی تھی۔ احاطے میں جشن کا سا سماں تھا۔ سجاول کے قریبی ساتھی اور بہی خواہ ڈھول کی تھاپ پر ناچ رہے تھے۔ جگہ جگہ الاؤ روشن کردیے گئے تھے اور لوگ ٹولیوں کی صورت ان کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ یہ لوگ سجاول کو دل و جان سے اپنا سردار مانتے تھے۔ پچھلے چند دن ان لوگوں نے بہت کرب میں گزارے تھے کہ ان کے سردار کی عزت کو للکارا گیا تھا اور داؤ پر لگایا گیا تھا۔ آج ان کا سردار ''سرخرو'' ہوا تھا (کم از کم ان کی نظروں میں تو سرخرو ہی ہوا تھا) وہ بہت شاداں تھے۔

پہلوان حشمت نے میرے کندھے پر اپنی کاریگری دکھانی شروع کی تو درد کچھ اور بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ پہلوان نے کس طرح سردار اعظم کی محبوبہ نگینہ کی اچھی بھلی جڑی ہوئی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔

میں نے کہا۔ ''پہلوان! زیادہ ہلاؤ جلاؤ نہ...... بس تھوڑا سا گرم تیل لگا کر اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دو۔ میرا خیال ہے کہ ایک دو دن.... آرام ملے گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''خود بخود کچھ نا ہیں ہووت ہے بھیا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ جنگ لگے نہ پھٹکری اور تو سن تیل بھی ہو جائے۔ تھوڑا بہت ہلا جلا کر پٹھوں کو ان کی تھاں (جگہ) پر بٹھانا تو ہووے گا۔'' پہلوان نے اصرار کیا۔

اس نے تھوڑی بہت کاریگری دکھائی۔ بہرحال میں نے زیادہ نہیں چلنے دی۔ میری پٹی کرتے ہوئے پہلوان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کپکپاہٹ کی وجہ ایک طرح کی مرعوبیت تھی۔ پہلوان نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح مجھے سجاول سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں تھی۔ یہاں موجود بدترین مخالف بھی یہ لڑائی دیکھ کر مجھ سے مرعوب ہوئے تھے۔

میں فیض محمد اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ راستے میں، میں نے باقر بگھیاڑ کو دیکھا۔ وہ حسب معمول جین جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ جیکٹ کے بٹن چاندی کے تھے اور ڈوبتے سورج کی کرنوں میں دمک رہے تھے۔ اس نے کانوں میں ٹونٹیاں ٹھونس رکھی تھیں۔ شاید موبائل فون پر میوزک سن رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ مجھے اس کی صورت دیکھ کر کبھی بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے فوراً موذن عبدالرحیم یاد آجاتا تھا جسے صرف اس وجہ سے موت کے گھاٹ اتارا گیا کہ اس کی وضع قطع اور ڈیل ڈول باقر سے ملتے تھے۔

باقر کو میں نے کچھ روز پہلے چاروں شانے چت کردیا تھا۔ میری اس کامیابی نے مجھے یہاں کے لوگوں میں ایک خاص اہمیت دلا دی تھی۔ آج اس اہمیت میں گونا گوں اضافہ ہوگیا تھا۔ بے شک لوگوں نے یہی جانا تھا کہ میں ان کے سردار سے ہار گیا ہوں، لیکن جو زبردست فائٹ انہوں نے دیکھی تھی وہ ان کے دل و دماغ پر یقیناً نقش ہوگئی تھی۔

میں جب تک اپنے کمرے میں پہنچ نہیں گیا، باقر اپنی جگہ پر کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد کئی چوٹیں تکلیف دینے لگیں۔ ان میں زیادہ اہم چوٹ کندھے ہی کی تھی۔ یہاں نیل پڑ گیا تھا اور سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ شیشے کی کرچیوں سے جو کٹ وغیرہ آئے تھے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

کھانے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میری اور سجاول کی لڑائی ایک طرح سے برابری پر ختم ہوئی تھی لیکن میں نے ہار مان لی تھی۔ ایک طرح سے میں نے اس کو اپنی حیثیت بھی بتادی تھی اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھا دیا تھا۔ اب گیند سجاول کے کورٹ میں تھی کہ وہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔

پھر میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ پچھلے تقریباً 72 گھنٹے سے میں اس سے مل نہیں سکا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ بے حد پریشان ہوگی۔ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہی ہوگی مگر سردار سجاول نے میرے اور اس کے ملنے پر پابندی لگا دی تھی۔ آخری مرتبہ جب میں نیچے تہ خانے میں گیا تھا تو بمشکل مجھے چند منٹ ملاقات کی اجازت ملی تھی اور اس دوران میں آخری سے میری منہ ماری بھی ہوگئی تھی۔

میری وجہ سے تاجور شدید مشکلات کا شکار تھی، اس کے حوالے سے میرے ذہن پر ہر وقت ایک بوجھ سا تھا۔ حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اس پھول صفت لڑکی کو میرے ساتھ کانٹوں پر گھسٹنا پڑ رہا تھا۔ دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔'' باہر سے باقر کی آواز آئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ باقر نے مجھے بتایا کہ چھوٹے سردار نے مجھے فوراً طلب کیا ہے۔

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کا رویہ کیا ہوگا۔ میں باقر کے ساتھ سردار سجاول کے کمرے تک پہنچا۔ احاطے میں اب بھی چند ٹولیاں اپنے سردار کی فتح کی خوشی منانے میں مصروف تھیں۔ دو الاؤ دہک رہے تھے

اور موج میلہ ہو رہا تھا۔ باقر وہیں رک گیا۔ میں سردار کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی ایک آنکھ بری طرح سوجی ہوئی تھی اور ابرو پر بینڈیج دکھائی دے رہی تھی۔ باقی چوٹیں اس کے لباس میں چھپ گئی تھیں۔ سردار کبھی کبھار ہی شراب پیتا تھا اور وہ بھی ناپ تول کر۔ لیکن اس وقت وہ براہِ راست بوتل سے پی رہا تھا اور ایک خالی بوتل فرش پر لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔

وہ مجھے دیکھ کر پھنکارا۔ ''کیا سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو۔ کیا سمجھتا ہے؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اس نے مجھے گالی دی۔ ''تو مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ احسان چڑھانا چاہتا ہے مجھ پر۔ سجاول نے کبھی تجھ جیسے کسی کمینے کا احسان نہیں لیا۔ میں تیری ٹانگیں چیر دوں گا۔ سب کے سامنے تیری ٹانگیں چیر دوں گا۔'' اس کے منہ سے الفاظ کے بجائے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ ابھی تک اسی خاص کیفیت میں ہے جو کسی قدیم رسم کی ادائیگی کے بعد سے اس پر طاری ہوئی تھی اور جو آج سہ پہر ہونے والی لڑائی میں بھی اس پر طاری رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سردار! اب غصہ کس بات کا ہے۔ میں نے سب کے سامنے اپنی ہار مان لی ہے۔''

''کیوں مانی ہے تو نے ہار؟'' اس نے گرج کر میری بات کاٹی۔ ''یہ لڑائی ابھی آگے چلنی تھی...... اگر...... میں تیری پنڈلی نہیں توڑ سکتا تھا تو...... تو بھی میرے گھٹنے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم دونوں کو اپنا اپنا داؤ چھوڑنا تھا۔ ہاں یہ لڑائی ابھی آگے چلنی تھی...... اور میں اسے چلاؤں گا۔ ابھی اسے چلاؤں گا۔'' اس نے میرا گلا دبوچ لیا اور کمرے کی پتھریلی دیوار سے دے مارا۔

اس کی جنونی کیفیت پھر پوری طرح عود کر آئی۔ وہ دہاڑا۔ ''تجھے میری جان لینی ہوگی یا اپنی جان دینی ہوگی۔''

''تو لے لو جان۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

اس نے میری ناف میں گھٹنے کی ایک طوفانی ضرب لگائی۔ میں رکوع کے بل جھک گیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں اپنا نائن ایم ایم پستول نکال کر میری گردن میں گھسیڑ دیا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن میرے اندر کی توانائی نے مجھے لڑکھڑانے نہیں دیا۔ میں یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس نے انگلی لبلبی پر رکھ لی۔ ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ قیامت کا لمحہ تھا لیکن گزر گیا۔ اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور میرے سر کو بے پناہ طاقت سے کھینچتا ہوا زمین کی طرف لے گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرا چہرہ کمرے کے ناہموار پتھریلے فرش سے رگڑ رگڑ کر لہولہان کر دینا چاہتا ہے۔ اسے جیسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے۔

میرا چہرہ فرش سے لگانے کے بعد اس نے میری پسلیوں میں ایک ٹھوکر لگائی۔ میں پھر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لالٹین چکنا چور ہو گئی۔ فرش پر بچھے ہوئے ایک نمدے نے آگ پکڑ لی۔

وہ دہاڑا۔ ''دفع ہو جا یہاں سے۔ چلا جا...... نہیں تو مارا جائے گا۔'' اس کی آواز میں واقعی کسی خونی جانور کا سا آہنگ تھا۔

میں نے پاؤں سے مسل کر نمدے کی آگ کو بڑھنے سے روکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ جب میں باہر نکلا تو کمرے کے اندر سے کڑاکے کی زوردار آواز آئی۔ (جیسا کہ بعد میں پتا چلا سجاول نے سخت طیش کے عالم میں اپنا مہلک گھونسا رسید کر کے شیشم کی مضبوط میز کے پرخچے اڑا دیے تھے)

باہر باقر بالکل الرٹ کھڑا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ شاید میں مزید چند سیکنڈ تک باہر نہ آتا تو وہ صورتِ حال جاننے کے لیے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیتا۔

☆☆☆

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میرا کندھا پہلے سے بہتر تھا۔ جسم پر آنے والے چھوٹے بڑے کٹ بھی مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال تاجور سے میری ملاقات ابھی تک نہیں ہو پائی تھی۔

ماؤ اور اس کی آفتِ جاں پوتی، لڑائی کے اگلے روز ہی واپس آ گئی تھیں۔ پالکی سے اترتے ہوئے کہیں ماؤ کے پاؤں میں موچ آئی تھی اور وہ زیادہ وقت بستر پر گزار رہی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق ماؤ اور مانی کو یہاں ہونے والی خون ریز لڑائی کا کچھ علم نہیں تھا۔ سردار سجاول نے ہیڈ نوکرانی ماسی کو سختی سے پابند کر دیا تھا کہ نوکرانیوں میں سے کوئی ماؤ اور مانی کے سامنے اس سلسلے میں اپنی زبان نہیں کھولے گی۔ مقابلے کے وقت جاناں کے علاوہ ناچنے گانے والی تین چار عورتیں بھی اس ڈیرے پر موجود تھیں۔ مقابلے سے پہلے انہیں یہاں کے ایک تہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا

اور وہ صورتِ حال سے بے خبر رہی تھیں۔

شام کے وقت مجھے ایک بار پھر سردار سجاول کی طرف سے بلاوا آگیا۔ میں سردار کے کمرے میں پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ اس خاص کیفیت سے نکل چکا ہے جس میں اس نے مجھ سے مقابلہ کیا تھا اور بعد میں کمرے میں بلا کر مجھ سے مار اماری و بدکلامی کی تھی۔ آج وہ بالکل خاموش اور سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود ہمیشہ کی طرح وہ رنگین پایوں والی جہازی سائز کی کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے تپائی پر اس کا قیمتی سیل فون اور سگریٹ کیس رکھا تھا۔ ایک اور سیل فون بھی پڑا تھا۔ میں نے ایسا سیل فون باقر کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ سجاول کے ماتھے پر بائیں طرف وہ بینڈ ایج ابھی تک موجود تھی جس نے اس کی ابرو کے زخم کو ڈھانپا ہوا تھا۔

سجاول نے آج مقابلے والا موضوع بالکل نہیں چھیڑا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تم سے کئی بار ایک سوال پوچھا ہے اور تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سا سوال؟''

''یہی کہ تم کون ہو؟''

''میں قریباً سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔''

''سب کچھ نہیں۔ بہت تھوڑا سا۔'' اس نے کہا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''پرسوں باقر اکوٹلی گیا تھا۔ وہاں کے ایک نیٹ کیفے سے وہ کچھ لے کر آیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

سجاول نے باقر والا سیل فون اٹھایا اور ایک تصویر میرے سامنے کردی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ تصویر کوپن ہیگن یا لندن کے کسی رنگ میں اتاری گئی تھی۔ یہ میری تصویر تھی۔ لمبے بال، داڑھی اور گھنی مونچھیں، میں کسی مقابلے سے پہلے غالباً خود کو وارم اپ کررہا تھا۔ درجنوں کیمرے میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔

سجاول نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''باقر کو شک ہے کہ یہ کوئی اور نہیں، تم ہو۔''

میں اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ میں نے تصویر پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ ''شکلوں سے شکلیں مل جایا کرتی ہیں۔ لیکن یہاں تو شکل بھی زیادہ نہیں مل رہی۔ پتا نہیں تم ایسی بات کیوں کہہ رہے ہو؟''

سجاول نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اسی لہجے میں بولا۔ ''باقر کا خیال ہے کہ تم یورپ کے ملکوں میں کسی بڑے دبنگ نام سے پہچانے جاتے ہو..... اور لڑائی کے بڑے بڑے مقابلے کرچکے ہو۔ تمہارے مقابلوں کی فلمیں ٹی وی اور نیٹ وغیرہ پر چلتی ہیں۔ ایک دنیا تم کو جانتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر سچ مچ ایسا ہوتا تو میں خود کو بڑا خوش قسمت تصور کرتا۔''

وہ زہرخند انداز میں بولا۔ ''لیکن سب کچھ تو ''خوش قسمتی'' والا نہیں ہے نا۔ کہتے ہیں کچھ خون شون بھی کیے ہیں تم نے۔ کچھ بڑی پکی دشمنیاں ہیں تمہاری۔ ہوسکتا ہے وہ ''باہر کی پولیس'' بھی ڈھونڈ رہی ہو تمہیں..... کیا کہتے ہیں اس کو انٹرپول۔''

''پتا نہیں سجاول! تم کیا کہتے جارہے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ڈنمارک میں مارشل آرٹ سیکھتا رہا ہوں اور چھوٹے موٹے مقابلے بھی کرتا رہا ہوں۔ لیکن جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اسے غلط فہمی ہی کہا جاسکتا ہے۔''

وہ گہری سانس بھر کر بولا۔ ''چھوٹے موٹے مقابلے کرنے والا بندہ..... میرے ساتھ اس طرح نہیں لڑسکتا تھا جس طرح تم تین دن پہلے میرے ساتھ لڑے ہو۔ باقی رہی غلط فہمی والی بات تو اس کا پتا بھی دو چار دن میں چل جائے گا۔'' وہ موبائل والی تصویر بڑے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔

میرے دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ وہی کچھ ہورہا تھا جس کے اندیشے تھے۔ میرا ماضی کھلنا شروع ہوگیا تھا۔ باقر کی شکل میری نگاہوں میں گھومی اور جھلاہٹ کی لہر سی سینے میں اٹھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آرہی تھی کہ وہ مقابلے کے بعد سے مجھے کڑی نظروں سے کیوں گھور رہا تھا۔ یقیناً اس نے کسی ٹی وی چینل پر مجھے MMA کی فائٹ لڑتے ہوئے دیکھا تھا، اور ممکن تھا کہ کئی بار دیکھا ہو۔ اس کی سوچوں کا رخ اسے دھیرے دھیرے ایک نتیجے تک لے گیا تھا۔

اسی دوران میں ہلکی سی دستک کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور غیر متوقع طور پر کھانے کی خوشبو کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ کھانے کا وقت ہی تھا۔ بھرے بھرے جسم والی دو جوان ملازمائیں دو تھالوں میں کھانا لیے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ دیسی گھی کا مرغ قورما، تلی ہوئی مچھلی اور پلاؤ وغیرہ کھانے میں شامل تھے۔

ایک ملازمہ نے الماری میں سے امپورٹڈ وہسکی کی بوتل نکالی اور گلاسوں سمیت میز پر سجادی۔ یہ سب کچھ اس غیر معمولی تبدیلی کا اشارہ دے رہا تھا جو سجاول کے رویّے میں آئی تھی۔ نہ ہار کر بھی میں نے جو ہار مانی تھی، اس کے

مثبت آثار نمودار ہو گئے تھے۔

سجاول کے اشارے پر ایک ملازمہ نے بڑے ادب سے جھک کر گلاسوں میں وہسکی انڈیلی۔ سجاول نے جام اٹھایا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ CHEER کرنا چاہتا ہے۔ اب میری بھی مجبوری تھی کہ میں جام اٹھاؤں۔ ہم نے گلاس ٹکرائے اور کھانے سے پہلے چند گھونٹ لیے۔

کھانا مکمل خاموشی سے کھایا گیا۔ حالانکہ سجاول نے ملازماؤں کو باہر بھیج دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اب سجاول مقابلے والا موضوع چھیڑنا ہی نہیں چاہتا۔ یہ بھی ایک مثبت اشارہ تھا۔ کھانے کے بعد پھر جام بھرے گئے۔ ماحول بتدریج دوستانہ ہوتا جارہا تھا...... مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اب وہ پھر میرے ماضی کو کریدنا شروع کردے گا مگر یہ اندیشہ بھی درست ثابت نہیں ہوا۔ اس نے موبائل فون میں موجود تصویر والا معاملہ وہیں کا وہیں رہنے دیا۔

سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر وہ اچانک بولا۔ ''عالمگیر کا منشی محمد افضل یہاں پہنچ چکا ہے۔ تمہارا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ وہ الٹی لکھائی والا خط اسی کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن ہے بڑا ڈھیٹ بندہ۔ کافی مار کھا چکا ہے پھر بھی بہت سی باتیں گول کررہا ہے۔''

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ عالمگیر کا کوئی خاص بندہ بہت جلد اغوا ہو کر یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بتاتا ہے وہ؟''

''اس نے مانا ہے کہ اس سے یہ خط عالمگیر نے لکھوایا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس طرح کے تین چار خط وقتاً فوقتاً کسی ماسٹر ریاض نام کے بندے کو لکھوا چکا ہے۔ یہ ماسٹر ریاض سیالکوٹ کے ہی کسی گاؤں میں رہتا ہے، لیکن کہاں رہتا ہے اس کا منشی کچھ نہیں بتا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ عالمگیر اس سے خط لکھواتا ضرور تھا مگر اس کو ڈاک میں خود ڈالتا تھا۔ ایڈریس بھی خود ہی لکھتا ہوگا۔''

''لڑکیوں کے چکر کے بارے میں منشی کیا کہہ رہا ہے؟''

''کہتا ہے ناکہ گول مول باتیں کررہا ہے۔ کہتا ہے کہ جس طرح مولوی فدا کی لڑکی زینب کو کھانے میں نشہ ملا کر دیا جاتا رہا ہے، اسی طرح ایک دوا اور لڑکیوں کو بھی دیا جارہا ہے اور وہ لڑکیاں ماسٹر ریاض کے پنڈ کی ہیں۔''

''نشے کے بارے میں کیا بتاتا ہے وہ؟''

''بس یہ کہ یہ نشہ سانپ کے زہر سے تیار ہوتا ہے اور اسے پیر سائیں کا بیٹا پیر ولایت تیار کرتا ہے۔ ماسٹر ریاض کو بھی یہ نشہ پیر ولایت اور عالمگیر نے ہی سپلائی کیا ہوا ہے۔ منشی کا کہنا ہے کہ جو مرد عورت اس نشے کو دیر تک استعمال کرتا رہتا ہے اس کے اندر ایک خاص طرح کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔''

''طاقت؟''

''ہاں، اس کو کوئی بھی زہریلا کیڑا مکوڑا بلکہ سانپ بھی کاٹ لے تو اس کو کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ اسے کوئی زہر بھی دے دیا جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔'' سجاول نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مطلب یہ ہوا کہ ان لڑکیوں کو کسی بھی طرح کے زہر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہے؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں، ابھی تو یہی لگ رہا ہے۔ منشی سے پوچھ گچھ جاری ہے۔ سخت ہڈی کا ہے، لیکن کب تک منہ نہ کھولے گا۔ میں نے اسے فخرو کے حوالے کیا ہوا ہے۔ ایک دو دن تک سب کچھ بک دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''خط میں کسی لورو نامی جگہ کا ذکر ہے اور کسی بڑے صاحب کی بات ہے۔ اس کے بارے میں منشی کیا کہتا ہے؟''

''لورو والے معاملے میں منشی نے کافی مار کھائی ہے مگر کچھ بتا نہیں سکا۔''

''تم نے اپنے طور پر بھی پتا کرنے کی کوشش کی؟''

سجاول نے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ''ہاں آس پاس کے علاقے میں میرے بندوں نے کوشش کی ہے۔ ابھی تک اس نام کا کوئی پنڈ یا بستی سامنے نہیں آئی۔''

اندازہ ہورہا تھا کہ سجاول اس سلسلے میں کافی سرگرم ہے۔ یقیناً اس کے اندر کا لالچ اسے اکسا رہا تھا کہ وہ کھوج لگائے اور آگے بڑھے۔ جہاں ایک لڑکی کے لیے کروڑ سوا کروڑ کی بات ہورہی تھی تو وہ کوئی معمولی چکر تو نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے بھی منشی سے بات کرنے کا موقع دو۔''

''ہاں کیوں نہیں، تم بھی کرلینا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے ذرا اس کی آکڑ شاکڑ ختم ہو جائے۔ ابھی تھوڑی دیر میں اس کی چھترول ہونی ہے۔ اس سے کافی افاقہ ہوگا اُسے۔''

اچانک سجاول کے سیل فون پر کال آئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور کھڑکی کی طرف جا کر بات کرنے لگا۔ دوسری طرف سے بولنے والے کی مدھم آواز میرے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک ہوا کہ دوسری طرف اختری بات کر رہی ہے۔

ایک منٹ بعد ہی میرا یہ قیافہ درست ثابت ہو گیا۔ بات ختم کرنے کے بعد سجاول نے فون اپنے سامنے لوہے کی تپائی پر رکھا اور ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اختری کی کال تھی تہ خانے سے۔''

''کیا کہتی ہے؟'' میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''تمہاری اس منہ بولی بیوی نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ رو رو کر برا حال کر رہی ہے۔ چلو جا کر پہلے اس سے مل لو۔ سمجھاؤ اسے کہ سکون سے رہے۔ اگر ہمیں بے سکون کرے گی تو خود بھی تنگ ہوگی۔''

یہ تو مجھے منہ مانگی مراد مل گئی تھی۔ میں سجاول سے اس بارے میں بات کرنے ہی والا تھا۔ میں نے اسی وقت سجاول سے اجازت لی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی رات کے دس بجنے میں ایک گھنٹا باقی تھا چونکہ سجاول نے خود اجازت دے دی تھی اس لیے میں تہ خانے میں اتر سکتا تھا۔ کمرے میں جا کر میں نے اپنا حلیہ درست کیا۔ لباس بدلا، گردن کے قریب شیشے کے ٹکڑوں سے آنے والے دو کٹ موجود تھے۔ انہیں چھپانے کے لیے مفلر کا استعمال کیا۔ کندھے کی پٹی اتار دی تاکہ جیکٹ کے نیچے سے ابھار محسوس نہ ہو۔ جب میں تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا اچانک ٹھٹک گیا۔ میں نے ڈرنک کیا ہوا تھا۔ یقیناً میرے منہ سے ابھی تک وہسکی کی بو آ رہی تھی لیکن کیا کیا جاتا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ مجھے فوراً تاجور کے پاس بھی پہنچنا تھا۔

میں کمرے میں واپس پہنچا۔ اچھی طرح کلیاں کیں۔ ایک الائچی منہ میں رکھی اور پھر تہ خانے کی طرف چل پڑا۔ سرد رات اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ چار سو سناٹا تھا۔ احاطے کی طرف سے مجھے چلانے اور گڑگڑانے کی مدھم آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ عالمگیر کا منشی ہی تھا، جسے کسی کوٹھری میں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ میں سیڑھیوں سے اتر کر پہلے دروازے تک پہنچا۔ حسبِ توقع پہلے دروازے کے سامنے واسکٹ والا پٹھان چوکیدار چوکس کھڑا تھا۔ مجھے رائفل اس کے ہاتھ میں نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا ضرور مگر پچھلی بار کی طرح اس نے سخت رویہ نہیں دکھایا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چابی نکالی اور دروازے کا تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب سے تاجور کے مسلسل رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بڑے صبر والی تھی مگر اب شاید اس کا صبر جواب دے گیا تھا۔ پچھلی بار اس نے جو فقرہ کہا تھا وہ آج بھی تیر کی طرح میرے دل میں پیوست تھا۔ اس نے کہا تھا..... شاہ زیب! اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔

ان گنت طوفان اور صدمے، بے جگری سے سینے پر سہہ جانے والے شاہ زیب کو اس ایک فقرے نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ منظر چونکا دینے والا تھا۔ تنومند اختری، تاجور کے ساتھ کمرے میں موجود نہیں تھی بلکہ باہر کھڑی تھی۔ اس نے کمرے کو باہر سے کنڈی چڑھا رکھی تھی۔ اندر تاجور سنگلاخ دیوار سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا سر اس کے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر تھا اور چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا..... اس کی قمیص کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ ایک کلائی پر بھی گہری خراشیں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔

تب میں نے اختری کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان بھی پھٹا ہوا تھا۔ چہرے کی ایک جانب سرخی ہو رہی تھی اور نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تھوڑی دیر پہلے تاجور اور اختری میں باقاعدہ ہاتھا پائی ہوئی ہے۔ اختری نے مجھے دیکھ کر جیسے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہ تاجور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سنبھالو اپنی زنانی کو۔ میری جان کو آئی ہوئی ہے۔'' اس نے کمرے کی چابی میری طرف بڑھا دی۔

تالا نہیں لگا تھا۔ صرف کنڈی بند تھی۔ میں کنڈی کھول کر اندر داخل ہوا۔ تاجور جان گئی تھی کہ میں آ گیا ہوں۔ لیکن وہ اسی طرح سکڑی سمٹی بیٹھی رہی اور روتی رہی۔ اس کے رونے کی آواز میرا سینہ چھلنی کر رہی تھی۔

میں نے اختری کو اشارہ کیا کہ وہ باہر جائے۔

غیر متوقع طور پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ راہداری والا دروازہ بھی بھیڑ گئی۔ اب کمرے میں تاجور اور میں تنہا تھے۔ میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ''تاجور! چپ ہو جاؤ۔ میں آ گیا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے اشکوں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ جیسے سفید

گلاب پر شبنم کے قطرے لرز رہے ہوں۔
وہ کراہ کر بولی۔ ''شاہ زیب! میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں اس جگہ مر جاؤں گی۔ میں آپ سے کچھ اور نہیں مانگتی۔ خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔ یہ لوگ جتنا روپیا بھی کہیں گے میرے اباجی دے دیں گے۔ بس مجھے یہاں سے نکال دیں۔''
''یہ کیسی باتیں کرتی ہو تاجور۔ روپے کی بات نہیں ہے یہاں...... بس ایک اچھے موقع کی تلاش ہے مجھے۔''
اچانک وہ ٹھٹک سی گئی۔ میں ٹپٹا گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ اسے میرے منہ سے بو آ گئی تھی۔ یکا یک وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ چند سیکنڈ کے اندر وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مجھ سے کچھ اور دور چلی گئی ہے۔
اس نے چہرہ پھر گھٹنوں میں چھپا لیا اور سسکنے لگی۔ ''یا اللہ! میری مدد کر...... میری غلطیاں معاف کر میرے مالک۔ مجھے رہائی دے دے یا پھر موت دے دے۔'' وہ دعائیہ انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔
اس کی کلائی کے علاوہ اس کی گردن اور کندھے پر بھی بالکل تازہ خراشیں تھیں۔ یقیناً یہ اسی زور آزمائی کی نشانیاں تھیں جو میرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے یہاں تاجور اور اختری میں ہوئی تھی۔ (اختری کے تاثرات سے اندازہ ہوا تھا کہ اسے تاجور کی طرف سے قرار واقعی جواب ملا ہے۔ اگر اس نے تاجور کو دو تھپڑ مارے ہوں گے تو ایک دو اسے سہنے بھی پڑے ہوں گے)
میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ آخر میں نے خیالات جمع کرتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! باہر حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ چھوٹا سردار سجاول کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عالمگیر وغیرہ سے اس کی ناچاقی ہو گئی ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ اب ہمیں زیادہ دن یہاں نہیں رکھے گا۔ میں کل اس سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ ہمیں اوپر پہلے والے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دے...... تم...... میری بات سن رہی ہو نا؟''
تاجور اسی طرح چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔ اس کے کندھے سسکیوں کی وجہ سے لرزتے محسوس ہوتے تھے۔
میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے ایک دم میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنے آپ میں بالکل سمٹ گئی۔ ''خدا کے لیے...... مجھ پر رحم کریں...... مم...... مجھے یہاں سے نکال دیں۔ میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔'' اس کے لہجے میں حد درجے کی بیگانگی تھی۔ میں جیسے کٹ کر رہ گیا۔
پھر ایک دم اسے نجانے کیا ہوا۔ اس نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ اپنے گھٹنوں سے اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرے حال پر رحم کریں۔ جس طرح بھی ہو۔ مجھے میرے گھر والوں تک پہنچا دیں، میں آپ سے اور کچھ نہیں مانگتی...... کچھ نہیں چاہتی۔''
اس کے لہجے کی اجنبیت اور تلخی نے مجھے لرزا دیا۔ مجھے لگا جیسے اس کے لب و لہجے نے مجھے یکا یک عرش سے فرش پر لا پھینکا ہے...... بلکہ شاید فرش سے بھی نیچے...... کسی اندھے گڑھے میں۔
...... ہاں جو میری جان تھی، میری زندگی کی شاید پہلی اور آخری محبت تھی جس کا عشق میری زندگی کا حاصل تھا...... وہ مجھ سے ڈر رہی تھی۔ میری قربت اس کو خوف زدہ کر رہی تھی۔ ایک دم سے میرے اندر جیسے کچھ بجھ گیا۔ ایک بے پناہ روشنی تھی جو زور سے پھڑپھڑائی اور تاریک ہو گئی۔ میرے لیے تاجور کی طرف دیکھنا بھی دوبھر ہو گیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ تاجور کا شانہ عریاں ہو رہا تھا۔ میں نے ایک گرم چادر اس کے شانوں پر ڈالی۔
''ٹھیک ہے تاجور! ایک یا دو راتیں جیسے تیسے کاٹ لو۔ میں تمہیں اب یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''
میں اپنا بچھونا بالکل ایک کونے میں لے گیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ اضطراب کے عالم میں وہ آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہی تھی۔ اختری اندر آئی۔ اس نے کمرے کی صورت حال کا جائزہ لیا۔
''شاہ زیب! کوئی چیز تو نہیں چاہیے؟'' اس نے بلند آواز میں پوچھا۔
میں نے نفی میں جواب دیا۔
وہ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر واپس چلی گئی۔ پانچ دس منٹ بعد میں نے کمبل میں سے سر نکال کر دیکھا۔ تاجور اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ وہ کمرے کے دوسرے گوشے میں فرش پر ایک چادر بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے ہالے میں تھا۔ آنسوؤں سے دھلا دھلایا چہرہ ایک غم آمیز پاکیزگی کی تصویر تھا۔ لالٹین کی

مدھم روشنی میں وہ کسی مقدس موی مجسمے کی طرح تھی۔ ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ خوب صورت دودھیا پاؤں آپس میں جڑے ہوئے تھے، آنکھیں بند، لب بے ساختہ حرکت کرتے ہوئے۔ اس کے اردگرد جیسے نور کا ایک ہالہ سا تھا۔ وہ اس ہالے کے اندر تھی، میں اس ہالے کے باہر تھا۔ ان درو دیوار سے باہر یخ بستہ رات کا کہرا آہستہ آہستہ ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر کمبل سر پر تان لیا۔

دل و دماغ میں ایک ہلچل سی تھی۔ وہ سوچیں جو پچھلے کئی روز سے مجھے کچوکے لگا رہی تھیں، آج کچھ زیادہ اذیت ناک ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج مجھے تاجور پر بے تحاشا ترس آرہا تھا۔ وہ مجھے لاہور سے اپنے ساتھ چاند گڑھی کیوں لے کر آئی تھی؟ وہ اس لیے لے کر آئی تھی کہ اسے چاند گڑھی میں کچھ مشکل حالات کا سامنا تھا۔ اسحاق اور عالمگیر اس کا رشتہ زبردستی حاصل کرنا چاہ رہے تھے اور پیر ولایت ان کی مدد کر رہا تھا۔ تاجور اس میں اپنی اور اپنے والدین کی توہین محسوس کر رہی تھی۔

میرے آنے سے اسے کیا فائدہ پہنچا تھا؟ صرف یہی کہ وہ فوری طور پر اسحاق کی ڈولی میں بیٹھنے سے بچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اور تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو جس توہین اور بے عزتی سے بچانا چاہتی تھی وہ کئی گنا بڑھ کر ان کی طرف آئی تھی۔ ایسے چرچے زبان زدِ عام تھے کہ تاجور نے گھر سے بھاگ کر اپنے باپ کے کامے سے نکاح کر لیا ہے۔ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ علیحدہ سے تاجور اور اہلِ خانہ کے دشمن بنے پھرتے تھے۔ بے شک چاند گڑھی میں ایک دوسرا دھڑا بھی موجود تھا جو میری حمایت میں بول رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میری وجہ سے گاؤں کی ایک بیٹی ریشمی صحیح سلامت ملنگوں کے چنگل سے نکل کر واپس آگئی تھی...... اور پیر ولایت کے باپ کے کرتوت بھی آشکار ہو گئے تھے مگر لگتا یہی تھا کہ آہستہ آہستہ دوسرے دھڑے کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور میری حمایت کرنے والوں کی آواز دب جائے گی۔

پچھلے چند دنوں کے اندر ایک اور سوچ بھی میرے ذہن میں آئی تھی۔ یہ بڑی انوکھی سوچ تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ کیوں نہ میں تاجور سے واقعی نکاح کر لوں اور اسے ایک بیوی کی حیثیت سے گاؤں والوں کے سامنے لے جا کھڑا کروں۔ مگر یہ سب تو تب ہی ہو سکتا تھا جب تاجور بھی دل و جان سے ایسا چاہتی۔ اس نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی اور اب تو یہ بات بھی پرانی ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہاں اس ڈیرے پر آنے کے بعد وہ بتدریج مجھ سے دور ہوئی ہے۔ اگر کوئی کچا پکا جذبہ اس کے اندر پرورش پا بھی رہا تھا تو حالات نے اسے بھسم کر دیا تھا۔ اس نے ملنگی ڈیرے پر میرا دوسرا روپ بھی دیکھا تھا۔ میری مارا ماری اور خونریزی دیکھی تھی۔ پھر یہاں پر بھی کئی ایسے واقعات پیش آئے تھے جنہوں نے اسے میرے قریب لانے کے بجائے مجھ سے خوف زدہ کیا تھا۔ اسے میرے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ دکھائی دیتا تھا اور یہ بات اس نے ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے کہی تھی۔

......اور وہ کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے جو سگنل دیے تھے، وہ FAKE نہیں تھے۔ میں جانتا تھا میں کون ہوں اور میرا ماضی مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ وہ میرے آس پاس ہی پھنکار رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ میرے قریب آرہا تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے سردار سجاول کے کمرے میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہ میرے لیے تہلکہ خیز تھیں۔ ایسٹرن کنگ کے نام کی گونج ڈکیتوں کے اس ڈیرے تک پہنچ گئی تھی اور وہ کسی بھی وقت تاجور کے کانوں تک اور چاند گڑھی تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ تاجور جان سکتی تھی کہ جسے وہ صرف ایک کھلاڑی سمجھتی ہے، وہ موت کا کھلاڑی ہے۔ جرم کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو کسی بھی وقت دردناک موت کا شکار ہو سکتا ہے۔

......میں کیوں ایک مظلوم، معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا؟ میرے اندر کی آواز نے پھر پکار کر کہا۔ ''شاہ زیب! تم صحرا کی جلتی ہوئی دھوپ ہو۔ وہ چاند گڑھی کے خوب صورت باغیچے میں کھلا ہوا خوش رنگ پھول ہے۔ تم کیوں اسے جھلسا کر راکھ کر دینا چاہتے ہو؟ وہ تمہارے لیے نہیں ہے، تم اس کے لیے نہیں ہو۔ تم اس سے محبت کرتے ہو لیکن اس کی سزا اسے کیوں دینا چاہتے ہو۔ تم نے اسے پیار کیا...... پھر ساڑھے تین سال تک اسے ڈھونڈا...... اسے پایا...... اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے ساتھ کچھ اچھے لمحات گزارے۔ اب...... اب اس کے سر پر بوسہ دو۔ اس کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر الوداع کہہ دو۔ اس پر سے اپنی کڑی دھوپ ہٹا لو۔ اسے ان پُربہار صبحوں کے حوالے کر دو جو شبنم کی نمی کے ساتھ ان دیہات کے کھیتوں کھلیانوں پر اترتی ہیں، تاجور اور ریشمی جیسے پھولوں کو زندگی سے معمور کرتی ہیں۔ اسے ان حسین شاموں کو

سونپ دو جو دیہی علاقوں کے کچے پکے گھروندوں کے اندر زندگی کے سادہ اور حسین ترین روپ کو پروان چڑھاتی ہیں۔ تم صرف ایک خطرناک کھیل کے کھلاڑی بھی ہوتے، تب بھی کوئی بات نہیں تھی، تم تو ایک مجرم ہو...... گینگسٹر ہو...... تمہارے جیسے کی پُراندیش صبحیں کہیں اور ہیں...... تمہارے مقدر کی خوں رنگ شامیں کہیں اور ہیں۔ کیوں بھول رہے ہو خود کو؟ کیوں فراموش کر رہے ہو اپنے انجام کو؟

میں کونے میں کمبل تانے لیٹا رہا۔ تاجور مجھ سے کافی فاصلے پر لیٹ گئی تھی۔ اس نے کمبل اوڑھ کر کروٹ بدل لی تھی۔ مجھے ملنگی ڈیرے کی وہ پُرخطر لیکن ترنگ آمیز رات یاد آگئی۔ جب ہم اسی طرح ایک کوٹھری میں لیٹے تھے۔ بہت قریب قریب۔ ایک دوجے کی سانسوں کو محسوس کرتے ہوئے اور پھر تاریکی میں گونجنے والی لیو پرڈ چیتے کی آواز نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنی تھی، سرگوشیاں کی تھیں مگر وہ سب کچھ اب نہیں تھا۔ اب ایک ہی بند کمرے میں ہونے کے باوجود فاصلہ تھا۔ سنگلاخ فرش کا ایک خالی ٹکڑا جس کی وسعت شاید ہزار ہا کلومیٹر سے زیادہ تھی۔

پتا نہیں کب مجھے اونگھ محسوس ہوئی۔ اسی غنودگی کی حالت میں مجھے لگا کہ میں ایک نکھری نکھری دیہاتی دوپہر میں گل عباسی کے پودوں کے پیچھے کھڑا ہوں۔ ایک کھیت میں تاجور کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر وہی خوش رنگ چمک ہے جو میں نے پہلے پہل دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند خوبرو نوجوان ہے۔ اس کے سر پر رنگین پگڑی ہے۔ اس نے تاجور کے کندھوں پر بازو رکھا ہوا ہے اور اسے دور تک لہلہاتی فصل دکھا رہا ہے۔ تاجور کی گود میں ایک ننھا سا گول مٹول بچہ ہے۔ چمکتی آنکھوں والا اتنا پیارا بچہ جسے دیکھ کر بے ساختہ چومنے کو دل چاہے، اور خدا کی قدرت پر یقین ہونے لگے۔ وہ ہمک رہا ہے اور ماں کا رنگین آنچل کھینچ رہا ہے۔ میں مطمئن نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے فائر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں گل عباسی کے پودوں سے نکل کر بھاگتا ہوں۔ کھیتوں میں دوڑتا ہوا ایک نہر کا پل پار کرتا ہوں۔ دوسری طرف جاتا ہوں تو منظر بدل جاتا ہے۔ کھیت کھلیان پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ کوپن ہیگن کی کسی گلی کا منظر ہے...... بلند عمارتیں، گاڑیوں کا شور، میرے پیچھے جان ڈیرک کے خونخوار کارندے لگے ہیں اور پولیس کاروں کا شور ہے۔ میں اندھا دھند بھاگ رہا ہوں۔ میرے پھیپھڑے جیسے پھٹ رہے ہیں۔ پھر گولیاں چلتی ہیں۔ میں اوندھے منہ تارکول کی سڑک پر گرتا ہوں......

اچانک میں اپنی غنودہ حالت سے باہر نکل آیا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ میں بھاری کمبل کے نیچے اسی طرح ساکت پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے حواس بحال ہوئے۔ میں نے کمبل کا ایک کونا اٹھا کر کن انکھیوں سے تاجور کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ لالٹین کی لو خود بخود مدھم ہوتی چلی جارہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو گیا تھا...... جب تیل ختم ہوتا ہے تو اسی طرح روشنی آہستہ آہستہ تاریکی میں بدل جاتی ہے...... میں نے گہری سانس لے کر کروٹ بدلی اور آنکھیں پھر بند کر لیں۔

☆☆☆

......اور یہ سجاول کے کمرے کا منظر تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم دوستانہ ماحول میں بیٹھے تھے۔ اسٹیل کی گول تپائی پر وہسکی کی بوتل کھلی ہوئی تھی اور کمرے میں سگریٹ کا دھواں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''منشی کی کیا خبر ہے سجاول؟''

''اچھی خبر ہے۔ اس خبیث کی عقل ٹھکانے پر آرہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آج شام تک وہ سب کچھ نکال دے گا جو اس کے پیٹ میں ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ مجھے بھی اس سے ملواؤ گے۔''

''چلو، ملوا بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔'' وہ میرے گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے بولا۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، لکڑی کی الماری کھولی اور ایک چھوٹی نال کی کلاشنکوف نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ تمہاری امانت ہے۔'' اس نے کہا۔

میں چونک گیا۔ یہ وہی کلاشنکوف تھی جس کے ساتھ میں ملنگی ڈیرے سے بھاگا تھا۔ بعدازاں جب یہاں ہمیں سجاول کے ساتھیوں نے گھیرا تو میں نے یہ کلاشنکوف استعمال کرنے کی کوشش کی۔ یہ چل نہیں سکی اور یوں میں اور تاجور پکڑے گئے۔ یہ کلاشنکوف بھی ہم سے چھین لی گئی تھی لیکن اب یہ پھر میرے سامنے پڑی تھی۔

سجاول اپنی تیکھی مونچھوں کو سہلا کر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''اب یہ بالکل ٹھیک ہے شاہی! چاہو تو ابھی چلا کر

دیکھ سکتے ہو۔“

میں نے کلاشنکوف کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی اچھی طرح صفائی کی گئی تھی اور تیل وغیرہ دیا گیا تھا۔ میگزین بھی بالکل ٹھیک جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے میری کلاشنکوف کا واپس مل جانا ایک بڑی اہم بات تھی۔ یہ اس امر کا واضح اور کھلا اشارہ تھا کہ سردار سجاول مجھ پر اعتماد کررہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میرے اور اپنے دوستانہ تعلق کو مزید آگے بڑھانا چاہ رہا ہے۔

کلاشنکوف کا وزن ہی بتا رہا تھا کہ وہ لوڈڈ ہے اور میں جب چاہے اسے استعمال کرسکتا ہوں۔ میں نے شکریے کے انداز میں سجاول کی طرف دیکھا اور رائفل اپنے پاس چارپائی پر رکھ لی۔

ہم نے اپنے اپنے گلاس خالی کیے تو سجاول اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو آؤ، اب تمہیں منشی صاحب سے ملواؤں۔“

ہم دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکلے۔ سجاول حسبِ معمول سیاہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ نائن ایم ایم کا پستول ہر وقت اس کی کمر سے بندھا رہتا تھا۔ اس کے ابرو کے زخم پر ابھی تک بینڈ ایج موجود تھی۔ شام اب گہری ہوچکی تھی۔ اس ”ڈکیت ڈیرے“ پر لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہوگئے تھے۔ حفاظتی چٹانوں پر بھی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ میرے کندھے پر کلاشنکوف دیکھ کر سجاول کے ساتھیوں کو حیرت ہوئی۔ کئی ایک مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

میری اور سجاول کی لڑائی میں لکڑی کا جو مستطیل کیبن تباہ ہوگیا تھا، اسے پھر سے کھڑا کیا جارہا تھا۔ وہاں چاروں طرف لکڑی کا بُرادہ اور تختے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ ہم زیرِتعمیر کیبن کے پاس سے گزرتے احاطے کے اس سرے پر پہنچ گئے جہاں چشمہ واقع تھا۔ ایک چٹان کے اندر واقع کھوہ کو کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہاں لوہے کا دروازہ تھا جس پر کالا روغن کیا گیا تھا۔ دروازے پر کسی نے سفید روغن کے ساتھ ہی بے ڈھنگے طریقے سے ”لڈو پیڑے“ لکھوا دیا تھا۔ یہ دراصل یہاں کا عقوبت خانہ تھا اور طنزیہ انداز میں اسے لڈو پیڑے کا نام دیا گیا تھا۔ مسلح گارڈ نے دروازہ کھولا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک ہی بڑا کمرا تھا جسے دو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پتھریلی چھت پر زنجیریں وغیرہ جھول رہی تھیں۔ ایک طرف لوہے کا زنگ آلود شکنجہ پڑا تھا۔ بید کی ایک موٹی چھڑی اور ایذا رسانی کی دیگر اشیا بھی نظر آرہی تھیں۔ منشی افضل سامنے ہی ننگے فرش پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ چاند گڑھی میں شاید ایک دوبار میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونکا۔ اس کے بالائی جسم پر تو سویٹر اور جیکٹ تھی مگر زیریں جسم بالکل عریاں تھا۔ اس کی فربہ ٹانگوں پر درجنوں جگہ ایک سفید سفید مرہم سا لگا ہوا تھا۔ جیسے پھنسیاں ہوں۔ لیکن یہ پھنسیاں نہیں تھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔

میرا خیال تھا کہ منشی کوئی دبلا پتلا کھچڑی داڑھی والا بندہ ہوگا لیکن یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ ہٹا کٹا تھا۔ سر کے زیادہ تر بال اُڑے ہوئے تھے۔ عمر پینتیس چالیس ہوگی۔ وہ شکل سے ہی سخت جان اور عیار نظر آتا تھا۔ اس کی ناک سوجی ہوئی تھی اور چہرے پر نیل تھے۔ ایک طرف فرش پر اس کی ٹوٹی ہوئی عینک بھی پڑی تھی۔

وہ کچھ دیر سجاول کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور برہنگی کی پروا کیے بغیر اس کے قدموں میں گر پڑا۔ ”مجھے معاف کردو سردار، مجھے اس بندے (فخرو) سے بچالو۔ میں نے سب کچھ بتادیا ہے۔ اب اس سے کہو، میری جان چھوڑ دے۔“

سردار نے بے پروائی سے پاؤں جھٹک کر اسے اپنے قدموں سے ہٹایا۔ اتنے میں چپٹی ناک والا فخرو بھی نمودار ہوگیا۔ اس نے دو کرسیاں لاکر کمرے میں رکھ دیں۔ ہم بیٹھ گئے۔ منشی افضل اسی طرح فرش پر بیٹھا رحم طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا۔ فخرو کو دیکھ کر اس کا رنگ مزید پیلا پڑ گیا تھا۔

سجاول نے جوتے سے اس کی عریاں ران پر ضرب لگائی اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری آکڑ شاکڑ ختم ہوئی یا ابھی مزید خدمت کی لوڑ ہے؟“

”میری کوئی آکڑ نہیں سردار، میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں۔ مجھے ان کے پاس واپس جانے دو۔ میں بیوی بچوں کو لے کر کسی طرف منہ کر جاؤں گا۔ کبھی کسی کو دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔“

”کیوں شکل نہیں دکھاؤ گے؟“

”جو کچھ میں بتا چکا ہوں، اس کے بعد میرے لیے چاند گڑھی میں رہنا تو ناممکن ہوجائے گا۔ چودھری عالمگیر ٹریکٹر کے نیچے دے کر قیمہ کروادے گا میرا۔“

”میں نے کہا ہے ناکہ تیرا نام کسی کام میں نہیں آئے گا۔“ سجاول بولا۔ ”اس لیے جو جو کچھ بتانا ہے، کھل کر بتا دے۔“

اس نے ایک بار پھر سجاول کے پاؤں پکڑ لیے۔ ”مجھے جو کچھ پتا ہے میں نے بتادیا ہے سردار، اب تو یہی ہو

سکتا ہے کہ میں فخرو صاحب سے جان بچانے کے لیے جھوٹ بولتا رہوں اور جو جو کچھ وہ کہتے رہیں، قبولتا رہوں۔''

منشی کو اپنی برہنگی کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اس ''شرمندگی'' نے جیسے اس کے لیے اپنے معنی کھو دیے تھے۔ اس کی شلوار پاس ہی ایک کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے ''چیں چیں'' کی باریک آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک کونے میں ایک پنجرے کے اندر آٹھ دس تگڑے چوہے بند تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ منشی کا منہ کھلوانے کے لیے اس کی شلوار میں چوہے چھوڑے گئے تھے۔ اس کی ٹانگوں پر جو چھوٹے چھوٹے زخم تھے وہ یقیناً چوہوں کے کاٹنے سے ہی آئے تھے۔ اب ان پر مرہم یا چونا وغیرہ لگا کر انہیں کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

سجاول نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، جو کچھ اب تک بتایا ہے اسے ایک دفعہ دہراؤ...... ذرا تفصیل کے ساتھ۔''

منشی افضل نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں اور فخرو کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ کسی ٹیپ ریکارڈر ہی کی طرح فرفر بولنے لگا۔ یہ وہی باتیں تھیں جو اس سے پہلے مجھے سجاول بتا چکا تھا لیکن دو تین نئی باتیں بھی تھیں۔ منشی نے کہا کہ اسے ماسٹر ریاض کے پنڈ کے بارے میں کچھ پتا نہیں اور نہ ہی اس نے کبھی اس بندے کو چاند گڑھی میں دیکھا ہے۔ بس اس کا اندازہ ہے کہ وہ ضلع راجن پور کے کسی دور دراز پنڈ میں رہتا ہے۔ وہاں ٹیلی فون یا موبائل وغیرہ کی سہولت نہیں ہے۔ جس طرح عالمگیر زینب کو کسی کام کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ماسٹر ریاض بھی دو لڑکیوں کو تیار کر رہا ہے۔ یہ لڑکیاں بھی کنواری ہیں اور مذہبی گھرانے سے ہیں۔ ان لڑکیوں کو بہت مہنگی قیمت پر کسی بڑے صاحب کے پاس بھیجا جاتا ہے۔

فخرو نے کڑک کر کہا۔ ''تم نے لورو کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ بھی سردار کو بتاؤ۔''

منشی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''لورو نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''لیکن خط میں تو لکھا ہوا ہے اور ہم اسے ڈھونڈنے کے لیے خجل ہوتے رہے ہیں۔''

منشی نے کہا۔ ''وہ سارا خط الٹے حرفوں میں لکھا گیا تھا، مگر اس جگہ کا نام چودھری عالمگیر نے سیدھے حرفوں میں ہی لکھوایا تھا۔ خط میں اس جگہ کو ''ورول'' لکھا گیا تھا اور یہ ورول ہی ہے۔''

سجاول نے ایک جھانپڑ منشی کے گنجے سر پر لگایا۔ ''کم بختا! دو دن پہلے بتا دیتا تو ہمیں اس طرح لور لور نہ پھرنا پڑتا۔''

منشی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سجاول نے فخرو سے پوچھا۔ ''ہے کوئی ورول نامی جگہ تمہارے ذہن میں؟''

''نہیں سردار، پر...... نام کچھ سنا سنا سا بھی لگتا ہے۔''

''کہاں ہے یہ تمہاری ماں کا سسرال؟'' سجاول نے ایک اور جھانپڑ منشی کی چندیا پر لگا کر پوچھا۔

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں سردار! مجھے کچھ پتا نہیں۔ چودھری عالمگیر جیسے لکھواتا تھا، میں لکھ دیتا تھا......''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ عالمگیر کے چمچوں چانٹوں میں سے کس کو پتا ہوگا اس جگہ کا؟'' سجاول نے پوچھا۔

''یہ سارا معاملہ چودھری عالمگیر بہت بھید میں رکھتا ہے۔ شاید والی بات ہے کہ اسحاق اس بارے میں جانتا ہو۔''

''اور پیر ولایت؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، پیر ولایت کو تو ضرور پتا ہوگا۔'' منشی نے جیسے چونک کر کہا۔

سجاول نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں منشی کی طرف پھینکا پھر فخرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پہلے اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں۔ نہ ہوا تو پھر اس ساتے یا پیر ولایت کو بھی یہاں لا کر لوہے پیڑے کھلانے پڑیں گے۔''

فخرو بولا۔ ''اب صحیح نام کا پتا چل گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ جگہ کا کھوج بھی لگ جائے گا۔''

سجاول نے منشی سے کچھ مزید سوال جواب کیے، پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے یہاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ میں چاند گڑھی کے حالات کے بارے میں منشی سے ایک دو سوال کروں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''پنڈ کے حالات اب کیا ہیں...... ریشمی کس حال میں ہے؟''

''ریشمی بالکل خیریت سے ہے۔ بہت سے لوگ کھلم کھلا پیر ولایت اور عالمگیر کے مخالف ہو گئے ہیں۔ انہوں نے پکا ارادہ کیا ہے کہ وہ ریشمی اور ان دولڑکوں پر کوئی حرف نہیں آنے دیں گے جو منگی ڈیرے سے بچ کر آئے ہیں۔''

دولڑکوں سے منشی افضل کی مراد یقیناً انیق اور رضوان ہی تھے۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ریشمی خیریت سے ہے اور اپنوں کے پاس ہے۔ بوڑھے گول کیپر کی آخری لڑائی

رائگاں نہیں گئی تھی۔

میں نے منشی سے پوچھا۔ ''تاجور کے گھر والوں کے کیا حالات ہیں؟''

وہ دو سیکنڈ کے لیے چپ رہا پھر بولا۔ ''وہ...... پنڈ چھوڑ گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے...... یہاں آنے سے ایک دن پہلے وہ راتوں رات کہیں نکل گئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ ایک رات پہلے ہی انہوں نے اپنا ضروری سامان اپنی ٹریکٹر ٹرالی پر کہیں بھیج دیا تھا۔ اب ان کے خالی گھر کو تالے لگے ہوئے ہیں۔''

یہ ایک اہم اطلاع تھی۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ چودھری دین محمد اور ان کے گھر والے یہ صورتِ حال برداشت نہیں کر سکیں گے اور شاید ایک طرح سے انہوں نے اچھا ہی کیا تھا۔ عالمگیر جیل سے باہر آچکا تھا۔ مقامی پولیس کے ساتھ اس کا ایکا گٹھ جوڑ تھا۔ وہ کسی بھی وقت تاجور کے اہلِ خانہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا...... ان کا عرصۂ حیات مزید تنگ کر سکتا تھا۔

منشی نے یہ بھی بتایا کہ پیر ولایت اپنے باپ پیر ساحتا کو گاؤں کے اندر مسجد کے عقب میں دفنانا چاہتا تھا مگر بہت سے لوگوں نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ اب اسے گاؤں سے باہر عام قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔

ہم نے قریباً ایک گھنٹا منشی افضل سے پوچھ گچھ کی۔ ہم واپس آنے لگے تو وہ ایک بار پھر منت سماجت پر اتر آیا۔ اس بار اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور فریاد کرنے لگا۔ ''میری سفارش کر دو شاہ صاحب! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

سجاول نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''یہ بھی بتاؤ نا کہ اس میں ایک بچہ تمہارا ہے، دو بچے اس غریب مزدور کے ہیں جس سے تو نے زبردستی اس کی زنانی چھینی تھی۔ چھینی تھی یا نہیں؟''

''وہ...... وہ بات اب پرانی ہوگئی ہے سردار، اب وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ رہتی ہے۔''

''ایسی ہی ''مرضی'' کے ساتھ تم بھی تو یہاں رہ رہے ہو۔'' سجاول نے طنزیہ لہجے میں کہا اور مجھے لے کر باہر نکل آیا۔

منشی کی آنکھوں میں کچھ ایسی فریاد تھی کہ مجھے اس پر تھوڑا سا ترس آگیا۔ میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''اس کی جان تو بچ جائے گی؟''

''جان بچا کر کیا کرنا ہے اس نے؟ بہت کچھ کھا پی لیا ہے۔ دیکھا نہیں کتنی چربی چڑھی ہوئی ہے کمینے پر۔''

''چلو پھر بھی، کچھ تعاون تو کیا ہے اس نے۔ اسے یہیں کہیں بند کر کے چھوڑ دو...... سالوں سال بھی بند رہے گا تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

''ہاں...... کیا تو جا سکتا ہے ایسا...... چلو بعد میں دیکھیں گے۔''

سجاول سے رخصت ہو کر میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ نیچے تاجور کے پاس تہ خانے میں جانے کے لیے دس بجے کا وقت مقرر تھا۔ سجاول نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں ماؤ کی عیادت کر آؤں۔ پالکی سے اترتے ہوئے اس کے پاؤں میں موچ آئی تھی۔ میں نے کلاشنکوف سنبھال کر الماری میں رکھی اور ماؤ کی طرف چل دیا۔ دل میں تمنا کر رہا تھا کہ آفت کی پرکالہ سے ملاقات نہ ہونے پائے۔ میرا دل تاجور کے معاملے میں بہت بجھا ہوا تھا۔ دل پر جبر کر کے بھی مانی کی خرمستیوں کو جھیلنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

میں اندرونی حصے میں پہنچا تو ماؤ فوراً ہی نظر آگئی۔ وہ صحن نما جگہ پر پہلوان حشمت کے سہارے چہل قدمی کر رہی تھی۔ پہلوان خود بھی اچھے قد کاٹھ کا تھا لیکن حجم اور وزن کے معاملے میں ماؤ اس سے بھی آگے تھی۔ اس نے پہلوان کے کندھوں پر اپنے بھاری بھرکم بازو کا پورا بوجھ ڈالا ہوا تھا اور چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلوان کا چہرہ زور لگنے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ قریب ہی چست لباس والی مانی بھی موجود تھی۔

مجھے دیکھتے ہی ماؤ نے دونوں بازو پھیلائے اور گرتے گرتے بچی۔ اس نے حسبِ معمول مجھے اپنے جن جپھے میں لے لیا اور منہ سر چومنے لگی۔ ''تو کہاں تھا میرے بچڑے، میرا پتا ہی نہیں لیا تو نے۔ میں تو ماکھی کو بھیجنے والی تھی تیری طرف۔''

پہلوان حشمت نے کرسی گھسیٹ لی۔ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ پہلوان نے جیسے شکر کی سانس لی۔

میں نے مانی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ چار پانچ دن پہلے یہاں میرے اور سجاول کے درمیان ہونے والے تہلکہ خیز مقابلے کا پتا مانی کو چل چکا ہے۔ وہ اب شدید ناراضگی دکھا رہی تھی۔ پاؤں پٹختی اور کولہے مٹکاتی

ہوئی کمرے کی طرف چلی گئی۔

ماؤ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور بولی۔ ''دیکھو، اب تم سے شرمانا شروع ہوگئی ہے۔''

میں نے ماؤ کا حال احوال پوچھا۔ اس کے دو چار دکھڑے سنے۔ ماؤ کا کہنا تھا کہ اس کی زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں۔ پوتی کی صورت میں اس کے پاس جو نادر روزگار نمونہ تھا، وہ جلد از جلد میری جھولی میں ڈال دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''پرسوں پیرو سائیں سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ انہوں نے کھل کھلا کر بات کی ہے۔ ان کو پورا یقین ہے کہ وہ کمینی اب زندہ نہیں ہے۔''

''کون؟''

''وہی تیری غنڈی بیوی، جس نے منہ کالا کیا تھا کسی کے ساتھ۔ سائیں نے کہا ہے کہ اب تیرے اور مانی کے ویاہ میں کوئی رکاوٹ شکاوٹ نہیں ہے۔ ستارے بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ اب مانی اور شاہ زیب جب چاہیں اک دوجے کے جیون ساتھی بن سکتے ہیں اور میں نے فوراً کہا...... پیر جی تہاڈے منہ میں گھی شکر......''

''اور ماؤ جی! تمہارے منہ میں بھینس کا گوبر۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ (ظاہر ہے زبان سے کہتا تو ماؤ نے بم کی طرح پھٹ جانا تھا)

پہلوان ہانپتے ہوئے بیل کی طرح ایک طرف بیٹھا تھا۔ اب اس کی سانسیں کچھ بحال ہو چکی تھیں۔ میں نے موقع مناسب دیکھ کر کہا۔ ''ماؤ جی! وہ کڑی جاناں کدھر ہے۔ سنا تھا بخار وغیرہ ہورہا ہے اس کو۔''

''مجھے تو عشق کا بخار لگتا ہے۔ کوئی چکر شکر ہے اس کڑی کا۔ ناچنے گانے والی ہے۔ کسی امیرزادے سے اکھ منکا کرلیا ہوگا...... ویسے اب ٹھیک ہے۔ وہ سامنے کمرے میں ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''ماؤ! آپ کو کیسے پتا ہے کہ وہ کسی کے چکر میں ہے؟''

''مانی نے بتایا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ بخار کی بے ہوشی میں بھی اس کا نام لیتی رہی ہے۔ پتا نہیں کیا نام بتا رہی تھی۔ وہ...... ہاں...... یاسر... اللہ جانے یہ کون ٹٹ پیناں ہے۔ ویلے ٹائم میں بیٹھ کر بس شعر پڑھتی رہتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کی ماتھے کی چوٹ کا اب کیا حال ہے؟''

''زیادہ چوٹ نہیں تھی۔ بس مکر شکر کر رہی تھی۔ اب ٹھیک ہے۔''

''میں ایک منٹ اسے دیکھ لوں؟''

''دیکھ لو۔'' ماؤ نے بادلِ ناخواستہ کہا۔

میں نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے جاناں نے پوچھا۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا وہ کھل گیا۔ اندر جاناں پلنگ پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا زخم اب مندمل ہورہا تھا۔ زیادہ چوٹ سر پر ہی آئی تھی۔ تقریباً ایک انچ کا نشان ماتھے پر بھی تھا۔

اس کے سرہانے رکھے ٹرانزسسٹر ریڈیو پر عابدہ پروین کی گائی ہوئی غزل گونج رہی تھی۔ جب سے تم نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے، سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔

اس نے ریڈیو بند کیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''بس تمہارا حال پوچھنے چلا آیا تھا۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ احاطے کی طرف نہ جاؤ اور زیادہ وقت مانی کے ساتھ گزارو۔ وڈا سردار تمہارے لیے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتا ہے۔''

''بس غلطی ہوگئی مجھ سے۔ اب احتیاط کروں گی۔'' وہ احسان مندی کے لہجے میں بولی۔

وہ جانتی تھی کہ میری ہی وجہ سے اس کی اور مانی کی دوستی ہوئی ہے اور یوں اس کے لیے سردار اعظم سے بچے رہنے کا موقع پیدا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس نے اس بات پر بھی میرا شکریہ ادا کیا۔

اسی دوران میں ماؤ نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ یقیناً میرا جاناں سے باتیں کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جاناں کو تسلی دے کر میں ماؤ کے پاس واپس پہنچا تو وہ پہلوان حشمت سے اپنے پاؤں کی مالش کروا رہی تھی۔ معنی خیز لہجے میں مجھ سے کہنے لگی۔ ''جا اندر جا کر حال چال پوچھ لے اپنی ''ہونے والی'' کا بھی...... شرم حیا والی ہے۔ منہ سے نہیں کہندی پر تیرا انتظار کرتی رہتی ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''ماؤ جی! اس وقت تو مجھے سردار سجاول نے بلایا ہے۔ دیر ہوگئی تو ناراض ہوں گے۔ کل کسی وقت آؤں گا۔''

ماؤ سے بمشکل جان چھڑا کر میں اس زنانے حصے سے باہر نکل آیا۔ ''شرم حیا والی'' کے الفاظ کانوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ رات بھی کل رات کی طرح عجب بے قراری کے عالم میں گزری۔ میں تہ خانے میں تاجور کے پاس رہا لیکن پاس رہ کر بھی بہت دور۔ وہ ایک کونے میں کمبل اوڑھ کر سمٹی رہی۔ میں دوسرے کونے میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ آنسو جیسے براہِ راست میرے دل پر گرتے تھے۔ میری سمجھ میں یہ بات آنا شروع ہوگئی تھی کہ تاجور میری وجہ سے کانٹوں پر گھسیٹی جارہی ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ رہا تو اس کا یہ لہولہو سفر جاری رہے گا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت سجاول نے مجھے ساتھ لیا اور چہل قدمی کرتا ہوا احاطے سے باہر لے گیا۔ پچھلے چند ہفتوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس احاطے اور مچانوں کے حصار سے باہر نکلا تھا۔ ایک طرح کی آزادی کا احساس ہوا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی اور درختوں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ پرندے چہچہا رہے تھے مگر میرے دل کا موسم کچھ اور تھا۔

پتھریلی ڈھلوانوں پر دور دور تک جنگل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک آب جو کے کنارے تھوڑی سی دھوپ میں بیٹھ گئے۔ میں نے کلاشنکوف کندھے سے اتار کر گود میں رکھ لی۔ سجاول نے سگریٹ سلگانے کے بعد مجھے بھی پیشکش کی۔ مجھے سگریٹ کی طلب نہیں ہوتی تھی، مگر میں نے اس کی آفر رد نہیں کی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! اس علاقے میں عام لوگ نہیں آتے؟''

''دو چار سال پہلے اِکا دُکا آجاتے تھے، مگر اب نہیں آتے۔ وہ اسے خطرناک علاقہ سمجھتے ہیں۔ ایک دو لاشیں ملنے کے بعد مشہور ہوگیا کہ یہاں جن بھوت ہیں...... ہمیں بھی یہ بات اچھی لگی۔ ہم نے یہاں دو چار مزید ایسی کارروائیاں کیں جن سے لوگوں کا ڈر پکا ہوگیا۔ اب کوئی بھولا بھٹکا آجاتا ہو تو علیحدہ بات ہے، ورنہ ارادہ کر کے کوئی نہیں آتا۔'' سجاول کی تیکھی مونچھوں کے نیچے عیارانہ مسکراہٹ تھی۔

''پولیس بھی جن بھوتوں سے ڈرتی ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... وہ ہم سے ڈرتی ہے۔'' سجاول نے بھی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے، جنگل میں پرندوں کی آوازوں اور بہتے پانی کی ''کل کل'' کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ آخر سجاول نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ اس ''بڑے صاحب'' والے معاملے میں تم میرے ساتھ چلنا چاہو گے؟''

''تمہیں پتا ہے میں عالمگیر سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ نفرت نکالنے کا جو موقع بھی ملے گا، میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہوں گا اور پھر اس کام میں کافی سارا روپیا بھی نظر آرہا ہے...... لیکن ساتھ چلنے کے لیے دل بالکل صاف ہونے چاہئیں سجاول...... اس لیے میری ایک شرط ہے۔''

''بتاؤ۔''

''تم تاجور کو چھوڑ دو۔ میں اسے جہاں چاہوں بھیج دوں، تم یا تمہارا کوئی بندہ اس کی زندگی میں کوئی دخل نہ دے۔''

''بس یا کچھ اور......؟'' وہ مسکرایا۔

''پہلوان حشمت اور اس کے ساتھ پکڑی جانے والی لڑکی کو بھی آزاد کردو۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ ڈانسر جاناں؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے...... یہ بھی ہوگیا۔'' اس نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ایک چھوٹی سی ڈیمانڈ اور ہے۔ چاند گڑھی میں میرا ایک ساتھی انیق ہے۔ میں اسے یہاں اپنے پاس بلانا چاہتا ہوں، وہ بہت کام کا بندہ ہے۔''

سجاول اس مطالبے پر یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''اگر وہ بندہ تمہارے بھروسے کا ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اس کے یہاں آنے سے فائدہ ہوگا، تو لے آؤ۔''

''بس...... تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے کلاشنکوف کو سہلایا۔

وہ توقف کر کے بولا۔ ''لیکن تاجور کو کہاں بھیجو گے تم؟ کل تم نے سن ہی لیا ہے جو منشی افضل کہہ رہا تھا۔ اس کے گھر والے چاند گڑھی چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ آس پاس کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے اس کا اور اگر ہوتا بھی تو کیا وہ عالمگیر وغیرہ کے ہوتے وہاں بچ کر رہ سکتی ہے؟''

''یہ تمہارے سوچنے کی نہیں، میرے سوچنے کی باتیں ہیں۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتا رہا پھر کش لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے شاہی، لیکن ایک بات دھیان میں رکھ لینا، یہ زنانیاں کبھی کبھی بڑی مشکل میں ڈال دیتی ہیں مرد ذات کو۔''

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ عشق مشوقی والے کام مجھے چنگے نہیں لگتے۔ میں تو کہتا ہوں اسے اپنے پاس رکھو۔ موج میلہ کرتے رہو۔ یہ اس تہ خانے میں ہر ایک کی نظر سے بچی رہے گی۔ اور......"

"دیکھو سجاول! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "میں اس بارے میں تم سے کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔"

میرے ماتھے پر بل دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "نہیں، میں تو بس ایک مشورہ دے رہا تھا۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔" چند سیکنڈ تک ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی تب وہ اس بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے صرف اتنی پریشانی ہے کہ تاجور نے یہاں تک کا رستہ دیکھا ہوا ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ بعد میں کسی مشکل کا سبب بن جائے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر جو بھی باہر سے آتا ہے، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے مگر تاجور نے یہ رستہ کافی حد تک دیکھ لیا ہے......"

"میں...... اس کی ...... پوری پوری ذمے داری لیتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

میرے تاثرات دیکھ کر سجاول جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ "بس ٹھیک ہے شاہی، اب یہ سب کچھ طے ہو گیا ہے۔"

وہ ایک معاملہ فہم شخص تھا اور تاثرات دیکھ کر بندے کے ذہن کو فوراً پڑھ لیتا تھا۔

ہم ایک مچان کے نیچے سے گزرتے ہوئے واپس احاطے میں آ گئے۔ سجاول اس ہال کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اس کے چھرے باز اور فائٹر "بارا ماری" کی مشق کرتے تھے۔ میں پہلوان حشمت کو دیکھنے کے لیے اس کی کوٹھری کی طرف آ گیا۔ پہلوان سے ملنا اور اس کی باتیں سننا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ لیکن آج تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی سینے کو اندر سے نوچ رہا ہو۔

پہلوان کے پاس پہنچا تو وہ کوٹھری کے فرش پر اوندھا لیٹا تھا، اور اپنا ایک بازو موڑ کر اپنے ہی ہاتھ سے اپنی کمر کی مالش کر رہا تھا۔

"کیا ہوا پہلوان جی؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "بھیا، یہ پوچھو کیا نا ہیں ہوا۔"

"چلو بتا دو۔ کیا نا ہیں ہوا؟"

وہ میرے کندھے پر کلاشنکوف دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ اصلی ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ سردار سجاول سے تمہارے حالات اچھے جا رہے ہیں۔"

"ہاں، کچھ کچھ۔" میں اس کے قریب چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

پہلوان نے ہاتھ بڑھا کر مجھے تکیہ پیش کرنا چاہا تو منہ سے بے ساختہ "ہائے اللہ" نکل گیا۔ اس نے بایاں ہاتھ کمر پر رکھ لیا تھا۔

"کوئی چوٹ لگ گئی ہے پہلوان جی؟"

"چوٹ ہی سمجھ لو۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس موقع کے لیے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

ان کو سہارا دیتے تھے، بھاگے پھرتے تھے
یارو، تب بس ہم تھے اور ہماری دوڑ تھی
پر اس وقت وہ کہیں نظر نہ آئے ہم کو
جب مشکل وقت میں ہم کو ان کی بڑی لوڑ تھی۔"

ظاہر ہے کہ یہ پہلوان کا اپنا ہی شعر تھا، کیونکہ اس میں حسبِ معمول ایک جگہ پنجابی ٹھوکی گئی تھی۔

"کسے سہارا دیا آپ نے؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ سرگوشی میں بولا۔ "اسی موئی ہتھنی کو، جسے یہاں سردار کی ماؤ کہا جاوت ہے۔ میری ہی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے اس کو مشورہ دے دیا کہ وہ کسی کا سہارا لے کر چند قدم چل لیا کرے، اس سے موچ جلد ٹھیک ہو جاوے گی۔ اس ظالم نے میرا ہی سہارا لے کر چلنا شروع کر دیا۔ چار دن سے صبح شام اس ہتھنی کو چہل قدمی کروا رہا ہوں۔ کمر کا کباڑا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگت ہے کہ اس چہل قدمی...... سے میرے "چہلم" کی راہ ہموار ہو جاوے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔ پہلوان جی ابھی تو آپ نے بہت کچھ دیکھنا ہے دنیا میں۔"

"مجھے تو لگت ہے بھیا، ہر چیز سے دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے۔ بچے بہت زیادہ یاد آوت ہیں۔"

چند دن پہلے یہ راز کھلا تھا کہ پہلوان حشمت کے چار بچے ہیں۔ بیوی بیمار رہتی ہے اور بچوں کی دادی ہی زیادہ تر بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

میں نے پہلوان سے کہا۔ "آپ بچوں کو یاد کرتے ہیں تو وہ بھی آپ کو یاد کرتے ہوں گے اور کہتے ہیں کہ بچوں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے

یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل بن جائے۔"

پہلوان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "کک...... کیا...... کوئی بات ہوئی ہے سردار سے؟"

"نہیں، ہوئی تو نہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ ہو جائے...... اور میں آپ کو کوئی اچھی خبر سنا سکوں۔"

پہلوان کے چہرے پر چمک نمودار ہوگئی۔ اس نے مجھے کریدنے کی کوشش کی مگر میں وقت سے پہلے اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ پچھلے دنوں پہلوان کے کانوں تک بھی یہ خبریں پہنچی تھیں کہ تاجور یہاں سے بھاگ گئی ہے اور وہ ازحد پریشان بھی رہا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ یہیں پر میرے ساتھ ہے اور خیریت سے ہے تو اسے تسلی ہوئی۔

وہ رات بڑی دل گرفتہ کر دینے والی تھی۔ تہ خانے کی کوٹھری میں میرے اور تاجور کے درمیان اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ یخ بستہ کوٹھری میں، میں اور تاجور شانوں تک کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ لالٹین کی زرد روشنی میں ہمارے سائے دیوار پر لرزتے تھے۔ دو دن سے تاجور کو یہاں انگیٹھی بھی فراہم کی جا رہی تھی مگر اس وقت انگیٹھی قریباً بجھ چکی تھی۔ اختری بھی اوپر جا چکی تھی ورنہ اسے انگیٹھی دہکانے کی زحمت دی جا سکتی تھی۔ جب سے میرے کندھے پر کلاشنکوف آئی تھی یہاں میری حیثیت واضح ہو گئی تھی۔ اختری سمیت دیگر ملازم بے چون و چرا میری ہدایت پر عمل کرنے لگے تھے۔

میں نے تاجور کو بتا دیا تھا کہ میں اسے یہاں سے نکلوا سکتا ہوں اور وہ واپس اپنے والدین کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے گھر والے اب چاند گڑھی میں نہیں ہیں۔ تازہ اطلاع یہ ہے کہ وہ خاموشی سے گاؤں چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔ اپنا سامان بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ والدین کے چاند گڑھی سے جانے کا سن کر تاجور کی پریشانی میں اضافہ ہو جائے گا مگر یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا۔ اسے دھچکا تو لگا مگر شدید نہیں۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تاجور! اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم کہاں اور کس کے پاس جانا چاہو گی؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "میرا خیال ہے کہ میں جانتی ہوں۔ ابا جی کہاں گئے ہوں گے۔"

"کہاں گئے ہوں گے؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "جب گاؤں میں ہمیں عالمگیر اور پیر ولایت نے زیادہ تنگ کر دیا تھا تو ابا جی اور امی جی اکثر پروگرام بناتے تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خاموشی سے کہیں چلے جائیں۔ وہ جہاں کا پروگرام بنایا کرتے تھے، مجھے پتا ہے۔"

"کون سی جگہ تھی؟"

وہ توقف سے بولی۔ "وہ میں تب بتاؤں گی...... جب آپ مجھے خود چھوڑنے جائیں گے۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس خاص جگہ کے بارے میں کسی دوسرے کو معلوم ہو۔

میں نے کہا۔ "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہیں کسی اور کے ساتھ یہاں سے بھیج دوں گا؟"

"اس لیے کہ آپ نے ابھی تک یہاں سے اپنے جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"سمجھو کہ میری کوئی مجبوری ہے۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکتا لیکن میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گا اور تمہارا ہاتھ دین محمد صاحب کے ہاتھ میں پکڑا کر واپس آؤں گا۔"

"کیا مجبوری ہے؟" اس نے اپنی اشک بار آنکھیں میری طرف اٹھا کر پوچھا۔

"بس کوئی ذاتی وجہ ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مزید کچھ پوچھے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے اوڑھنی کو اس طرح سرکایا کہ ایک چھوٹا گھونگھٹ سا بن گیا۔ اب میری نگاہ براہ راست اس کے چہرے پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہاں...... یہ مشرقی عورت کا وہی گھونگھٹ ہے جس میں وہ ہزار ہا طوفان اور ان گنت بھید چھپا لیتی ہے۔

میں نے دھیرے سے کہا۔ "تم تیار رہو۔ ہم کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"کیا...... کوئی برقع وغیرہ مل جائے گا؟" اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر نہ ہوا تو کچھ اور انتظام کرلیں گے۔"

اس نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ میں نے بھی کچھ اور نہیں کہا۔ کچھ دیر بوجھل خاموشی طاری رہی پھر میں اٹھ کر اپنے کونے میں آ گیا، اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

ہاں وہ رات بڑی دل گرفتہ کر دینے والی تھی۔ جو کچھ

ہو رہا تھا اس کی زیادہ ذمے داری مجھ پر ہی تھی۔ مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ میں کون ہوں، میں نے گاؤں کی اس شبنم جیسی پاک الھڑ دوشیزہ کو دل دیا تھا اور اسے پانے کی خواہش اپنے اندر پالی تھی۔ یہ سراسر غلط تھا اور یہ غلطی جلد یا بدیر پوری شدت سے سامنے آنی ہی تھی۔

جدائی سے پہلے کی راتیں بڑی بوجھل ہوتی ہیں۔ ایک پہاڑ جیسے بوجھ کے ساتھ دل و دماغ کو کچلتی چلی جاتی ہیں۔ لب سل جاتے ہیں اور الفاظ، دل و دماغ سے اپنا دامن چھڑا لیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ پتا نہیں کیوں ایک بار تاجور کو چھونے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن کس حوالے سے چھوتا۔ مجھے وہ منظر بھولا نہیں تھا جب میری سانسوں میں شراب کی بو محسوس کر کے اس نے میرا ہاتھ اپنے جسم سے ایک دم پیچھے ہٹایا تھا اور سمٹ گئی تھی۔

وقت جیسا بھی ہو، گزر جاتا ہے۔ یہ رات بھی گزر گئی۔ میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ شراب میری کمزوری نہیں تھی مگر اس وقت کیفیت کچھ ایسی تھی کہ پینے کو دل چاہ رہا تھا۔ ہتھیار بند اختری تہ خانے میں آ گئی تو میں اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے بوتل کا منہ کھولا اور پینے لگا مگر عجب بات تھی ہر گھونٹ گلے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ میرے گلے میں کوئی مرمریں ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کی وجہ سے الکحل کا گھونٹ آگے جانے سے رک جاتا ہے۔

میں زبردستی چڑھاتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ مرمریں ہاتھ الکحل میں تحلیل ہو گیا۔ کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ میں نے جیسے خود کو مخاطب کرتے ہوئے یقین دلایا۔ ''تم اس کے لیے نہیں ہو شاہ زیب! تم ظلمت کدے کے باسی ہو...... وہ نور نگر کی روشنی ہے۔ اپنا سایہ اس پر ڈالو گے تو یہ روشنی بے موت مر جائے گی۔ تھوڑے دن تکلیف ضرور ہو گی لیکن پھر دھیرے دھیرے قرار آ جائے گا۔ کوئی نہ کوئی اور تمہیں ضرور ایسا مل جائے گا، جو سنبھلنے میں اور نارمل ہونے میں تمہاری مدد کرے گا۔''

ایک سایہ سا آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس سائے نے کہا۔ ''اسے حاصل کر لو...... اسے اپنے پاس رکھ لو۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی بھی رکاوٹ نہیں ہے......''

لیکن اس سائے کی اور اس کی آواز کی عمر چند سیکنڈ سے زائد نہیں تھی پھر میرے اندر کی توانائی نے اس کو اوجھل کر دیا اور اس کی آواز کو بھی۔

☆☆☆

پہلوان کی آنکھوں میں حیرت کا دریا بہہ گیا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہاں سے رہائی مل رہی ہے۔ کچھ یہی حال جاناں کا بھی ہوا۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ دبلا جسم لرزنے لگا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''ہم آج رات دو بجے یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔''

میں نے اسے سیاہ برقع دیا اور ایک شولڈر بیگ بھی فراہم کیا۔ ایسا ہی ایک برقع تاجور کے لیے بھی مہیا ہو چکا تھا۔ سجاول نے مجھے ایک کولٹ پسٹل اور اس کے پچاس فالتو راؤنڈ بھی فراہم کر دیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سیل فون بھی دیا تھا۔ مجھے سیل فون کا مل جانا ایک نہایت اہم واقعہ تھا۔ فون چالو حالت میں تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں یہاں سے گھوڑوں پر روانہ ہونا تھا۔ تاجور اور جاناں کے لیے پالکی تھی۔ قریباً چھ کلومیٹر آگے پختہ سڑک کے قریب ایک اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ ہمیں اس پر کوٹلی اور پھر سیالکوٹ کے لیے سفر کرنا تھا۔ میرے اصرار پر تاجور نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کی منزل لالہ موسیٰ سے جنوب مشرق کی طرف ایک سیکڑا نامی چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اسے نوے فیصد یقین تھا کہ اس کے والدین اور دونوں چھوٹے بھائی وہیں ہوں گے۔ روانگی کا یہ سارا انتظام اور ضروری اشیا کی فراہمی سجاول نے ہی کی تھی۔

پروگرام کے مطابق رات کے دو بجے، جب اس ڈیرے کے بیشتر افراد سو رہے تھے، ہم حرکت میں آ گئے۔ فیض محمد، فخرو اور باقرے کے علاوہ بس دو چار بندوں کو ہی معلوم تھا کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ برقع پوش خواتین کے بارے میں ان کو بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کون ہیں۔ مقررہ وقت پر میں برقع میں لپٹی ہوئی تاجور کو تہ خانے سے باہر لے کر آیا۔ پالکی بالکل پاس ہی موجود تھی۔ میں نے تاجور کو اس میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد جاناں بھی ایک ملازمہ کے ساتھ آ گئی۔ سجاول نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے جاناں اور تاجور کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پہلوان حشمت کو پہلے ہی ایک گھوڑے پر سوار کر کے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جا چکی تھی۔ وہ سخت مضطرب نظر آتا تھا کیونکہ میں اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فی الحال اسے اپنی کمر کی تکلیف بالکل بھولی ہوئی تھی۔

میں نے اپنا حلیہ تھوڑا بہت تبدیل کر لیا تھا۔ مانگ بیچ میں سے نکال لی تھی۔ یہاں پر قیام کے دوران میں، میں

نے شیو نہیں کی تھی۔ (سوائے ایک دفعہ کے جب مانی نے میری گردن پر استرا رکھ دیا تھا) اب میرے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی اور مونچھیں نظر آرہی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ بادی النظر میں مجھے پہچانا نہیں جاسکتا۔

وقتِ رخصت سجاول نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''اعتبار کررہا ہوں...... اور تم سے بھی اعتبار مانگتا ہوں۔''

''جو دے رہے ہو، وہ ملے گا بھی۔'' میں نے کہا۔

دوسرے لفظوں میں اسے بتا رہا تھا کہ مجھے یہاں واپس آنا ہے اور ہر صورت آنا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ تاجور کے اصل دشمنوں عالمگیر، پیرولایت اور ساتے کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر میں یہاں سے ٹلنے والا نہیں تھا اور پھر وہ ''بڑا صاحب'' جس کے پاس زینب اور تاجور وغیرہ کو پہنچائے جانے کا مذموم پروگرام تھا۔

میرے لیے بھی گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ سجاول نے میری آنکھوں پر بھی سیاہ پٹی بندھوا دی۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ ایک شخص نے میرے اور پہلوان والے گھوڑے کی لگامیں تھام لیں۔ چار کہاروں نے پالکی اٹھائی اور ہم روانہ ہوگئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ اب مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر یقینی بات تھی کہ نہایت دشوار راستے پر سجاول کے لوگ ٹارچوں کی روشنی میں سفر کررہے ہیں۔ کبھی ڈھلوان آجاتی اور گھوڑے کے پاؤں پھسلنے لگتے۔ کبھی چڑھائی ہوتی اور جانور بری طرح ہانپنے لگتا۔ ایک دو جگہ ہمیں رکنا بھی پڑا۔ میں راستہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے مشکل سفر کے بعد ہمیں گھوڑوں سے اتارا گیا اور آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی ڈھلوان ہے جہاں چند ہفتے پہلے تاجور چلتی گاڑی سے گری تھی اور میں نے اس کے پیچھے گاڑی سے چھلانگ لگائی تھی۔ کچھ اوپر تاریک سڑک کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ ہوا درختوں سے سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔ باقر کے کہنے پر برقع پوش جاناں اور تاجور پالکی میں سے نکل آئیں۔ میں نے ان کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دیں۔ میری پٹی پہلے ہی کھولی جاچکی تھی۔ سجاول کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ٹارچیں موجود تھیں لیکن اب وہ ان کو روشن نہیں کررہے تھے۔

''آگے تھوڑا سفر پیدل کرنا ہوگا جی۔'' فخرو نے مجھ سے کہا۔

''کتنی دور جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

ہم ایک تنگ پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتے کوئی دو فرلانگ آگے گئے۔ مجھے بائیں طرف پختہ سڑک کے آثار صاف نظر آرہے تھے مگر سڑک بالکل خالی تھی۔ ایک جگہ سیاہ رنگ کی اسٹیشن ویگن کھڑی نظر آئی۔ اس میں ہماری ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ پروگرام کے مطابق سجاول کے خاص کارندے فخرو کو کوٹلی شہر تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ اس کے بعد اسٹیشن ویگن مجھے خود ڈرائیو کرنا تھی اور تاجور، جاناں وغیرہ کو ان کی منزل تک پہنچانا تھا۔

ہم صبح چار بجے کے لگ بھگ اسٹیشن ویگن پر روانہ ہوئے۔ میں، فخرو کے ساتھ اگلی نشست پر تھا۔ جاناں درمیان والی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سجاول کی ہدایت کے مطابق راستے میں، میں نے تاجور اور جاناں سے بالکل کوئی بات نہیں کی۔ دراصل سجاول نے اپنے کارندوں کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ برقع میں جاناں کے علاوہ دوسری لڑکی کون ہے؟

کہیں کچی اور کہیں نیم پکی سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم دھوپ نکلنے تک اس مقام سے قریباً چالیس میل آگے نکل آئے۔ ایک جگہ رک کر گاڑی کے اندر ہی ناشتا کیا گیا۔ اب تک کے سفر میں صرف ایک جگہ ہمیں معمول کے ناکے پر روکا گیا۔ پولیس کے اہلکاروں نے فخرو سے پوچھا تھا کہ ہم کہاں سے آئے اور کہاں جارہے ہیں۔ فخرو نے آزاد کشمیر کے ہی ایک قصبے کا نام بتایا تھا اور پچھلی نشست پر لیٹی ہوئی جاناں کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا۔ ''میری اس ہمشیرہ کو گردے کی سخت تکلیف ہے۔ اسے کوٹلی کے اسپتال لے کر جارہے ہیں۔''

ہمیں آگے جانے دیا گیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم پھر روانہ ہوگئے۔ جوں جوں ہم بارونق علاقے میں پہنچ رہے تھے، دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ایک مقررہ جگہ پر فخرو گاڑی سے اتر گیا اور اس نے چابی میرے حوالے کردی۔ پروگرام کے مطابق اب اسے یہیں پر رہ کر میرا انتظار کرنا تھا۔ میں نے کل کسی وقت یا آج رات کو اسے فون پر اطلاع دینا تھی کہ میں کتنے بجے واپس کوٹلی پہنچ رہا ہوں۔

کوٹلی سے ہمارا سفر سیالکوٹ کی طرف شروع ہوا۔ سردی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ پلان کے مطابق میں نے سب سے پہلے تاجور کو اس کے مطلوبہ مقام تک پہنچانا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ کنفرم کرنا ضروری تھا کہ تاجور کے والدین واقعی اس سیکھرا نامی گاؤں میں موجود ہیں جس کا ذکر اس نے کیا تھا؟ اب سیل فون کے واضح سگنل آنے شروع ہوگئے تھے۔ میں نے تاجور کے بتائے ہوئے نمبر پر دو تین بار کوشش کی تو رابطہ ہوگیا۔ دوسری طرف سے تاجور کے والد چودھری دین محمد کی ہی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے چودھری صاحب..... آپ کی بیٹی آپ سے بات کرنا چاہتی ہے.....''

اس کے ساتھ ہی میں نے فون تاجور کو تھما دیا اور جاناں اور پہلوان کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر آجائیں۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ میں چاہتا تھا کہ تاجور پوری تسلی سے والدے اور گھر والوں سے بات کرلے۔

قریباً پانچ منٹ بعد تاجور نے کھڑکی کا شیشہ کھول کر مجھے اشارے سے پاس بلایا اور کہا کہ میں اس کے اباجی سے گاؤں کا پتا ٹھیک سے پوچھ لوں۔ اس کے آنکھ کٹورے بھرے ہوئے تھے۔

دین محمد صاحب نے مجھے راستے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ آخر میں پوچھا۔ ''تم کون ہو پتر؟''

میں نے کہا۔ ''وہاں پہنچ کر آپ کو بتاتا ہوں۔''

دین محمد صاحب نے اس سے پہلے میری آواز سنی ہی نہیں تھی، وہ کیسے پہچانتے؟ اندازہ ہورہا تھا کہ ابھی تاجور نے بھی انہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دین محمد صاحب نے مجھے جو ایڈریس بتایا وہ لالہ موسیٰ کے نواح میں سیکھرا گاؤں کا ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تاجور کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس کے اہلِ خانہ اسی گاؤں میں تھے جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا۔ اپنے اندازے کی درستگی پر وہ بھی مطمئن دکھائی دینے لگی۔

جوں جوں تاجور سے جدائی کا وقت قریب آرہا تھا، دل کی حالت ابتر ہورہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں نے تاجور کے گھر والوں سے رابطے کے لیے فون کیا تھا، پتا نہیں کیوں دل کی گہرائی میں کہیں یہ دبی دبی خواہش بھی پیدا ہوئی تھی کہ یہ رابطہ نہ ہو۔ تاجور کے گھر والے لاپتا رہیں..... اور..... وہ پھر میرے ساتھ واپس چلی جائے۔ مگر یہ سوچ صرف چند سیکنڈ کے لیے رہی تھی۔

ہم میر پور کے قریب سے ہوتے ہوئے لالہ موسیٰ کے نواحی علاقے میں پہنچ گئے۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ ہم ایک تنگ سڑک پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم ایک ایسے دیہی پیٹرول پمپ کے قریب پہنچنے والے تھے جس کا پتا مجھے سجاول نے بتایا تھا۔ اس نے تسلیم تو نہیں کیا تھا لیکن مجھے شک تھا کہ یہ پیٹرول پمپ اس کی ملکیت ہے یا وہ اس میں حصے دار ہے۔ وہ ڈکیت تھا، اس کا کام پمپ وغیرہ لوٹنا تھا، مگر وہ ایک پمپ میں مالک کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے کئی اور ''کام'' بھی اس نے کر رکھے ہوں۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس میں روپے کی ہوس بے انتہا ہے اور روپے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔

اسٹیشن ویگن شکستہ سڑک پر ہچکولے کھاتی جارہی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ تاجور میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھی۔ ہماری دونوں جانب جھاڑیاں اور قدرے بے آباد زمین تھی۔ جاناں بھی بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں میں اداسی کی گردش لیتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہ وہی رومانی کیفیت تھی جس کا ذکر مانی مجھ سے کرچکی تھی۔ اچانک مجھے ٹھٹکنا پڑا۔ جونہی ہم ایک موڑ سے گھومے۔ سامنے ہی ٹارچوں کی روشنی دکھائی دی۔ مخالف سمت سے آنے والی ایک ٹریکٹر ٹرالی بھی یہاں کھڑی تھی۔ ٹرالی پر پانچ چھ عورتیں اور مرد نظر آرہے تھے۔ دو تین بچے بھی تھے۔ یہ لوگ شاید کسی شادی سے لوٹے تھے۔ جس نے مجھے چونکایا تھا، وہ ایک موٹا تگڑا بندہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دور سے ہی صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس شخص کے پیچھے تین چار اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں سے بھی دو مسلح دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا انداز ہی بتارہا تھا کہ جب ہم قریب پہنچیں گے تو یہ مسلح افراد ٹرالی کی طرح ہمیں بھی روک لیں گے۔ میں نے گاڑی کو پہلے ہی بریک لگادیے۔

''یہ..... کیا ہورہا ہے؟'' پہلوان حشمت نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا۔

''گڑبڑ ہے۔'' میں نے تائید کی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ مسلح افراد ٹرالی والوں سے چھینا جھپٹی کررہے ہیں۔ میں اس وقت کسی بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے مڑکر پیچھے دیکھا۔ پیچھے تاریک موڑ تھا۔ ممکن نہیں تھا کہ میں ویگن کو ریورس گیئر میں بھگا کر پیچھے

لے جاتا۔ اسے تنگ سڑک پر فوراً موڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جو چیز مجھے زیادہ پریشان کر رہی تھی، وہ موٹے تگڑے شخص کی دید تھی۔ میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس بندے کو چاند گڑھی میں دو تین بار پیر ولایت کے گھوڑے کے آگے آگے لگام تھام کر چلتے دیکھا تھا۔ اب یہ شخص چاند گڑھی سے پچاس ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر یہاں لالہ موسیٰ کے نواح میں موجود تھا، اور راہزانی فرما رہا تھا۔

اسی اثنا میں پہلوان حشمت نے بھی اسے پہچان لیا، وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''یہ تو مجھے جیرا قصائی لگتا ہے۔ پیر ولایت کا چمچہ ہے......''

مسلح افراد نے اب تاڑ لیا تھا کہ ہم بھاگنے کی فکر میں ہیں، وہ ہماری طرف بڑھے۔ میں اُن کی نظر میں ہرگز نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے پگڑی کے پلو میں اپنا چہرہ مکمل طور پر چھپا لیا اور پہلوان حشمت سے بھی کہا کہ وہ چہرہ چادر سے ڈھانپ لے۔

دو مسلح افراد بھاگتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے رائفلیں دھمکانے والے انداز میں ہماری طرف اٹھا رکھی تھیں۔

''رک جاؤ، اوئے۔ گولی مار دیں گے۔'' ایک بندے نے دور ہی سے چلا کر کہا۔

میں انجن بند کر کے اور چابی جیب میں ڈال کر نیچے اتر آیا۔ میں نے چادر کی بُکل مار رکھی تھی اور بُکل کے نیچے کولٹ پسٹل بالکل تیار حالت میں موجود تھا۔ جو دو بندے بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے وہ بھی شاید چاند گڑھی کے ہی تھے۔ ان میں سے ایک کے رائفل پکڑنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ اس کام میں ابھی کچا ہے۔

''یہ زنانیاں کون ہیں تمہارے ساتھ؟'' ان میں سے ایک نے کڑک کر پوچھا۔

''ان میں سے ایک تیری بہن ہے اور دوسری ماں۔'' میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ تاہم جواب دیتے ہوئے میں نے اپنی آواز ذرا بھاری کر لی تھی تاکہ ان لوگوں پر اضافی رعب پڑے۔

اور واقعی ان پر رعب پڑا۔ انہوں نے اپنے نصف چہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے، اور ڈھاٹا میں نے بھی لگا رکھا تھا۔

''کون ہو تم؟'' ان میں سے ایک نے قدرے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''اپنے باپ کو بلاؤ۔'' میں نے ہٹے کٹے جیرے قصائی کی طرف اشارہ کیا۔

جیرا ایک عورت کو تھپڑ مارنے کے بعد اس کے ہاتھوں سے زبردستی چوڑیاں اتروا رہا تھا۔ یقیناً یہ سونے کی ہی رہی ہوں گی۔ رائفل بردار نے جیرے کو آواز دی۔ ''استاد جی اِدھر آؤ ذرا۔''

استاد یعنی جیرے نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ بدمعاشوں کے انداز میں سینہ چوڑا کر کے اور بازو لہرا کر چلتا ہوا میری طرف آیا۔ ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ میرے منہ پر ڈھاٹا دیکھ کر اور میرا انداز پرکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکا۔ قریب آ کر بولا۔ ''کون ہو بھئی تم...... کیا چکر ہے؟''

''چکر تو تم بتاؤ، کس بہن کا جہیز اکٹھا کر رہے ہو یہاں؟''

بندہ سمجھ دار تھا، جان گیا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا ہے۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا، وہ ٹرالی کی طرف چلے گئے۔

''اپنے ہی قبیلے کے ہو؟''

''تمہارے قبیلے کا والد صاحب ہوں، سمجھو خصم ہوں تمہاری ماؤں کا۔''

اس کا چہرہ تمتما گیا، پھنکارا۔ ''بات تو تمیز سے کرو۔'' میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر پستول کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ ''اپنی منحوس زبان چلاؤ گے تو یہیں مار کر پھینک دوں گا۔'' میں نے بھاری بھرکم، بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ جیسے تھرا کر رہ گیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ شاید وہ کوئی اندھا دھند ردِعمل ظاہر کرے گا مگر پھر وہ سنبھل گیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''راشد خان کے گروپ سے تو نہیں ہو؟''

پتا نہیں وہ کس حرامی کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''گروپ کوئی بھی ہو، اب تم اپنی گندی صورت لے کر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ابھی اسی وقت...... اور وہ جو چوڑیاں شوڑیاں تم نے اتروائی ہیں اپنی ہمشیرہ کے ہاتھوں سے، ابھی واپس کرو...... میرے سامنے۔''

''استاد جی! یاروں کے یار ہیں ہم...... ایسی کون سی بات ہے۔ آ...... آپ نے کہہ دیا...... تو ہو گیا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ایک ساتھی کو رعب سے آواز دی۔ ''اوئے دو نمبر...... اِدھر آ...... یہ...... چوڑیاں واپس کر بی بی کو...... اور جانے دے ان لوگوں کو۔''

چمکیلے لباس والی ایک ادھیڑ عمر عورت نے ٹرالی کے اوپر سے دُہائی دی کہ اس کے کانٹے بھی اتروائے ہیں ان لوگوں نے۔ میرے کہنے پر جیرے نے یہ کانٹے بھی فوراً واپس کیے۔

ٹرالی برق رفتاری سے شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں نے پستول اب تک جیرے کی پسلیوں سے لگایا ہوا تھا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اگر ان ٹرالی والوں کے ساتھ کوئی حرامی پن کیا تو نے تو بخشوں گا نہیں۔''

میرے الفاظ اور مہیب لہجے نے جیرے کا پتا پانی کر دیا تھا۔ وہ تو اب بس جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔ اس کی ہدایت پر اس کے کارندوں نے قریبی درختوں میں چھپی ہوئی اپنی موٹر سائیکلز نکالیں اور ایک بغلی کچے راستے پر دھول اُڑاتے نو دو گیارہ ہو گئے۔

بظاہر یہ سفر کے دوران میں پیش آنے والا ایک واقعہ تھا لیکن اس واقعے کا نتیجہ بعد میں کیا نکلا، اور اس نتیجے نے مجھے کس طرح متاثر کیا، اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

اب ایک بار پھر ہم اسٹیشن ویگن پر سوار اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ پہلوان حشمت بھی میری طرح حیران تھا کہ چاند گڑھی سے اتنی دور یہ ولایت کے اس ''نیک نام'' چیلے سے ہماری ملاقات کیسے ہو گئی۔ اگر یہ لوگ جان جاتے کہ ہم اس علاقے میں ہیں تو تاجور کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

جلد ہی ہم مطلوبہ پیٹرول پمپ پر پہنچ گئے۔ سجاول نے یہاں پہلے ہی اطلاع پہنچا دی تھی۔ یہاں موجود یونس نامی شخص نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا۔ ہم نے اسٹیشن ویگن ایک چار دیواری کے اندر کھڑی کر دی۔ پروگرام کے مطابق پہلوان حشمت کو یہاں جاناں کے پاس رہنا تھا۔ میں نے تاجور کو ایک موٹر سائیکل پر لے کر آگے جانا تھا اور قریباً بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اسے اس کے والدین کے پاس پہنچانا تھا۔ پہلوان حشمت اور جاناں سمیت کسی کو اس گاؤں کا نام معلوم نہیں تھا۔ یہ بھید صرف میرے اور تاجور کے درمیان تھا۔

ون ٹین موٹر سائیکل مجھے فراہم کر دی گئی۔ اس کی ٹینکی فل تھی۔ ٹائر کو پنکچر لگانے کا سامان بھی موجود تھا۔ ایک طویل عرصے بعد سیل فون میرے ہاتھ آیا تھا۔ جی چاہا تھا کہ انیق کو فون کروں، مگر انیق والا فون تو ہم سے ملنگی ڈیرے پر ہی چھین لیا گیا تھا پھر بھی میں نے اس نمبر پر ٹرائی کیا لیکن کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ لاہور میں داؤد بھاؤ اور مراد پور میں چاچا حفیظ سے رابطہ کرنے کو بھی دل چاہ رہا تھا مگر پھر میں نے صبر کرنا مناسب سمجھا۔ ہم نے اسٹیشن ویگن میں ہی کھانا کھایا پھر چل پڑے۔ سردی میں موٹر سائیکل کا سفر آسان نہیں ہوتا (اور خاص طور پر رات کے وقت کھلے علاقے میں) ہم نے خود کو حتی الامکان گرم کپڑوں میں لپیٹ لیا تھا۔ برقع اب غیر ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا تاجور نے اتار کر ویگن میں رکھ دیا تھا۔

سڑک کہیں نیم پختہ اور کہیں بالکل کچا راستہ تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ہماری پاکستانی عورتیں اکثر اپنا پلو لٹکائے رکھتی ہیں اور پلو کو موٹر سائیکل کے پہیے میں پھنسا بیٹھتی ہیں۔

''چادر سنبھال لی ہے؟'' میں نے تاجور سے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے بس ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا۔

وہ عجیب کیفیت میں محسوس ہوتی تھی۔ یہ کچھ ملی جلی کیفیت تھی۔ اسے اپنے گھر والوں کے پاس واپس پہنچنے کی خوشی بھی تھی، ایک طرح کا خوف بھی تھا اور شاید...... شاید کچھ اداسی بھی تھی۔ بہرحال یہ بات تو صاف محسوس ہوتی تھی کہ وہ ذہنی طور پر مجھ سے فاصلے پر چلی گئی ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ اس ہچکولے دار سفر کے باوجود میرا کندھا تھامنے یا کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ میں احتیاط سے چلا رہا تھا پھر بھی کسی وقت موٹر سائیکل اچھلتی تھی اور ڈر لگتا تھا وہ کہیں گر نہ پڑے۔

''میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لو۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ذرا توقف کرنے کے بعد اس نے میرا کندھا تھام لیا۔ تاہم اس گرفت میں جو لرزش اور بیگانگی تھی، وہ بھی عیاں تھی۔

کھیتوں میں بس کہیں کہیں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اِکا دُکا راہگیر بھی ملے۔ راہگیروں میں دو اسکوٹر سوار بھی دکھائی دیے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان دیہاتی راستوں پر موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ اسکوٹر بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکوٹر میں فالتو ٹائر بھی ہوتا ہے اور خراب راستوں پر پنکچر ہونے کی صورت میں کام آتا ہے۔

ایک دو جگہ رک کر میں نے راستے کی تصدیق کی اور مجھے پتا چلا کہ ہم سیکھرا جانے کے لیے درست سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ تاجور کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ شاید میں بھی اس بوجھل خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا لیکن توڑ نہیں پا رہا تھا۔ یہ جدائی کی گھڑی تھی

اور کہا جاتا ہے کہ جدائی کی گھڑیاں ایسی ہی گمبھیر ہوتی ہیں۔
سفر کم ہوتا جارہا تھا اور خاموشی برقرار تھی۔ اچانک مجھے ایک ہچکی سی سنائی دی۔ یہ تاجور ہی تھی۔ میں نے جلدی سے موٹر سائیکل کچے راستے کے کنارے پر روک دی۔ لائٹ بند کر کے انجن آف کیا اور نیچے اتر آیا۔ وہ بھی اتر آئی۔ گرم شال اس نے مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ اسی شال کا ایک چھوٹا گھونگھٹ سا پیشانی کی طرف بن گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔
''کیا بات ہے تاجور۔ تم رو رہی ہو؟''
اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا مگر وہ جانتی تھی کہ اس کا جواب درست نہیں ہے۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ رات یخ بستہ اور خاموش تھی۔ درمیانی راتوں کا ٹھٹھرا ہوا چاند آہستہ آہستہ بدلیوں میں سفر کر رہا تھا اور اپنی منزل یعنی مغربی افق کی طرف جھکتا جارہا تھا۔ دور فاصلے پر کسی کاشتکار نے کھیتوں میں چھوٹا سا الاؤ بھڑکا رکھا تھا۔ دور سے یہ الاؤ کسی ٹمٹماتے دیے کی طرح ہی دکھائی دیتا تھا۔
وہ جیسے کراہ کر بولی۔ ''آپ نے...... میرے لیے...... بہت کچھ کیا ہے شاہ زیب! میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکی، مجھے معاف کر دیں۔''
میں نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے لیے تمہیں نہیں مجھے معافی مانگنی چاہیے۔''
''آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ آپ میری سہیلی فرح کے کہنے پر صرف میری خاطر چاند گڑھی آئے تھے اور آپ نے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتے تھے اور یہ سچ ہے کہ آپ کی وجہ سے عالمگیر کا زور ٹوٹ گیا اور حالات بدل گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس پر کسی کا زور نہیں تھا اور وہ میری ہی وجہ سے ہوا۔ میں نے ہی آپ سے کہا کہ آپ میری سہیلی کو ڈھونڈیں۔ میری طرح آپ کو بھی پتا نہیں تھا کہ اس تلاش کی وجہ سے کیا کچھ ہو جائے گا۔''
''تاجور! تم نے مجھے کسی کام پر مجبور نہیں کیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔ ہم سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں جن کی وجہ سے تمہاری ملازمہ نوری کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ چاچا رزاق کی جان بھی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گاؤں میں تمہارے والدین کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اپنے گھر بار کو خیرباد کہنا پڑا۔''
''تقدیر میں یہی کچھ لکھا تھا۔ لیکن یہ تو ہوا کہ ہم نے ریشمی کو بچا لیا اور پیر ولایت کے باپ کا بھید بھی کھول دیا......''
میں خاموش رہا۔ وہ بھی خاموش رہی۔ سرد ہوا دھیرے دھیرے کھیتوں میں اور درختوں میں سرسراتی رہی، چاند کی کرنیں بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ خاموشی طویل ہوتی جارہی تھی۔ آخر تاجور نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ...... میں نے آپ کا دل دکھایا ہے...... اس کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی...... آپ سے...... ایک...... چھوٹی سی...... درخواست بھی کرنا چاہتی ہوں......'' اس کی آواز اشک بار تھی۔
''کہو تاجور!''
''آپ بہت اچھے ہیں، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ جن لوگوں میں رہتے ہیں وہ اچھے نہیں ہیں۔ آپ خطرناک طرح کی زندگی گزار رہے ہیں...... پتا نہیں کہ یہ آپ کی مجبوری ہے یا کچھ اور بات ہے...... میری عقل اتنی نہیں کہ آپ کو سمجھا سکوں، بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ...... آپ ان لڑائی جھگڑے والے کاموں سے دور چلے جائیں، ہو سکتا ہے کہ پھر آہستہ آہستہ آپ دوسرے کام بھی چھوڑ دیں......'' دوسرے کاموں سے اس کا مطلب یقیناً سگریٹ نوشی، شراب نوشی اور اس طرح کے دیگر مشاغل تھے۔
اس بے چاری کو پتا نہیں تھا کہ بات اس سے کہیں آگے نکلی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسے شخص سے ہمکلام ہے جو گردن تک جرم کی دلدل میں دھنس چکا ہے اور موت کے ان گنت ہرکاروں کو اپنے پیچھے لگائے پھرتا ہے...... وہ بہت کم جانتی تھی اور بہت زیادہ پریشان تھی۔
شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس بارے میں کچھ کہوں گا لیکن میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں، میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چادر کے عقب میں انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ''اب کہاں جائیں گے آپ؟''
''شاید واپس لاہور...... یا پھر ہو سکتا ہے کہ پاکستان سے باہر ہی جانا پڑے۔''
''میں آپ کے لیے...... دعا کیا کروں گی۔ میرا کہا سنا معاف کر دیجیے گا۔'' اس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں لگا کہ وہ خود کو رونے سے بمشکل روکے ہوئے ہے۔
ہم دونوں پھر موٹر سائیکل کے پاس آ گئے۔ ''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔'' میں نے کہا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔
وہ میرے عقب میں بیٹھ گئی۔ چاند بدلیوں کی اوٹ

میں چلا گیا۔ کھیت کھلیان گہری تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ آن کی اور ہم پھر سے روانہ ہو گئے۔

ہم مختلف چھوٹے بڑے دیہات اور بستیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آئے تھے۔ اب بھی آس پاس دیہات کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ یہ سارا علاقہ ہی شاداب، آباد اور سرسبز تھا۔ آخر مجھے بیکھرا گاؤں کا ہیولا دکھائی دینے لگا۔ دور چاندی کی سنہری کرنوں میں گاؤں کی مسجد کے بلند مینار پر نگاہ پڑ رہی تھی۔ گھروں کے مدھم خدوخال بھی دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر سیل فون پر دین محمد صاحب سے رابطہ کرنا چاہا، مگر مجھ سے پہلے ہی ان کی کال آگئی۔ وہ کافی بے تاب تھے۔ چھوٹتے ہی بولے۔ ''پانچ بجنے والے ہیں پُتر، کتنی دیر میں پہنچو گے؟ ہم تو گاؤں سے باہر ہی کھڑے ہیں۔'' ان کی آواز سردی اور تناؤ کے سبب لرز رہی تھی۔

مجھے دور درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ اس جھنڈ میں تین کھجور کے درخت سب سے نمایاں اور بلند تھے۔

میں نے کہا۔ ''دین محمد صاحب، گاؤں سے باہر جو تین کھجوریں نظر آرہی ہیں ہم وہیں پر ہیں۔ آپ آجائیں۔''

''تم...... گاؤں کے اندر کیوں نہیں آجاتے؟'' دین محمد صاحب کے لہجے میں شکوک کی جھلک دکھائی دی۔

''ایسی کوئی بات نہیں دین محمد صاحب! بس میں ذرا احتیاط کرنا چاہتا ہوں...... لیں، یہ آپ تاجور سے بات کر لیں۔''

میں نے سیل فون تاجور کی طرف بڑھایا، اس نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر والد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا جی...... آپ ان درختوں کے پاس آجائیں۔ ہم بھی پاس ہی ہیں۔''

دوسری طرف سے کچھ اور بھی پوچھا گیا۔ جواب میں تاجور نے نفی میں سر ہلایا...... نہیں ابا جی...... اور کوئی نہیں...... ہم دونوں ہی ہیں۔''

پھر دوسری جانب سے کوئی مزید سوال کیا گیا، تاجور نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''مجھے نہیں پتا ابا جی، ابھی آپ خود ہی بات کر لینا۔''

میں بھانپ گیا کہ تاجور کے والد نے کیا پوچھا ہوگا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ تاجور کے ساتھ آنے والا میں یعنی شاہ زیب ہی ہوں؟ تاجور نے اس کا گول مول جواب دیا تھا۔

آخر میں وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے ابا جی، آجائیں جلدی۔''

بات ختم کر کے اس نے سیل فون مجھے تھما دیا۔ میں نے موٹر سائیکل دوبارہ اسٹارٹ کی۔ تاجور ذرا سا اچھل کر میرے عقب میں بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ الوداعی لمس ہے۔ چوڑیوں کی مدھم کھن کھن...... اس کے جسم کی دیوانہ کر دینے والی مہک، اس کے لباس کی سرسراہٹ، میں سب کچھ محسوس کر رہا تھا...... اور سفر ختم ہو رہا تھا۔

میں نے اب موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ روشن نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اب اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ دور تک ہرے ہرے کھیت۔ اور ان پر چھایا ہوا کہرا دکھائی دیتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل بند کر دی۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں دین محمد صاحب سے نہیں ملوں گا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ ان کا سامنا کر سکوں۔ بس، ان سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔''

وہ بڑبڑائی۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ ایسا کریں گے۔''

''بس سمجھ لو کہ یہ بھی میری مجبوریوں میں سے ایک مجبوری ہے۔ ویری سوری۔''

''میں انہیں کیا بتاؤں کہ کس کے ساتھ یہاں پہنچی ہوں۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''بتا دینا میرے بارے میں...... اور یہ بھی کہہ دینا کہ تمہیں اتار کر فوراً واپس چلا گیا ہوں۔''

اتنے میں دور فاصلے پر ایک سرخ ٹریکٹر ہچکولے کھاتا دکھائی دیا۔ یہ بیکھرا گاؤں کی طرف سے ہی آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! لگتا ہے، تمہارے گھر والے آگئے ہیں۔''

وہ سمجھی کہ میں جا رہا ہوں۔ ہکلا کے بولی۔ ''یہ کہیں...... کوئی اور نہ ہو؟''

''گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی یہیں ہوں۔ تم جاؤ، میں یہاں سے دیکھتا رہوں گا۔ جب دین محمد صاحب تم کو دیکھ لیں گے، تم سے بات کر لیں گے، میں پھر ہی جاؤں گا۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ ٹریکٹر تیزی سے اچھلتا ہوا کچھ نزدیک آچکا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور دور سے ہی پہچان لیا۔ یہ وہی ٹریکٹر تھا جسے میں چاند گڑھی میں چلاتا رہا تھا۔ اس پر ڈرائیونگ سیٹ کے علاوہ دو مزید بندوں کے بیٹھنے کی جگہ بھی تھی۔ فاصلہ کچھ اور کم ہوا تو مجھے دین محمد صاحب اور ان کی پگڑی کا شملہ صاف دکھائی دینے لگا۔ اب تاجور کو بھی کافی حد تک پتا چل گیا تھا کہ یہ اس کے ابا جی ہی ہیں۔ ڈرائیونگ کوئی اور شخص کر رہا تھا...... اور اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے کندھے پر رائفل بھی موجود ہے۔ ہمارا اور ٹریکٹر کا درمیانی فاصلہ اب بھی 100 میٹر سے زیادہ تھا۔

تاجور نے میری طرف دیکھا۔ ''اللہ حافظ۔'' میں نے کہا۔

''اللہ حافظ۔'' اس نے بھی کانپتے ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔

وہ کچھ دیر ساکت کھڑی میری طرف دیکھتی رہی، پھر پلٹ گئی۔ وہ دھیمے سست قدموں کے ساتھ جا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ مڑ کر دیکھے گی۔ وہ چلتی گئی...... مگر اس نے دیکھا نہیں۔ اور شاید اچھا ہی کیا کہ نہیں دیکھا۔ اگر وہ ایسا کرتی تو یقیناً میرے دل پر پڑا ہوا بوجھ کچھ اور بڑھتا۔ دم بدم پھیلتے اجالے میں وہ چلتی چلی گئی۔ اس کی گلابی اور سفید گرم شال مجھے دور تک نظر آتی رہی۔ اسے دیکھ کر ٹریکٹر رک گیا تھا۔ اس پر سے دین محمد صاحب اور ان کا ساتھی اترے اور تیزی سے تاجور کی طرف بڑھے۔ باپ کو دیکھ کر تاجور کی رفتار تیز ہو گئی پھر چند سیکنڈ بعد وہ بھاگ اٹھی...... اور بازو کھول کر دین محمد صاحب سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ جیسے کوئی پرندہ اپنے بچے کو پروں میں چھپاتا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور رخ موڑ کر واپس اس طرف چل دیا، جدھر ایک سنسان پیٹرول پمپ پر پہلوان حشمت اور جاناں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دل پر ایک بھاری...... بہت بھاری بوجھ تھا لیکن اس بوجھ کی تکلیف کے اندر ایک عجیب سی طمانیت بھی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے تاجور کو بہت بڑی بڑی مصیبتوں کی زد میں آنے سے بچا لیا ہے۔

جب میں اس دیہی پیٹرول پمپ پر پہنچا تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ دھند غائب ہو چکی تھی اور ایک چمکیلی دھوپ دھیرے دھیرے نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ اسٹیشن ویگن پمپ پر ہی موجود تھی لیکن مجھے وہاں کچھ افراتفری سی نظر آئی۔ پہلوان حشمت ویگن سے باہر ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یونس بھی اس کے قریب موجود تھا۔ دو افراد جو غالباً پمپ کے ملازم تھے، قریب ہی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک فون کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر حشمت تیزی سے میرے پاس آیا اور بولا۔ ''ایک گڑبڑ ہو گئی ہے شاہ زیب۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''وہ لڑکی جاناں مجھے بتائے بغیر چلی گئی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی پہلوان نے ایک چھوٹا سا رقعہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں جاناں کی تحریر پہچانتا تھا۔ یہ اسی نے لکھا تھا۔ ''پہلوان جی، میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ مجھے یہاں ایک جاننے والا نظر آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ حفاظت سے لاہور پہنچ جاؤں گی۔ میری طرف سے شاہ زیب کا بھی بہت بہت شکریہ ادا کر دیں۔ میں ان کا احسان نہیں اتار سکتی۔''

''کہاں ملا یہ؟'' میں نے پہلوان سے پوچھا۔

''ویگن کے اسٹیئرنگ پر رکھا ہوا تھا۔'' پہلوان نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟''

''تمہارے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی مجھ سے کہنے لگی کہ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ وہ سامنے ہی اسپتال کا میڈیکل اسٹور ہے۔ میں نے سوچا وہاں سے ڈسپرین وغیرہ لا دیتا ہوں۔ مشکل سے تین چار منٹ لگے ہوں گے۔ واپس آیا تو وہ نہیں تھی۔ ادھر ادھر دیکھا کہیں نہیں ملی۔ پھر میں نے یونس بھائی کو جگایا۔ کافی دیر ہم لوگ آس پاس کی سڑکوں پر دیکھتے رہے۔ تھک کر واپس آئے تو اسٹیئرنگ پر یہ رقعہ رکھا ہوا ملا۔''

میں تلملا کر رہ گیا۔ یہ تیسری مرتبہ تھی کہ جاناں نے ایسی حرکت کی تھی۔ اچھی بھلی سیانی تھی پھر پتا نہیں اس طرح کی حماقت کیوں کر جاتی تھی۔ پہلے وہ گاؤں میں رام پیاری اور وکرم والی پناہ گاہ چھوڑ کر گئی اور لاہور جانے کی کوشش میں پکڑی گئی۔ پھر سجاول کے ڈیرے پر، میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ احاطے میں اکیلی نکلی اور سردار اعظم کے ہتھے چڑھی۔ اب اس نے پھر سے من مانی کر ڈالی تھی۔

یونس کے ایک ادھیڑ عمر ملازم نے کہا۔ ''میں وہاں کیبن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے ایک برقعے کی جھلک نظر آئی۔ ساتھ ایک دبلا پتلا بندہ بھی تھا۔ وہ دونوں سڑک کی

طرف جارہے تھے۔ میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ آپ کے ساتھ آنے والی کڑی ہوگی۔"

اس اطلاع نے سخت بدمزہ کیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس ٹائپ کی تھی۔ یہ بات بھی سوچنے والی تھی کہ اس دور افتادہ جگہ پر اسے اپنا کوئی شناسا اچانک کیسے دکھائی دے گیا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ یونہی کسی کے ساتھ چل پڑی ہو۔ اکیلی خوب صورت لڑکی کے لیے کسی کا ساتھ ڈھونڈنا کون سا مشکل کام تھا۔

پہلوان قدرے شرمندہ بھی نظر آرہا تھا۔ ایک طرح سے میں اسے جاناں کا نگہبان مقرر کرکے گیا تھا لیکن اس کا بھی کیا قصور تھا۔ میری طرح اس کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ کوئی اس طرح کی حرکت کرے گی۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچا تھا۔ شاید دماغ میں یہ بات چل رہی ہو کہ وہ برقع میں ہے اس لیے اکیلی سفر کرکے زیادہ محفوظ رہے گی۔

دل بوجھل تھا۔ یونس کا ملازم مزے دار سیالکوٹی ناشتا لایا۔ حلوہ پوری گرما گرم چنے، اچار اور دہی وغیرہ۔ میں بس دو چار لقمے ہی لے سکا۔

میں محسوس کررہا تھا کہ اب ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ پروگرام کے مطابق پہلوان کو اب یہیں سے چاند گڑھی کے لیے روانہ ہوجانا تھا۔ میں نے پہلوان کو اینق کے لیے اپنا پیغام تحریری شکل میں دیا۔ اس کے علاوہ اسے اپنا موجودہ سیل نمبر بھی دیا اور کہا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ رابطہ نہ ہونے کی صورت میں اسے ایک دو روز تک یہاں اسی پیٹرول پمپ پر آجانا تھا۔ یونس نامی یہ بندہ اسے میرے اور سجاول کے پاس پہنچانے کا انتظام کرسکتا تھا۔

وقتِ رخصت پہلوان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ بولا۔ "میرے لیے دعا کرنا شاہ زیب! پتا ناہیں چاند گڑھی میں اب کیا پیش آوے۔"

دراصل وہ عالمگیر وغیرہ سے ڈر رہا تھا۔ ویسے اسے کوئی فوری خطرہ تو نہیں تھا۔ جب سجاول کے ڈیرے پر آگ لگی اور میں اور تاجور عالمگیر کی نظر میں آئے تو پہلوان اس صورتِ حال سے بچ گیا تھا۔ وہ عالمگیر وغیرہ کی نگاہ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن پہلوان کو اندیشہ تھا کہ جلد یا بدیر عالمگیر پر یہ راز کھل جائے گا۔ اسے معلوم ہوجائے گا کہ جب سجاول نے اپنے ڈیرے پر اس کی میزبانی کی تو پہلوان بھی ڈیرے پر موجود تھا (یعنی پہلوان ایک طرح سے سجاول اور عالمگیر کی خفیہ دوستی کا ایک اور گواہ بن سکتا تھا)

جاتے جاتے پہلوان پھر مڑ کر واپس آگیا۔ اس نے مجھ سے دوبارہ معانقہ کیا اور بولا۔ "شاہ زیب! میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آوت ہے، اگر اب مجھے اور میرے بچوں کو چاند گڑھی میں رہنا ہے تو مجھے عالمگیر اور پیر ولایت سے بہت بنا کر رکھنا ہووے گی۔ وہ کیا کہوت ہیں، وقت پڑنے پر گدھے کو بھی...... گدھے کو بھی کچھ کیا جا سکت ہے......"

میں نے پہلوان کو تسلی تشفی دی اور یہ بھی کہا کہ میں اس کے حالات سے باخبر رہوں گا۔

☆☆☆

میری واپسی کا سفر شروع ہوچکا تھا۔ میں دس بجے کے لگ بھگ پیٹرول پمپ سے اسٹیشن وین لے کر نکلا اور کوٹلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ کوٹلی تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ بس ڈرائیونگ ہوتی رہی۔ میری نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں اور ذہن ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں واپس تو آگیا ہوں مگر اپنی آنکھیں وہیں درختوں کے اس جھنڈ میں چھوڑ آیا ہوں جہاں تاجور مجھ سے وداع ہوئی تھی۔ اس کا آہستہ آہستہ چلتے ہی جانا، مڑ کر دیکھنا اور پھر دور ایک کچے راستے پر اپنے والد کی باہوں میں چلے جانا۔ شاید اسے ٹھیک سے احساس نہیں تھا کہ میں نے اسے خود سے جدا کرنے کے لیے اپنے اوپر کیا کیا عذاب جھیلے ہیں اور جو کچھ کیا تھا اس کے لیے کیا تھا۔ اس کی بھلائی اور اس کی بہتر زندگی کے لیے۔ مجھے پتا تھا اگلے چند ہفتے یا مہینے مجھ پر بہت کٹھن گزریں گے مگر پوری امید تھی کہ میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے گاہے بگاہے جاناں کی جلد بازی کا خیال بھی ذہن میں آتا تھا مگر اب اس کے لیے نیک خواہشات کے سوا اور کیا کیا جاسکتا تھا۔

سہ پہر کے وقت میں کوٹلی شہر کے آس پاس پہنچ گیا۔ راستے میں ایک دفعہ چاچا حفیظ سے ٹیلی فونک رابطے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ فخرو سے بھی رابطہ کیا۔ پہلی کوشش ناکام ہوئی لیکن دوسری کامیاب رہی۔ فخرو نے کہا کہ وہ مجھے مقررہ جگہ پر کھڑا ملے گا۔

وہ اپنے کہے کے مطابق طے شدہ جگہ پر موجود تھا۔ ہم ایک پاس کے ہوٹل میں چلے گئے۔ متوسط درجے کا ریسٹورنٹ تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوا۔ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور ایک بار پھر روانہ ہوگئے۔ ہم نے فیول ٹینکی فل کرائی تھی۔ اس مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ فخرو نے سنبھالی۔

میں ساتھ والی نشست پر بیٹھا اور وین بل کھاتی شکستہ سڑک پر ہچکولے لیتی شمال کی جانب رواں ہوگئی...... شمال جہاں ایک دشوار گزار علاقے میں، گھنے جنگل کے اندر سجاول نے اپنی ایک چھوٹی سی الگ دنیا بنا رکھی تھی۔

رات نو بجے تک ہم اپنی منزل سے پندرہ بیس کلومیٹر دور رہ گئے۔ سڑک سنسان تھی۔ بس کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی یا مال بردار ٹرک دکھائی دیتا تھا۔ فخرو اچھی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال کیا تھا اور نہ میں نے اسے کچھ بتایا تھا۔ بس ہم ادھر اُدھر کی باتیں ہی کرتے رہے تھے۔ اچانک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ شاید کوئی مدھم آواز تھی جو وین کی عقبی نشستوں کی طرف سے آئی تھی۔ جیسے وہاں کوئی زندہ چیز موجود ہو...... کیا وہاں کوئی چوہا وغیرہ تھا۔

قریباً چار پانچ منٹ بعد یہ مدھم آہٹ دوبارہ سنائی دی۔ فخرو نے تو نوٹ نہیں کیا، مگر میری چھٹی حس ایک ہلکا سا الارم بجانے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے فخرو کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں سامنے تارکول کی شکستہ سڑک پر جمی تھیں اور وہ اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''فخرو! ذرا گاڑی روکو۔''

اس نے پہلے تو تعجب سے میری جانب دیکھا، پھر گاڑی سڑک سے اتار کر ایک طرف روک دی۔

میں نیچے اترا اور سلائیڈنگ دروازہ کھول کر عقبی نشستوں کی طرف گیا۔ یہاں بالکل آخر میں عقبی اسکرین کے نیچے ایک لمبوترا خانہ سا بنا ہوا تھا۔ چوڑائی کوئی ڈیڑھ فٹ اور لمبائی پانچ فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔ شاید اس خانے سے وہی کام لیا جاتا تھا جو کار میں ڈکی کا ہوتا ہے۔ یعنی اوزار اور دیگر اشیا یہاں رکھی جاتی ہیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ آواز اسی ڈکی نما خانے سے آئی تھی۔ میں نے احتیاطاً کولٹ پسٹل نکال لیا۔

''کیا بات ہے جناب؟'' فخرو نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہاں پیچھے کچھ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس خانے کا کھٹکا تلاش کیا اور ڈھکن اٹھا دیا۔ وین کی اندرونی روشنی میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ سکتہ زدہ کر گیا۔ خلا میں جاناں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں اور چہرہ بے تاثر تھا۔ ڈھکن اٹھنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اسی لباس میں تھی جس میں ہمارے ساتھ روانہ ہوئی تھی۔ زیریں جسم پر سیاہ برقع تھا۔ برقع کا اوپر والا حصہ اس کے کندھوں پر تھا اور لمبے سیاہ بال چہرے پر منتشر ہو رہے تھے۔ شولڈر بیگ اس کی گود میں تھا۔

میں نے کولٹ پسٹل دوبارہ قمیص کے نیچے لگا لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے واپس نہیں جانا۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

اس کے لہجے کی مضبوطی اور استحکام نے مجھے چونکا دیا۔

''یہ کیا تماشا لگایا ہے تم نے؟'' میرا پارا چڑھنے لگا۔ ''ہم بے وقوفوں کی طرح وہاں تمہاری تلاش میں بھاگے پھرے ہیں اور تم ...... یہاں گھس کر بیٹھی ہوئی ہو، تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟''

''میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ میں اب واپس جانا نہیں چاہتی۔'' اس نے کہا اور خود کو سمیٹتی ہوئی خلا سے نکل آئی۔

مجھے حیرانی ہو رہی تھی، وہ پچھلے سولہ سترہ گھنٹوں سے بھوکی پیاسی اس تابوت نما جگہ میں بند تھی۔ اگر موسم سرد نہ ہوتا تو یقیناً یہ حبس کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی نے ایسا کیوں کیا ہے۔ فخرو بھی ششدر کھڑا تھا۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ دیوانی ہوگئی ہو کیا؟''

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے فخرو کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو کہ وہ اس کی موجودگی میں بات کرنا نہیں چاہتی۔

میں نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں فخرو سے کہا۔ ''فخرو! تم ذرا دو منٹ کے لیے ہٹ جاؤ یہاں سے۔''

وہ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''بتاؤ اب...... یہ کیا بے ہودہ ناٹک رچایا ہے تم نے؟''

''یہ کوئی ناٹک نہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں، سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ لاہور میں میرے لیے بہت سے خطرے ہیں۔ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں آپ جائیں گے میں بھی وہاں جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے، لاہور میں تمہارے لیے بہت خطرے ہیں، اور وہاں سجاول کے ڈیرے پر تو تمہیں بڑی شاندار قسم کی چادر اور چار دیواری مل جائے گی۔ وہاں وہ خبیث وڈا سردار کسی بھیڑیے کی طرح چکراتا ہے۔ ایک دن کھینچ کر

لے جائے گا تمہیں اپنے بستر پر، حشر خراب کر ڈالے گا تمہارا۔"

"مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے نا کہ مجھے اب آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

"یہ کیا "اب اب" لگا رکھی ہے۔ اب کیا ہوگیا ہے، جو کل تک نہیں تھا۔" میں نے تڑخ کر کہا۔

"بس کچھ ہوگیا ہے۔" وہ بدستور میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہو۔ ختم کرو یہ تماشا۔ مجھے ایسی ڈرامے بازیاں زہر لگتی ہیں۔"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "برا نہ ماننا، ڈرامے تو آپ بھی کرتے رہے ہیں، کبھی کسی روپ میں...... کبھی کسی روپ میں۔"

"تم پہیلیاں نہ ہی بجھواؤ تو اچھا ہے۔ سیدھی بات کرو۔ میرا صبر جواب دے رہا ہے۔"

اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہوگئے۔ ناک بھی سرخ دکھائی دینے لگی۔ جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔ "میں آپ کو جانتی تو پہلے سے تھی، اب پہچان بھی گئی ہوں، اور جب بندہ کسی کو اچھی طرح پہچان لیتا ہے تو پھر اس کے بارے میں رائے بھی بدل جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہماری ملاقات پرانی ہے۔"

میں اندر سے ٹھٹک گیا لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تم کس ملاقات کی بات کر رہی ہو؟"

"آپ کو پتا ہے لیکن آپ چھپا رہے ہو۔ حالانکہ آپ نے بے دھیانی میں خود ہی مجھے بتا بھی دیا ہے۔"

"بتا بھی دیا ہے؟ کیا بتایا ہے اور کب؟" میرا پارا واقعی بلندی کی طرف جارہا تھا۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر ڈرامائی لہجے میں بولی۔ "کل رات جب لالہ موسیٰ کی طرف جاتے ہوئے ہمیں مسلح لوگوں نے روکا اور آپ نے ان کے بڑے سے بات کی تو مجھے سب کچھ پتا چل گیا۔"

پہلے تو اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، پھر میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ چند سیکنڈ کے اندر آنکھوں کے سامنے ایک تیز رفتار فلم سی چل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کڑی سے کڑی ملی اور مجھے پتا چل گیا کہ جاناں یہاں کیوں ہے؟ جب جیرے قصائی اور اس کے لوگوں نے ہمیں روکا تو میں نے منہ پر ڈھاٹا لگا کر اور ذرا آواز بدل کر جیرے سے بات کی تھی اور میرا یہی انداز ہوتا تھا جب میں چاند گڑھی میں ایک دوسرا روپ دھار کر نکلتا تھا اور عالمگیر وغیرہ کے خلاف کوئی کارروائی ڈالتا تھا۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور مجھ سے بھی یہ غلطی ہوگئی تھی کہ میں جیرے قصائی سے بات کرتے ہوئے وین میں جاناں کی موجودگی کو بھول گیا تھا۔ جاناں نے وہ سب کچھ دیکھا اور سنا تھا۔ اس دیکھنے اور سننے نے اس کا ذہن سیدھا "یاسر بھائی" کی طرف منتقل کر دیا تھا اور شاید اسے یقین ہوگیا تھا کہ یاسر اور شاہ زیب ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔

میں اندر سے تو بے طرح ٹپٹایا لیکن چہرے سے میں نے زیادہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا۔ "جاناں، تمہاری بک بک میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی...... تمہارے کھوتے دماغ میں یہ سیدھی سادی بات کیوں نہیں آرہی کہ میں نے کوشش کر کے تمہیں یہاں سے رہائی دلوائی ہے اور تم پھر یہاں اس چنگل میں پھنسنا چاہ رہی ہو۔ یہاں تمہیں شرابی مردوں اور بے عزتی کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔"

"اگر آپ کا ساتھ ہے تو میں سب کچھ جھیل سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ چلو بیٹھو آگے سیٹ پر۔ ہم تمہیں واپس چھوڑ کر آئیں گے۔ ابھی اسی وقت۔" میرا انداز فیصلہ کن تھا۔

اس کی ناک پھر سرخ ہوگئی۔ اشک بار لیکن مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں آپ سے درخواست کرتی ہوں، مجھ سے زبردستی نہ کریں...... نہیں تو......"

"نہیں تو کیا......؟"

"نہیں تو میں اپنے ساتھ جو کچھ کروں گی اس کی ذمے داری صرف اور صرف آپ پر ہوگی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور فوراً جان گیا۔ وہ خالی خولی دھمکی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کوئی بھی احمقانہ حرکت کرسکتی تھی۔ خود کو زخمی کرسکتی تھی۔ کھائی میں کود کر اپنے ہاتھ پاؤں تڑوا سکتی تھی...... اور اس طرح کے دیگر اقدام۔

میں جانتا تھا وہ "یاسر" سے محبت کرنے لگی ہے۔ وہ یاسر جس نے اسے اپنی جان خطرے میں ڈال کر سجاول کے ساتھیوں کے چنگل سے بچایا تھا اور رام پیاری والی پناہ گاہ میں پہنچایا تھا۔ اسے وہاں ہر طرح کی سہولت فراہم کی تھی، اس کے وہ کٹھن ترین دن بے لوث ہمدردی اور توجہ سے آسان کیے تھے۔ وہاں اس نے رام پیاری سے یاسر کی دلیری اور انسان دوستی کے قصے سنے تھے اور اس کے غائبانہ عشق میں مبتلا ہوگئی

تھی...... اور کل رات اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جس یاسر سے ملی تھی، وہ کوئی اور نہیں میں ہی ہوں...... اور یہ میں ہی ہوں جو ڈکیت بھیڑیوں کے اس خطرناک غول میں اس کی بچی کھچی عزت اور زندگی کا ضامن بنا ہوں۔

عورت ایک پہیلی ہے اور یہ پہیلی اس تاریک رات میں اس اسٹیشن ویگن کے اندر اپنے تمام تر اسرار اور پیچیدگی کے ساتھ میرے سامنے تھی۔

وہ کہہ رہی تھی، واپس نہیں جائے گی اور اگر زبردستی بھیجی گئی تو وہ خود کو نقصان پہنچا لے گی۔

میں نے چند منٹ اس کے ساتھ مزید سر کھپایا پھر طیش سے میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے دو تھپڑ رسید کیے۔

کوئی پریشان کن ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے وہ میرے قدموں میں گر گئی اور سسکنے لگی۔ اس کے بال میرے پاؤں پر اور ویگن کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی دل فگار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''مجھے واپس بھیجنا ہے تو پھر ابھی پستول نکالیں اور مجھے گولی مار دیں۔ میں اپنا خون آپ کو معاف کرتی ہوں۔''

دور کھڑے فخرو کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ویگن میں کچھ مارا ماری ہوئی ہے۔ (ویگن کی اندرونی بتی روشن تھی) وہ جلدی سے ہماری طرف آیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے جاناں کو اپنے قدموں سے اٹھا دیا تھا۔

''کیا بات ہے جی؟'' فخرو نے پریشان لہجے میں کہا۔

میں کچھ دیر جاناں کی طرف دیکھتا رہا، پھر میں نے ایک گہری سانس لی اور فخرو سے کہا۔ ''تم ابھی تھوڑی دیر اور باہر رکو۔ یہ کمبل پڑا ہے لے جاؤ۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ویگن سے باہر واقعی بڑی سردی تھی۔ کمبل لپیٹ کر اور اپنے سگریٹ لے کر وہ پھر وہیں درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

میں نے کہا۔ ''جاناں، جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے، تمہاری ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ تمہارے دماغ میں صرف وہ چاند گڑھی کا یاسر گھسا ہوا ہے جس نے تمہاری مدد کی تھی۔ تمہیں میرے اندر اس کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری یہ غلط فہمی کس طرح تمہارے دماغ سے نکالوں۔''

''چلیں...... آپ اس کو ''غلط فہمی'' ہی رہنے دیں۔ لیکن پلیز...... پلیز مجھے خود سے جدا نہ کریں۔ میرے لیے اگر یہاں خطرہ ہے تو لاہور میں بھی کم نہیں ہے۔ انسپکٹر قیصر، پاشا اور لالہ وریام جیسے لوگ وہاں بھی میری مٹی پلید کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

وہ میری غلط فہمی والی بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ لیکن اس کی اہمیت تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے اگر تم واپس سجاول کے ڈیرے پر جاتی ہو اور اپنے ساتھ یہ غلط فہمی بھی لے جاتی ہو تو میرے لیے کتنا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے؟''

''میں...... سمجھی نہیں۔''

''تمہارے ذہن میں بیٹھ گیا ہے کہ میں وہ یاسر ہوں جس نے تمہیں کھنڈر سے نکالا اور رام پیاری تک پہنچایا۔ یہی یاسر ہے جسے سجاول وغیرہ دیوانوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، کیونکہ ان کے بندے قتل ہوئے ہیں۔ اگر کہیں بھولے سے بھی تم نے اپنی یہ غلط فہمی ان لوگوں کے سامنے بیان فرما دی تو یہ لوگ میری گردن دو فٹ لمبی کر دیں گے، پھانسی دے کر۔''

اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے کومل ہاتھ جذبات کی شدت سے لرز رہے تھے۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ میں نے آپ کو اپنا خون دل و جان سے معاف کر دیا۔ اگر کبھی سردار کے ڈیرے پر میں اس طرح کی کوئی بات کہوں تو آپ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لینا۔''

وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح مضبوط تھی۔ دو چار منٹ ہمارے درمیان مزید بات ہوئی۔ آخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ فی الحال اسے اپنے ساتھ ڈیرے پر لے جاؤں۔ وہاں چند دن اسے سوچنے کا موقع دیا جائے اور سمجھایا بجھایا بھی جائے۔

ہم ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔ فخرو بالکل خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ ماجرا بالکل نہیں آیا تھا۔ یہ لڑکی تو دوسروں کے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوئی تھی مگر ویگن کے عقبی حصے میں چھپ کر پھر واپس پہنچ گئی تھی۔ یہ بات اب واضح تھی کہ پیٹرول پمپ پر یونس کے ملازم نے جس برقع پوش لڑکی اور دبلے پتلے نوجوان کو جاتے دیکھا تھا وہ کوئی اور تھے۔ ہماری واپسی کے سفر کے مرحلے بھی وہی تھے۔ جہاں اسٹیشن ویگن رکی وہاں پہلے سے سجاول کے دو کارندے موجود تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ جاناں کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ ہم نے پہلے کچھ سفر پیدل کیا۔ پھر میری اور جاناں کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور ہم گھوڑوں پر بیٹھے دو آدمی گھوڑوں کی باگیں پکڑے آگے آگے تھے۔ اونچے نیچے دشوار گزار سفر کے بعد ہم بالآخر ڈیرے پر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے سجاول سے ملاقات ہوئی۔ اسے کچھ دیر پہلے

موبائل فون پر اطلاع مل چکی تھی کہ جاناں میرے ساتھ ہی واپس آ گئی ہے۔ وہ بھی حیران تھا۔

میں نے سردار سے کہا۔ ''صبح میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ کیا ماجرا ہوا ہے۔''

اس نے سفر کا باقی حال احوال پوچھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے آگاہ کیا اور بتایا کہ سب ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔ میں نے فخرو کے ساتھ جاناں کو مائی اور ماؤ کی طرف بھیج دیا۔ مجھے پتا تھا کہ مائی جب جاناں کو واپس اپنے پاس دیکھے گی تو خوش ہو گی۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ جاناں نہ صرف اس کی سہیلی تھی بلکہ ڈانس سیکھنے میں بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ دونوں گھنٹوں تک کمرے میں بند رہ کر ٹیپ ریکارڈر پر میوزک بجاتی تھیں اور توڑے شوڑے اور آؤ بھاؤ کی مشق فرماتی تھیں۔

میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔ یہ آواز اسی بند دروازے کی طرف سے آئی تھی جس پر ''لڈو پیڑے'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ یہ دراصل سجاول کا عقوبت خانہ تھا اور یہاں کے لڈو پیڑے بڑے عبرت ناک قسم کے تھے۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ آواز دینے والا وہی منشی افضل تھا۔ وہ ایک تنگ سے سوراخ سے منہ لگا کر مجھے پکار رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ اندر مکمل تاریکی تھی اس لیے مجھے اس کی صورت نظر نہیں آئی۔ ہاں احاطے میں روشنی تھی اور وہ مجھے دیکھ سکتا تھا۔ سوراخ پر لوہے کی باریک جالی لگی ہوئی تھی۔

منشی فریاد کناں لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! میں نے سجاول صاحب کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ اب میری جان بخشی کرا دو۔ میں ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مصیبت آ تو فٹافٹ جاتی ہے لیکن ٹلتے ٹلتے کچھ وقت لگتا ہے۔ شکر کرو سجاول نے تمہاری زندگی بخشنے کی بات کی ہے لیکن ابھی اتنی جلدی رہائی تمہیں یہاں سے نہیں ملے گی۔''

وہ پکارا۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔ کبھی کسی کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

اسی دوران میں باقر۔ میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ منشی واویلا کرتا رہا، میں احاطہ پار کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔

یہ وہی کمرا تھا جہاں میں نے تاجور کے ساتھ کئی دن گزارے تھے۔ کئی دن اور کئی راتیں۔ دیواروں پر ابھی تک بچوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں کے حوالے سے میں اکثر اسے چھیڑا کرتا تھا اور وہ کبھی غصے اور کبھی شرم سے سرخ ہو جاتی تھی۔ اب وہ الماری خالی پڑی تھی جس میں اس کے کپڑے ہوتے تھے۔ ایک عجیب طرح کی اداسی نے مجھے گھیر لیا۔ یہاں ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات تو جیسے تیسے گزاروں گا۔ کل سجاول سے کہوں گا کہ وہ مجھے کوئی اور کمرا دے دے۔

صبح سویرے سجاول سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے جاناں کے حوالے سے بتایا کہ وہ کیوں اور کیسے میرے ساتھ واپس چلی آئی ہے۔ بہرحال اس میں یاسر بھائی کا ذکر کہیں نہیں تھا بلکہ اشارہ تک نہیں تھا۔ میں نے سجاول کو بتایا، وہ کچے ذہن کی لڑکی ہے۔ کسی وقت کسی کے عشق میں بھی گرفتار ہو سکتی ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے پہلے یاسر کا نام لیتی رہی ہے۔ اب خیر سے مجھ پر عنایت کرم فرما رہی ہے۔ کہتی ہے کہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ لاہور جانا نہیں چاہتی کیونکہ وہاں اس کے بے شمار دشمن ہوں گے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح گاڑی کی عقبی نشستوں کے پیچھے چھپ گئی اور یہاں تک آ گئی۔

سجاول نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''تمہیں پتا ہی ہے شاہی، بھایا (اعظم) اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس کے ہتھے چڑھ گئی اور کوئی مسئلہ ہو گیا تو میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔''

''نہیں سجاول! میں کوشش کروں گا کہ وہ یہاں نہ رہے۔ اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا جائے۔''

''میں بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں کچھ نیا ہوا ہے۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں میرے بندوں نے کافی بھاگ دوڑ کی ہے۔ ورول نامی جگہ کا پتا لگ گیا ہے۔'' سجاول کے لہجے میں ہلکا ہلکا جوش تھا۔

''زبردست۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے۔ کہاں ہو گی یہ جگہ؟''

''مجھے تو آزاد کشمیر یا پھر پنجاب کا ہی کوئی علاقہ لگتا ہے۔''

''ہے تو پنجاب کا ہی مگر ذرا ہٹ کر ہے۔ لیہ اور مظفر گڑھ وغیرہ کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟''

''مظفر گڑھ تو شاید سنا ہوا ہے۔''

''بس اس کے آس پاس ہی ہے۔ سننے میں آ رہا ہے

کہ کچھ بڑے اونچے لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں یہاں......'' سجاول سیالکوٹی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''بڑے صاحب کے بارے میں بھی کچھ پتا چلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ کچھ چلا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوا ہے کہ اس سے ملاقات کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ایک خاص تحفہ لے کر جانا ہوگا ہمیں، اور اس کا انتظام بھی میں کر چکا ہوں تقریباً......''

''کیسا تحفہ؟''

''وقت آنے پر بتادوں گا تمہیں۔'' وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا پھر جیسے چونک کر بولا۔ ''اچھا، تم نے اپنے دوست کا ذکر کیا تھا، کیا نام تھا اس کا؟''

''انیق، میں نے پہلوان کے ہاتھ اس کے لیے پیغام بھجوا دیا ہے ہو سکتا ہے کہ آج ہی کسی وقت اس کا فون آجائے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ وہ بہت سی زبانیں جانتا ہے۔ مطلب یہ کہ اردو، انگریزی کے علاوہ بھی۔''

''ہاں جانتا تو وہ ہے۔''

''اچھا...... مجھے بتاؤ...... مالے بھی کوئی زبان ہے؟''

''مالے؟ مالے تو نہیں لیکن ملائی زبان ہے ایک۔''

''یہ کس علاقے میں بولی جاتی ہے؟''

''مجھے ٹھیک سے پتا تو نہیں۔ بس ایک اندازہ سا ہے کہ یہ یہاں کی زبان نہیں، باہر کے ملک کی ہے۔ ایک برونائی نام کے ملک میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے، اس کے علاوہ ملائیشیا اور ایک دو دوسرے ملک بھی ہوں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، تمہارا وہ دوست یہ زبان جانتا ہوگا؟''

''ہو سکتا ہے۔ یہ تو اس سے پوچھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔''

سجاول جیسے کسی سوچ میں گم ہوگیا۔ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ باتیں چھپا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ میرے لیے دوستانہ جذبات محسوس کر رہا ہے۔ مقابلے میں اپنی شکست تسلیم کر کے میں نے جو قربانی دی تھی، اس نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ شاید وہ مجھے ساتھ لے کر چلنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی رکھتا تھا کہ اختیار اس کے پاس ہی رہے۔

مجھے اختیار کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرا اصل مقصد تو یہی تھا کہ زینب اور دیگر لڑکیوں والے اسرار کا پتا چلے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دوسرا مقصد یہ تھا

کہ عالمگیر اور ساتھی کے کرتوتوں کا پردہ چاک ہو اور وہ کیفرِ کردار تک پہنچیں۔ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ منشی افضل کو مسلسل ''لڈو پیڑے'' کھلانے کے بعد اس سے کافی کچھ اگلوالیا گیا ہے مگر سجاول مجھے پوری بات بتا نہیں رہا تھا۔ کم از کم ... ابھی تک نہیں بتا رہا تھا۔

میں نے سجاول سے کہا کہ میں اپنا کمرا بدلنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ کچھ تاڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں تاجور سے بے حد لگاؤ رکھتا تھا، اب وہ دور جا چکی ہے اور میں خود کو اس کمرے میں بے آرام محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے اندرونی حصے میں وہی کمرا دے دیا جس میں، میں اور تاجور آتشزدگی کے بعد دو چار دن رہے تھے۔ یہ پھر بھی میرے لیے بہتر تھا۔ (سجاول کا رعب داب تو پہلے کی طرح ہی تھا لیکن اس کے رویے میں وہ جنونی کیفیت دور دور تک موجود نہیں تھی جس کا مظاہرہ اس نے مقابلے میں اور مقابلے کے بعد کیا تھا)

اس رات اس نئے کمرے میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ ماؤ ہوگی۔ مگر پٹ کھولے تو سامنے جاناں کھڑی دکھائی دی۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اندر آگئی۔ مجھے مجبوراً دروازہ بھیڑنا پڑا۔ اس نے ایک عام سی شال لپیٹی ہوئی تھی۔ سر پر بھی یہی شال تھی۔

''خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نیند نہیں آرہی تھی...... چلی آئی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس نے شال ہٹائی تو میں دیکھتا رہ گیا۔ وہ کسی ہندی فلم کی ہیروئن دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لالی، رخساروں پر چمک...... غرض سولہ سنگار۔ اس نے بالوں میں پھول پرو رکھے تھے اور ہاتھوں میں گجرے تھے۔ اس کا لباس ساڑی تھی لیکن یہ اس طرح سے پہنی گئی تھی کہ ہرگز وہ کام نہیں کر رہی تھی جو اس کے کرنے کا تھا۔ یعنی جسم چھپانے کا۔ اگر اس منظر کا نقشہ تین چار لفظوں میں کھینچا جائے تو وہ یوں تھا...... وہ سراپا دعوت تھی۔

پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ بغیر پوچھے میرے بستر پر بیٹھ گئی اور چند لمحے جھجکنے کے بعد تکیے پر سر رکھ کر نیم دراز ہوگئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''کہیں تم نے نشہ وغیرہ تو نہیں کر رکھا؟'' میں نے اس کا منہ سونگھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''ہاں جی! میں نشے میں ہوں...... اور یہ آپ کے پیار کا نشہ ہے۔ یہ نشہ ٹوٹا تو میں مر جاؤں گی۔ مجھے اپنا بنا لیں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

اپنا بنانے سے اس کی جو مراد تھی وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ آدھی رات کو جس حال میں یہاں آئی تھی، اس کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ میں جیرے قصائی سے بات کرنے کے لیے جب اپنا چہرہ ڈھاٹے میں چھپاؤں گا اور آواز بدل کر بات کروں گا تو میرا یہ روپ اس روپ کے بالکل قریب چلا جائے گا جو میں بطور ''یاسر بھائی'' اپناتا تھا۔ اور میری یہ غلطی جاناں کے دیوانے پن میں اضافے کا باعث بن جائے گی اور اس اضافے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنا آپ میرے حوالے کرنے کے لیے بے تاب ہو جائے گی۔

میں اپنے بارے میں کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ زندگی کے جس حصے میں، میں جس طرح تھا، ویسا ہی بیان کر رہا ہوں۔ جذباتی لحاظ سے وہ میری زندگی کا بڑا پرآشوب دور تھا۔ میں نے تاجور کو تازہ تازہ کھویا تھا۔ اسے بھولنے کے لیے اور خود کو سنبھالنے کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اس وقت سگریٹ پھونک رہا تھا، شراب بھی پی رہا تھا اور اب ایک اور ''سہارا'' عورت کی صورت میں میرے سامنے تھا۔ (یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کوئی ''لیڈی کلر'' تھا یا لڑکیاں مجھ پر مکھیوں کی طرح گرتی تھیں۔ ہاں خواتین میری زندگی میں آتی رہی تھیں اور اب بھی آرہی تھیں۔ ان میں سے اکثر ایسی تھیں جو میرے ''مارا ماری'' کے فن سے متاثر ہوتی تھیں یا پھر مجھے ان کی مدد کرنے کا موقع ملتا تھا۔ جاناں کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھ سے ملنے سے پہلے وہ خود کو سخت غیر محفوظ تصور کرتی تھی)

کچھ دیر پہلے چند سیکنڈ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ جاناں کو بازو سے پکڑوں اور کھینچ کر کمرے سے باہر نکال دوں، لیکن پھر اتنی زیادہ سختی مجھے مناسب محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ملاقات صرف باتوں تک نہیں رہے گی...... اور وہ نہیں رہی۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی شریف زادی نہیں تھی۔ اتفاقاً یا بدقسمتی سے کئی پاپڑ بیل چکی تھی۔ گھر سے نکلی تو ٹی وی آرٹسٹ یا ماڈل بننے کے لیے ہی تھی مگر اس بے چاری کا اسکرین ٹیسٹ کسی پروڈیوسر یا ہدایت کار کے بجائے انسپکٹر قیصر، پاشا اور لالہ جیسے لوگوں نے لیا تھا۔ اب تک پتا نہیں وہ کتنے مرحلوں

سے گزر چکی تھی۔

وہ اٹھی اور خود ہی الماری سے میرے لیے امپورٹڈ وہسکی نکال لائی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے پلانی شروع کی اور قریب تر ہوتی گئی۔ ایسی بہت سی راتیں میں گزار چکا تھا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین اور رنگین۔ مگر پتا نہیں آج کیا بات تھی میرے اندر ایک ملامت سی تھی، میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا، کہاں سے آیا تھا یہ بوجھ؟ میرا کسی سے کوئی وعدہ نہیں تھا؟ وفا کی کوئی قسم نہیں تھی، کسی آس امید یا انتظار کے تانے بانے نہیں تھے۔ پھر یہ کیا تھا۔ تلخ گھونٹ گلے میں کیوں اٹکتے تھے؟ گرم بانہوں میں تازیانوں کی سی تاثیر کیوں تھی؟

شاید یہ حالات اور زیادہ آگے بڑھتے اور "خطرناک مرحلوں" میں داخل ہو جاتے کہ اچانک مجھے ٹھٹک کر جاناں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ مجھے احاطے کی تاریکی میں کچھ فاصلے پر کسی ہلچل کی مدھم آوازیں سنائی دی تھیں۔ "کیا ہوا جی؟" جاناں نے گھبرا کر پوچھا۔

میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ "کچھ نظر آرہا ہے؟" جاناں نے پھر پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "میرا خیال ہے اب تم جاؤ۔"

وہ ایک دم مایوس سی ہو گئی، لیکن منہ سے کچھ بولی نہیں۔ اس نے اپنے بال سمیٹے، شال اوڑھی۔ ایک بار زور سے میرے گلے لگ کر اور گال چوم کر باہر چلی گئی۔ فرش پر اور بستر پر پھولوں کی پتیاں بکھری تھیں۔ میں نے انہیں سمیٹ کر پلنگ کے نیچے کر دیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے چہرہ لگا کر احاطے کی نیم تاریکی میں جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے کی لالٹین میں نے یکسر بجھا دی تھی۔ کچھ دیر بعد میری نگاہیں احاطے کی نیم تیرگی میں جھانکنے کے قابل ہو گئیں۔ مجھے لگا کہ چشمے کے قریب چار پانچ افراد موجود ہیں۔

وہ چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے لیکن آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی، پھر ان افراد میں سے ایک بندہ یک لخت علیحدہ ہوا اور بھاگا۔ یوں لگا جیسے وہ فرار ہونے کی کوشش میں ہے۔ اس کا رخ چٹانوں کی طرف تھا اگر وہ اس اندھیری شب میں چٹانوں تک پہنچ جاتا تو اس کے بچ نکلنے کے امکانات تھے لیکن اسے ان چٹانوں تک کس نے پہنچنے دینا تھا۔ شاید اسے ان مچانوں کا پتا نہیں تھا جنہوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا اور جہاں ماہر شوٹر چوکس بیٹھے رہتے تھے۔

"رک جاؤ۔" ایک گرجتی ہوئی دور افتادہ آواز میرے کانوں تک پہنچی...... شاید یہ آواز کسی مچان سے آئی تھی۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ "ریٹ ٹیٹ" کی دل ہلا دینے والی آواز سے رات کا گہرا سناٹا تھرا اٹھا۔ میں نے بھاگنے والے سائے کو دیکھا۔ وہ گولیاں کھا کر ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا واپس احاطے میں آگرا...... ساری مچانوں پر ایک دم ٹارچیں روشن ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کئی ٹارچیں سرچ لائٹ کی طرح طاقتور تھیں۔ اس ہنگامے نے ڈیرے کے سوئے ہوئے بیشتر مکینوں کو جگا دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے احاطے اور برآمدوں میں کئی لالٹینیں اور ٹارچیں گردش کرتی نظر آئیں۔ میں بھی ٹارچ لے کر اور کلاشنکوف کندھے پر لٹکا کر باہر نکلا۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے کھاتا، موقع پر پہنچا تو ایک ٹارچ کے روشن دائرے میں منشی افضل کی خون چکاں لاش اوندھی پڑی نظر آئی۔ آٹومیٹک رائفل کی کم و بیش چار گولیوں نے اس کے سینے کو نشانہ بنایا تھا اور عقبی پسلیاں توڑ کر نکل گئی تھیں۔ میں ششدر رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ منشی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ "کیا ہوا؟" میں نے ایک گارڈ سے سخت لہجے میں پوچھا۔

گارڈ کے بجائے چپٹی ناک والا فخرو آگے آیا اور بولا۔ "اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہے جی، روکنے پر بھی نہیں رکا۔ اوپر مچان والے گارڈ نے گولی چلا دی۔"

میرا جی چاہا ایک زناٹے کا تھپڑ فخرو کے گال پر رسید کروں لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نے کھڑکی سے سب کچھ دیکھا تھا۔ منشی بھاگا نہیں تھا۔ اسے شاید بھگایا گیا تھا۔ بالکل جیسے پولیس والے کسی بدنصیب شخص کے ساتھ پولیس مقابلہ کرتے ہیں۔ اسے بھاگنے کے لیے کہتے ہیں اور پھر بھون ڈالتے ہیں۔ اسی دوران میں دور سے سجاول کی پاٹ دار آواز بھی سنائی دی۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا اس نے پکار کر پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

فخرو اور دو دوسرے افراد سجاول کو جواب دینے کے لیے اس کی طرف لپک گئے۔ میں اپنی جگہ کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ سجاول کی لاعلمی میں ہوا ہو۔ وہ لاعلمی کا ناٹک کر رہا تھا۔ میں سجاول کی سفاکی پہلے بھی دیکھ چکا تھا اب ایک اور خونی مثال سامنے آگئی تھی۔

یہ ایک اتفاق ہوا تھا کہ رات کے اس پہر جاناں نے میرے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اگر وہ نہ آتی اور میں سو رہا ہوتا تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ منشی کے ساتھ اصل

واقعہ کیا ہوا ہے۔ پھر شاید میں بھی یہی سمجھتا کہ اس نے بھاگنے کی بے وقوفی کی ہو۔ منشی والے واقعے کو دیکھ کر مجھے ایک بار پھر موذن عبدالرحیم کا لرزا خیز قتل یاد آ گیا۔ اسے سجاول نے ایک وزنی جیپ کے نیچے دیا تھا اور اس کی کھوپڑی چٹخادی تھی۔

سجاول نے بظاہر منشی کی ناگہانی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور میرے سامنے اس چوکیدار کی سخت سرزنش کی جس کی غلطی کی وجہ سے ''لڈو پیڑے'' والے کمرے کا دروازہ ٹھیک سے لاک نہ ہوسکا اور منشی کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں نے یہ ساری ڈراما بازی خاموشی سے دیکھی اور سنی۔ کوئی بات کرنے کا اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ منشی کی جان تو جا چکی تھی۔ یقیناً سجاول ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے جرم کا نشان مٹانے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ اگر سجاول میری درخواست مان کر منشی کو کہیں بند کر دیتا تو اس بات کا امکان موجود رہتا کہ کبھی نہ کبھی اس کے اغوا کا راز فاش ہو جائے۔ اس راز کا فاش ہونا سجاول اور عالمگیر کے تعلق کی موت ثابت ہوتا۔ لہٰذا اس موت سے بچنے کے لیے اس نے منشی کو موت دے دی تھی اور یہ سجاول جیسے بندے کے لیے روزمرہ کے کاموں جیسا ہی ایک کام تھا۔

مجھے افسردہ کھڑے دیکھ کر سجاول لمبے ڈگ بھرتا ہوا میری طرف آیا اور میرے دونوں کندھوں پر اپنا بازو رکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو چھوڑو شاہی، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، شاید اس کے مقدر میں یہی تھا...... آؤ میں تمہیں ایک نئی چیز دکھاؤں۔''

میں ست قدموں سے اس کے ساتھ چل دیا۔ رات کے اس پہر بھی وہ کافی چوکس نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ آگے بڑھنے کے لیے ایک تحفے کی ضرورت بھی پڑے گی۔ میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔''

وہ مجھے رہائش گاہ کے ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا یہاں گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول پڑا تھا مگر اس ادھ کھلے پھول کی اونچائی چار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ گھیر قریباً دو فٹ قطر کا ہوگا۔ بڑی نفاست سے بنایا گیا تھا۔ غور سے دیکھنے پر ہی پتا چلتا تھا کہ یہ پلاسٹک کا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر نیم گنجا شخص جو شاید اس پھول کا موجد تھا اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھا۔ سجاول نے مجھے دکھایا کہ کس طرح ہاتھ لگانے سے یہ پھول کھل اٹھتا ہے۔

اچھی چیز بنائی گئی تھی۔ ہاتھ لگانے سے غنچہ، پھول بن جاتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کھلونے سے کس کو خوش کیا جائے گا۔ یہ کوئی ایسی انوکھی شے تو نہیں تھی۔ اس کے اندر یقیناً کوئی بیٹری اور چھوٹی موٹر کام کرتی تھی جو پتیوں کو کھولتی تھی۔

سجاول مسکرایا۔ ''شاید تم سوچ رہے ہو کہ یہ کوئی نایاب تحفہ نہیں ہے مگر یہ نایاب بن جائے گا۔ کوئی اسے نایاب بنا دے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''آؤ دکھاؤں۔'' اس نے کہا اور مجھے لے کر ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ ساتھ ساتھ وہ بول رہا تھا۔ ''دراصل ہمیں جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ اگلے بیس چوبیس گھنٹوں میں......''

ہم ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی تک پہنچے۔ اندر دو گیس لیمپ روشن تھے اور منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میری حیرت بڑھ گئی۔ بیس بائیس سال کی ایک نہایت خوش شکل لڑکی ایک لکڑی کے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ تین چار ملازمائیں جن میں ماکھی بھی شامل تھی اسے بنانے سنوارنے میں مصروف تھیں۔ خوش اندام لڑکی کی پنڈلیوں اور عریاں بازوؤں پر کوئی ابٹن ملا جا رہا تھا۔ اس کے ناخن تراشے جا رہے تھے۔ لمبے گھنے بالوں میں کسی خوشبودار تیل کی مالش ہو رہی تھی۔ نوخیز لڑکی مسکرا رہی تھی۔ یہ سب کچھ بڑا داستانی سا لگ رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے سجاول کو دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کنول کے پھول میں سے تو شہزادی وغیرہ نکلتی ہی ہے۔ اب گلاب کے پھول سے بھی نکلے گی۔''

اب بات سمجھ میں آرہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون شخص تھا جس کو اس طرح کے تحفے سے راہِ راست پر لایا جانا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر سجاول مجھے کچھ باتیں بتا رہا ہے تو بہت سی چھپا بھی رہا ہے۔ مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ ہم جلد ہی یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ کہاں؟

شاید اسی ورول نامی جگہ کی طرف جہاں کوئی وڈا صاحب موجود تھا۔ کیا مشینی گلاب کے اندر سے برآمد ہونے والی یہ لڑکی اسی کو پیش کی جانی تھی۔ کیا یہ اُن لڑکیوں میں سے ہی ایک تھی جنہیں خاص طریقے سے Immune کیا گیا تھا اور وہ زہروں کے اثر سے محفوظ ہوگئی تھیں یا پھر یہ کوئی اور تھی...... اور اسے اپنے ساتھ لے جائے جانے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں اپنے اندر عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

خواب ناک

سید علی ارسلان

کچھ انسان بالکل بے لگام گھوڑے کے مانند تُند خو، سرکش... اور ضدی ہوتے ہیں...ان کی لگامیں تھامنا بے حد ضروری ہوتا ہے...گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے والے بھگوڑے کی دلچسپ روداد... خوبصورتی ...دلکشی کے بجائے ایک ناک نے اسے تسخیر کرلیا...اس کی منہ زوری کو لگام دے دی تھی۔

ایسے کردار کی تصویر کشی جو بیک وقت غم ناک، خواب ناک کیفیات کا اسیر تھا

اس کی صرف ناک ہی تھی جس نے مجھے سر سے پیر تک گھائل کر دیا تھا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت حسین ہوتے ہیں، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف حسین ہوتے ہیں بہت حسین نہیں ہوتے اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ذرا بھی حسین نہیں ہوتے لیکن پھر بھی متاثر کر دیتے ہیں۔

اس کا شمار ان تینوں اقسام میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی بلکہ عام سے بھی کچھ

کم۔ نہ اس کی باتوں نے مجھے چونکایا، نہ اس کی اداؤں میں، میں نے دلکشی پائی، نہ اس کی آنکھوں نے میرے دل کی پھانکیں کر دیں، نہ اس کی زلفوں نے مجھے جکڑنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کی چال مجھے پسند آئی البتہ اس کی ناک نے کسی ڈائنامائٹ کی طرح میری تمام سوچوں اور خیالات کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے اور پھر وہ اس کی ناک ہی تھی جو میرے ذہن پر بارش کی طرح برسی اور دماغ کے ریشوں پر ثبت ہونے کے ساتھ ساتھ دل کے کاغذ پر گوند کی طرح چپک گئی۔ اس کے باوجود وہ، یعنی مونا میرا آئیڈیل نہیں تھی، ہاں اس کی ناک ضرور میرا آئیڈیل تھی بلکہ میرا سب کچھ تھی۔ اگر مونا کے چہرے پر ناک نہ ہوتی یا اس ناک کے بجائے کوئی اور ناک ہوتی تو یقیناً میں اس پر کوئی توجہ نہ دیتا۔ پہلی ملاقات میں میری نگاہ سب سے پہلے اس کی ناک پر ہی پڑی تھی۔ پڑی کیا تھی یوں کہیں کہ گر پڑی تھی اور اٹھنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس کی ناک دیکھ لینے کے بعد اس کے دیگر اعضا کا جائزہ لینے کی مجھے قطعی کوئی خواہش نہ ہوئی لیکن چونکہ پہلی پہلی ملاقات تھی لہٰذا مجھے اخلاقاً اور رسماً اس کے پورے چہرے پر نظر دوڑانا پڑی مگر میری نظر کو بڑی مایوسی ہوئی۔ مجھے معنک لڑکیاں بالکل پسند نہیں اور وہ معنک تھی یعنی ایک عدد بھاری سی نظر کی عینک نے بیک وقت اس کے کانوں، آنکھوں اور ناک پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ مجھے اس کے کانوں اور آنکھوں سے ذرا بھی ہمدردی نہ ہوئی البتہ اس کی ناک پر بڑا ترس آیا۔ وہ ناک جو میرا سب کچھ تھی، میرے تصورات پر برسوں سے چھائی ہوئی تھی، عینک کے موٹے تازے کالے فریم کے نیچے یوں دبی ہوئی تھی جیسے کسی افریقی دیوزاد پہلوان کے نیچے معمولی سا چھوٹے قد کا دبلا پتلا بنگالی۔ اس آئیڈیل ناک کی اس دُرگت پر بے اختیار میرے منہ سے ''چچ چچ'' نکل گیا۔ کاش وہ اپنی آنکھوں پر کانٹیکٹ لینس لگوا لیتی تو ناک کی مظلومیت اور بے حرمتی پر میرا دل اس طرح نہ دکھتا۔ مجھے اپنے دل کے دکھنے پر بھی بہت رنج ہوا۔

موٹے موٹے بازوؤں والی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں اور مونا کے بازو کافی موٹے موٹے تھے مگدر کی طرح۔ سپاٹ آواز کی مالک لڑکیاں مجھے کسی ایسی کار کی طرح لگتی ہیں جس کے سائیلنسر کی ڈھوکنی پھٹ چکی ہو، مونا کی آواز ایسی ہی تھی۔

ایسی لڑکیاں جو مسکراتے وقت اپنی عقل ڈاڑھ تک دکھا دیں، مجھے کسی ایسے اداس اور نکمے گھوڑے کی طرح محسوس ہوتی ہیں جو بیکار کھڑا کھڑا جمائیاں لیتا رہتا ہے۔ وہ یونہی مسکراتی تھی۔ چلتے وقت اس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ کو قینچی کی طرح کراس کرتی تھی اور اگلے قدم پر دوسری ٹانگ پہلی کو پار کر جاتی تھی۔ مجھے ایسی بے ڈھنگی چالیں بالکل مچھر دانی کے بانسوں کی طرح لگتی ہیں، مونا ایسے ہی چلتی تھی۔

یہ ساری برائیاں ایک طرف، ان برائیوں سے میری ناپسندیدگی بجا لیکن مونا کی اس ایک ناک نے اس کے تمام عیوب پر وارنش پھیر دی تھی اور یہ تمام بڑی بڑی خامیاں مونا کی اس مختصری اکلوتی ناک کے پیچھے یوں چھپ گئی تھیں جیسے پہاڑ کے پیچھے گلہری۔

کہنے کا مطلب یہ کہ اس وقت میرا سب کچھ وہی ایک ناک تھی۔ مونا کی ناک کی اس قدر تعریف کا مطلب آپ یہ ہرگز نہ لیں کہ وہ ناک دیوارِ چین کی طرح بلند تھی، یا ستون کی طرح ستواں تھی یا چغتائی آرٹ کا نمونہ تھی۔ نہیں ان میں سے کوئی ایک خوبی بھی اس ناک میں نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ محض ایک ناک تھی جیسے کہ عام طور پر ہوا کرتی ہیں اور بس۔ ایک معمولی سی اوسط درجے کی ناک جس پر مستقل عینک لگانے کی وجہ سے دونوں طرف سفید لکیریں سی پڑ گئی تھیں۔

مونا کی ناک کچھ اس طرح میرے ہوش و حواس پر مسلط ہوئی کہ میں نے کئی دن خواب میں بھی مسلسل اسی ناک کو جلوہ گر دیکھا۔ آخر یہ ہوا کہ اس ہوش ربا ناک کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر میں نے خود اپنے آپ کو ''ناک زدہ'' قرار دے دیا، بالکل ایسے ہی جیسے سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو سیلاب زدہ، زلزلہ بھگتنے والوں کو زلزلہ زدہ اور آفت یافتہ لوگوں کو آفت زدہ قرار دے دیا جاتا ہے۔

میرے قارئین یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ مونا کی ناک ضرور میری کسی سابقہ یا گمشدہ محبوبہ کی ناک سے مماثلت رکھتی ہوگی۔ جناب اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں تو آپ کا خیال قطعی غلط ہے۔ لہٰذا اس افسانے کو آگے بھی پڑھیں کہ یہ ایک ناک کا افسانہ ہے۔ ناک جو اونچی بھی ہو جاتی ہے نیچی بھی ہو جاتی ہے اور جس پر مکھی بھی بیٹھ جایا کرتی ہے۔ یہ پڑھ کر آپ کے اندازوں پر یقیناً اوس پڑ جائے گی کہ وہ ناک نہ میری کسی سابقہ محبوبہ سے ملتی جلتی تھی اور نہ ہی میری کسی پسندیدہ ایکٹریس جیسی تھی۔ وہ ناک تو ہو بہو میری ماں کی ناک جیسی تھی۔

مجھے اپنے گھر سے نکلے ہوئے سترہ سال ہو چکے تھے اور گزرتے ہوئے ہر سال کے ساتھ ساتھ میرے ذہن سے میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے چہروں کے نقوش

دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے اپنی ماں کی شکل بھی اچھی طرح یاد نہیں رہی تھی بس ایک ہلکا سا خاکہ تھا جو دماغ کے کسی گوشے میں پوشیدہ تھا۔ لیکن مجھے اپنی ماں کی ناک بہت اچھی طرح یاد تھی بالکل ایسے جیسے میں نے اس ناک کو ابھی کل ہی دیکھا ہو۔ مجھے یاد ہے جب میرے والد صاحب مجھے مار مار کر زبردستی گھر سے نکال رہے تھے تو میری ماں کی ناک روتے روتے سرخ ہو گئی تھی اور میری ماں بار بار دوپٹے سے اپنی ناک کو رگڑے جا رہی تھی۔ مجھے اس وقت اپنی ماں کی ناک پر بڑا ترس آیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ اس ناک کی خاطر ہی رک جاؤں۔ مگر میں بہت جذباتی اور ایب نارمل قسم کا آدمی ہوں یا تو معمولی سے معمولی بات برداشت نہیں کرتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا ہوں اور یا یہ کہ بڑے سے بڑا طعنہ اور بڑی سے بڑی گالی سن کر بھی مسکراتا رہتا ہوں۔

میں اپنی ان جذباتی عادتوں کی وجہ سے خاصا پریشان رہتا ہوں اور انہی حماقتوں کی وجہ سے دوبار جیل کی ہوا کھا چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے معمولی سی بات پر غصے میں آکر اپنے افسر کو بہت بری طرح پیٹ ڈالا تھا اور دوسری مرتبہ اپنے چپراسی کا سر پھاڑ دیا تھا۔ چنانچہ مجھ سے اپنے والد کی بات بھی برداشت نہ ہو سکی تھی اور میں اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا جب میرے تیسری مرتبہ ایف اے میں فیل ہونے پر انہوں نے دل کھول کر میری پٹائی کی تھی اور اس کے بعد کہا تھا۔

''میاں، ہمارے اور بھی بچے ہیں تمہارے علاوہ۔ اسی رفتار سے پڑھتے رہے تو ساری زندگی بی اے بھی نہ کر سکو گے۔ بیس برس کے ہو چکے ہو اور ایف اے تک نہیں کر سکے، آخر ہم کب تک تمہارے ناز اٹھاتے رہیں۔'' اتنی سی بات پر میرا پارا آسمان کی بلندی کو چھو بیٹھا تھا اور میں اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے گھر سے نکل جانے پر کسی نے بھی دلچسپی نہ لی تھی سوائے میری ماں کے۔ کسی کی ناک روتے روتے لال نہیں ہوئی تھی سوائے میری ماں کی ناک کے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ آخر میں گھر سے نکل کر جا بھی کہاں سکتا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح خالہ کے ہاں جا پڑوں گا اور پانچ چھ دن بعد واپس آکر گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور گھر والوں میں ویسے ہی مل جاؤں گا جیسے ریوڑ سے بچھڑ جانے والی بکری شام کو آکر دوبارہ گلے میں شامل ہو جاتی ہے۔ مگر اس بار میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب کے ایسا نکلوں گا کہ واپس نہیں آؤں گا۔ لہٰذا میں نے اس وقت ماں کے زار و قطار رونے کی قطعی پروا نہ کی اور ماڈل ٹاؤن لاہور سے نکل کر اپنی خالہ کے گھر کرشن نگر نہیں گیا بلکہ دو نمبر کی بس میں بیٹھا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے ٹکٹ کٹا کے کراچی اترا مگر کراچی میں دال نہ گلنے کی وجہ سے حیدر آباد میں ٹھکانا کیا اور ابھی تک یہیں ہوں۔

شروع شروع میں مجھے اپنا لاہور بہت یاد آتا رہا۔ ماڈل ٹاؤن کی پُرسکون فضا نے میرے دل میں بہت چٹکیاں لیں۔ لاہور کی چاکلیٹی ہواؤں کی خوشبو نے کئی دن مجھے بے چین رکھا۔ ماں بھی بہت یاد آئی اور میں اس کے لیے راتوں کو روتا رہا۔ پھر میں نے اپنے دل کی دراڑوں میں وقت کی سیمنٹ بھرنا شروع کر دی اور آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرا دل پوری طرح سیمنٹ سے ڈھک گیا اب اس میں کوئی دراڑ نہیں پڑتی تھی۔ لیکن مونا کی کند ناک نے میرے سیمنٹ کے دل پر اتنی گہری دراڑ ڈال دی تھی جسے میں بھر نہ سکا اور یہ دراڑ گہری سے گہری ہوتی چلی گئی۔

مونا سے میری پہلی ملاقات سارڈینیا ہوٹل میں ہوئی۔ سارا دن ایریگیشن کے دفتر میں مغز ماری کرنے اور دل بھر کے رشوت وصول کرنے کے بعد میرا روز کا معمول تھا کہ سارڈینیا ہوٹل میں آکر بیٹھتا اور رات گئے تک کچھ نہ کچھ پیتا رہتا۔ کچھ نہ کچھ پینے سے میری مراد آج کل سوپ، مشروبات اور چائے کافی سے ہے ورنہ جب تک ملک میں شراب بندی نہ ہوئی تھی میں سردیوں میں برانڈی اور گرمیوں میں بیئر اور رم کے اوجھے چڑھاتا رہتا اور حرام کی بے تحاشا کمائی کا معمولی سا حصہ ہوٹل والوں کی نذر کر کے باہر نکلتا تو خود کو بے حد پُرسکون محسوس کرتا اور اپنے ذاتی بنگلے میں چین کی گہری نیند سوتا۔ واقعی لوگ سچ کہتے ہیں کہ حرام کی کمائی میں سکون نصیب نہیں ہوتا لیکن اسے خرچ کرنے میں بڑی راحت نصیب ہوتی ہے۔

تو جناب اسی طرح ایک روز میں حسبِ معمول کھانا کھانے کے بعد کوکا کولا کی بوتل وہسکی سمجھ کر چڑھا رہا تھا کہ ہوٹل کی مدھم روشنی اور خوابناک ماحول میں میری نظر مونا پر پڑ گئی۔ وہ مجھ سے چند میزوں کے فاصلے پر بیٹھی بیرے سے الجھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ بیرے کا پلڑا بھاری پڑ رہا ہے اور مونا کافی دبی دبی سی ہے۔ فطری تجسس نے مجھے آن گھیرا اور میں اس کی میز کی طرف چل دیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے بیرے سے ڈپٹ کر پوچھا۔ اس وقت تک میری نگاہ اس ستم رسیدہ ناک پر نہیں پڑی تھی۔

''جی، یہ میم صاحب پورا بل ادا نہیں کر رہی۔'' بیرے نے ترنج کر کہا۔

''کیوں جی، آخر آپ بل ادا کیوں نہیں کر رہیں؟'' اتنا کہہ کر میں اس کی طرف پلٹ گیا اور تبھی میں نے ڈائنامائٹ کے اس فلیتے کو دیکھا جو درحقیقت مونا کی ناک تھی۔

''جی، وہ اتنا زیادہ بل ہے۔ دو سو پچاس روپے ستر پیسے۔ میں کراچی سے آئی ہوں، اتنا مہنگا کھانا تو وہاں بھی نہیں ہوتا۔ اتنا زیادہ بل...... بھلا کیسے......؟'' لیکن میں سن ہی کہاں رہا تھا۔ میں تو زمین میں گڑے ہوئے پتھر کے کسی مجسمے کی طرح اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور میری نگاہوں کا مرکز اس کی ناک تھی۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ میں اس وقت چونکا جب اس نے تیز لہجے میں مجھ سے کہا۔

''اے مسٹر! تم میری شکل کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے یہاں کسی فلم کا پوسٹر لگا ہو۔ کیا حیدرآباد میں تم نے کبھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی؟''

اس کے جملے اتنے نوکدار تھے کہ میری ساری محویت کافور ہو گئی۔ میں نے فوراً سنبھل کر اور نظریں جھکا کر کہا۔

''نہیں نہیں مس، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک نہایت شریف آدمی ہوں اور یقین کیجیے کہ آپ حیدرآباد میں پہلی لڑکی نہیں ہیں۔ یہاں بہت ساری لڑکیاں ہیں لیکن آپ جیسی کوئی نہیں۔'' آخری فقرہ نہ جانے کیسے بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا اور اس جملے پر وہ بدک گئی۔

''کیا کہا، ذرا دوبارہ تو کہنا۔ آخر تمہاری ان گھٹیا حرکتوں کے معنی کیا ہیں۔ اچھی خاصی عمر کے آدمی ہو اور کالج بوائز کی طرح عشق بگھارنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' بیرا اپنا بل بھول کر ہم دونوں کا دنگل دیکھ رہا تھا۔

''مس میں نے کہا نا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' پھر میں بہت دیر تک اس کو اپنی شرافت اور روح کی بالیدگی کا یقین دلاتا رہا اور جب وہ میرے خوب صورت لفظوں کے جال میں پھنس گئی تو میں نے کہا۔ ''مجھے آپ کی ناک بہت پسند آئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ پھر اکڑنے لگی۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ کراچی سے حیدرآباد اتنی گرمی میں کیوں آئی ہیں؟ آپ کی ناک گرمی کی وجہ سے تمتمائی ہوئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس تمتماہٹ کی وجہ آپ کی بیرے سے نوک جھوک ہو۔'' میں نے نہایت خوب صورتی سے بات بدل دی۔

''جی ہاں، اب دیکھیے نا، اتنا بل بنا دیا ہے، لوٹ کھسوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں۔'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''کراچی میں یہی کھانا زیادہ سے زیادہ سو روپے میں مل جاتا ہے۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی یہ نہیں تھا۔''

''خواب و خیال میں ہوٹل کے بل کبھی نہیں آتے مس......'' میں جان بوجھ کر رک گیا۔ اس وقت تک مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔

''مونا۔'' اس نے جملہ پورا کرتے ہوئے ایک بھنچی ہوئی مسکراہٹ سے مجھ کو نوازا۔ مجھے اس کے بھینچے اور کھنچے ہوئے ہونٹوں سے گھن سی آئی۔ اسی وقت میری نظروں کا ٹکراؤ اس کی ناک سے ہو گیا اور میرا موڈ پھر آف ہوتے ہوتے آن ہو گیا۔

''ہاں تو مس مونا میں کہہ رہا تھا کہ یہ کراچی نہیں حیدرآباد ہے اور جہاں آپ بیٹھی ہیں وہ حیدرآباد کے بہترین ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل ہے۔ آپ اسے بھول جائیں کہ آپ نے کیا کھایا ہے بلکہ یہ سوچیں کہ کہاں کھایا ہے۔ یہ اتنا زیادہ بل محض کھانے کا نہیں ہے بلکہ ائر کنڈیشنر، دھلے ہوئے نیپکن، چمکتی کٹلری، فوم والے صوفے اور اس ہوٹل میں بیٹھنے کا کرایہ بھی ہے ورنہ یہی کھانا آپ کسی فٹ پاتھ کے ہوٹل میں کھائیں تو پچیس پچاس روپے میں کھا سکتی ہیں مگر فٹ پاتھی ہوٹل میں مشکل یہ ہے کہ آپ وہاں کھانا کم کھاتیں اور وہاں کے لوگ آپ کو نظروں ہی نظروں میں زیادہ کھاتے۔ لہٰذا ایک لڑکی کے لیے نظروں کے چھری کانٹوں سے بچنے کا واحد حل یہی ہے کہ وہ زیادہ بل ادا کرے۔''

میری طویل تقریر سننے کے بعد اس نے اپنا پرس کھولا اور روپے گننے لگی۔ میں نے اپنی نگاہیں دوبارہ اس کی تیکھی ناک پر جما دی تھیں۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اس کی ناک پہلے گلابی سی ہوئی اور اس کے بعد تھوڑی سی نیچی بھی ہو گئی پھر میری نظروں کا تصادم اس کی نظروں سے ہو گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر شرمندگی کی پھنکار برس رہی تھی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعی کوئی تامل نہیں ہوا کہ اپنے پیسے دوبارہ گننے کے باوجود وہ ہوٹل کا بل ادا کرنے سے قاصر ہے۔ میں مسکرایا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جب اپنا اور مونا کا بل ادا کر کے میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی ناک اونچی ہو کر پھر اپنی پرانی جگہ پر واپس لوٹ آئی تھی۔

''میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔'' اس

نے گردن جھکا کر کہا۔ ''آپ اپنا ایڈریس مجھے دے دیجیے انشاء اللہ بہت جلد آپ کا قرض لوٹا دوں گی۔''

میں نے اس سے کہنا چاہا کہ ''اے کالے ہونے کی حد تک سانولی لڑکی! یہ قرض نہیں ہے۔ یہ تو تیری ناک کا صدقہ ہے بلکہ یہ تو تیری ''ناک دکھائی'' ہے جیسے کہ منہ دکھائی ہوتی ہے جو میں نے بل کی صورت میں ادا کر دی ہے ورنہ تو یہ مت سمجھ لے کہ میں نے تیرے ہیبت ناک حسن سے متاثر ہو کر تجھ پر احسان کا چھپر ارکھا ہے اور عشق کرنے کا خواہشمند ہوں۔ لیکن میں اس سے یہ سب کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے اسے یہ سب کچھ کہہ دیا تو وہ پھر جنگلی ہرنی کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور نتیجتاً میں ناک کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گا۔

''ایڈریس کی کیا ضرورت ہے، آپ خوامخواہ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ ایسا کریں کہ اپنا ایڈریس مجھے دے دیں، جب کبھی ضرورت ہوگی میں آپ سے اپنا قرض واپس لے لوں گا۔'' میں نے صرف اتنا کہا مگر وہ بھی آخر بیسویں صدی کی ایک چالباز اور مکار لڑکی تھی فوراً میرا مطلب سمجھ گئی لیکن چونکہ میں ابھی ابھی اس پر ایک احسان کر چکا تھا لہٰذا اس نے ٹکا سا جواب دینے کے بجائے سیاسی جواب دیا، بولی۔

''میں تو کراچی میں رہتی ہوں، آپ میرا ایڈریس لے کر کیا کریں گے، ہاں میرا ہفتے میں دو تین بار حیدرآباد آنا ہوتا ہے اپنے کام کے سلسلے میں۔'' پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگی۔ ''میں انشورنس ایجنٹ ہوں، لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرتی ہوں۔ آپ نے اپنی انشورنس کروائی ہوئی ہے یا نہیں؟'' اس نے بہت ہوشیاری سے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میں بھی کتنا بڑا گھاگ ہوں۔ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا۔

''مس مونا، میرا بھی اکثر کراچی جانا ہوتا رہتا ہے، ہفتے میں ایک چکر تو لگ ہی جاتا ہے اسی لیے میں کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے اپنا پتا دے دیں ویسے اگر آپ کو اس میں کوئی اعتراض ہو تو میرا پتا لکھ لیجیے۔'' وہ مخمصے میں پڑ گئی۔ میں نے ہر طرف سے اس پر اپنا جال تنگ کر دیا تھا۔ فیصلہ اس پر ہوا کہ میں نے اس کا ایڈریس لے لیا اور اس نے میرا پتا لکھ لیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا چنانچہ میں نے اسے کراچی جانے والی بس میں سوار کروایا اور اس کی زبانی شکر گزاری کے کچھ اور جملے سننے کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا۔

مونا کے جانے کے تین دن بعد تک میں بہت بے چین رہا۔ مجھے اس کی ناک یاد آتی رہی۔ میں نے سوچا کیوں نا اس ناک کو میں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں مگر ایسا ہونا ناممکن تھا۔ مونا کی ناک کو اپنانے کے لیے مونا کو اپنانا بے حد ضروری تھا ورنہ یہ بات قطعی طور پر غیر امکانی تھی کہ وہ اپنی ناک کاٹ کر میرے حوالے کر دے۔ تین دن تک جیسے میں بھڑوں کے بستر پر لیٹتا رہا اور تتیوں کی کرسی پر بیٹھتا رہا۔ مجھے سخت بے چینی تھی کسی کل چین نہ پڑتا تھا۔ وہ ناک مجھے بار بار ڈس رہی تھی، ڈنک مار رہی تھی۔ چوتھے دن میں نے دفتر میں چھٹی کی درخواست دی اور کراچی روانہ ہو گیا۔ لیاقت آباد کے سی ون ایریا میں مونا کا مکان آسانی سے مل گیا۔ مونا کا گھر دیکھتے ہی مجھ پر وہی جنون سوار ہو گیا جس کا میں اکثر شکار ہوتا رہتا ہوں اور اسی جنون کی وجہ سے میری عقل پر بے شمار پتھر پڑ جاتے ہیں۔ مجھ پر وہی جذباتیت طاری ہو گئی جو عام طور پر طاری ہوتی رہتی ہے اور جس کا میں بُری طرح خمیازہ بھگتتا ہوں، کبھی جیل جانے کی صورت میں اور کبھی اپنے گھر سے نکل جانے کی شکل میں۔ کیونکہ میں ایک ایب نارمل جذباتی اور اوٹ پٹانگ آدمی ہوں۔ معمولی سی بات پر کچھ نہ کچھ کر گزرتا ہوں۔ اہم سے اہم فیصلے بھی گھڑی کی چوتھائی میں کرنے کا عادی ہوں چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔

مجھ پر بہت عجیب کیفیت طاری تھی۔ میں مونا کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ دروازے کو سر کی ایک زوردار ٹکر سے توڑ پھینکوں اور اندر گھس کر مونا کی ناک کو دل بھر کے دیکھتا رہوں۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھ سے کچھ بعید بھی نہ تھا کہ میں ٹکر مار ہی بیٹھوں مگر میں ٹکر نہ مار سکا۔ اس وجہ سے نہیں کہ مجھے عقل آ گئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ دروازہ خود بخود کھل گیا تھا اور دروازے کے فریم میں کسی پورٹریٹ کے مانند جڑی ہوئی مونا کھڑی تھی۔ میں اسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر دم بخود رہ گیا اور میری نگاہیں کسی ہپناٹسٹ کی طرح مونا کی ناک پر جم گئیں۔

''ارے آپ؟'' مونا کی آواز میں حیرت تھی۔ ''آپ کب آئے، آئیے اندر آئیے۔'' اس نے دروازے سے ہٹ کر مجھے اندر بُلا لیا۔

''بس ایسے ہی آنا ہو گیا۔ کراچی میں کام تھا سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔'' میں نے سفید جھوٹ بولا۔ ہم دونوں اس کے مختصر سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے اندازہ لگا لیا کہ گھر میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم بالکل اکیلی رہتی ہو؟''

"نہیں، میری بڑی بہن بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔"
"اوہ اچھا، کیا کرتی ہے وہ؟" مجھے کرید ہوئی۔
"عشق کرتی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
"ہیں، کیا مطلب؟" میری آنکھیں کسی حد تک پھٹ گئیں۔
"مطلب یہ کہ اس وقت بھی وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔"
"کتنے بوائے فرینڈ ہیں اس کے؟" میں نے گھبراہٹ میں پوچھا۔
"فی الحال تو ایک ہی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"فی الحال سے کیا مراد ہے، پہلے کئی اور بھی رہ چکے ہیں کیا؟"
"نہیں، یہ پہلا ہی ہے اور وہ بڑی مدت سے اسی ایک بوائے فرینڈ پر ڈٹی ہوئی ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ مجھے یہ صاف گوئی بہت پسند آئی۔ اگر میں بادشاہ ہوتا تو یقیناً اس وقت مونا کو پلاٹینم میں تلوا دیتا کیونکہ اس وقت میں موڈ میں تھا۔
"تمہارے کتنے دوست ہیں۔ بالکل فرینک ہو کر بتاؤ۔" میں نے اندیشوں میں گھر کر ڈرتے ڈرتے سوال کیا اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ کاش مونا اپنی اسی صاف گوئی پر قائم رہے۔
"نو بڈ پارٹنر۔" وہ ہونٹ ٹیڑھا کر کے بولی۔
"کیوں؟" میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔
"بس، کیا کریں۔ کوئی ٹرمپ کارڈ آتا ہی نہیں اپنے پاس اسی لیے نو ٹرمپ چل رہے ہیں۔"
"معلوم ہوتا ہے تمہیں برج کھیلنا بھی آتا ہے۔" میں نے مسکہ لگاتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں بالکل۔ میں بلیک وڈ اور اسٹرانگ نو ٹرمپ کھیلتی ہوں۔ تم کیا پسند کرتے ہو یہی یا اسٹے من۔"
"فی الحال تو میں کانٹریکٹ بنانا پسند کروں گا۔ البتہ شادی کے بعد ہم کلب کونشن کھیلا کریں گے۔"
"ہائیں، یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ شادی کے بعد....." وہ بھونچکا رہ گئی۔
"ہاں ڈارلنگ! اب تمہیں یہ شکایت نہیں ہونی چاہیے کہ تمہارے پاس ٹرمپ کارڈ نہیں آتے۔ ٹرمپ کا اکا تمہارے پاس خود چل کر آ گیا ہے۔ اب تمہیں نو ٹرمپ کھیلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" میں نے اس کی ناک پر آیا ہوا پسینا بڑے وقار سے پونچھتے ہوئے کہا اور اس کی ناک شرم سے سرخ ہو گئی۔

☆☆☆

شادی کے بعد مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس دنیا کا باسی نہیں رہا بلکہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہو گیا ہوں۔ عدم تحفظ کا جو احساس مجھ پر مسلط رہا کرتا تھا شادی کے بعد ختم ہو گیا تھا اور میں اپنے آپ کو ایک محفوظ چوزہ سمجھنے لگا تھا، ایک ایسا دیسی چوزہ جسے مرغی کی سرپرستی نصیب ہوتی ہے۔ اس خیال کی وجہ صرف مونا کی ناک تھی جو مجھے اپنی ماں کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ میں اس سرپرست ناک کے زیرِسایہ پرسکون زندگی گزارنے لگا۔
ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی، بہت میٹھی گزر رہی تھی کہ اچانک ایک دن تھوڑی سی تلخی پیدا ہو گئی۔ ہوا یوں کہ مونا کی انشورنس کمپنی سے نوٹس آیا کہ وہ فوراً آفس پہنچ جائے ورنہ ڈس مس کر دی جائے گی۔ میں شام کو دفتر سے گھر واپس آیا تو دیکھا کہ مونا نے اپنا سوٹ کیس تیار کیا ہوا ہے اور میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔ "خیریت، کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"کراچی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ ہمیشہ گفتگو کو مختصر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔
"لیکن کیوں؟"
"نوٹس آیا ہے آفس سے۔"
"ارے بھاڑ میں ڈالو نوکری کو۔" میں نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں کراچی وراچی جانے کی۔"
"لیکن نوید، آخر تمہیں اعتراض کیا ہے اس میں؟" اس نے تیز آواز میں سوال کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ناک سرخ ہونا شروع ہو گئی تھی۔
"یہ بھی کوئی تک ہے کہ شوہر حیدرآباد میں نوکری کرے اور بیوی کراچی میں دھکے کھاتی پھرے۔"
"اوہ، یہ بات ہے۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔ "تو پھر ایسا کرو کہ تم اپنا ٹرانسفر کراچی کروا لو، بڑا مزہ آئے گا، روز ہاکس بے جائیں گے، کلفٹن پر گھومیں گے، ہل پارک میں چہل قدمی کریں گے۔" اس نے یوں خوش ہو کر بولنا شروع کیا گویا میرا ٹرانسفر کراچی ہو چکا ہو۔
"یہ ناممکن ہے۔ میرا ٹرانسفر کراچی نہیں ہو سکتا اور پھر محض سیر و تفریح کے لیے ٹرانسفر کروا لینا میری نظر میں سراسر حماقت ہے۔ حیدرآباد میں بھی گھومنے پھرنے کی جگہیں ہیں۔ جامشورو کا خوب صورت پل ہے، رانی باغ کا پرسکون

ماحول ہے، عباس بھائی پارک کے دل ربا پھول ہیں۔''
''اچھا۔'' وہ قدرے مایوس ہو گئی۔ ''اگر تمہارا ٹرانسفر کراچی نہیں ہو سکتا تو پھر میں کوشش کرتی ہوں کہ حیدر آباد میں مجھے کوئی جگہ مل جائے۔''
''لیکن آخر کیوں؟ تمہیں نوکری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا میں مر گیا ہوں؟'' میرا پارا بغیر کسی وجہ کے چڑھنے لگا۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ میں ایک ایب نارمل آدمی ہوں۔
''اونہہ۔'' اس نے سر کو غصے سے جھٹکا دیا۔ ''وہی عام چھچھورے مردوں والی باتیں، وہی روایتی تنگ ذہنی، وہی پست سوچیں۔''
''آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟'' میں نے جوتے اتارتے ہوئے زہریلے لہجے میں پوچھا۔
''مطلب تو تمہارا میری سمجھ سے باہر ہے۔ نوکری جاری رکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟''
''اور ختم کر دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے اتنی دولت کمائی ہے کہ دو تین پشتیں آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔'' جوتے اتارنے کے بعد میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ عینک کے شیشوں کی اوٹ سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ چپ چاپ سڑی اور سوٹ کیس میں رکھے ہوئے تمام کپڑے غصے میں باہر نکال کر ڈھیر کر دیے۔ مجھے اس کا بے وقت کا غصہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ میں مسہری پر بیٹھا آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کھا جانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ جب سوٹ کیس بالکل خالی ہو گیا اور تمام کپڑے فرش پر ڈھیر ہو گئے تو مونا نے ان کپڑوں کو اپنے پیروں سے مسلنا شروع کر دیا۔ غالباً وہ اس وقت ان کپڑوں کو میرا سر سمجھ رہی تھی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اٹھا اور میں نے ایک زوردار دوہتڑ اس کی کمر پر رسید کر دیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے انگریزی میں گالی دی۔ میں نے اس کا جواب اردو کی گالیوں سے دیا اور بہت دیر تک دیتا رہا۔ جب اردو کی گالیں ختم ہو گئیں تو میں پنجابی میں شروع ہو گیا۔ وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ ابھی پنجابی کی گالیاں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اس نے سر اٹھا کر میرے چہرے پر اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ یکایک میری زبان پر بریک لگ گئے۔ وہ گالی جو میں دے رہا تھا پوری نہ کر سکا۔ میرے ہونٹ ایک دوسرے پر جم کر رہ گئے۔ اس نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور میں نے نہایت محبت سے اس کی ناک کو چھو لیا۔ ناک انگارا بنی ہوئی تھی۔
''رک کیوں گئے نوید؟'' اس کی آواز میں بڑا کرب ہو گا لیکن میں آواز کے کرب کو محسوس ہی کہاں کر رہا تھا، میری تو تمام تر ہمدردیاں اس کی ناک کے ساتھ تھیں۔ جواب میں، میں نے آگے بڑھ کر اس کی ناک کو چوم لیا۔ میرے ہونٹوں کو نمکین ذائقہ محسوس ہوا، اس کی ناک پسینے میں تر تھی۔
''یہ کیا بات ہے نوید۔ تم صرف میری ناک ہی پر کیوں پیار کرتے ہو؟ میری پوری شخصیت میں ایک صرف میری ناک ہی تو نہیں ہے۔''
میں اس سے کیا کہتا کہ اے نادان لڑکی! یہ تیری ناک ہی تو ہے جس کی وجہ سے تو میری بیوی بنی ہوئی ہے اور میرے گھر پر راج کر رہی ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ساری دنیا ناک ہی پر قائم ہے۔ اگر ناک نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ ناک ہی تو ہے جو عزت بھی دیتی ہے اور ذلیل بھی کروا دیتی ہے۔ اس ناک ہی نے تو ساری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ امریکا کی ناک ہی تو تھی جس نے برسوں ویت نام کی چہل پہل کو اجاڑے رکھا، آخر کٹ گئی۔ روس کی ناک ہی تھی جسے قائم اور اونچا رکھنے کے لیے وہ نہ صرف دنیا بلکہ خلا تک میں حکومت کے خواب دیکھتا رہا، آخر نہ روس رہا نہ اس کی ناک۔ اے میری چہیتی ناک والی بیگم، یہ تمہاری ناک ہے جو کبھی خطرناک ہو جاتی ہے، کبھی غمناک ہو جاتی ہے، کبھی نمناک اور کبھی دردناک ہو جاتی ہے۔ تم خود ہی سوچو اگر کسی چہرے پر ناک نہ ہو تو وہ کتنا عجیب لگتا ہے۔ بالکل کٹے ہوئے تربوز کی طرح۔ دوسرے یہ کہ ناک جگہ جگہ استعمال ہوتی رہتی ہے۔ محاورتاً بھی اور حقیقتاً بھی، ذرا سوچو اگر تمہارے چہرے پر ناک نہ ہوتی تو تم عینک کیسے لگاتیں۔''
میری اس بے مغز تقریر پر مونا نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔ ''تمہاری کیفیت واقعی بہت دردناک ہے۔''
جواباً میں نے پھر اس کی ناک کا بوسہ لیا۔ ویسے بھی بوسہ لینے کے بارے میں میرے خیالات عام لوگوں سے خاصے مختلف ہیں۔ آنکھوں کو چومنا میری نظر میں ایسا ہے جیسے کریلے کی کھیر پکا لینا۔ پیشانی پر پیار ضرور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ پیشانی ماں، بہن یا بیٹی کی ہو۔ یہ پیار ایک پُرتقدس پیار ہوتا ہے۔ بیوی کی پیشانی پر کبھی پیار نہیں کرنا چاہیے، اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ مونا کے رخساروں پر مہاسے بہت تھے لہٰذا یہ راستہ بھی بند۔ میں حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتا ہوں چنانچہ ہونٹوں کی بات بھی چھوڑیے۔ بس تو پھر لے دے کر ایک ناک ہی رہ جاتی ہے۔ ایک بات کا خیال رہے کہ یہ ساری باتیں میں نے اخلاقی حصار کے اندر رہتے ہوئے

بتائی ہیں، اس حصار سے میں کبھی باہر نہیں نکلتا، یہ بھی میرا اصول ہے۔

بس جناب اس معمولی جھڑپ کے بعد ہم میں مفاہمت ہوگئی اور میں نے دوبارہ مونا کی ناک کو مع مونا کے دل کی گہرائیوں سے چاہنا شروع کر دیا۔ اس نے بھی گرم جوشی سے میرا ساتھ دیا۔ طے یہ ہوا کہ مونا نوکری نہیں کرے گی گھر سنبھالے گی اور میری رشوت میں کمائی ہوئی دولت کو ٹھکانے لگاتی رہے گی۔ ہنسی خوشی گزر بسر ہونے لگی مگر اس معمولی جھڑپ نے گویا جھگڑوں کی بوہنی کر دی تھی۔ اکثر چھوٹا موٹا پنگا چھوٹتا ہی رہتا تھا۔

ہماری شادی کو چھ ماہ گزر گئے تھے۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ مونا کو خوش رکھ سکوں۔ میرا خیال تھا کہ اپنی اس کوشش میں مجھے بڑی حد تک کامیابی حاصل رہی تھی۔ میں نے اپنے نزدیک ہر ممکنہ آسائش اور خوشی مونا کو مہیا کر رکھی تھی کہ اچانک......ایک روز وہ پھٹ پڑی۔

''میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم نے مجھ سے شادی نہیں کی بلکہ میری ناک سے کی ہے۔ اگر میری ناک تمہاری ماں کی ناک سے ملتی جلتی نہ ہوتی تو تم کبھی میرے قریب نہ آتے۔ کتنے دھوکے باز ہو تم۔ چھ مہینے تک تم نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ خدا کی قسم اگر میرے اختیار میں ہوتا تو اپنی ناک کاٹ کر تمہیں پکڑا دیتی اور خود کہیں چلی جاتی۔ تمہیں مجھ سے زیادہ میری ناک کی ضرورت ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر بول رہی تھی۔

میں اس اچانک افتاد سے کافی پریشان ہو گیا۔ پھر بھی میں نے لیپا پوتی کی کوشش کی اور حقائق سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''مونا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ آخر تم میری بیوی ہو، سر سے پیر تک میری ہو اور تمہاری ناک بھی میری ملکیت ہے۔ اگر یہ میری ماں کی ناک سے ملتی ہے تو کیا ہوا۔ میں نے کبھی تمہیں ایسا تو نہیں کہا کہ ہمارا نکاح خطرے میں پڑ جاتا۔''

''نہیں، تم نے صرف میری ناک سے شادی کی ہے۔ کل رات جب تم سوتے میں بڑبڑا رہے تھے تو میں نے سب سن لیا تھا۔ تم شاید خواب میں اپنی ماں سے مخاطب تھے اور کہہ رہے تھے، خدا گواہ ہے کہ مونا میں اس کی ناک کے علاوہ کچھ نہیں۔ اماں اگر اس کی ناک تمہاری ناک کی یاد نہ دلاتی تو خدا کی قسم ساری عمر کنوارا رہتا۔''

مجھے یاد آگیا۔ واقعی میں نے اس قسم کا خواب دیکھا تھا اور آنکھ کھلنے پر مونا کی ناک کو اپنے ہاتھ میں پایا تھا جسے میں بہت پیار سے سہلا رہا تھا۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ اب اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ میں مسہری پر لیٹ گیا اور مسکرانے لگا۔ میری مسکراہٹ نے مونا کو سیخ پا کر دیا۔ وہ بھڑک اٹھی اور دیر تک بھڑکتی رہی۔ میں مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کی ناک نے کئی رنگ بدلے اور اب وہ غصے کے رنگ میں تھی یعنی لال سرخ۔ وہ جانے کیا کچھ بکتی رہی مگر میں ناک کی خوب صورتیوں میں گم رہا اور مسکراتا رہا۔ ہوں نا ایک ایب نارمل۔

اس مختصری ناک نے میرے اور مونا کے درمیان آگ کا سمندر بھڑکا دیا۔ اسے پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ میرے لیے اس کی ذات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس کی ساری عزت، وقعت اور اہمیت اس کی ناک سے وابستہ ہے۔ اگر وہ بہادر اور ضدی ہوتی تو یقیناً اپنی ناک کو کاٹ ڈالتی اور پھر مجھ سے پوچھتی کہ اب مجھے اپناؤ گے یا نہیں۔ لیکن شکر ہے کہ نہ وہ بہادر تھی اور نہ ضدی۔

ایک روز اتفاق سے میں شام پانچ بجے کے بجائے دوپہر بارہ بجے ہی دفتر سے گھر واپس آگیا۔ طبیعت میں گرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ گھر پہنچا تو میں نے اپنے گھر کو کسی پیشہ ور افسانہ نگار کے پیٹ کی طرح خالی پایا۔ مونا غائب تھی۔ میں سارے گھر میں اسے ڈھونڈتا پھرا۔ وہ تو نہ ملی البتہ اس کا ایک خط ضرور مل گیا جو میرے نام تھا۔ لکھا تھا۔

''نوید صاحب! خوش رہیے اور میری جیسی ناک والی کسی لڑکی کی تلاش شروع کر دیجیے کیونکہ میں اپنی مرضی سے خالد کے ساتھ جا رہی ہوں۔ جب ہم دونوں اس شہر سے بہت دور چلے جائیں گے تو میں آپ کو اپنا پتا لکھ دوں گی، آپ طلاق نامہ بھیج دیجیے گا۔ اس شہر میں اب اس لیے نہیں رہ سکتی کہ خالد کا یہاں بالکل دل نہیں لگتا، اسے یہ شہر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں آپ کے سامنے بھی گھر چھوڑ کر جا سکتی تھی، منہ در منہ بھی طلاق کا مطالبہ کر سکتی تھی مگر آپ ایب نارمل آدمی ہیں خدا جانے کیا کر بیٹھیں۔ بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے طلاق نامہ تیار کر رکھیے، خدا حافظ، مونا۔''

خط پڑھ کر میرا پورا جسم کڑھاؤ بن گیا اور خون اس کڑھاؤ میں کھولنے لگا۔ اگر خالد اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دیتا۔ آستین کا سانپ میرا اسسٹنٹ تھا اور اکثر گھر آیا جایا کرتا تھا۔ مجھے سان گمان بھی نہیں تھا کہ وہ میری بیوی کو لے اڑے گا اور ابھی ڈیڑھ ماہ قبل ہی تو کم بخت کی ماں مری تھی جس کی فاتحہ پر میں اور مونا دونوں گئے تھے۔ آج کل وہ اپنی ماں کے

چالیسویں کے سلسلے میں کئی دن کی چھٹی پر تھا۔ حرام خور اپنی ماں کا چالیسواں میری بیوی کو اغوا کر کے منا رہا تھا۔

میرا دل کہتا تھا کہ مونا بے قصور ہے۔ ایسی ناک کی مالک عورتیں اس قسم کی حرکت کر ہی نہیں سکتیں۔ مجھے پورا پورا یقین تھا کہ خالد نے ہی مونا کو ورغلایا ہوگا۔ مجھے مونا پر ذرا بھی غصہ نہیں تھا البتہ خالد کی تکّا بوٹی کر دینا اس وقت میری زندگی کی آخری خواہش تھی۔ میں نے اپنا بتیس بور کا ریوالور نکالا اور خالد کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں جانتا تھا وہ دونوں اس خیال میں ہوں گے کہ میں پانچ بجے گھر واپس آؤں گا اور اس وقت وہ گھر سے بھاگنے کی تیاری مکمل کر رہے ہوں گے۔ سارے راستے میں یہی پروگرام بناتا رہا کہ خالد پر کتنی گولیاں کہاں کہاں برساؤں گا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس کے جسم کے کسی حصے کو گولیوں سے مبرا نہ رکھوں گا۔ ایسا عبرتناک انتقام لوں گا کہ آئندہ کوئی کسی کی بیوی کو بھگانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اسی خیال سے میں نے کارتوسوں کی پیٹی بھی کمر سے باندھ لی تھی۔

جب میں خالد کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ خالد کی کار گھر کے باہر کھڑی ہے، کار کی چھت پر جنگلا لگا ہے اور جنگلے پر سامان لدا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھ پر پھر خون سوار ہوگیا۔ میں تیزی سے اندر کی طرف بڑھا مگر پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے مونا اور خالد کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہ دونوں سامان کی پیکنگ میں مصروف تھے اور ہنس ہنس کر اطمینان سے باتیں کرتے جارہے تھے۔ دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

میں نے ریوالور والا ہاتھ بلند کیا اور کھڑکی میں سے ہی خالد کا نشانہ لیا لیکن اس سے پہلے کہ میں گولی چلاتا وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور اٹیچی میں سامان رکھنے لگا۔ صوفے کی پشت میرے اور اس کے درمیان آگئی تھی اور نشانہ لینا مشکل تھا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا، میں نے نشست باندھی مگر اس بار مونا نادانستگی میں خالد کے سامنے ہوگئی۔ میں نے غصے میں اپنے ہونٹ چبا لیے۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے دوبارہ موقع ملا لیکن میرے فائر کرنے سے پہلے وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں پھر انتظار کرنے لگا۔ جب وہ دوسرے کمرے سے برآمد ہوا تو میرے لیے اس کا نشانہ لینا بہت دشوار تھا کیونکہ اس نے ایک ... آدم تصویر اٹھا رکھی تھی اور وہ اس کے پیچھے کافی حد تک چھپ گیا تھا صرف اس کی ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' مونا نے اس سے پوچھا۔ میں نے اس انداز میں نشانہ لے لیا تھا کہ جیسے ہی وہ تصویر کو نیچے رکھے میں تاک کر گولی چلادوں اور اس کے سر کا وزن ایک چھٹانک بڑھا دوں۔

''اسے بھی ساتھ لے چلیں گے۔ یہ میری ماں کی تصویر ہے۔'' خالد نے مونا کو جواب دیا۔ ہاں، اور الو کے پٹھے تو ماں کا چالیسواں کتنی دھوم دھام سے منا رہا ہے۔ میں نے زیر لب اس کو خوب گالیاں دینے کے بعد دل ہی دل میں کہا۔ میری انگلی ٹریگر پر جمی ہوئی تھی اور نظریں خالد پر جو تصویر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں اس لمحے کا بے قراری سے منتظر تھا کہ وہ تصویر رکھ کر اس کی اوٹ سے نکل آئے۔ وہ تصویر رکھنے کے لیے مڑا اور چند گھڑیوں کے لیے تصویر کا رخ میری طرف ہوگیا۔ پھر اس نے تصویر رکھ دی، کچھ دیر کھڑا ہاتھ جھاڑتا رہا اور پھر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے گولی نہیں چلائی۔ اپنا ریوالور جیب میں رکھا اور آہستہ آہستہ واپس آگیا۔ میرے ہونٹوں پر دعا چل رہی تھی کہ خدا انہیں خوش رکھے، سکون دے۔ گھر آکر میں نے طلاق نامہ تیار کیا اور اپنے وکیل کو دے دیا تاکہ مونا جب بھی اسے طلب کرے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے بعد میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ ریلوے اسٹیشن سے لاہور کا ٹکٹ کٹایا اور ماڈل ٹاؤن کی روپہلی فضاؤں کو یاد کرتے ہوئے لاہور کی جانب رواں دواں ہو گیا جہاں میری ماں تھی، والدین تھے، بہن بھائی تھے۔

آپ یقیناً مجھے ایک بے حس اور بے غیرت آدمی سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں بہت حساس ہوں۔ میں نے خالد پر صرف اس لیے گولی نہیں چلائی تھی کہ اس کی ماں کی تصویر دیکھ چکا تھا۔

خالد کی مرحومہ ماں کی ناک بھی بالکل مونا کی ناک جیسی تھی۔ پھر بھلا میں کیسے خالد کو قتل کر دیتا۔ وہ تو پہلے ہی مظلوم ہے۔ اسے بھی ایک سرپرست ناک کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے لیے قربانی دے دی صرف اسی وجہ سے کہ اس کی ماں مر چکی ہے اور میری ماں خدا کے فضل سے حیات ہے۔ اللہ کرے اسے میری عمر بھی لگ جائے۔ مجھے امید ہے مونا، خالد کی ماں کی کمی کافی حد تک پوری کر دے گی جیسے اس نے میری ماں کی کمی پوری کی تھی۔ شاید آپ کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔ آئے گی بھی نہیں۔ میں نے پہلے کہا نا کہ میں ایک ایب نارمل آدمی ہوں۔

ادھورا مشن

تنویر ریاض

صبر آزما کام انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے... اگر مسلسل اس انداز کو برقرار رکھا جائے تو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے... صنفِ نازک کے ہاتھوں اور جسمانی مشقت کے کمالات... وہ رِنگ میں اپنی مخالف حریف کو شکست و فتح سے دوچار کرتی تھی... ایک سُپر اسٹار ریسلر بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر تھا کہ اچانک ہی تیز آندھی نے زندگی کی سانسوں کو اکھاڑ کے رکھ دیا۔

موت کے معمے کی کھوج میں ایک ہمدرد کا نہ تھکنے والا سفرِ مشن

ایرلین اسٹارک نے ہمیشہ وہی کیا جو اس سے کہا گیا۔ اس کے خاندانی گھوڑوں کے فارم کو چلانے کے لیے ضروری تھا کہ گھر کے تمام افراد کام کریں خواہ ان کی عمر اور جسامت کچھ بھی ہو۔ جب وہ، اس کا جڑواں بھائی ارل اور چھوٹی بہن میرلین پیٹ بھر کھانا کھا سکتے تھے تو کام کرنے میں بھی انہیں کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اجتماعی کام کا وہ جذبہ تھا جس پر ایرلین مذہب کی طرح اعتقاد رکھتی تھی۔ اس محنت و مشقت کی بدولت اس کا جسم بھی بھائی اور اس کے

دوستوں کی طرح مضبوط ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اس محنت اور امتحان میں اچھے نمبر آنے کی صورت میں اس کا باپ کارل اسٹارک بھی کبھار اپنے بچوں کو تیس میل دور واقع بڑے شہر میں کشتی کے مقابلے دکھانے لے جاتا تھا جس سے وہ خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ارل اور میرلین اپنے پسندیدہ ہیروز کو جیتتا ہوا دیکھ کر تالیاں بجاتے لیکن ایرلین خاموش بیٹھی سحر زدہ ہو کر اپنی پسندیدہ شخصیات کو اکھاڑے میں ایک دوسرے پر غراتے اور جھپٹتے ہوئے دیکھا کرتی۔

یہ بات نہیں کہ اس کی زندگی میں محبت کی کمی تھی یا کسی نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دونوں بہنوں میں بہت پیار تھا اور وہ ایک ہی بستر پر سوتی تھیں۔ ماں باپ بھی اس کا خیال رکھتے۔ وہ سارا دن گھوڑوں میں مگن رہتی لیکن اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی تھی اور اسے امید تھی کہ شہر جانے اور کشتیاں دیکھنے کے دوران شاید یہ خلا پُر ہو جائے اور اسے وہ توجہ مل جائے جس کی وہ مستحق تھی۔

موسم سرما کے آخر میں خواتین ریسلرز کی شہر میں آمد خصوصی توجہ کا مرکز بن گئی اور ایرلین کو پہلی مرتبہ کاؤنٹیش ویرونیکا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ متضاد خوبیوں کا مجموعہ تھی اور پرستار بیک وقت اس سے محبت اور نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس ایرلین اس جیسا بننا چاہتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں سے مختلف تھی جو فلم اسٹارز کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش مند تھیں، وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ اس انداز میں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی طاقت اور خوب صورتی کی دھوم مچ جائے۔

اس شام مقابلے ختم ہونے کے بعد کارل اور اس کے بچے پارکنگ لاٹ میں ان مداحوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے جنہیں امید تھی کہ وہ کسی ریسلر کا آٹوگراف لینے یا اس سے مصافحہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کچھ دیر بعد ویرونیکا اپنے جسم کو اونی کوٹ میں چھپائے اور سر کے بالوں کو ہیٹ سے ڈھانپے باہر آئی۔ رنگ میں اپنے رویے کے باعث وہ خاصی نرم مزاج نظر آرہی تھی۔ ایرلین ہمت کر کے آگے بڑھی اور اپنی کاپی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میم، کیا تم مجھے آٹوگراف دو گی۔ تم بہت خوب صورت اور طاقتور ہو۔ میں بھی تمہاری طرح ریسلر بننا چاہتی ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے بچی؟" ویرونیکا نے اس کی آٹوگراف پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"ایرلین۔ ایرلین اسٹارک۔ اوہ میرے خدا۔ یقین نہیں آرہا کہ میں تم سے مخاطب ہوں۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"پندرہ، لیکن جولائی میں سولہ کی ہو جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے جب تم اسکول کی تعلیم مکمل کر لو تو میرے پاس آنا پھر ہم اس بارے میں بات کریں گے۔"

ایرلین نے اپنے باپ کو اس دعوت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ ایرلین نے فارم کے معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ ایک سال اور گزر گیا اور ایک دن ایرلین کاؤنٹیش ویرونیکا کے پاس پہنچ گئی۔

ویرونیکا کی ریسلنگ اکیڈمی دیکھ کر اسے خاصی مایوسی ہوئی جو ایک تنگ و تاریک جگہ پر واقع تھی اور وہاں کا ماحول دیکھ کر بہت سے ریسلنگ سیکھنے کے خواہش مند مایوس ہو کر جا چکے تھے لیکن ایرلین کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس میں سیکھنے کی لگن تھی اور اس کی وجہ سے اس نے ان جسمانی سزاؤں کو بھی نظرانداز کر دیا جو سیکھنے کے عمل کا حصہ تھیں۔

بہت جلد اس نے کشتی کے فن میں مہارت حاصل کر لی اور اس قابل ہو گئی کہ چھوٹے موٹے مقابلوں میں حصہ لے کر اکیڈمی کی آمدنی میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے تھوڑی بہت رقم گھر بھیجنا شروع کر دی تاکہ گھر چھوڑنے کی وجہ سے اس کے خاندان کو جو دکھ ہوا تھا اس کا کچھ مداوا ہو سکے لیکن ایک روز اس کا بے جان جسم ایک کچی سڑک کے کنارے پایا گیا جس پر مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔

سراغ رساں بروک مہمان خانے کی بینچ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس تنگ و تاریک قید خانے میں قیدی اور محافظ کس طرح سانس لیتے ہوں گے۔ جس کی دیواریں سیل زدہ، رنگ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا اور فضا میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یہاں بڈ سے ملنے آیا تھا جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کا وزن بہت کم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کی رونق ماند پڑ چکی تھی اور سیاہ چمکیلے بالوں میں جگہ جگہ سفیدی جھانک رہی تھی۔ بڈ نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔ "کچھ معلوم ہوا؟"

بروک نے اپنی جیب سے البامادیکلی کا تراشہ نکالتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ مضمون کہاں سے ملا؟"

"میری کوٹھری میں جو دوسرا قیدی ہے۔ اس کی بیوی لے کر آئی تھی۔ میں اس میں کوئی اسپورٹس اسٹوری تلاش کر رہا تھا کہ میری نظر اس آرٹیکل پر پڑ گئی۔"

''تم اس بارے میں جاننے کے لیے اتنے بے چین کیوں ہو؟''

''اس شو میں میرے کچھ دوست بھی تھے۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''گویا تم اس لڑکی کو خاتون ریسلر ہونے کی وجہ سے جانتے ہو؟''

''ہاں۔ میں ایولین کو جانتا ہوں۔''

''اس کا اصلی نام ایرلین اسٹارک ہے لیکن وہ تو عمر میں تم سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کا تمہارا کیا جوڑ؟''

''وہ اس وقت آئی جب میں وہاں سے نکل رہا تھا پھر بھی اس کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے اردگرد رہنے والوں کی خاطر خود کو بدل لیتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ ویرونیکا کے اسکول میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو کئی ماہ تک تربیت دیتے ہیں لیکن ہر طرح کی سختی اور مشقت برداشت کرنے کے باوجود ایولین کے جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جب ویرونیکا کو یقین ہوگیا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی تو اس نے ایولین کو ملازمت دے دی۔''

''تم ویرونیکا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پولیس کیا کہتی ہے؟''

''جب انہوں نے اس کی لاش دریافت کی تو وہ چوبیس گھنٹے پہلے مرچکی تھی۔ اس کا اناڑی پن سے آپریشن کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ قانون کی نظر میں یہ قتل ہے۔''

''وہ آپریشن کس نوعیت کا تھا؟''

''تمہارے خیال میں کیا ہوسکتا ہے۔ شاید اس کی جان بچ جاتی، اگر اسے کسی اچھے اسپتال میں لے جایا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پولیس جاننے کی کوشش کررہی ہے کہ یہ آپریشن کس نے کیا تھا۔ ویرونیکا نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ جب ایولین کی لاش دریافت ہوئی، اس سے ایک دن پہلے وہ انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

بڈ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بروک نے کہا۔ ''تمہارے خیال میں کیا ہوا ہوگا۔ اور اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ایک ہی بات ہے۔ انہوں نے اسے براہ راست قتل کرنے کے بجائے ایک قسائی کے پاس بھیج دیا۔ لیکن اب ہم اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو ان لوگوں کا پیچھا ضرور کرتا جنہوں نے اسے اس طرح مرنے دیا اور اب میں تم سے بھی چاہتا ہوں۔ اس کے قاتلوں کا پتا لگانا بہت ضروری ہے۔''

''پہلے تم مجھے ویرونیکا کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کون ہے اور اس کے پس پردہ عزائم کیا ہیں۔ پھر دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔''

☆☆☆

بروک کی فہرست میں پہلا نام اسٹارک کے فارم کا تھا۔ وہ ہفتے کی صبح وہاں پہنچا اور اپنی کار سے اتر کر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ پہلی ہی نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا کہ فارم کی دیکھ بھال مناسب انداز میں نہیں ہورہی۔ دیواروں کا رنگ اتر چکا تھا اور جگہ جگہ کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ آخری سرے پر ایک چھوٹا سا دفتر تھا جس کے باہر ایک بڑے سے بلیک بورڈ پر چاک سے مختلف خدمات کے نرخ لکھے ہوئے تھے۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے ہوتا ہوا اندر چلا گیا۔ وہاں ایک بوڑھا شخص میز پر دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اس نے بروک کی کار کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس لیے بروک کو اپنے سامنے دیکھ کر چونکتے ہوئے بولا۔

''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

بروک نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دکھایا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیپٹل پولیس، تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''تمہاری بیٹی کی موت کے سلسلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تمہارے دائرۂ اختیار میں نہیں آتا۔''

''نہیں لیکن ہمیں کچھ ایسے اشارے ملے ہیں جو ہم الباما کی پولیس سے شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں معلومات حاصل کی جارہی ہیں۔''

اسٹارک منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''اس گروپ کے بارے میں کیا جانتے ہو جن کے ساتھ ایولین کام کررہی تھی۔''

''اس کا نام ایرلین تھا۔''

''معاف کرنا۔ لوگ شو بزنس میں جاکر اپنا نام بدل لیتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اس گروپ کے بارے میں کچھ جانتے ہو یا ایرلین نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی؟''

''اس کے یہاں سے جانے کے بعد میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی۔ تمہیں اس کی ماں یا بھائی سے بات

کرنا ہوگی۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ یہاں سے ایسے چلی گئی جیسے کوئی بچہ میلہ دیکھنے جاتا ہے اور اس نے ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا۔''

''تم نے پولیس والوں کو بتایا تھا کہ اس نے ایک مرتبہ کچھ رقم بھی گھر بھیجی تھی۔''

''ہاں، اس کے علاوہ اس کی ایک چھوٹی سی انشورنس پالیسی بھی تھی جس سے صرف اس کی تدفین کے اخراجات ہی پورے ہوسکے۔''

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی کمر پکڑ لی اور درد سے کراہنے لگا۔ پھر بولا۔ ''مجھ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اندر جاؤ اور جو پوچھنا ہے وہ میری بیوی سے پوچھو۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس لڑکی کو کشتی دکھانے شہر کیوں لے گیا تھا۔''

اس کی بیوی کا علیحدہ دفتر تھا۔ اس نے بروک کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی اور خود اس کے سامنے دونوں بازو سینے پر باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ جوانی میں خوب صورت رہی ہوگی لیکن اب اس کا جسم پھیل گیا تھا اور وہ شوہر کے مقابلے میں زیادہ صحت مند نظر آرہی تھی۔

''ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے رہتے تھے۔'' اس نے بروک کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سے انکار نہیں کرسکتی کہ اس نے کارل کا دل توڑا لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہمارے سخت رویے کی وجہ سے ہی وہ واپس نہیں آئی۔''

''اس نے کسی ایسی تکلیف کا ذکر کیا جس کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہو؟''

''صاف صاف تو نہیں۔ البتہ اس کے دل میں کارل کے لیے اچھے جذبات نہیں تھے۔ وہ اپنے خطوں میں زیادہ تر ان شہروں اور قصبوں کا ذکر کرتی تھی جہاں اس کا جانا ہوتا تھا یا ان لوگوں کا تذکرہ کرتی جن کے ساتھ وہ کام کررہی تھی لیکن مجھے لگتا تھا کہ وہ بین السطور کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ مجھے لگا کہ اسے وہ زندگی نہیں ملی جس کی اسے توقع تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اگر وہ مطمئن نہیں ہے تو واپس آجائے۔ اس کے بعد اس کے خطوط کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔''

''اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ دوبارہ گھر نہیں جا سکتی تھی؟''

''میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن کارل اس سے بالکل مایوس ہوگیا تھا۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ اس نے اپنے خطوط میں کچھ لوگوں کا بھی ذکر کیا تھا؟''

''ہاں، پہلے وہ کاؤنیش کے بارے میں بہت لکھا کرتی تھی۔ وہ ایسی ہے۔ وہ ویسی ہے، پھر آہستہ آہستہ اس کا ذکر کم ہوتا گیا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب حقیقی رنگ سامنے آگئے ہیں۔ میری نظر میں وہ تقریباً محبوس ہوچکی تھی۔ اس کے خطوط میں دوسری لڑکیوں اور مرد پہلوانوں کا تھوڑا بہت ذکر ہوتا لیکن کاؤنیش بالکل غائب ہوچکی تھی۔''

''کیا ان میں سے کسی مرد کے ساتھ اس کا کوئی تعلق تھا؟''

''اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ویسے ہمیشہ ہی خاندان کے مردوں کی جانب اس کا جھکاؤ رہا ہے۔ اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔''

''ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں ملا کہ وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث تھی؟''

''نہیں۔''

''کیا وہ خطوط تمہارے پاس ہیں جو اس نے تمہیں بھیجے تھے؟''

''میں نے ان کا بنڈل بنا کر رکھا تھا لیکن کارل نے اس کی تدفین کے بعد انہیں جلا دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ بیٹی کے مرنے کے بعد سب کچھ ختم ہوگیا۔''

''تمہارے شوہر نے بتایا ہے کہ ایریلین کی موت پر انشورنس کی کچھ رقم بھی ملی تھی؟''

''ہاں، شاید اسے ڈر تھا کہ کسی دن اسے کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنا انشورنس کروایا تھا۔ وہ رقم بس اتنی ہی تھی کہ اس سے تدفین کے اخراجات پورے ہوسکے۔''

''اس کے پاس کچھ نقد رقم نہیں تھی؟''

''نہیں، البتہ پولیس کو ایک دوسری انشورنس پالیسی کے بارے میں ضرور معلوم ہوا تھا۔''

بروک یہ سن کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ شیرف کے دفتر اور مقامی سراغ رسانوں سے اس کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تھی، اس میں اس دوسری پالیسی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا چنانچہ اس نے کارل کی بیوی سے پوچھا۔

''تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''سراغ رساں کا خیال تھا کہ ہم اس سے کچھ چھپا رہے ہیں چنانچہ اس نے خود ہی ایریلین کے سامان کی تلاشی لی۔ بہر حال وہ پالیسی پہلی والی کے مقابلے میں کافی بڑی تھی اور اس نے ریسلنگ گروپ کو اپنا وارث بنایا تھا۔ لگتا ہے کہ وہاں کی تمام لڑکیوں کو اس میں سے حصہ ملا ہوگا۔''

بروک سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کاؤنیش اور اس کے عملے

نے انشورنس کی رقم وصول کرلی ہوگی۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔

"کیا ایرلین اپنے بھائی اور بہن سے رابطے میں تھی؟"

"ارل کی اس سے کبھی کبھی سرِراہ ملاقات ہوجاتی تھی جب وہ گھوڑے فروخت کرنے جایا کرتا تھا۔ میرلین اپنے باپ پر گئی ہے۔ بڑی بہن اسے الگ سے خط اور تصویریں بھیجا کرتی تھی لیکن اس نے کبھی جواب نہیں دیا۔"

"میں میرلین سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور ارل سے بھی۔ وہ کب تک واپس آئے گا؟"

مسز اسٹارک کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "یقیناً تم ہی بہتر طور پر معلوم کرسکتے ہو کہ ہماری لڑکی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

میرلین کی عمر بمشکل پندرہ برس ہوگی لیکن صحت مند ہونے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بروک کو دیکھ کر منہ بنایا اور بولی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم لوگوں نے اس کیس کو بند کردیا۔"

"اگر یہ بات ہوتی تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔" بروک نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس ایرلین کے کچھ خطوط ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے یہ جاننے میں مدد مل سکتی ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

"تم سمجھتے ہو کہ اس نے چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں کچھ بتایا ہوگا۔"

"شاید نہیں لیکن لوگ بالواسطہ کچھ باتیں کہہ دیتے ہیں۔ تمہاری مما کا خیال ہے کہ وہ کچھ چھپا رہی تھی۔"

"اس کے خط بھی ان تصویروں کی طرح دلچسپ ہوتے تھے جو وہ مجھے بھیجا کرتی تھی لیکن ان میں ہمیشہ مجھے ایک تلخی محسوس ہوئی۔"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"ان میں کچھ ایسے اشارے ہوتے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ گھر سے دور ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور یہ کہ میں ایسی غلطی نہ کروں۔"

"کیا تم نے اس کے کسی خط کا جواب دیا اور اپنے والدین سے یہ بات چھپائی؟"

"میں نے اسے کوئی خط نہیں لکھا جبکہ مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا اب بھی تمہارے پاس وہ خط موجود ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی مما کے خطوط کے ساتھ جلا دیے گئے تھے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان سے کوئی مدد مل سکتی تھی۔ ان میں کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا لیکن مجھے ان کا جواب دینا چاہیے تھا۔ شاید اس طرح وہ گھر آجاتی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ "میں نے اس کی تصویر جلنے سے بچالی تھی۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب سے والٹ نکال کر کھولا۔ بروک نے سیاہ بالوں والی خوب صورت لڑکی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دیکھی اور تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "اچھی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد بھی تمہارا بھائی اس سے ملتا رہتا تھا۔ کیا اس نے تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"اس کے سوا کچھ نہیں بتایا کہ وہ اچھی زندگی بسر کررہی ہے۔ اس نے ہمارے لیے کچھ پیسے بھی اسے دیے تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ کیسے مرگئی؟ یہاں کوئی مجھے نہیں بتائے گا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اسکول میں بچے جو کہہ رہے ہیں، کیا وہ سچ ہے؟"

بروک ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہی کہ اس نے ابارشن کروایا تھا اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مرگئی۔"

میرلین نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا جیسے چاہ رہی ہو کہ بروک اس کی تردید کردے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

بروک کا اندازہ تھا کہ اگر ارل اسٹارک گھر آیا تو اس کی واپسی رات سے پہلے نہیں ہوگی۔ اس کی رہائش فارم سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ چھوٹے سے کیبن کے باہر ایک پرانی پک اَپ ٹریلر کے ساتھ بندھی ہوئی کھڑی تھی۔

بروک نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا دفتر تک گیا اور وہاں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت کو اپنا کارڈ دکھایا اور بولا۔ "مجھے ارل اسٹارک سے ملنا ہے۔"

"وہ قصبے کی طرف گیا ہے۔ وہاں ایک بار ہے۔ وہ وہیں ملے گا۔"

بروک اس کا شکریہ ادا کرکے اس کے بتائے ہوئے پتے پر چل دیا۔ عمارت کا بیرونی حصہ ایک ریسٹوران کا منظر پیش کررہا تھا جس پر جیکب کا نیون سائن جگمگا رہا تھا جبکہ بار اس کے عقب میں تھا۔ وہ میزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا عقبی

ہال میں پہنچا جہاں ایک لڑکا بار اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔
''میں گھوڑوں کے سلسلے میں ایک شخص سے ملنے آیا ہوں۔'' بروک نے کہا۔
''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔
''میں ارل اسٹارک کے ایک گھوڑے کی بات کرنا چاہتا ہوں جو برائے فروخت ہے۔''
لڑکے نے انگوٹھے سے پیچھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ بروک نے ہال کے آخری سرے پر لگے دروازے کے پیچھے سے آتی ہوئی آوازیں سنیں اور جب اسے کھولا تو یہ آوازیں اور واضح ہو گئیں۔ وہ دروازے میں کھڑا کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی نظریں ایک چہرے پر جم گئیں۔ جس کی شکل اس تصویر سے بہت مل رہی تھی جو اسٹارک کی بیوی نے اسے دکھائی تھی۔ اس نے چیک کی کاؤبوائے قمیص اور نیلی جینز پہن رکھی تھی اور اس کا حلیہ وہی تھا جو موٹیل کے استقبالیہ پر بیٹھی عورت نے بتایا تھا۔
ارل کے ہاتھ میں بیئر کا گلاس تھا اور وہ کان لگائے ایک سرخ چہرے والے شخص کی باتیں سن رہا تھا جو دیکھنے میں ہی عادی شرابی معلوم ہو رہا تھا۔ بروک نے اس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔ ''ارل، ارل اسٹارک۔''
ارل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری مما نے بتایا تھا کہ تم مجھے یہاں مل سکتے ہو۔''
ارل کے چہرے پر سختی نمودار ہو گئی اور وہ بولا۔ ''میری مما اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ تم کون ہو؟''
''میرا نام ایل بروک ہے اور میں اس قصبے میں اجنبی ہوں۔ دراصل موٹیل کے استقبالیہ پر بیٹھی عورت نے مجھے یہاں کا راستہ دکھایا تھا۔''
ارل کے برابر میں بیٹھا ہوا شخص بھی خاموش ہو گیا تھا اور اب اس کی ساری توجہ بروک پر تھی۔
''کیا ہم باہر چل سکتے ہیں؟'' بروک نے کہا۔ ''مجھے ایرلین کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔''
ارل کی ساری خوش اخلاقی غائب ہو گئی اور وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''کیا تم پولیس والے ہو؟''
''ہاں لیکن میں یہاں تمہیں اپنا کارڈ نہیں دکھا سکتا۔''
ارل نے اسے گھورا پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا جان، میں واپس آ کر تم سے بات کرتا ہوں۔''

باہر آ کر وہ دونوں کھڑی ہوئی کاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سڑک کے کنارے لگے ہوئے کھمبے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ارل نے ایک بار پھر بروک سے کارڈ مانگا اور اسے دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تمہارا تعلق کیپٹل پولیس سے ہے۔ تم اس معاملے میں کیوں پڑ گئے؟''
''تمہارے باپ نے بھی یہی ردعمل ظاہر کیا تھا لیکن ماں نے میری بات غور سے سنی۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں ہمیں مقامی پولیس کی مدد کرنا ہوتی ہے۔''
یہ سن کر ارل کچھ نرم پڑ گیا۔ بروک نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم خاندان کے واحد فرد ہو جس کا ایرلین سے اس کے گھر سے چلے جانے کے بعد بھی براہِ راست رابطہ رہا۔''
''میں جب بھی کام کے سلسلے میں کسی ایسی جگہ جاتا جہاں اس کا شوہر رہا ہوتا تو اس سے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا، اس پر مجھے کوئی غصہ نہیں تھا کیونکہ فارم کچھ عرصے سے نقصان میں جا رہا تھا۔''
''اسی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی؟''
''اس نے یہ بات کبھی نہیں کہی۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے دل میں ایک بڑی ریسلنگ اسٹار بننے کی خواہش تھی۔''
''تم نے اسے آخری بار کب دیکھا؟''
''موسم بہار۔ اپریل کے مہینے میں۔ وہ رچمنڈ جا رہے تھے۔''
''وہ کیسی دکھائی دے رہی تھی؟''
''اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو خوش ظاہر کرتی تھی۔''
''ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتایا جن کے ساتھ وہ کام کرتی تھی؟''
''اس نے مجھے ان لوگوں اور خاص کر انتظامیہ کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ وہ ایک لڑکی سے بہت قریب ہو گئی تھی اور اسے بھی مجھ سے ملانا چاہ رہی تھی۔''
''اس کی کوئی خاص وجہ؟''
''ویسے تو اس کے بہت سے لوگوں سے اچھے تعلقات تھے لیکن اس لڑکی سے ملوانے کا مقصد اس پر یہ ظاہر کرنا ہو کہ اس کا بھی ایک خاندان ہے یا مجھے دکھانا چاہ رہی ہو کہ اس کے کچھ اچھے دوست بھی ہیں۔''
''گویا سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا؟''
''میں نہیں جانتا لیکن یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ان لڑکیوں سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔''

''میرے پاس بھی ایسی ہی اطلاعات ہیں لیکن تم نے یہ بات کیوں کہی؟''

''انہیں جوتے کی نوک پر رکھا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ چار لڑکیوں کو ایک سستے ہوٹل کے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ انہیں ناقص خوراک دی جاتی اور کسی وقفے کے بغیر لگاتار دو شو کرنا ہوتے تھے اور جب شو نہ ہو رہا ہوتو وہ لڑکیاں اس ریسلنگ اسکول میں خدمات انجام دیا کرتیں جو ان کی مالکن چلا رہی تھی۔''

''لیکن ایرلین نے تو خاصی رقم گھر بھیجنے کے علاوہ انشورنس پالیسی بھی خریدی تھی۔''

ارل ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ سب کیسے کیا؟''

''جب تم آخری بار اس سے ملے تو اس کے ساتھ کوئی دوست تھی؟''

''ہاں، اینجل وائٹ۔ یہ اس کا اصل نام نہیں ہوگا اور ہو بھی سکتا ہے۔'' وہ افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا تم اینجل سے رابطے میں ہو؟''

''نہیں، میں اس سے صرف ایک ہی بار ملا تھا۔''

''ہم دوبارہ انتظامیہ کی طرف آتے ہیں۔'' بروک بولا۔ ''اس میں کاؤنیش کے علاوہ اور کون لوگ تھے؟''

''ان کے دفتر میں ایک عورت تھی جو اسکول کے عقب میں واقع تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بکنگ ایجنٹ اور ایک شخص وہیل چیئر پہ تھا۔''

''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

''میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا نام بھی دوسرے لوگوں کی طرح دلچسپ تھا، اسمائیلی۔ ایرلین اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔''

''اسمائیلی روز۔'' بروک نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ ہوگا جبھی تم اس کا نام جانتے ہو۔''

بروک اسے کیا بتاتا کہ بڈ چل نے ہی اسے وہیل چیئر تک پہنچایا تھا۔ یہی ایک سزا تھی جو وہ اپنے بیٹے کے قتل کے سلسلے میں اسے دے سکتا تھا۔

''نہیں، میں اس ریکارڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' بروک جلدی سے بولا۔ ''لڑکیوں سے کم اجرت کے عوض کام لینے کے علاوہ وہاں اور کیا ہو رہا تھا؟''

ارل نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کاش وہ مجھے یہ نہ بتاتی کہ وہ لوگ اس سے کیا توقع کررہے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس سے ہمارے آپس کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ اچھا نہیں لگے گا اگر میں اس کے الفاظ دہراؤں۔''

''اس نے کیا بتایا تھا؟''

''ان لڑکیوں کے بارے میں جنہیں ایسے مردوں کو خوش کرنے کے لیے کہا جاتا تھا جو اکھاڑے اور لائسنس کے معاملات کنٹرول کرتے تھے۔''

''اس کے عوض انہیں اضافی معاوضہ ملتا ہوگا؟''

''یہ میں نہیں جانتا لیکن وہ کچھ نہ کچھ تو دیتے ہوں گے۔''

''ان مردوں کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو جن سے ایرلین کا تعلق رہا ہوگا۔ ضروری نہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔''

''ان مردوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس نے بھی اس تفریح میں حصہ لیا ہوگا۔ وہ جوان ہو گئی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنے گھر والوں کو روٹی، کپڑا اور مکان کی سہولت فراہم کرے۔''

''تمہاری مما کا کہنا ہے کہ اس نے ایرلین کو گھر بلانے کی کوشش کی تھی۔ کیا تم نے بھی اس سے کچھ کہا تھا؟''

''ہاں، لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے تلخ لہجے میں بات کرتی تھی۔ مثلاً یہ کہ میں اس سے ملنے کیوں آتا ہوں۔ فون پر بھی بات ہو سکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔''

''ذاتی طور پر ملنے اور فون پر بات کرنے میں بہت فرق ہے۔ بہرحال تمہارا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ کم عمر گھوڑوں کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔''

''تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تم نے ایرلین کی موت کا سب سے زیادہ اثر لیا ہے؟''

''ہاں، میں اور ایرلین اس دنیا میں اکٹھے آئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ہم ایک ساتھ ہی اس دنیا سے جائیں گے لیکن وہ پہلے چلی گئی۔''

''میں نے تمہارا بہت وقت لے لیا۔'' بروک نے کہا۔ ''یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ اگر تمہیں کوئی اور بات یاد آجائے تو مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔ ہم اس معاملے کی تہ تک جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اندر جارہا ہوں، میرا دوست انتظار کررہا ہوگا۔''

اس کے جانے کے بعد بروک چند قدم واپس گیا اور گاڑیوں کے درمیان کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ دو گھنٹے بعد ارل کی واپسی ہوئی۔ وہ پوری طرح نشے میں تھا

اور اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

''اگر تم چاہو تو لاج تک چھوڑ سکتا ہوں۔'' بروک نے اچانک اس کے سامنے آ کر کہا۔

ارل ٹھٹک کر رک گیا اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے بروک کی آواز نے اس کا توازن بگاڑ دیا ہو۔ وہ آگے کی طرف جھکا اور گھاس پر قے کر دی۔

''گاڑی میں بیٹھ جاؤ ارل لیکن اپنی طرف کی کھڑکی کھلی رکھنا۔''

بروک نے اپنی کار سرخ ٹرک کے برابر میں روکی اور ارل کو باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ارل فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور اس نے کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی۔

''تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟'' اس نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' بروک نے کہا۔ ''میں نے مسز اسٹارک سے تمہاری آمد و رفت کی تفصیل پوچھی تھی۔ اس نے مجھے فائل سے ایک کاغذ نکال کر دیا جس میں پورے سال کے دوران تمہارے سفر کی تفصیل درج ہے۔ تم یہاں اگست میں آئے تھے۔ استقبالیہ پر بیٹھی عورت کا کہنا ہے کہ اس رات تمہیں ایک کال موصول ہوئی تھی اور تم فوراً ہی اپنی وین لے کر چلے گئے تھے لیکن سہ پہر تک ایولین سے نہ مل سکے۔ یہ اس کی لاش ملنے سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔''

ارل نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بروک نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ایولین نے تمہیں فون کیا تھا کہ اسے آ کر لے جاؤ۔''

ارل نے کہنا شروع کیا۔ ''اس نے کہا کہ وہ گھر آنا چاہ رہی ہے۔ اس نے مجھے ایک جگہ کا پتا بتایا جو ائربیس کے قریب تھی۔ وہ ایک دانتوں کے ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں وہاں ٹھہر کر اس کا انتظار کروں۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اور یہی سمجھا کہ اس کے دانت میں تکلیف ہو گی۔ میں اپنی وین لے کر وہاں پہنچ گیا اور عمارت کے سامنے اس کا انتظار کرنے لگا جبکہ وہ عقبی حصے سے باہر آئی۔''

''تمہیں وہ پتا یاد ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہو گی۔''

''میں وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔''

''اس کے باہر آنے کے بعد کیا ہوا؟''

''وہ ٹھیک نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ لیکن وہ سیدھی میری وین پر آئی اور اس میں سوار ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے گھر لے چلو ارل'' راستے میں ہماری بہت کم بات ہوئی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس نے اپنا نام کیوں تبدیل کر لیا۔ بالآخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا، معلوم ہوا کہ اس نے کاؤنٹش کے کہنے پر ایسا کیا تھا۔ اس کے بقول اب وہ اسٹار بننا چاہ رہی تھی۔ اس لیے اس کا نام ایولین اسٹار ہونا چاہیے۔''

تیز ہوا سے درختوں کے پتے ہل رہے تھے۔ ارل نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہہ کر ایولین نے آنکھیں بند کر لیں جیسے سونا چاہ رہی ہو۔ اسے واقعی نیند کی ضرورت تھی۔''

''اس کے علاوہ اس نے کچھ کہا؟'' بروک نے پوچھا۔

''نہیں، ایک لفظ بھی نہیں۔ میں ایک گھنٹے تک گاڑی چلاتا رہا۔ انجن کے شور میں یہ پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی سانسیں رک گئی ہیں لیکن برابر والی سیٹ پر نظر پڑتے ہی میں چونک پڑا۔ مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے گاڑی روک کر اسے باہر نکالا اور گھاس پر لٹا دیا لیکن وہ جا چکی تھی۔''

''تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو؟''

''میں فارم میں پلا بڑھا ہوں اور جانتا ہوں کہ مردہ جسم کیسا ہوتا ہے۔''

''تم نے اسے وہاں کیوں چھوڑ دیا؟''

''مجھے ڈر تھا کہ اس کی موت کا الزام مجھ پر آئے گا کیونکہ میرے کپڑے اور گاڑی کی سیٹ خون آلود ہو چکی تھی، مجھ پر اعانتِ جرم کا الزام عائد ہو سکتا تھا۔ اس لیے اسے اپنے ساتھ نہیں لایا۔''

''تم نے ہی پولیس کو اطلاع دی تھی؟''

''ہاں، جیسے ہی مجھے پبلک فون نظر آیا، میں نے انہیں اطلاع دی۔ لگتا ہے کہ انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ ورنہ وہ سارا دن وہاں نہ پڑی رہتی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم مجھے اس ڈاکٹر کا پتا بتاؤ۔''

☆☆☆

بروک نے شیرف لائیل کو ہمراہ لیا اور ارل کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس نے دیکھا کہ ایک دروازے پر تختی لگی ہوئی تھی۔ 'ڈاکٹر فیلے۔ ڈینٹل سرجن۔'

انتظار گاہ میں دو مریض ایک درمیانی عمر کی استقبالیہ کلرک کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عورت بہت چوکنا تھی۔ اس کی تیز نظروں نے فوراً ہی شیرف کے سوٹ پر لگا ہوا بیج دیکھ لیا۔ شیرف دروازے میں ہی رک گیا جبکہ بروک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''دوستو! ڈاکٹر فیلے

آج آپ لوگوں کو نہیں دیکھ سکیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا بیج ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''پولیس ایک ضروری کارروائی کے سلسلے میں یہاں آئی ہے۔''
خاتون مریض تیزی سے باہر جانے کے لیے لپکی جبکہ مرد نے اپنے چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں کہاں جاؤں؟''
''بہتر ہوگا کہ تم کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔'' شیرف نے اسے مشورہ دیا۔
''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' استقبالیہ کلرک نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''کیا تم چاہتی ہو کہ مزید پولیس والے یہاں آجائیں؟'' شیرف نے غصے سے کہا جبکہ بروک سمجھ گیا تھا کہ وہ وکیل کو فون کرنا چاہ رہی ہے۔ وہ اس کے پاس آیا اور ایرلین کی تصویر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اسے پہچانتی ہو؟''
اس نے تصویر پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔ ''نہیں۔''
''میں تمہیں سوچنے کے لیے مزید وقت دے رہا ہوں۔ کیا ڈاکٹر فیلے کے پاس کوئی مریض ہے؟''
''ہاں۔''
بروک بائیں جانب واقع دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ڈاکٹر ایک نوعمر لڑکے کا معائنہ کر رہا تھا۔ بروک نے اسے اپنا بیج دکھایا تو ڈاکٹر نے لڑکے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم جا سکتے ہو۔''
بروک نے ایک نظر ڈاکٹر کو دیکھا اور اسے ایرلین کی تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے یاد کرو اور شیرف کو بھی اندر بلا لو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی موجودگی میں تم سے سوالات کروں۔ اسے اس بات پر بہت غصہ ہے کہ لوگ اس کی کاؤنٹی میں لاشیں پھینک کر چلے جاتے ہیں۔ اگر میں فوری طور پر کوئی نتیجہ حاصل نہ کر سکا تو وہ اپنا طریقہ آزمائے گا۔''
''میں نہیں جانتا کہ تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟''
''ڈاکٹر، ہمارے پاس ایک گواہ ہے جو لڑکی کو اس کے مرنے سے ایک گھنٹا قبل یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔''
''میں اپنے وکیل کو فون کرتا ہوں۔''
''تمہیں بہت جلد اس کی ضرورت پیش آئے گی جب ہم پولیس کو یہاں بلائیں گے اور وہ تم سے سب کچھ اگلوا لے گی لیکن اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو شیرف کی کارروائی سے بچ سکتے ہو اور اس طرح شاید تم پر عائد الزامات کی شدت بھی کم ہو جائے۔''
ڈاکٹر نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''
''کیا تم نے اس لڑکی کا علاج کیا تھا۔ میرا مطلب ہے دانتوں کے علاوہ۔''
''ہاں، میں نے اسے پہچان لیا ہے۔''
''میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کیں۔ وہ عقل سے عاری تھے۔''
''یہ ان کی غلطی تھی۔ ان میں سے کسی ایک کو اس لڑکی کے پاس رہنا چاہیے تھا جب وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ وہ شخص کسی کام سے چلا گیا اور لڑکی اس کے واپس آنے سے پہلے نکل گئی۔ اس طرح یہ اس کی بھی غلطی تھی۔ وہ یقیناً الجھن کا شکار تھی اور اسے اس حالت میں باہر نہیں جانا چاہیے تھا۔''
''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا؟''
''ہاں اگر وہ نہ جاتی تو ہم اس کی مدد کر سکتے تھے۔''
''تم یہ بات لوگوں کو سمجھا سکتے ہو۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری خدمات کس نے حاصل کی

لطیفہ

ایک دفعہ ملا نصیرالدین بازار سے جا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے انہیں زور سے تھپڑ مارا۔ ملا نصیر صاحب نے غصے سے پیچھے دیکھا وہ شخص گھبرا کر بولا۔ ''معاف کرنا میں سمجھا، میرا دوست ہے۔''
ملا صاحب نے کہا۔ ''نہیں، چلو عدالت چلتے ہیں۔''
جج صاحب کے سامنے اپنا مدعا پیش کیا۔
جج نے اس شخص کا خوف دیکھ کر کہا: ''کیوں جناب! تم تھپڑ کی قیمت دو گے یا ملا صاحب آپ کو بھی تھپڑ لگائیں؟''
اس شخص نے کہا۔ ''جناب! میں تھپڑ کی قیمت دوں گا لیکن ابھی میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میری بیوی کے پاس کچھ زیور ہیں، وہ میں لے کے آتا ہوں۔''
جج نے کہا: ''ٹھیک ہے، جلدی آؤ۔''
ملا صاحب انتظار کرتے کرتے تھک گئے لیکن وہ شخص نہیں آیا ملا نصیرالدین اٹھے اور ایک زوردار تھپڑ جج کو مارا اور کہا۔ ''اگر وہ زیور لائے تو تم لے لینا۔''

کلرشاخ گوٹھ تاج محمد سے محمد ہارون بلوچ

تھیں کیونکہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایرلین تمہارے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھی۔''

''میں یہ تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

بروک نے چند لمحے انتظار کیا پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔''ٹھیک ہے پھر نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''ایک منٹ۔'' فیلے جلدی سے بولا۔''وہ اسی ریسلنگ کمپنی کے لوگ ہیں، وہ اس سے پہلے بھی لڑکیوں کو یہاں بھیجتے رہے ہیں۔''

فیلے کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔وہ جلدی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔''او میرے خدا! وہ لیڈیا کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

''وہ اس معاملے میں کس حد تک ملوث ہے؟''

''وہی سب کچھ کرتی ہے۔ میں تو صرف سہولیات فراہم کرتا ہوں۔''

☆☆☆

دفتر آنے کے بعد بروک نے بڈ سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور اسے بتایا۔''میں نے معلوم کرلیا ہے کہ یہ کس کی کارستانی ہے اور کس طرح اس لڑکی کی موت راستے میں واقع ہوئی۔اب میرا اگلا ہدف وہی لوگ ہیں لیکن فون پر بات کرنے کے بجائے میں خود ان سے ملنے جاؤں گا۔''

''کیا تم ان سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکو گے؟''

''انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔اس لیے بھی کہ اس میں روز ملوث ہے۔''

''کیا؟''

''ہاں، وہ ان دنوں ویرونیکا کا دستِ راست بنا ہوا ہے اور وہیل چیئر پہ بیٹھ کر ہی سارے کام کررہا ہے۔''

''اب وہ لوگ کہاں ہیں؟''

''چارلوٹ میں، لیکن اگلے ہفتے کے اختتام پر وہ یہاں ہوں گے۔وہ تقریباً دو مہینے بعد اکیڈمی جائیں گے۔ میں ان کا شو دیکھنے جاؤں گا اور وہاں سے تعاقب کرتے ہوئے ان کے کیمپ تک پہنچ جاؤں گا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اسمائیلی کو میری طرف سے ہیلو کہہ دینا۔''

اگلے ہفتے ان کا شو فوجی ہال میں ہونا تھا۔رنگ کے دونوں طرف کم ٹکٹ والی نشستیں لگائی گئی تھیں۔لیکن اب بھی اتنی جگہ تھی کہ وہاں پوری ایک بٹالین آجاتی۔ اونچی اونچی کھڑکیوں سے باہر اندھیرا پھیل چکا تھا اور چھت میں جگہ جگہ بڑے بڑے گلوب لگا کر روشنی کا سامان کیا گیا تھا اور جو لوگ جلدی آگئے تھے، ان کے بولنے کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ بروک درمیانی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور رنگ کا جائزہ لینے لگا۔ عین اس وقت کسی نے سامنے والی دیوار کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا اور اس کے سامنے سے ایک وہیل چیئر گزری۔ بروک کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس پر کون بیٹھا ہوا تھا۔ گو کہ بڈ مچل نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔اس کے باوجود اسمائیلی روز خود ہی کرسی گھسیٹ رہا تھا اور اب اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے اسے رنگ میں ہونے والی کشتیاں صاف نظر آسکیں۔

چھت پر لگی روشنیاں ماند پڑگئیں اور ان کی جگہ رنگ کے چاروں طرف لگی ہوئی اسپاٹ لائٹس نے لے لی۔ جونہی ریفری رنگ میں داخل ہوا مجمع نے شور مچانا شروع کر دیا۔اس کی وجہ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔اس کے بعد پہلوانوں کے مقابلے شروع ہوئے لیکن سب لوگوں کو کاوئنیش کی باری کا انتظار تھا جس کے ٹائٹل کو اینجل وائٹ نے چیلنج کیا تھا۔ پہلے وہی رنگ میں آئی۔اس کی عمر ایرلین جتنی ہی تھی اور جسامت بھی ویسی ہی تھی۔جب کاوئنیش رنگ میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے دونوں بازو فضا میں بلند کر کے رنگ کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا۔اس کے بعد ریفری نے دونوں کو رنگ کے درمیان بلایا...... ان دونوں نے اپنے لبادے اتار دیے تھے اور ریفری قاعدے کے مطابق ان کے جسموں کو ٹٹولنے لگا۔اس کے بعد دونوں نے اچھلنا شروع کر دیا۔ اچانک ہی ویرونیکا نے اینجل کو دھکا دیا اور وہ دو قدم پیچھے چلی گئی۔

دو منٹ بعد ہی واضح ہوگیا کہ ویرونیکا اپنی حریف کو سچ مچ تکلیف میں مبتلا کررہی تھی اور اینجل کے پاس اپنا دفاع کرنے کے لیے کوئی جوابی داؤ نہیں تھا۔ وہ ویرونیکا کے تابڑتوڑ حملوں کی تاب نہ لاسکی اور فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ اس نے یقیناً سکون کا سانس لیا ہوگا جب ریفری نے تین تک گننے کے بعد ویرونیکا کا ہاتھ فضا میں بلند کردیا۔اس کے جواب میں اس نے اس کی پسلیوں میں لات رسید کی اور مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا دیے۔

مقابلہ ختم ہونے کے بعد بروک اس دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا جہاں سے کمپنی کے ملازمین اور مقابلے میں

حصہ لینے والے پہلوان گزر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اینجل اکیلی پارکنگ لاٹ کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک برف کا ٹکڑا تھا جسے وہ بار بار اپنی آنکھ پر رکھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ایک گاڑی کی جانب بڑھی کہ بروک اچانک ہی اس کے سامنے آگیا اور اسے اپنا بیج دکھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے تم سے ایولین اسٹار کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔''

اینجل نے برف کا ٹکڑا نیچے کیا اور حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اس سے پہلے کہ تم یہ کہو کہ کچھ نہیں جانتیں، میں یہ بتا دوں کہ ہم اس عورت تک پہنچ چکے ہیں جس نے اس کا اسقاطِ حمل کیا تھا۔ میں صرف اس شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں جس نے اس سے اپائنٹمنٹ لیا تھا۔''

''اگر جانتی بھی ہوں تو تمہیں کیوں بتاؤں، یہ وہ جگہ ہے جہاں سے مجھے کھانے کو ملتا ہے۔''

''میں دیکھ چکا ہوں کہ کچھ دیر پہلے وہ پاگل عورت تمہارے ساتھ کیا کر رہی تھی۔ کیا روٹی کمانے کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ مجھے ایولین کے بھائی نے بتایا ہے کہ تم اور وہ اچھی دوست تھیں۔''

اینجل نے پیچھے مڑ کر دیکھا پھر بولی۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایولین نے جو سوچا وہ کیا لیکن باقی لڑکیاں ایسا نہیں کریں گی۔'' اس نے دائیں بائیں دیکھا اور بولی۔ ''اگر تمہارے پاس کار ہے تو میرا ٹیکسی کا کرایہ بچ جائے گا۔''

بروک نے اس سے منزل کا پتا پوچھا اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔ راستے میں وہ بولی۔ ''تم نے آج جو کچھ دیکھا۔ ہمیں اسی کام کے پیسے ملتے ہیں۔ اس سے پروموٹرز بھی خوش ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بھی حصہ مل رہا ہوتا ہے۔ ہم اپنی زبان بند رکھتے ہیں۔ اس کے عوض ہمیں مختلف مقامات پر جانے اور اسٹار بننے کا موقع ملتا ہے۔ ہم وہی کرتے ہیں جو کہا جاتا ہے۔ ایک بات اور...... تمام لڑکیاں پروموٹرز کے ساتھ اچھی طرح پیش آتی ہیں، تم سمجھ رہے ہو نا؟''

''اسی وجہ سے ایولین حاملہ ہوگئی تھی؟''

''پتا نہیں یہ کیسے ہوگیا حالانکہ ہم سب بہت محتاط رہتی ہیں کہ یہ نوبت نہ آنے پائے۔''

''کیا تمہارے پاس مجھے بتانے کے لیے بھی کچھ ہے؟''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے یہاں سے روٹی ملتی ہے اگر کوئی دوسرا راستہ ایسا ہوا تو میں اس کے بارے میں سوچوں گی لیکن فی الحال ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے یہیں اترنا ہے۔ کیا تم پہلے بھی یہاں آئے ہو؟''

''نہیں، مجھے کسی نے دعوت نہیں دی اور تم بھی یہ مت بتانا کہ میں نے تمہیں یہاں چھوڑا ہے۔''

☆☆☆

ریسلنگ کیمپ شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ بروک اس راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے اس نے مناسب فاصلہ رکھ کر اس وین کا تعاقب کرنا شروع کیا جو دیہاتی پہاڑی علاقے کی جانب جارہی تھی۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ اسمائیلی، اس کی کرسی اور چاروں خواتین ریسلرز سفر کر رہی تھیں۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ وین ایک ہوٹل کے پاس رکی جہاں سے ایک اور سیڈان کار اس قافلے میں شامل ہوگئی جس میں چار عورتیں سوار تھیں۔ دو گھنٹے بعد یہ قافلہ ایک کچی سڑک پر مڑ گیا جہاں ایک فارم ہاؤس، بہت بڑا گودام اور نصف درجن چھوٹے کاٹیج تھے۔ کیمپ کے سامنے ایک بہت بڑا ڈھلوان لان تھا جس کا اختتام ایک جھیل اور گودی پر ہوتا تھا۔ بروک اس کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی ایک سائڈ لین پر اتار دی جو جھیل کے سامنے بنے ہوئے بنگلوں کی قطار کی جانب جارہی تھی۔ اس نے اپنی کار ایک بنگلے کے سامنے روک دی جہاں سے ریسلنگ کیمپ صاف نظر آتا تھا۔ وہ ایک پتھر کی بینچ پر بیٹھ گیا اور چشمہ لگالیا تاکہ اسے دور کی چیزیں نظر آسکیں۔ اب اسے اپنی اگلی کارروائی کے لیے وقت کا تعین کرنا تھا۔ اسمائیلی پہلے ہی وین سے باہر آچکا تھا اور خواتین ریسلرز بھی کاٹیج میں چلی گئی تھیں۔ اسے نچلی منزل کی کھڑکی سے ویرونیکا نظر آئی جو کسی دوسری عورت سے باتیں کر رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ایک ٹیکسی وہاں آکر رکی اور اس میں سے دو نوجوان عورتیں مع سوٹ کیس برآمد ہوئیں۔ ویرونیکا نے باہر آکر گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور وہ سب گھر کے اندر چلے گئے۔ ایک گھنٹا اور گزر گیا پھر ویرونیکا اور اسمائیلی روز فیملی پورچ میں نمودار ہوئے اور ڈھلوان سطح پر جھیل کی جانب بڑھنے لگے۔ روز اپنی وہیل چیئر گھسیٹتا ہوا

گودی کی طرف جا رہا تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ باتیں کرنے کے لیے رک گئے۔ بروک نے دیکھا کہ زیادہ تر گفتگو ویرونیکا ہی کر رہی تھی۔ اسی دوران ایک چھوٹی اسکول بس وہاں آکر رکی اور اس میں سے درجن بھر لڑکیاں اتریں۔ وہ سب ویرونیکا سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔ ویرونیکا نے نظریں اٹھا کر چڑھائی کی طرف دیکھا اور ان لڑکیوں کے بارے میں اپنے ساتھی سے کچھ کہنے لگی۔ بروک نے چشمہ اتار کر جیب میں رکھا اور اپنی کار کی جانب چل دیا۔ کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ اس نے اپنی کار بس کے برابر کھڑی کر دی۔ خاتون ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس گیا اور اپنا بیج دکھاتے ہوئے بولا۔

''خاتون، میں لڑکیوں کو واپس بھیج رہا ہوں۔ انہیں لے کر فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ کچھ دیر میں پولیس کی تحقیقات شروع ہونے والی ہے اور ہم انہیں اس جگہ سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ان کے ساتھ کوئی ٹیچر ہے؟''

''بس میں ہی ہوں۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

بروک نے اطمینان کر لیا کہ ڈرائیور کی توجہ اخبار سے ہٹ گئی ہے اور وہ اپنے فرض کی انجام دہی کے لیے تیار ہے۔ اس کے بعد وہ گودام میں چلا گیا جہاں یہ اکیڈمی کام کر رہی تھی۔ وہاں دیواروں کے ساتھ چٹائیاں، وزن اٹھانے کا سامان اور جمناسٹک کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ گائڈ کے فرائض انجام دینے والی ایک عورت لڑکیوں کو اکیڈمی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بروک نے اس کے پاس جا کر اپنا بیج دکھایا تو وہ بولی۔ ''کیا مسئلہ ہے؟''

''یہاں چھاپا پڑنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے یہ لڑکیاں یہاں سے چلی جائیں۔''

''پہلے میں ایک فون کال کرلوں۔'' اس عورت نے کہا۔

''تم جتنی چاہو کالیں کرنا مگر یہ لڑکیاں ابھی یہاں سے جا رہی ہیں۔''

وہ انہیں لے کر بس کی جانب چل دیا۔ لڑکیاں خاصی برہم نظر آ رہی تھیں۔ ان کی ساری تفریح غارت ہو گئی تھی۔ کچھ نے تو کھل کر احتجاج بھی کیا لیکن بروک نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا اور انہیں بس میں بٹھا کر ڈرائیور کو وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد وہ ویرونیکا کی طرف چل پڑا جو اس کا بیج دیکھ کے قطعی متاثر نہیں ہوئی۔ البتہ روز نے اسے پہچان لیا اور بولا۔ ''تم وہی پولیس والے ہو۔''

''تم ایک دوسرے کو جانتے ہو؟'' ویرونیکا نے کہا۔

''اس نے مجھے قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کی تھی۔'' روز نے ناگواری سے کہا۔

''خیر، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ہمارے مہمانوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''میں انہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں ایولین اسٹارک کے قتل کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''یہ کون ہے؟'' روز نے کہا۔

''میں ایولین اسٹار کی بات کر رہا ہوں۔''

''وہ لڑکی ہمیں چھوڑ گئی تھی۔'' ویرونیکا نے کہا۔ ''اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا تو میں اس کی کیا مدد کرتی اور نہ مجھ سے مشورہ مانگا۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تمہارے علم میں لائے بغیر وہ اس عورت کے پاس چلی گئی جو اس سے پہلے بھی تمہاری لڑکیوں کا اسقاط کر چکی تھی۔ میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ اس نام نہاد ڈاکٹر کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ اپنی مرضی سے وہاں گئی تھی۔'' روز نے کہا۔

''ڈاکٹر فیلے پہلے ہی تمہارا نام لے چکا ہے اور ایولین کے بھائی نے تمہاری وین کو ڈاکٹر کے کلینک کے باہر دیکھا تھا جب وہ اسے لینے وہاں پہنچا۔''

ویرونیکا نے ترچھی نظروں سے روز کو دیکھا اور اس کی کرسی کو ہلکے سے لات مارتے ہوئے بولی۔ ''احمق انسان۔''

''اصل مسئلہ کیا تھا اسمائیلی، شاید اس کا حمل گر گیا تھا۔''

''وہ حاملہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے بیکار ہو چکی تھی۔ ٹکٹوں کی فروخت اور دوسرے ذرائع سے ہونے والی آمدنی میں بھی کمی واقع ہو رہی تھی۔''

''اس بچے کا باپ شاید ہمیں اس سے زیادہ رقم دیتا جو ایولین نے پانچ برسوں میں کمائی تھی۔'' ویرونیکا نے کہا۔ ''لیکن اب تو شاید ہمیں انشورنس کی رقم بھی نہ مل سکے۔''

''مجھے سارا الزام مت دو۔'' روز نے کہا۔ ''اس لڑکی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک ایسے بچے کی ماں بننا نہیں چاہتی جسے کوئی قبول نہ کرے۔''

"اسے یہ راستہ کس نے دکھایا تھا۔ وہ تم ہی تھے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر کرسی کو زوردار لات ماری۔ اس مرتبہ کرسی نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ڈھلوان سطح پر لڑھکتی ہوئی گہرے پانی میں جا گری۔ اس جگہ جھیل کی گہرائی اتنی تھی کہ روز اور اس کی کرسی دونوں پانی میں ڈوب گئے۔

ویرونیکا نے چڑھائی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بروک اس کے پیچھے جانا چاہ رہا تھا پھر اسے خیال آیا کہ پہلے روز کو پانی سے نکالنا چاہیے۔ اس نے اپنی جیکٹ اور ریوالور زمین پر رکھا اور خود پانی میں چلا گیا جو اس کے سینے تک آ رہا تھا۔ اس نے کرسی کے قریب پہنچ کر روز کو اٹھانا چاہا لیکن وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے کرسی کے ہتھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ اس کے پہیوں کو ریت کی تہ میں دھنسا دیا پھر اس نے روز کا چہرہ پانی سے نکالا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ بروک نے سوچا کہ وہ ساحل پر جا کر کسی کو مدد کے لیے بلائے۔ اس نے روز سے کہا۔ "میرا انتظار کرنا۔"

جواب میں روز نے اسے ایک گالی دی۔ وہ خشکی پر آیا۔ اپنی جیکٹ اور ریوالور اٹھایا پھر عمارت کی جانب چل دیا۔ عقبی پورچ میں خواتین ریسلرز مجمع لگائے کھڑی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ بروک کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اکیڈمی جا کر لوگوں کو اسمائیلی کی مدد کے لیے بلائے یا اندر جا کر دیکھے کہ کیا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ روز مزید چند منٹ انتظار کر سکتا ہے۔

اسی وقت ان لڑکیوں میں سے ایک باہر آئی جو کچھ دیر پہلے ٹیکسی میں وہاں پہنچی تھیں۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ بروک اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ لوئیس اپنی مالکن ویرونیکا کے ساکت جسم پر جھکی ہوئی تھی۔ ویرونیکا چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کی بے جان آنکھیں خلا میں مرکوز تھیں۔ لوئیس نے اپنے ہاتھ میں چاقو پکڑا ہوا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"اس کتیا نے اس پر کوئی داؤ آزمایا ہے جس کی وجہ سے یہ سانس نہیں لے پا رہی۔ میں ہوا کے لیے سوراخ بنانا چاہ رہی ہوں۔"

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

"اینجل، وہ گھات لگائے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی میڈم اندر آئی، اس نے حملہ کر دیا۔"

بروک نے ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیا اور بولا۔ "مجھے ایک چھوٹا پائپ یا کوئی بال پوائنٹ دو، جلدی کرو۔"

لوئیس دونوں چیزیں لے کر آئی تو اس نے اپنی کارروائی شروع کر دی اور کہا۔ "ایمبولینس کو فون کرو۔"

جب اسے یقین ہو گیا کہ ویرونیکا کے نتھنوں میں ہوا جا رہی ہے تو وہ گودام کی طرف دوڑا۔ وہاں کوئی مرد نہیں تھا۔ اس نے دو لڑکیوں کو ساتھ لیا اور جھیل کی طرف چل پڑا۔

جب وہ کنارے پر پہنچا تو اسے جھیل کی سطح پر صرف کرسی کے ہتھے ہی نظر آئے لیکن اسمائیلی غائب تھا۔ اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کہیں وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں پھسل تو نہیں گیا لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کا جسم تو بیلٹ سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

بروک نے اپنی بات ختم کی تو بڈ مچل بولا۔ "وہ ابھی تک اس کی لاش تلاش نہیں کر سکے؟"

"نہیں اور انہیں اس کی لاش کبھی نہیں ملے گی۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہ بیلٹ ڈھیلی کر کے پانی میں کود جاتا۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی اور نے اسے کرسی سے نکالا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔"

"اس کے آدمیوں نے یہ کام اس وقت کیا ہو گا جب تم مکان میں چلے گئے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے بڈ۔ وہ ایک کاکروچ کے مانند ہے لیکن ہم نے دندان ساز اور اس عورت کو گرفتار کر لیا ہے جبکہ ویرونیکا کی حالت مردوں سے بدتر ہے۔ وہ کسی کام کی نہیں رہی۔ ہماری ساری محنت اکارت گئی۔ میں تو ان لڑکیوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہ اب کیا کریں گی؟"

"اسے دوسرے انداز سے دیکھو۔ تم نے انہیں ملبے کے ڈھیر سے نکالا ہے جس کے تلے وہ دبی ہوئی تھیں۔ البتہ مجھے اینجل کے فرار ہو جانے پر غصہ ہے لیکن میں اسے بھی قصوروار نہیں سمجھتا۔ اس نے موقع ملتے ہی اپنا داؤ استعمال کیا۔"

"مجھے تو صرف یہ افسوس ہے کہ اسمائیلی ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ جہاں کہیں بھی چھپا ہو گا، میں اسے تلاش کر لوں گا۔ جب تک وہ پکڑا نہیں جاتا، میں اس مشن کو ادھورا ہی سمجھوں گا۔"

"مجھے تمہاری کامیابی کا یقین ہے۔ اسے تلاش کرنے میں میرے آدمی تمہاری مدد کریں گے۔" بڈ نے بڑے وثوق سے کہا۔

بے خبری

سلیم انور

دولت مند چچا کی لاڈلی بھتیجیوں کی دیرینہ خواہش کا قصہ... شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ وہ اس کی دولت پر عیش بھی کرتی تھیں... مگر اچانک ہی ہوا نے رخ بدلا اور تینوں کی خواہشات نے یکساں رنگ پکڑا...

جنوں رہا نہ پری رہی جو رہی سو بے خبری رہی ..... سراغرسی کی نکتہ بیں کہانی

سراغ رساں سارہ برلن کیسینو میں داخل ہونے کے بعد یہ توقع کر رہی تھی کہ وہاں موجود ہر آنکھ اس کی جانب متوجہ ہو جائے گی۔ لیکن وہاں پر شوقین مزاج اور مختلف کھیل کھیلنے والے دیگر افراد اپنے اپنے کھیلوں میں اس قدر مگن تھے کہ کسی نے بھی سارہ برلن پر کوئی توجہ نہیں دی۔

وہ اس بے اعتنائی کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھی چیک ان ڈیسک پر پہنچ گئی۔ جہاں سارجنٹ کارل ریڈی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''کیا صورتِ حال ہے؟'' اس نے سارجنٹ سے پوچھا۔

''دلچسپ کیس ہے۔'' سارجنٹ کارل ریڈی نے کہا۔ ''میں نے اب تک جو معلومات اکٹھا کی ہیں، اس کے مطابق گزشتہ روز چار افراد بیرونِ شہر سے آکر یہاں کیسینو میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ایک انکل اور ان کی تین بھتیجیاں۔ وہ ہر سال خاندانی تعطیلات منانے کے لیے نکلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر سارجنٹ نے توقف کیا۔

''اور؟'' سراغ رساں سارہ نے تقاضا کیا۔
''اور وہ انکل آج سہ پہر لگ بھگ ساڑھے چار بجے اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے ہیں'' سارجنٹ نے بتایا۔
''لاش کس نے دریافت کی تھی؟''
''ہوٹل کی ایک ملازمہ نے۔''
''موت کا سبب؟''
''کسی نے بیڈ سائڈ لیمپ کی مدد سے اس کی کھوپڑی پر متعدد ضربیں لگا کر اسے پاش پاش کر دیا تھا۔''
''کیا تمہارے خیال میں ان کی بھتیجیوں میں سے کوئی ایک ہو سکتی ہے؟'' سراغ رساں سارہ نے پوچھا۔
سارجنٹ کارل نے شانے اچکا دیے۔ ''ممکن ہو سکتا ہے اس گروپ کا یہاں کوئی اور شناسا بھی نہیں ہے۔ جو جوڑا انکل کے برابر کے کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے دوپہر تین بجے کے قریب انکل کے کمرے سے کسی مرد اور کسی عورت کے تکرار کی آوازیں سنی تھیں۔''
''وہ عورتیں کہاں ہیں؟''
''کون عورتیں؟''
''اس انکل کی بھتیجیاں!''
''میں نے انہیں منیجر کے کمرے میں محدود کیا ہوا ہے۔''
سراغ رساں سارہ برلن، سارجنٹ کارل کے ہمراہ منیجر کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ جب وہ منیجر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں اس نے تین عورتوں کو موجود پایا جو ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں اور سراسیمہ دکھائی دے رہی تھیں۔
''لیڈیز!'' سراغ رساں برلن نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں پولیس سراغ رساں سارہ ہوں۔ تم جانتی ہوگی کہ تم لوگوں کو یہاں کیوں بُلایا گیا ہے۔ مجھے تم لیڈیز سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔''
ان میں سے ایک عورت نے جس کی عمر تیس برس سے اوپر کی رہی ہوگی۔ اثبات میں سر ہلا دیا۔
''تمہارا خیال ہے کہ انکل جیک کو ہم میں سے کسی ایک نے قتل کیا ہے؟''
''تم کون ہو؟''
''میرا نام بیٹی میکڈانلڈ ہے۔'' میں اس گروپ میں سب سے بڑی اور مدبر ہوں۔''
''کیا تم میں سے کسی کے پاس یہ جواز ہے کہ وہ اپنے انکل کو مردہ دیکھنے کا خواہش مند تھا؟'' سراغ رساں سارہ برلن نے پوچھا۔
''بدقسمتی سے ہاں۔'' بیٹی میکڈانلڈ نے جواب دیا۔
''وہ کیسے؟''
''وہ اس طرح کے انکل جیک ہر سال ہمیں تعطیلات منانے کے لیے کہیں نہ کہیں ساتھ لے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح خاندان میں قربت قائم رہتی ہے۔ ہم ہمیشہ ہوائی جہاز سے سفر کرتے تھے۔ انکل جیک فرسٹ کلاس میں اور ہم اکانومی کلاس میں۔'' بیٹی نے وضاحت کی۔
''اور یہ وہ وجہ ہے جس کی وجہ سے تم انہیں مردہ دیکھنا چاہتے تھے؟'' سراغ رساں سارہ نے کہا۔
''نہیں۔ نہیں'' اس مرتبہ ان میں سے دوسری عورت بول پڑی۔ ''میرا نام لیلا ہے۔ یہ وجہ نہیں تھی جو تم سمجھ رہی ہو۔''
''تو پھر کیا وجہ تھی؟'' سارہ نے جاننا چاہا۔
''یہاں آتے وقت جہاز میں انکل جیک کے برابر کی سیٹ پر کوئی چرب زبان مذہبی لیڈر بیٹھا ہوا تھا۔''
''اوہ!''
''ہاں'' انکل جیک کی تیسری بھتیجی کیرولین نے لقمہ دیا۔ ''اس چرب زبان مذہبی لیڈر نے انکل جیک کو اس بات پر رام کر لیا کہ اپنی روح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر کرنے کی خاطر انہیں اپنے تمام دنیاوی مال و اسباب سے دستبردار ہونا ہوگا۔''
''جب ہم نے یہاں لینڈ کیا تو انکل جیک نے ہمیں بتا دیا کہ یہ ہماری آخری تعطیلات ہیں۔'' بیٹی میکڈانلڈ نے بات کا سلسلہ برقرار رکھتے ہوئے کہا ''انہوں نے کہا کہ ایک بار گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنی وصیت تبدیل کر دیں گے اور اپنی تمام دولت اور جائداد اس بے ایمان مذہبی لیڈر کے چرچ کے نام کر دیں گے۔''
''وہ صرف اتنا کچھ اپنے پاس رکھیں گے کہ بقیہ زندگی میانہ روی کے ساتھ گزار سکیں۔'' لیلا نے کہا۔
''تمہارے انکل کے مال و اسباب کی کیا مالیت ہوگی؟'' سراغ رساں سارہ نے پوچھا۔
''کروڑوں!'' کیرولین نے بتایا۔
''انکل جیک اپنی دولت کے بارے میں ہمیشہ شیخیاں بگھارا کرتے تھے۔'' بیٹی میکڈانلڈ نے کہا۔ ''شاید اسی وجہ سے اس مذہبی لیڈر نے اپنی چرب زبانی سے انہیں شیشے میں اُتار لیا تھا۔''

''ہمارے خیال کے مطابق تمہارے انکل کی موت سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ واقع ہوئی تھی۔'' سراغ رساں سارہ برلن نے کہا۔ ''اس وقت تم تینوں کہاں تھیں؟''

سب سے پہلے ہیٹی گویا ہوئی۔ ''مجھے قمار بازی کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ لہٰذا میں تمام سہ پہر ان ڈور پول میں ہی رہی تھی۔ میرے لحاظ سے باہر کھلے میں گرمی بہت زیادہ تھی۔''

''میں سلاٹ مشینوں پر تھی۔'' لیلا نے کہا۔ ''میں لنچ کے فوراً بعد وہاں چلی گئی تھی اور ساڑھے تین بجے سے پہلے وہاں سے نہیں نکلی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں سے نکلتے وقت میں نے دیوار پر لگی گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔''

''اور میں تمام سہ پہر کیسینو میں مٹرگشت کرتی رہی تھی۔'' کیرولین نے بتایا۔ ''میں نے اس دوران میں کچھ تاش کے کھیل، کچھ نمبروں والے پالنے کے کھیل اور کچھ رولٹ کے کھیل کھیلے تھے۔ ہم لاس ویگاس پہلی مرتبہ آئے تھے۔ اس لیے میں واپس جا کر اپنے دوستوں کو یہ بتانے کے قابل ہونا چاہتی تھی کہ میں نے حقیقت میں قمار بازی کی ہے۔''

سراغ رساں سارہ برلن سارجنٹ کارل ریڈی کی جانب گھوم گئی۔ جو نوٹس لکھنے میں مصروف تھا۔

''کیا تم نے سب کچھ لکھ لیا؟''

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ! یہ اس لیے ضروری ہے کہ ان میں سے ایک عورت نے اپنے انکل کو قتل کیا ہے۔''

یہ سن کر سارجنٹ چونک پڑا۔ ''وہ کون ہے؟''

سراغ رساں سارہ برلن نے لیلا کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ''اسے حراست میں لے لو!''

''وہ کیوں؟'' لیلا نے صدائے احتجاج بلند کیا۔

''اس لیے کہ تم نے ابھی کہا کہ تم لنچ کے فوراً بعد سلاٹ مشینوں پر چلی گئی تھیں اور ساڑھے تین بجے سے پہلے وہاں سے نکل گئی تھیں۔ تم نے یہ بھی کہا کہ وہاں سے نکلتے وقت تم نے دیوار پر لگی گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔'' یہ کہہ کر سراغ رساں نے قدرے توقف کیا۔

''تو پھر؟'' لیلا نے بے تابی سے پوچھا۔

''چونکہ تم پہلی بار لاس ویگاس آئی ہو اس لیے تمہیں یہ علم نہیں کہ لاس ویگاس کے کیسینوز میں گھڑیاں نہیں ہوتیں۔ تمہارا یہ جھوٹ تمہارے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو سکتا ہے۔'' سارہ نے فاتحانہ نظروں سے سارجنٹ اور لیلا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ہاتھ جھاڑ کے کھڑی ہو گئی۔

آوارہ گرد

قسط 26

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی ایک معصوم بچہ، جس نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک جھلک اور دھندلا خاکہ یاد تھا۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ماں تھی کہاں؟ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا، ایک نئی عورت بھی اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھی مگر اس کے ساتھ اس کا رویہ درست نہ تھا۔ شہزی اپنی ماں کا خلا اپنے باپ کی موجودگی سے پُر کرنے کی کوشش کرتا مگر چند ہی دنوں بعد باپ اسے "نئی عورت" کے ایما پر اطفال گھر میں چھوڑ کر چلا گیا جو یتیم خانے کی جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بھی رہتے تھے، جن کے "بچوں" نے انہیں یہاں چھوڑ کر خود کو "یتیم" سمجھنے میں زیادہ عافیت محسوس کی تھی۔ یہاں زیادہ تعداد ایسے بچوں کی ... تھی، جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی "یتیم" تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی اور ایک "تعلق خاطر" ان دونوں کے بیچ پنپنے لگا تھا۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ ادارہ "اطفال گھر" ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چل رہا تھا۔ یہاں روایتی یتیم خانوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ بچوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا۔ ان کے رہن سہن، کھانے پینے اور تربیت تک کی کڑی نگرانی ایک نظم و ضبط کے تحت کی جاتی تھی۔ ادھر ہی شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی، جس کی حقیقت جان کر شہزی کو ایک تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں تھا بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا مگر اس کے جوان اکلوتے بیٹے نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک گیا تھا۔ اس کے دو بچے تھے، جو اپنے دادا سے مانوس تھے۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس "بوڑھے دوست" کے یوں اچانک چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ دینی و دینوی تعلیم و تربیت میں پروان چڑھنے والا یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہاں رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا قبضہ ہونے لگا، پھر سب کچھ بدلنے لگا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں شوکت حسین، اس کی بہن شکیلہ، بلال، اشرف، ثریا، عابدہ سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ناکام ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گنگل خان اور اس کے حواری، ان پر تشدد کرتے ہیں، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن جاتے تھا۔ گنگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ انسپکٹر روشن خان، چوہدری ممتاز خان کا ٹاؤٹ اور "راتب خور" ہے، جو ان کے خفیہ اور گھناؤنے مقاصد کے لیے کام کرتا ہے۔ وہ شہزی کا دشمن بن جاتا ہے اور اسے بے گناہ قانونی شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی کا یار اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ، جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں وہ "چھوٹے استاذ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "بڑا استاذ" کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی ہے۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو کسی بڈھے کے چنگل سے چھڑانے کے لیے شہزی اور اول خیر ملتان سے لاہور کا قصد کرتے ہیں۔ راستے میں بڑی سیاسی شخصیت زبیر خان کے لاڈلے اور بگڑے ہوئے بیٹے شفقت راجہ کے ساتھ شہزی کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ جی بائی کے چنگل سے چھڑا کر شہزی، ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو لاہور دارالامان پہنچا دیتا ہے۔ جھگڑے کے معاملے میں شہزی اور اول خیر، کمیل دادا سے بھڑ جاتے ہیں، زہرہ بانو المعروف "بیگم صاحبہ" اول خیر کو گروہ سے بے دخل کر دیتی ہے، اس میں کمیل دادا کی کج ادائیوں کا بھی دخل ہے مگر بیگم صاحبہ شہزی کو نہیں بھولتی، وہ اسی طرح اس کی ہر قسم کی مدد میں شامل رہتی ہے۔ بیگم صاحبہ کے سخت ترین حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا ہے، جب تک یہ بھید کھلتا ہے کہ ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان نے ایک مغنیہ ستارہ بیگم سے محبت کی دوسری شادی کی تھی۔ ستارہ بیگم کی پہلے سے ایک بیٹی تھی، جو گود میں تھی، یہی زہرہ بانو ہوتی ہے۔ زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی، جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی بھی ہے۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹر" کا زونل چیف ہے، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں، لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی کارڈ کی حمایت حاصل ہونے کے باعث میجر ریاض بغیر کسی ٹھوس ثبوت وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر ہے، اس لیے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو "آنریری" طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی "پاور" کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں ہوتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں "پاور" کو مصلحتاً "ڈراپ" کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ کے جگر کی پیوندکاری کے سلسلے میں امریکا روانگی کے وقت عابدہ اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ جو ایک عالمی سطح کا ڈان ہے...... لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے اور اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہے جسے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر تھی۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ عابدہ کو امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے کسی ایک میں ڈالنے کا شدت سے خواہش مند ہے۔ باسکل ہولارڈ کی اپنی ذاتی نوعیت کی فورس "ٹائیگر ٹیگ" شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہے، ایک تو وہ تقیا سینہ تو یہ سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ بنا ہوا ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی جس کی سرحدی چوکی پر واہگہ مین کی ڈیوٹی تھی۔ ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں سرحد پار کر جاتا ہے اور بھارتی فرعون افسروں کے چنگل میں جا پھنستا ہے، مگر وہ دشمن کی ایک گھناؤنی سازش کو بے نقاب بلکہ ناکامی سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی کے افسران کی وہ لابی جو وطن عزیز کو "دولخت" کرنے کی مذموم سازش

میں شامل رہی تھی، اپنی نئی سازش کی ناکامی پر تاج دین شاہ پر تشدد کی انتہا کر ڈالتی ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹمسی پے در پے ذلت آمیز شکست اٹھانے کے بعد دونوں کا آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے۔ بی آر بی کے کنارے شہزی اپنے دوستوں اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا وغیرہ کی مدد سے بلیو ٹمسی کے کرنل سی جی بھجوانی کا ایک منصوبہ ناکامی سے دوچار کرتا ہے اور اپنے باپ کو اس کے چنگل سے بھی چھڑا لیتا ہے۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے، جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی کے سلسلے میں نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے سی آئی اے ایجنسی میریز کورٹ میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حالات نے شہزی کو گہری تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے، اگرچہ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر، تجزیہ نگار اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ’’ٹائیگر ٹیگ‘‘ کے دو ٹاپ ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، اور ایک بحری کنٹینر کے ذریعے اسے ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہاں شہزی، جو نیم بے ہوشی اور خالی الذہنی کی حالت میں ہے، منہ کا چھینا ہوا شکار ثابت ہوتا ہے اور ایک دشمن سے دوسرے دشمن کے منہ میں جا پھنستا ہے۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شپرز کے سلسلے میں لولوش آج کل برما (رنگون) میں مقیم ہے۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک سپر ٹاپ لگژری بوٹ (YACHT) میں لیے بحرِ ہند میں خلیج کے کسی ساحلی علاقے کے قریب گہرے پانیوں میں موجود ہے۔ شہزی ان کی قید میں ہے اور یہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھنگری سے ہوتی ہے، جو لاڑکانہ کا رہائشی ہے۔ شہزی کو میجر ریاض باجوہ کی بریفنگ کے دوران یاد آجاتا ہے کہ یہ وہی آرکیالوجسٹ بشام چھنگری ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ فیلڈ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر حیثیت کی حامل تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اسے ’’ہائی جیک‘‘ کر کے اب خود اس کا سربراہ بن بیٹھا تھا۔ بشام پہلے تو شہزی پر شک کرتا ہے، مگر پھر جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک محبِ وطن شخص ہے تو پھر وہ اسے پاکستان میں موئن جودڑو کے مقام سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک کے جنگی جنونی اور ہٹلر کی طرح جوع الارض کے ہوش کا رجرنیل اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ’’ورلڈ بگ بینگ‘‘ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ بلیو ٹمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ بے چارہ خالی الذہن ہو کر رہ گیا اور اپنی یادداشت تک کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ’’ڈبل کراس‘‘ ہوگئی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو اب ایک بڑی تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے ایک جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، اس میں اس کی مدد چندر کلا کرتی ہے۔ سوشیلا بھی اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ بعد میں چندر کلا دھوکا دیتی ہے اور سے جی کوہارا اور بھوک کی بربریت کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چندر کلا...... کے چہرے پہ سرد مہری کھنڈی ہوئی تھی۔

’’یہ کیا حرکت ہے چندر کلا؟‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ سوشیلا بھی گنگ سی ہو گئی تھی۔

’’تم دونوں کو وہی کچھ کرنا ہے جو میں چاہوں گی۔‘‘ اس نے میری طرف دیکھ کر اسی لہجے میں کہا۔ ’’اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کرلو اور خبردار...... کوئی غلط حرکت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔‘‘ اس نے آخر میں تحکمانہ درشتی سے کہا اور ساتھ ہی ہمیں کیبن سے باہر نکلنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

’’تم غلطی کر رہی ہو چندر کلا! اس وقت ہم......‘‘

’’شٹ اَپ!‘‘ وہ چلا کر بولی۔ اسے اس لہجے میں بولتے پا کر مجھے کچھ خاص حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کا اندازہ میں بہت پہلے ہی سے لگا چکا تھا، جب اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی کچھ اسی طرح کے انگلش الفاظ منہ سے اُگلے تھے۔

اس کی یہ حرکت، اس بات کا بھی صاف پتا دیتی تھی کہ وہ اندر سے کیا ’’شے‘‘ ہوسکتی ہے۔ ناچار ہمیں اس کا حکم ماننا پڑا، مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں یہ جی کوہارا اور بھوک جیسے وحشی برمیوں کے سلسلے میں کوئی بھیانک غلطی نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ وہ اگر اس کی ذرا سی بھی بے وقوفی پر آزاد ہو جاتے تو صورتِ حال خود اس کے لیے بھی خطرناک ہوسکتی تھی۔

بہرکیف...... اس کا حکم ماننے کے سوا میرے پاس سردست اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دونوں ... ہاتھ اُوپر اٹھا لیے تو سوشیلا نے بھی فوراً میری تقلید کی۔ وہ ہمیں سٹیرنگ روم سے باہر لے آئی اور پائلٹ روم کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

پائلٹ روم اس پُرتعیش رہائشی کیبن کے بالمقابل ہی تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سوشیلا سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔
''چلو سوشیلا! اسے پائلٹ کرو اور بالاسور کی بندرگاہ تک پہنچاؤ، لیکن خبردار اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی کا مظاہرہ کیا تو......''
''مجھے چھوٹی موٹی بوٹ چلانے کا تو تجربہ ہے، لیکن..... اتنی بڑی یوٹ چلانا میرے لیے مشکل ہوگا۔'' سوشیلا نے منمناتی آوازسی آواز میں کہا۔ ایک بار پھر اس کی حالت غیر سی ہونے لگی تھی، اس بے چاری کے لیے یہ صورتِ حال بھی آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا جیسی تھی۔ اس کی بات پر چندر کلا نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔
''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو اور آگے بڑھ کر اسے پائلٹ کرو، ورنہ گولی مار کے تمہاری لاش سمندر میں پھنکوا دوں گی۔'' اس کی دھمکی پر سوشیلا نے میری طرف بے بسی سے دیکھا تو میں نے چندر کلا کو آخری بار سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''چندر کلا.....! دیکھو، ہم خوامخواہ ہی ایک دوسرے کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے اگر اس دوران وہ دونوں وحشی بری موقع سے فائدہ اٹھا گئے تو یہ ہم تینوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوگا۔ بالاسور کی بندرگاہ کا رخ کرنے سے ہمارا سامنا انڈین نیوی والوں سے ہوسکتا ہے اور تم نہیں جانتی ہو کہ اگر انہوں نے سے جی کوہارا اور بھومک کو دیکھ لیا تو وہ اپنے اثر و رسوخ سے نہ صرف انڈین نیول کو رام کرلیں گے بلکہ الٹا ہم ہی دوبارہ ان وحشیوں کے نرغے میں آجائیں گے جبکہ ان کے اثر و رسوخ کا اب تک تمہیں بھی بہ خوبی اندازہ ہو ہی چکا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی بات کی اثر پذیری بھانپنے کے لیے چندر کلا کے چہرے پہ نظریں گاڑے رکھی تھیں، جس کے خاطر خواہ نتائج، پہلی بار اس کے چہرے سے اُلجھن آمیز سوچوں کی صورت میں نظر آئے تو میں نے بھی لوہا گرم دیکھ کر اس سے مزید کہا۔
''دیکھو چندر کلا.....! اس وقت ہمارے ساتھ تم بھی خطرے میں گھری ہوئی ہو۔ ہمارے دشمن مشترکہ ہیں۔ سے جی کوہارا اور بھومک کا تعلق ایک خطرناک عالمی گینگ سے ہے جو یقیناً ان سے ہر لمحہ رابطے میں رہتے ہوں گے، لیکن اب سے جی کوہارا اور بھومک کی طرف سے ان کی خاموشی انہیں بھی کھٹکا سکتی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ یہاں موجود اپنے حریف انڈین خفیہ ایجنسی (بلیو ٹنسی) سے مدد کے لیے نہ کہہ دیں، تم جانتی تو ہو کہ مجھے ایک دن کے لیے ان کے حوالے بھی کیا گیا تھا۔ اب رہی بات ہیرے کے حصول کی تو اس کے لیے میں پہلے ہی تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہیں ابتدا میں ہی باہمی بھروسے کی تلقین کی تھی۔''
میں نے محض یہ بات چندر کلا کو ڈرانے کے لیے ہی نہیں کی تھی بلکہ مجھے خود بھی اس متوقع اور مخفی خطرے کا احساس تھا۔ اس میں بھلا شک بھی کیا تھا کہ رنگون میں موجود لولوش یقیناً، میرے سلسلے میں سے جی کوہارا سے رابطے میں ہوگا، اب جبکہ یہ دونوں (سے جی کوہارا اور بھومک) بے بس کر دیے گئے تھے تو ضرور لولوش جیسے خطرناک شاطر شخص نے لامحالہ کسی خطرے کی بُو بھی سونگھ لی ہوگی، وہ یہاں موجود اپنے حریف کرنل بھجوانی کے کان میں اس خطرے کی بھنک ڈال سکتا تھا اور اسے اپنے ان دونوں ساتھیوں کی ''خیریت'' معلوم کرنے کے لیے انہیں یہاں متوجہ کرسکتا تھا۔
''لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اس گوری چڑیل کے ساتھ اس ہیرے کے سلسلے میں کچھ اور ہی سوچ رہے ہو۔'' کہتے ہوئے ایک کڑوی سی نگاہ اس نے سوشیلا پر ڈالتے ہوئے میری طرف شاکی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اس بارے میں کھٹک تو میں پہلے ہی گیا تھا جب سوشیلا اور میرے درمیان طلسم نور ہیرے سے متعلق مختصر سی گفتگو ہوئی تھی، جس میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ہیرا میرے لیے بھی کتنا اہم ہوسکتا ہے۔
لہٰذا میں نے اسی شبہے کو رفع کرنے کی غرض سے بات بنانی چاہی اور اس سے کہا۔
''تمہیں شاید کچھ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہوگی۔ سوشیلا کی کہانی تم نے سن لی کہ اس نے اپنی شادی شدہ بہن اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کو اس جنونی جنرل کے ایل ایڈوانی کے خونی چنگل سے بچانا چاہا تھا مگر اس بدبخت اور سفاک انسان نے ہیرا اس سے حاصل کرنے کے باوجود اس کی بدنصیب بہن کو نہیں بخشا، پہلے اس بے چاری کے شوہر کو مروایا اور بعد میں اوشا کو بھی اس کے دونوں معصوم چھوٹے بچوں سمیت جلوا کر خاکستر کر ڈالا اسی لیے سوشیلا کی نگاہوں میں اب اس ہیرے کی کوئی قدر و منزلت سرے سے نہیں ہے، وہ تو صرف اس ظالم اور درندہ صفت جنرل سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہے، اس کے لیے وہ مجھ سے مدد کی طلب گار ہے۔''
''اور..... تم اس کے ذریعے وہ ہیرا حاصل کر کے

اپنے ملک پاکستان کا رخ کرنا چاہتے ہو؟'' چندرکلا نے میری طرف تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے طنزیہ کہا تو میں اس کی بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے بولا۔

''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ ہاتھ آئی دولت کو اس طرح مفت میں لوٹا دوں۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں اس کی طرف کھسکنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ''اسی لیے تو میں نے تم سے سب سے پہلے یہی سوال کیا تھا کہ تم کون سے گروپ سے تعلق رکھتی ہو؟ جرنیلی گروپ سے یا طالع آزماؤں کے گروہ سے۔''

اسی وقت گولی چلنے کے دھماکے کی آواز اُبھری۔ میں زور سے اچھلا اور اسی لمحے اپنے حواسوں کو بحال رکھتے ہوئے میں چندرکلا کے ساتھ وہ کچھ کر گیا، جو ''گیم'' میں اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اس نے بروقت میری حرکت نوٹ کر لی تھی اور مجھے خبردار کرنے کے اس نے میرے پیروں کے پاس فائر جھونک مارا تھا، جس سے پہلے تو میں بوکھلا کر اچھلا اور پھر اسی کو ''موقع واردات'' کا ایک سنہری موقع جان کر دانستہ کچھ اس طرح لڑکھڑایا جیسے کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا ہوں اور فرش پر اس طرح گرا کہ مجھے ٹھیک ٹھاک اس امر کا اندازہ بھی رہے کہ میری لات بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت پذیر ہونے پر وہ پستول لیے کھڑی چندرکلا کی ٹانگوں سے ٹکرائے جائے اور...... میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا، جس کا موقع ایک طرح سے چندرکلا نے ہی مجھے فراہم کیا تھا، نتیجے میں وہ فرش سے چند انچ اُچھلی اور پھر کسی چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گری تو اس کے ہاتھ سے پستول نکلتا چلا گیا...... چندرکلا کو جب تک میری اس بروقت اور فوری چالاکی سمجھ میں آتی وہ میرے زیرِدست آ چکی تھی، سوشیلا پستول اُٹھانے کے لیے لپکی جبکہ چندرکلا کو میں نے فرش پر اسی طرح لیٹے لیٹے ہی لوٹ لگا کر چھاپ لیا اور اس کی نرم و نازک گردن دبوچ لی تو ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے میرے مضبوط ہاتھ کے آہنی شکنجے میں کسی کمزوری چڑیا کی گردن آ گئی ہو اور جسے میں نے ذرا دیر اگر زیادہ دبائے رکھا تو اس کی جان... نکل جائے گی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بہ ظاہر کمزور نظر آنے والی یہ چڑیا کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتی تھی ایسے وقت میں......

چندرکلا کو اسی طرح دبوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور تب تک سوشیلا اپنی ہوشیاری دکھا چکی تھی، یعنی اس کا پستول وہ اپنے قبضے میں لے چکی تھی۔

''اس کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر ان دونوں کے ساتھ اندر بند کرنا پڑے گا، تم کوئی رسی وغیرہ کا بندوبست کر لو جلدی......'' میں نے سوشیلا کو ہدایت کی۔ وہ فوراً حرکت میں آ گئی۔

''مم...... مجھے چھما کر دو...... میرے پریتم!'' چندرکلا میرے بازو کی آہنی گرفت میں گھگیا کر بولی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھے کس برتے پر ''پریتم'' پکارتی تھی نہ ہی مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔ میں جلد از جلد لولوش کے ساتھ ایک ''گیم'' کھیلنا چاہتا تھا اور چندرکلا نے درمیان میں اچانک روڑا اٹکا دیا تھا۔ بہرکیف میں نے یہ روڑا ہٹا دیا تھا میں نے... اب سوشیلا کی مدد سے، اسے بھی رسن بستہ کر کے اسی تکونی شیپ کے کابک نما کیبن میں، ان دونوں وحشی برمیوں کے ساتھ مقید کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چندرکلا کے لیے یہ مختصر قید خانہ ایسا ہی محسوس ہوتا رہے گا جیسے وہ دو خونخوار بھیڑیوں کے پنجرے میں قید کر دی گئی ہو۔

جیسا کہ میں بہت پہلے ہی اس اہم امر کا ادراک کر چکا تھا کہ چندرکلا کے مقابلے میں سوشیلا، میرے زیادہ کام آ سکتی تھی اور میرا حکم بھی بلاچون و چرا بجا لا سکتی تھی، کیونکہ اس کے مطمح نظر اب طلسم نور ہیرا نہیں رہا تھا بلکہ کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن اوشا اور اس کے بدنصیب خاندان کا انتقام لینا زیادہ بڑا مقصد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سوشیلا سے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہیرے کے حصول اور جنرل ایڈوانی سے انتقام لینے میں وہ کسی جلدبازی کا مظاہرہ نہ کرے کیونکہ اس دوران کچھ اور اہم کام پہلے نمٹانا میرے لیے زیادہ ضروری تھے۔ حسب توقع سوشیلا نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے اس فیصلے کو قبول کیا تھا۔ تاہم میں نے اسے اپنے اور اپنے مشن کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ میں تھا کون اور آئندہ کیا کرنا چاہتا تھا، وغیرہ۔

سوشیلا بہرحال ایک بھارتی عورت تھی، اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ کسی وقت بھی اس کی اپنے وطن (بھارت) کے لیے رگ حمیت پھڑک سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنے بارے میں اسے چندرکلا کی طرح یہی بتایا تھا کہ ایک عالمی گینگ لولوش کے ساتھ میرے کچھ کاروباری معاملات کے سلسلے میں بڑی خطرناک ''ڈنسل'' چل رہی ہے۔ لہٰذا میں اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں......

بہرکیف میں اس کے ساتھ سب سے پہلے سچر تنگ روم میں آ گیا۔ میں سے جی کو ہار، کا سیل فون پہلے ہی اپنے قبضے میں کر چکا تھا اور اس کی کونٹیکٹ لسٹ میں... لولوش کا نمبر تلاشنے کی سعی چاہی تھی، لولوش یا کسی ''گریٹ ماسٹر''

کے نام سے اس لسٹ میں مجھے ایسا کوئی نمبر ''سیو'' نہیں ملا تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی تاہم میں نے اس میں زیادہ سر کھپانا غیر ضروری ہی سمجھا تھا، میں نے کنٹرول پینل کا رخ کیا۔ وہاں وائرلیس سسٹم پر میں نے مختلف فریکوئینسیز چیک آؤٹ کیں، لیکن وہاں بھی مجھے ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے ایسا کوئی سسٹم نہیں نظر آسکا تھا جسے بروئے کار لاتے ہوئے میں لولووش سے کوئی رابطہ کرسکتا۔

درحقیقت میں لولووش سے رابطہ کرنا چاہتا تھا اور ذہن میں اُبھرنے والے ایک فوری منصوبے کے تحت اُسے ''بلف'' کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے کمپاس کا بھی جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت ہم بحرِ ہند یا خلیج بنگال کے کس مقام پر موجود تھے؟ پتا چلا بنگال کے وسط میں ہماری بوٹ تیر رہی تھی۔ جہاں سے میانمار (برما) کی بندرگاہ کا سی چینل جاتا تھا۔

اچانک ایک بورڈ کے کونے میں لگا ننھا سا سرخ بلب تیزی سے جلنے بجھنے لگا، ساتھ ہی سیٹی کی آواز بھی ابھرنے لگی۔ سوشیلا بھی اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''شاید کوئی ہم سے رابطہ کرنا چاہ رہا ہے۔'' ساتھ ہی میرے ذہن میں لولووش کا ہی خیال ابھرا تھا کہ کیا خبر وہی اپنے اہم دستِ راست سے جی کو ہارا سے رابطہ کرنا چاہ رہا ہو......؟ میں نے جب یہ کہتے ہوئے سوشیلا کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونکا۔ اس کے چہرے پر مجھے عجیب سی گھبراہٹ کے آثار محسوس ہوئے تھے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

''یہ کسی اور رابطے کی رِنگ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آگے بولی۔

''یہ کسی کی کال فریکوئنسی نہیں بلکہ سگنل الارم ہے، جس کا مطلب ہے کوئی لانچ اس بوٹ کے قریب آرہی ہے۔''

''لانچ؟'' میری پیشانی پر شکن نمودار ہوئی۔ ''کیسی لانچ؟''

''جسٹ اے منٹ، میں دیکھتی ہوں......'' وہ بولی اور فوراً آگے بڑھی۔ اب وہ پینل بورڈ پر جھکی مختلف نمبروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ اس کی لانچ والی بات نے مجھے فکرمند سا کردیا تھا۔

''اس لانچ کی ڈگری بتا رہی ہے، یہ بالاسور کے کسی نزدیکی ساحل سے آرہی ہے۔''

اسکرین کے ریڈار سیکشن میں ایک گہرے سبز رنگ کے نقطے کو جلتا بجھتا دیکھ کر سوشیلا نے بتایا تو میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔

''اس لانچ کی شناخت ہوسکتی ہے؟ پتا تو چلے یہ کوئی اور لانچ ہے یا پھر انڈین نیول کی کوئی بوٹ ہے؟''

''وہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں......'' سوشیلا نے بدستور پینل بورڈ کے مختلف بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کہا۔ چند منٹوں کی عرق ریزی کے بعد اس نے کچھ تسلی بخش اطلاع دی کہ یہ کوئی اور ہی لانچ تھی۔

''ہوسکتا ہے یہ کوئی ایڈونچر فیری ہو؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''ممکن ہے لیکن اس کا رخ ہماری ہی طرف ہے، جیسے انہیں ہماری ہی کھوج ہو۔'' سوشیلا نے کہا۔

''ہم م م......'' میں نے ہونٹ بھینچے۔ ''یہ جس زاویے سے آرہی ہے، ہمیں پہلے ہی سے محتاط ہوکر اسے واچ کرنا ہوگا۔ تم آسکتی ہو میرے ساتھ؟''

''چلو۔'' وہ مڑی۔ پھر ہم دونوں کچرنگ روم سے باہر نکل آئے۔ نکلتے وقت میں نے کسی احتیاط کے پیشِ نظر وہاں موجود واکی ٹاکی اٹھا لیے تھے، ایک سوشیلا کو تھماتے وقت میں نے اسے ہدایت کی۔

''تم کیبن کریو (پائلٹ روم) کا رخ کرو...... اور مجھ سے رابطے میں رہو۔ ہوسکتا ہے ہمیں کسی قریبی ساحل کا رخ کرنا پڑے۔'' اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

''ایک بات اور......'' میں نے کہا وہ جاتے جاتے رکی اور مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''تم فیول وغیرہ چیک کرلینا اور جو بھی کمی بیشی تمہیں محسوس ہو مجھے بتا دینا۔ ہمیں اس بوٹ کو ساتھ رکھنا ہے۔''

''اوکے۔'' اس نے اثبات میں... سر ہلا دیا اور میں عرشے پر آگیا۔

بوٹ میں قابض ہونے کے بعد سے میں نے اس کی پوری تلاشی لے لی تھی۔ اسلحے کے نام پر مجھے صرف چار پستول ملے تھے، جن میں سے تین خالی تھے، ان میں سے دو میں نے سمندر میں پھینک دیے۔ فاضل راؤنڈ کا صرف ایک ڈبا اور دو عدد اسٹیچڈ بلٹ کلپ ملے تھے، ایک کلپ تو میں نے خالی پستول میں لگا کر سوشیلا کے حوالے کردیا تھا، ایک بھرا ہوا کلپ میرے پاس تھا۔ بہ قول چندرکلا کے ان کا ایک ساتھی غائب تھا، اُسے پھر ایک اور بار تلاش کیا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا، اس بارے میں چندرکلا کا پہلے ہی سے یہی خیال تھا کہ وہ خوف زدہ ہوکر سمندر میں چھلانگ لگا کر

کہیں غائب ہو گیا ہوگا۔

بہرحال میں نے پستول شرٹ کے نیچے، بیلٹ میں اڑسا اور دوربین گلے میں لٹکائے عرشے کی ریلنگ کے کنارے آ کر کھڑا ہو گیا۔ واکی ٹاکی بیلٹ میں اٹکا رکھا تھا تاکہ بہ وقتِ ضرورت کیبن کریو میں موجود سوشیلا سے فوری رابطہ بھی کر سکوں۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ آسمان پر ہلکے بادلوں کی موجودگی موسم کی کسی بھی وقت خرابی کا اعلان کرتے نظر آ رہے تھے۔ سمندری ہواؤں میں بھی تیزی محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے دوربین گلے سے اتار کر آنکھوں سے لگالی اور بیکراں پھیلے اطراف کے سمندر کا جائزہ لینے لگا۔ ہواؤں کے پکڑتے زور کے باعث لہریں کچھ متلاطم زدہ دکھائی دے رہی تھیں، جنوب مشرق کی جانب مجھے موجوں پر ایک ڈولتی ہوئی لانچ دکھائی دے گئی۔ میں نے دوربین گلے میں جھولتی چھوڑ کر، بھومک سے چھینی ہوئی طاقت ور سنگل لینس ٹیلی اسکوپ نکال کر اپنی ایک آنکھ سے لگالی۔ لمبی ٹیوب کی شکل کی اس دوربین کو میں نے اسی جانب فوکس کر کے ایک آنکھ چپکا دی۔ وہ کوئی عام سی چھوٹی لانچ تھی... بالکل اسی طرح کی جیسی ساحل کے کنارے آباد مچھیروں کی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ ورنہ تو میں بھی سمجھا تھا کہ یہ کسی انڈین سرکار سے تعلق رکھنے والی نیول یا کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ نہ ہو۔ تاہم احتیاط کا تقاضا یہ بھی نہ تھا کہ میں ان سے بالکل غافل ہو رہتا۔ ادھر کریو کیبن میں موجود سوشیلا میرے کسی حکم کی منتظر تھی، اس نے تھوڑی دیر بعد مجھ سے واکی ٹاکی پر رابطہ بھی کیا تھا۔ میں نے اسے عرشے پر ہی بلا لیا اور ٹیلی اسکوپ تھما دی اور ساتھ ہی اس لانچ کے بارے میں بتا دیا۔

''ہوں ں...... مجھے بھی یہ کسی مچھیروں ہی کی لانچ لگتی ہے۔'' سوشیلا نے ٹیلی اسکوپ اپنی ایک آنکھ پر لگائے رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن...... اس لانچ کا ہماری طرف رخ ہونا بلا مقصد نہیں ہو سکتا۔''

''بالکل صحیح کہا تم نے، مجھے بھی یہی بات کھٹک رہی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اصل میں ہیں کون اور ہماری طرف کس مقصد کے تحت آ رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ایک پستول میں نے تمہیں دے رکھا ہے۔'' ایک لمحے کے وقفے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''تم اندر پائلٹ روم میں موجود رہو، واکی ٹاکی ہمارے پاس ہے، میں ادھر ذرا چھپ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بھی محتاط رہنا، ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرتے ہی میں تم سے واکی ٹاکی پر رابطہ کروں گا۔'' میری بات پر اس نے فوراً اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی اور پائلٹ روم کی طرف لوٹ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا اور ایک بار پھر دوربین نکال کر آنکھ سے لگالی۔

لانچ قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ عام سی موٹر لانچ تھی۔ اب اس میں موجود... کچھ افراد بھی صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ مزید قریب آنے پر ان کے خاکے بھی واضح ہوتے دکھائی دیے۔ یہ چار افراد تھے۔ عام سے کھلے ڈلے لباسوں میں تھے اور غیر مسلح بھی۔ لیکن باوجود اس کے مجھے یہ مشکوک سے محسوس ہوئے۔ یہ سب ایک ساتھ کھڑے ہماری بوٹ کی طرف... دیکھ رہے تھے۔ معاً واکی ٹاکی پر سوشیلا نے مجھ سے رابطہ کیا۔

''مجھے یہ لوگ چندر کلا کے ساتھی لگتے ہیں۔'' اس نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم بھی انہیں دیکھ رہی ہو؟'' مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔

''ہاں! تمہاری والی دوربین میں اب ان کی لانچ ہی نہیں بلکہ اس میں ریلنگ کے قریب کھڑے یہ چاروں افراد مجھے بھی دکھائی دینے لگے ہیں اور اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا۔''

''تمہارا خیال درست ہو سکتا ہے سوشی!'' میں نے واکی ٹاکی پر فوراً اس کی تائید کر ڈالی۔ میری بات پر وہ آگے بولی۔

''یہ لوگ مسلح بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے تو چندر کلا کا تعلق انہی جنوبی جرنیلی گروہ کے کسی جنرل سے لگتا ہے۔''

''تم محتاط رہو اور اسی طرف نگاہ رکھو۔'' میں نے اس کے اظہارِ خیال پر تبصرہ کیے بغیر کہا۔

''میں محتاط ہوں سر!'' وہ یک دم مؤدبانہ انداز میں بولی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

''ہم دونوں ایک ہی جیسے حالات کا شکار ہیں اور اپنی اپنی بقا اور غرض و غایت کے تابع بھی اسی لیے مجھے سر کہنے کی ضرورت نہیں، تومی کہہ سکتی ہو۔''

''شکریہ سر! میرا مطلب ہے تومی!'' وہ کھنکتے لہجے میں بولی۔ میں نے ''گڈ'' کہہ کر واکی ٹاکی دوبارہ بیلٹ میں اڑس لیا۔ اسے سے جی کو ہارا اور بھومک جیسے خبیث درندوں سے آزادی دلوانے اور ان کا میرے ہاتھوں حشرناک انجام دیکھنے کے بعد وہ بے چاری خود کو میرا محکوم سمجھنے لگی تھی۔ لیکن میں نے بردباری اور کسی حد تک مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اسے برابری کی حیثیت کا درجہ دے ڈالا تھا۔

کیونکہ وہ آگے چل کر میرے بہت کام آسکتی تھی (شاید، جب تک اس کا مفاد میرے ساتھ وابستہ رہتا)۔

لانچ کے قریب تر آنے تک میں اسی طرح ریلنگ سے لگا کھڑا رہا۔ اب وہ چاروں مجھے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب میرا پورا وجود جانے کس نامعلوم اندیشناک احساس سے دھڑکنے لگا۔

وہ لانچ ہماری بوٹ کے خاصے قریب آکر ٹھہر گئی تھی اور وہ چاروں مجھے بہ غور دیکھے جارہے تھے۔ ان چاروں میں دو سانولی رنگت کے درمیانے قدوقامت کے حامل، جبکہ ایک دبلا پتلا گوری رنگت والا شخص تھا، چوتھا ان کا ساتھی خاصا قدآور اور صحت مند دکھائی دیتا تھا جبکہ دبلے اور آخرالذکر آدمی کی رنگت سرخ و سپید نظر آتی تھی۔

پتا نہیں کیا بات تھی کہ قریب سے دیکھے جانے پر مجھے ان کے بشروں سے وہ عمومی پن عنقا نظر آنے لگا تھا جو میں ذرا دیر پہلے ان کے ذرا نز دیک آنے پر دوربین سے دیکھتا رہا تھا۔ نسبتاً دراز قامت آدمی نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر بہ آواز بلند مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ہماری بات سن سکتے ہو......؟'' اس کی آواز بھاری اور گونج دار تھی۔ لہجہ غیر ملکی ہونے کی چغلی کھاتا محسوس ہوا اور زبان ٹوٹی پھوٹی ہندی اور اردو تھی۔

''ہاں! میں تمہاری آواز بہ آسانی سن رہا ہوں۔ تم لوگ کون ہو؟'' میں نے بھی جواباً اسی طرح اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر بلند آواز میں کہا۔

''ہم شاید راستہ بھول رہے ہیں۔ کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ خلیج کھمبات کا ساحل کس طرف پڑے گا؟'' اسی دراز قامت آدمی نے کہا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو منہ سے ہٹا لیا۔ میں ابھی اُسے کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ یکایک میرے وجود میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ پل کے پل مجھے ان چاروں کے ہاتھوں میں رائفلوں کی جھلک دکھائی دے گئی، جو انہوں نے ایک خاص ''ٹرک'' کے ساتھ اپنے سامنے کہیں اس طرح ٹکا رکھی تھیں کہ بہ وقتِ ضرورت انہیں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گرفت میں لے کر فوراً استعمال کیا جاسکے اور وہی ہوا۔ یک بیک چار مہیب گنوں کی نالوں کا رخ میری جانب ہوگیا اور اگلے ہی لمحے سمندر کی کھلی بے رحم فضا میں گولیوں کی سماعت شکن بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور میں ایک زوردار چیخ مار کر بوٹ کی ریلنگ سے نیچے گہرے اتھلے پانیوں میں زوردار چھپاکے سے جاگرا......

☆☆☆

بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے، لیکن انسان کو اسی خالقِ کائنات نے عقل بھی عطا کی ہے کہ وہ آگ اور پانی کی پہچان کرسکے اور اپنے تحفظ کی راہ کو ممکن بناتا رہے۔ یہی کچھ میں نے کیا تھا۔

یہ میری چھٹی حس کی کارستانی تھی کہ ان کے قریب آتے ہی میرا دل کسی اندیشناک احساس سے دھڑکا تھا۔ میں نے پہلے ہی کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر سوچ لیا تھا کہ ایسی کسی ''صورت'' میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ان کے ہاتھوں میں گنز کی جھلک دیکھتے ہی میں نے ریلنگ کے قریب آکر خود کو پیٹ کے بل پر کرلیا تھا۔ جیسے ہی فضا فائرنگ سے گونجی، خود کو ریلنگ سے دانستہ چیخ خارج کرتے ہوئے گرا لیا تھا۔ یوں میں ان نامعلوم دشمنوں کو ''کراس بلف'' کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

پانی میں ایک زوردار چھپاکے سے گرتے ہی میں نے ایک گہری ''تار'' ماری اور تیزی سے تیرتا ہوا ان کی لانچ کی طرف چلا گیا پھر ایک محتاط انداز سے ایسی جگہ سے ابھرا کہ میں ان کی نظروں میں نہ آسکوں، مگر میں ان کی جھلک دیکھ سکوں۔ خاطرخواہ نتیجہ برآمد ہوتے ہی میں نے ریلنگ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ مجھے یہ چاروں ریلنگ سے سرے پر قدرے آگے کو جھکے ہوئے نظر آگئے۔ وہ میری بوٹ کے نیچے اتھلے پانی کی طرف اپنی گنز کا رخ کیے مجھے تلاشنے کی کوشش کررہے تھے۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ وہ کسی حد تک میرے دھوکے میں آچکے تھے۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ آیا میں ان کی گولیوں کی زد میں آکر پانی کے اندر کہیں غرق ہوچکا تھا یا نہیں اور میں انہیں یہ ''اندازہ'' لگانے کا موقع دے رہا تھا۔ میں چاہتا تو اپنا پستول نکال کر ایک دو کو ادھر سے ہی ڈھیر کرسکتا تھا مگر ان کے پاس ایک تو طاقتور رائفلیں تھیں، دوسرے یہ کہ انہیں میرا پتا چل جاتا اور باقی ساتھی دشمن میرے لیے مشکل کھڑی کرسکتے تھے۔

اچانک میں نے ایک عجیب سی شے کو فضا میں اڑتے دیکھا، یہ جال نما سیڑھی تھی جس کے سرے پر یقیناً کنڈے نما دو آنکڑے لگے ہوئے تھے جو ہماری بوٹ کی ریلنگ سے اٹک گئے تھے۔ یہ لوگ بوٹ پر چڑھائی کررہے تھے اور مجھے کروکیبن میں موجود سوشیلا کی فکر ستارہی تھی، ان معلوم دشمنوں کی اندھادھند فائرنگ سے مجھے ان کے سفاک عزائم کا اندازہ ہوچلا تھا اور یہی میرے لیے زیادہ تشویش کی بات تھی کہ یہ درندہ صفت لوگ سوشیلا کو بھی دیکھتے ہی گولی مار

دیں گے۔ اگرچہ میں نے دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے سوشیلا کو بھی ایک بھرا ہوا پسٹل دے رکھا تھا اور یقیناً وہ بھی اب تک گولیوں کی تڑتڑاہٹ سن کر محتاط ہو گئی ہو گی۔ تاہم پھر بھی وہ اکیلی تھی جبکہ یہ خونی دشمن چار کی تعداد میں تھے نیز ان کے پاس ہم سے زیادہ بھاری اسلحہ تھا۔

میں نے پانی کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی کمر پر شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس جالی دار رسی کی سیڑھی پر دشمنوں کے اترنے کا منتظر رہا۔

سب سے پہلے دونوں سانولی رنگت والے آئے، اپنی رائفلیں انہوں نے پشت پر اسٹرپ کر رکھی تھیں، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اچانک مجھے اسی دراز قامت آدمی کی آواز سنائی دی جو تحکمانہ انداز میں شاید اپنے انہی دونوں آدمیوں سے کہہ رہا تھا۔

”چندر کلا...... کے علاوہ جو بھی نظر آئے، اُسے بے دریغ گولیوں سے بھون ڈالو۔“

اس کی بات پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کا مطلب تھا میرا اور سوشیلا کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ لوگ چندر کلا کے ہی ساتھی تھے۔ لیکن میں اب شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ یہ دراز قامت گورا شخص اور اس کا ہم نسل دکھائی دینے والا ساتھی آگے بڑھنے پر آمادہ نہ تھے۔ میرا اب ان دونوں سانولی رنگت کے آدمیوں کو ادھر ہی سے ”شکار“ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے اپنا پستول والا ہاتھ ذرا بلند کر کے سیدھا کیا، اچانک اس بدبخت کے ساتھی کی نگاہ جانے کس طرح نیچے پڑ گئی۔ وہ گویا میری جھلک دیکھتے ہی حلق کے بل چلایا اور اسی جوش میں آ کر اس نے ریلنگ سے ذرا مزید آگے جھک کر مجھ پر اپنی گن تاننے کی کوشش چاہی تو میں نے پہلے اسی بدبخت کا ہی نشانہ لے کر اپنے پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ میرے پستول کی نال سے گرجتا ہوا شعلہ لپکا اور گولی اس کی پیشانی میں سرخ روشن دان بنا گئی، وہ آواز نکالے بغیر اور مجھ پر فائر کرنے کی حسرت لیے، ریلنگ سے اُلٹ کر ایک زوردار چھپاکے سے نیچے سمندر میں جا گرا۔ اس دوران میں مزید دو فائر کر ڈالے ان دونوں پر جو جالی دار سیڑھی پر اپنی لانچ سے میری بوٹ تک کا مختصر سفر طے کرنے میں مصروف کار تھے، دونوں کے حلق سے کریہہ انگیز چیخیں خارج ہوئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کون زندہ رہا یا دونوں ہی وفات پانے کے قریب تھے کیونکہ اسی وقت اپنی لانچ کی ریلنگ کے ساتھ کھڑے انہیں ”لیڈ“ کرنے والے اس دراز قامت گورے نے اپنی گن سے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی، میں تب تک اس متوقع خطرے کو بھانپ کر پانی میں ایک طویل اور گہرا غوطہ لگا چکا تھا اور ساتھ ہی اسی پھرتی سے اپنا زاویہ بھی بدل چکا تھا۔ پانی کے اندر اَن گنت بلبلے چھوٹے اور میں تیر کر دوسری سمت نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں سوشیلا کو اپنے دفاع کے لیے کافی حد تک موقع فراہم کر چکا تھا۔ مجھے جب تک اس کے پاس پہنچنے کا موقع ملتا، وہ تب تک اپنے دفاع کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر پانی کی سطح سے اپنا سر ابھارا تو مجھے لانچ کی سیلن زدہ گیلی دیوار پر نصب آہنی سیڑھی دکھائی دی اور میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس پر چڑھ گیا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دشمن لانچ پر آ گیا۔ پستول ہاتھ میں تولتے ہوئے میں محتاط رہنے کے ساتھ اسی سمت بڑھا جس طرف میرا اندازہ تھا کہ وہاں اسی دراز قامت شخص کو ہونا چاہیے تھا۔ لانچ اتنی زیادہ بڑی بھی نہیں تھی، ایک ہی کیبن تھا اور کچھ مستول جھول رہے تھے۔ مجھے لانچ میں ہر طرف اشیا بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں، ان سے بچتا بچاتا ہوا اسی طرف کو بڑھا جہاں دشمنوں نے ہماری بوٹ پر سوار ہونے کے لیے رسی کی جالی دار سیڑھیاں منسلک کر رکھی تھیں۔ اچانک میں نے اسی دراز قامت آدمی کی جھلک دیکھی۔ وہ اسی سیڑھی پر دوسری طرف ہماری بوٹ پر سوار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا، جبکہ اس کا ایک سانولی رنگت کا ساتھی اسی لانچ کی جانب اپنی گن تھامے پشت کے بل سیڑھی پر اٹکا ہوا تھا، تاکہ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر وہ باآسانی فائر کھول سکے۔

”تو گویا ان دونوں میں سے ایک میری فائرنگ سے زخمی ہو گیا تھا۔“ میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ میں اس کی نظروں میں آئے بغیر اس کا نشانہ لینا چاہتا تھا، قبل اس کے کہ اس کی مجھ پر نگاہ پڑتی اور یہ مجھ پر گولی چلاتا، لہٰذا ابھی میں اسے نشانہ بنانے کی تگ و دو میں تھا کہ اچانک فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ابھرا۔ میں یہی سمجھا شاید میں اس کی نظروں میں آ گیا تھا اور اسی نے ہی مجھ پر گولی چلائی تھی، لیکن ایسا نہیں تھا، گولی بوٹ کی طرف داغی گئی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ یہ حرکت سوشیلا کے سوا اور کس کی ہو سکتی تھی، اسی وقت ان دونوں کی طرف سے بھی جوابی فائرنگ ہوئی، ہدف بوٹ تھی۔ میں نے ان دونوں کی ”مصروفیت“ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے پستول سے اسی سانولی رنگت والے کا نشانہ لے کر گولی داغی۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ جالی دار سیڑھی سے چھوٹ کر نیچے سمندر میں جا گرا۔ سرخ

وسپید دراز قامت گورا اب میرے اور سوشیلا کے بیچ میں سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک برسٹ مجھ پر فائر کیا اور میں نے ایک آڑ میں ہو کر خود کو اس کی مہیب آتشیں زدگی سے بچایا، دوبارہ ابھر کر اس کی جانب دیکھا تو اس نے دوسرا برسٹ بوٹ کی جانب بھی داغ ڈالا اور تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا۔ میں نے اپنے پستول سے یکے بعد دیگرے اس پر دو فائر جھونک ڈالے، ایک گولی اسے کہیں لگی تھی، کیونکہ میں نے اسے جھٹکا کھاتے دیکھا تھا، مگر وہ خاصا سخت جان ثابت ہوا۔ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر بالآخر وہ بوٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اس کے خاصا نزدیک پہنچ چکا تھا۔ مجھے گہری تشویش نے آن لیا، میرے پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں، مگر میرے پاس پہلے ہی سے ایک عدد بھرا ہوا فاضل کلپ موجود تھا، خالی نکال کر میں نے وہ پستول میں اٹیچ کیا اور واکی ٹاکی پر سوشیلا سے رابطہ کرنا چاہا۔ میں اُسے خبردار کرنا چاہتا تھا کہ ایک دشمن بوٹ میں داخل ہو چکا ہے، مگر واکی ٹاکی میں شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ شاید پانی کی وجہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ اسی جانب بڑھا جہاں جالی دار سیڑھی ہماری بوٹ کے ساتھ منسلک تھی، جیسے ہی میں وہاں پہنچا، میرا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس بدبخت سرخ گورے نے بوٹ میں سوار ہوتے ہی وہ سیڑھی کاٹ کر نیچے پھینک دی تھی۔ میری پیشانی پر اُلجھن آمیز سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ ٹھیک اسی وقت بوٹ میں مجھے گولیاں چلنے کی آوازیں گونجتی سنائی دیں۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ سوشیلا کی طرف سے میری تشویش فزوں تر ہونے لگی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوبارہ سمندر میں چھلانگ لگا دی اور غوطہ مار کر اپنی بوٹ کی طرف آ گیا۔ اس طرف کچھ رسوں کے ساتھ ٹائر جھول رہے تھے، میں ان کے سہارے اُوپر چڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں بوٹ کے عرشے پر تھا۔

سہ پہر اب دھیرے دھیرے شام میں ڈھلنے لگی تھی۔ سمندری ہواؤں کی سبک خرامی میں تیزی آ رہی تھی۔ اُوپر بیکراں آسمان پر اب کالے بادل منڈلانے لگے تھے..... کسی بھی وقت تیز اور طوفانی بارش کا گماں ہوتا تھا۔

بوٹ پر مجھے غیر معمولی خاموشی اور سناٹے کا راج محسوس ہوا۔ پستول میرے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور اطراف کا جائزہ لینے کے دوران اچانک میری نگاہ فرش پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ فرش پر خون کی ایک تازہ... لکیر سی آگے تک چلی گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہ اسی گورے کا خون تھا جو میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔ میں آگے کو لپکا اور اسی وقت پائلٹ روم سے میں نے سوشیلا کو بدحواسی کے عالم میں دوڑتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اسے زندہ دیکھ کر میں نے بے اختیار طمانیت بھری سانس لی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی، میں نے اسے پستول دے رکھا تھا۔

''شش..... شہزی! جلدی آؤ.....'' وہ مجھ سے یہ کہہ کر دوبارہ پائلٹ روم کی جانب کو لپکی، میں بھی حیران و پریشان سا اس کے پیچھے دوڑا۔ جب میں پائلٹ روم میں پہنچا تو تب تک سوشیلا بوٹ کو حرکت میں لا چکی تھی۔ مجھے قریب فرش پر وہی گورا بے سدھ پڑا دکھائی دیا۔ سوشیلا کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل اسی کی تھی۔

''کیا یہ مر گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! بے ہوش ہے۔'' سوشیلا نے جواب دیا۔ ''لیکن ہمارا اب بالاسور کی بندرگاہ پر پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔''

''خیریت تو ہے ناں؟ ایسا کیا دیکھ لیا ہے تم نے؟''

''ایک تیز رفتار موٹر بوٹ ہماری بوٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مجھے یہ ان دونوں برمیوں کے ساتھی لگتے ہیں۔'' سوشیلا نے انکشاف کیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ.....'' معاً مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے بچکانا سوال پوچھ رہا تھا، ظاہر ہے اس نے ریڈار کے ذریعے ہی پتا چلایا ہوگا۔ لہٰذا میں نے اپنی ہی بات کا گلا گھونٹتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہماری بوٹ اس تیز رفتار اسپیڈ بوٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہمیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا، مجھے یہ ان کے انڈین حریف نما ساتھی لگتے ہیں۔'' میرا اشارہ بلیو ٹکسی کے ایجنٹوں کی طرف تھا، جس سے وہ لاعلم تھی۔

''ہمیں بالاسور کی طرف سفر جاری رکھنا ہوگا۔''

میری بات پر سوشیلا کا چہرہ جانے انجانے خوف سے سفید پڑ گیا۔ شاید اس کے سر پر ہی نہیں بلکہ اس کے اعصاب پر بھی ابھی تک سے جی کو ہارا اور بھوک کی شرمناک اور انسانیت سوز درندگی کا خوف سوار تھا۔ میری زبانی یہ سن کر اس کا متوحش ہونا عین امر تھا۔

بوٹ حرکت میں آ چکی تھی اور اسے جتنی تیز رفتاری سے طے شدہ آبی راہ گزر پر دوڑایا جا سکتا تھا، سوشیلا نے اسے گامزن کر دیا تھا۔

پھوار تیز بارش میں بدلنے سے پہلے ہی دم توڑ چکی تھی، جبکہ میں اس وقت تیز طوفانی بارش کی توقع کیے ہوئے تھا۔ تاہم موسم کے تیور ہنوز کچھ ایسے ہی اب بھی نظر آتے تھے کہ اب تب میں طوفان آیا کہ آیا......

میں نے واکی ٹاکی کا جائزہ لیا، خشک ہونے کے بعد یہ کام کرنے لگا تھا۔

''تم یہ رائفل مجھے دے دو اور اس گورے کی بھی مشکیں کس کر کیبن کریو سے باہر کہیں ڈال دو...... میں عرشے پر مستول گیری کرتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے فرش پر بے سدھ پڑے گورے کی جلدی سے تلاشی لی تو اس کے پاس سے کچھ شناختی کاغذات اور دیگر اشیا برآمد ہوئیں.... مقصد کی شے آخر میں اس کے پیٹ پر بندھے ایک چری بیلٹ میں اڑسے ہوئے بلٹ کلپ کی صورت میں برآمد ہوئی۔ اس کی رائفل بھری ہوئی تھی، فاضل کلپ میں نے اپنے قبضے میں کر لیے۔ پستول اپنا بیلٹ میں اس طرح اٹکا دیا کہ بہ وقت، فوری ضرورت پر نکال سکوں...... باقی برآمد ہونے والے کاغذات کا جائزہ لینے کا ابھی میرے پاس وقت نہ تھا۔ تاہم میں نے وہ بھی اپنے پاس سنبھال لیے تھے اور تیزی کے ساتھ کیبن کریو سے باہر نکلتا چلا گیا۔

عرشے پر آکر میں نے ون لینس دوربین سنبھالنے سے پہلے ایک نظر یوں ہی اطراف میں حدنگاہ پھیلے سمندر پر ڈالی تو چونک پڑا۔ لگ بھگ کوئی چند ناٹیکل میل کے فاصلے پر جنوب مشرقی سمت میں مجھے پانی کی ہلکورے لیتی سطح پر ہلچل سی مچتی دکھائی دی، وہ کوئی اسپیڈ وبوٹ ہی تھی جو انتہائی تیز رفتاری سے پانی کی سطح کو چیرتی اپنے پیچھے جھاگ کی لکیر چھوڑتی ہوئی اسی طرف ... گویا اُڑی چلی آرہی تھی۔ ایک اور متوقع خونیں معرکے کا سوچ کے میری رگوں میں خون کی گردش یک لخت تیز ہوگئی۔

دوربین کو میں نے آنکھ سے لگا کر اس اسپیڈ وبوٹ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا، تاکہ اس میں سواروں کی تعداد کا کچھ اندازہ لگا سکوں۔

تیز سمندری ہواؤں میں بتدریج اضافہ ہونے لگا تھا اور پھوار نما بارش پڑنا شروع ہوگئی تھی۔

مجھے اس میں پانچ سے زائد مسلح افراد کے خاکے دکھائی دیے گئے۔ ان کی حرکات وسکنات انہیں انتہائی تربیت یافتہ باور کراتی نظر آرہی تھی۔ میرے اندر کا تربیت یافتہ کمانڈو ایجنٹ گویا ایک انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا۔ میں نے دوربین آنکھ سے ہٹائی، ہاتھ میں دبی رائفل کی چال درست کی اور اس کی سیٹنگ کا جائزہ لیا پھر عرشے کی ایک ایسی سمت کی طرف جھکے جھکے انداز میں بڑھ گیا کہ اگر اسپیڈ وبوٹ میں سے کوئی اس بوٹ کا جائزہ لینا بھی چاہ رہا ہو تو میں انہیں نظر نہ آسکوں......

ایک آہنی آڑ میسر آتے ہی میں نے وہاں پوزیشن سنبھال لی۔ رائفل کسی بھی وقت آتشیں چنگھاڑ مارنے کے لیے میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی، میں ایسے رخ پر پوزیشن سنبھالے ہوئے تھا کہ دشمن کے اس نئے گروپ کی موٹر بوٹ مجھے نظر آتی رہے کہ وہ ہماری بوٹ کے کون سے حصے کا رخ کرتی ہے۔ نیز اس کے سوار بھی مجھے نظر آتے رہیں۔

کیبن کریو میں موجود سوشیلا بوٹ کو حتی المقدور بھگائے جارہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ہماری بوٹ ان کی اسپیڈ وبوٹ کا رخ نہیں کرسکتی۔ اسی لیے میں نے راہ فرار کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔ اسپیڈ وبوٹ تیزی سے قریب آتی جارہی تھی اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ اگر تو یہ متوقع طور پر بلیوٹکسی ایجنٹ تھے تو ان پر میرا اندھا دھند فائر کھولنا کارآمد ثابت نہیں ہوسکتا تھا، بجز اس کے کہ میں انہیں مکاری سے چھاپنے کی کوشش کرتا۔

اسپیڈ وبوٹ قریب آچکی تھی اور اسی رخ پہ تھی جہاں بوٹ پر میں ایک آڑ لیے چھپا کھڑا تھا، مجھے اس میں سوار پانچ سے چھ مسلح افراد نظر آرہے تھے۔ دو کو تو پہچان کر میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا تھا، وہ بلیوٹکسی ایجنٹ شیام اور کوریلا تھے۔ باقی ان کے تین چار ساتھی ایجنٹ تھے۔ ان کے جسموں پر چست لباس نظر آرہے تھے، میں اب بھی چاہتا تو ان پر بے دریغ فائر کھول سکتا تھا۔ لیکن میں یہ بے وقوفی نہیں کرسکتا تھا، حالانکہ چندر کلا کے ساتھیوں کے ساتھ میں نے یہی طریقہ آزمایا تھا مگر ہر دشمن کی اپنی کیمسٹری ہوتی ہے۔ یہ اس پر نہیں اترتے تھے۔

بہرکیف ایک کمانڈو ایجنٹ کی حیثیت سے میں ان کے ''لائن آف ایکشن'' کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں سر دست ان پر کوئی حملہ کیے بغیر آنکھیں سکیڑے ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے میں محو تھا۔ ان کی بوٹ قریب آتے ہی اپنا رخ بدل کر بوٹ کے دنبالے کی طرف بڑھ گئی، اب میرا اپنی جگہ پر محبوس رہنا عبث تھا لہٰذا میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوڑتا ہوا بوٹ کے دنبالے کی طرف پہنچا، اسی وقت بوٹ پر موجود کسی کو شاید میری جھلک دکھائی دے گئی، کیونکہ اگلے ہی

لمحے گولی چلنے کا دھماکا ہوا، میں نے آواز کا آہنگ بھانپتے ہی خود کو نیچے گرالیا۔

میں گرتے ہی لڑھکنے کے انداز میں اپنی پیش قدمی کو موقوف کیے بغیر بالآخر یوٹ کے اس حصے تک پہنچ گیا جدھر میں آنا چاہتا تھا۔ ابھی میں بہ سرعت سنبھل کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی گونجیلی آواز سنائی دی۔

''ہیلی کاپٹر......''

میرے ذہن میں ابھرا اور میری پیشانی پر ان گنت پریشان کن سی سلوٹیں ابھر آئیں۔ میں نے رائفل کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ذرا سر اٹھا کر کھلی فضا میں آواز کی سمت دیکھا تو وہاں مجھے ایک چوپڑ گڈگڈاتا ہوا نظر آ گیا، میں نے اس طرف سنگل لینس آنکھ سے لگا کر دیکھا تو مجھے تین افراد دکھائی دیے، تیسرا پائلٹ تھا، باقی دو مسلح تھے، ان کے ہاتھوں میں طاقت ور رائفلیں دبی ہوئی تھیں، ایک کی رائفل مجھے تھنڈر بولٹ کلیبر کی محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس کی نال کے نیچے راکٹ فائر سسٹم کی نسبتاً بڑے میکنزم کی اضافی نال بھی دکھائی دیتی تھی۔

پل کے پل ان کی صورتیں دیکھ کر میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ایک گہری تشویش کی لہر سی اٹھی تھی کہ میرے دشمنوں نے غالباً مشترکہ طور پر میرے خلاف ''ڈبل ایکٹ اسالٹ آپریشن'' کر ڈالا تھا۔ کیونکہ گنجے سر کے یہ تینوں چوپڑ سوار مجھے بری دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ بھی تھا، اب تو اس خطرناک ترین صورتِ حال کو مجھے فیس کرنا ہی تھا۔ دشمن کے دو گروہ (اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی) میرے خلاف جدید اسلحے سمیت ہلہ بولنے کے لیے سر پر آن پہنچے تھے اور مجھے اپنے محدود اسلحے کے بل بوتے پر بیک وقت ان دونوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔

اپنے ''ہائی پروفائل'' دشمنوں سے نمٹنے کے ایک عجیب جنوں خیز جوش تلے میرے ہونٹ سختی کے ساتھ باہم بھنچ گئے اور میں نے مضبوطی کے ساتھ رائفل تھام کر سب سے پہلے اسپیڈ بوٹ میں سوار بلیوٹکسی ایجنٹوں کی طرف توجہ کی اور ایک غائر سی نگاہ آسمان پر شکاری پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتے چوپڑ پر ڈالی...... وہ اب اسپیڈ بوٹ کے اوپر معلق تھا، یوں، جیسے انہیں ''کور'' فراہم کر رہا ہو...... صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے میں نے پل کے پل ایک گوریلا طرز کی حکمتِ عملی ترتیب دی اور واکی ٹاکی پر ہوشیار سے رابطہ کیا۔ پہلے اسے مختصراً صورتِ حال کی

دھوکا

نعیم: ''میری بیوی نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔''
خلیق: ''کیا دھوکا دیا؟''
نعیم: ''کہنے لگی کہ اگر تم رات کو دیر سے آئے تو میں خودکشی کرلوں گی۔''
خلیق: ''اس میں کیا دھوکا ہوا؟''
نعیم: ''اس نے خودکشی نہیں کی۔''

محمد منشا، جلالپور بھٹیاں

صراحت بیان کی اور اس کے بعد کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس! احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ کام کرنا ہوگا تمہیں، اسی وقت تم قیدیوں کے کمرے میں جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کرلینا، واکی ٹاکی پر میری مزید ہدایت کا انتظار کرنا......''

اسے یہ ہدایت دینے کے بعد میں نے یوٹ کی نسبتاً محفوظ دیوار سے باہر سمندر میں جھانکا تو اسپیڈ بوٹ اور اس پر ''معلق'' چوپڑ کو ویسے ہی پاکر مجھے کچھ حیرت سی ہوئی۔ میں ان کی طرف سے فوراً حملہ آور ہونے کی توقع کر رہا تھا مگر اب ان کی طرف سے یہ ''خاموشی'' مجھے ایک نامعلوم سی تشویش میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ ابھی میں اسی الجھن آمیز تانے بانے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک میگافون کے ذریعے آواز سنائی دی۔ یہ چوپڑ سے آرہی تھی۔

''مسٹر شہزاد کمال (خان)! اس وقت تمہارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں، پہلا یہ کہ تم بغیر کسی جوابی کارروائی کے خود کو ہمارے حوالے کر دو، کیونکہ تم ہم سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو، اگر یہ غلطی کرو گے تو سخت پچھتاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے لیے اس اجنبی دیس میں فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔ دوسرا راستہ جو تمہارے لیے آخری راستہ ہو...... ہم سے جنگ کرنے کا ہے اور اس میں لازماً تمہاری شکست اور عبرت ناک انجام کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف دس سیکنڈوں کی مہلت دی جاتی ہے۔ اپنے دونوں... ہاتھ بلند کر کے یوٹ کے عرشے پر آجاؤ، یا پھر اپنے بھیانک انجام کا سامنا کرو۔''

یہ کہتے ہی میگا فون سے گویا اسی وقت ہی کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دی گئی......

''ون......''

میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت ہی تیز تر ہو گئی۔ مجھے ایسی کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر کہ یہ لوگ مجھے

گولیوں کا نشانہ نہیں بنا سکتے..... ان کے آگے ہتھیار ڈالنے
کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ میرے پاس کوئی
میگافون نہ تھا..... ورنہ میں نے ان کی دھمکی کے جواب میں
یہ کہہ سکتا تھا کہ لولوش کا ایک اہم ساتھی سے جی کوہارا میری
گرفت میں ہے اور حملے کی صورت میں (میں) اُسے جانی
نقصان پہنچا سکتا ہوں..... اگرچہ اس پہ بھی کوئی بعید نہ تھا کہ
اُنہیں اپنے ان دونوں ساتھیوں کوہارا اور بھوک کی بھی کوئی
پروا ہوتی۔

میں نے پوزیشن سنبھالی۔ میگافون پر گنتی اب پانچ پر
آ گئی تھی۔ پل کے پل میں نے اس "دہری" صورت حال
کا جائزہ لیا کہ پہلے کون میرے لیے فوری خطرے کا سبب
بن سکتا تھا، بوٹ سوار یا چوپڑ..... میں نے سب سے پہلے
اسپیڈ وبوٹ پر معلق چوپڑ کا نشانہ لیا، مگر جلد ہی مجھ پر یہ
حوصلہ شکن انکشاف ہو گیا کہ میرے ہاتھ میں دبی ہوئی
رائفل کی فضائی رینج سے چوپڑ باہر تھا۔ اگر ہوتا..... تو بھی
اس کی گولی چوپڑ کی باڈی کو خاطر خواہ نقصان نہیں پہنچا سکتی
تھی، تب تک دشمن سنبھل کر مجھ پر ہلہ بول سکتا تھا۔ میں
چاہتا تھا کہ ایک ہی وار دشمن کے لیے کاری ثابت ہوتا کہ
میں دوسری طرف متوجہ ہو سکتا۔ گنتی آٹھ پر پہنچ چکی تھی اور
میرے پاس اب سوچنے کے بجائے عمل کرنے کا قلیل ترین
وقت رہ گیا تھا۔ میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ
گیا۔ میرے انداز واطوار سے بے بسی سی جھلکنے لگی تھی۔

☆☆☆

گنتی پوری ہو گئی۔

فضا میں یک بیک ایک عجیب سی ٹھٹکا دینے والی
ہولناک سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ماسوائے سمندری ہواؤں
کے شور میں چوپڑ کی گڑگڑاہٹ..... جیسے ابھی کچھ ہونے والا
تھا، آر یا پار..... میں نے دیکھا۔ بوٹ کے اُوپر معلق چوپڑ
نے حرکت کی اور بوٹ کے قریب آنے لگا۔ وہ دونوں فضا
سے ہی بوٹ کے اندرونی گوشوں کا جائزہ لینے میں مصروف
ہو گئے، جبکہ اسپیڈو بوٹ نے بھی بیک وقت ہی حرکت کی
تھی۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے، دل جیسے سائیں
سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا تھا۔ دشمن حملے کے لیے پر
تولے ہوئے تھا۔ بوٹ اور چوپڑ کی آوازیں قریب تر ہو گئی
تھیں بلکہ چوپڑ تو اب تقریباً بوٹ پر معلق نظر آنے لگا تھا۔
مجھے سب سے زیادہ اور فوری خطرہ ٹیلی اسکوپ گن سے تھا۔
مجھے ان کی حکمت عملی سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی۔
چوپڑ پہلے بوٹ کے اُوپر آ کے اپنے بوٹ والے "حلیفوں"
کو کور دے رہا تھا، تاکہ بلیوتکسی کے گھاگ ایجنٹ بوٹ میں
دراندازہوسکیں، جبکہ میں اپنی جگہ جیسے محبوس کر دیا گیا تھا
لیکن ایسا زیادہ دیر چلنا، دشمنوں کے شکنجے میں آنے کے
مترادف تھا، میں نے اُوپر فضا میں آہنی عفریت کی طرح
منڈلاتے چوپڑ کو دیکھا اور اپنی جگہ سے حرکت کی، تاکہ نسبتاً
محفوظ جگہ سے اس پر فائر کھول سکوں مگر میری جھلک تاک
میں بیٹھے ایک اسکن ہیڈ نے دیکھ لی۔ اسی وقت گولی چلی،
میری ٹھٹکی ہوئی سماعتیں، پہلے ہی اس متوقع آواز کے دھیان
پر تھیں۔ لہٰذا گولی کی سنسناتی آواز پہ میں نے ایک جست
بھری، ایک کیبن کی چھت پر لڑھکتا ہوا میں پشت کے بل پر
ہوا، رائفل سیدھی کی، چوپڑ میرے عین سر پہ ڈگمگا رہا تھا۔
میں نے ایک پل ضائع کیے بغیر اس پر برسٹ فائر کر دیا۔
چوپڑ کے نچلے فولادی پنجرے پر میں نے چنگاریاں سی چھٹتی
دیکھیں، جو گولیاں ٹکرانے کے باعث ہی تھیں۔ چوپڑ نے
خطرہ محسوس کرتے ہی، حرکت کی اور ایسی پوزیشن پر آنے لگا
کہ اس پر سوار دونوں اسکن ہیڈ "برمی" مجھ پر باآسانی
گولیاں داغ سکیں، لیکن تب تک میں تیزی سے رینگ کر
اپنی جگہ بدل چکا تھا، اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری،
قریب ہونے کے باعث، ان دونوں گنجے شیطانوں نے
شاید بھاری مشین گن کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ پوری باڑ
کیبن کی اس چھت کو چھیدتی چلی گئی، جہاں تھوڑی دیر پہلے
میں موجود تھا۔ میں ایک تنگ سے گلیارے میں آن گرا تھا۔
فائرنگ بند ہو گئی، ان کے حملہ کرنے کا محتاط انداز مجھے یہ
باور کرانے لگا تھا کہ دشمن اس بوٹ کو کسی ایسے خطرے میں
نہیں ڈالنا چاہتے تھے، جس سے اس کے سمندر برد ہونے کا
خطرہ ہو۔ وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ انہیں پتا تھا، اس بوٹ میں ان
کے (لولوش کے) دو ساتھی سے جی کوہارا اور بھوک بھی
موجود تھے، اور بھی سمجھ میں آنے والی وجوہات ہو سکتی تھیں۔

تنگ گلیارے میں گرتے ہی، مجھے احساس ہوا کہ
بوٹ پر بوٹ سوار دشمن بھی آ دھمکے ہیں..... لیکن مجھے
میرے لیے زیادہ مصیبت کا باعث وہ چوپڑ تھا جو لٹکتی ہوئی
تلوار کی صورت میرے سر پر معلق تھا۔

میں نے گن سنبھالی اور اسی سمت کو اس اوپن ٹاپ
راہداری کی دیوار سے پیٹھ چپکائے محتاط روی کے ساتھ
آگے بڑھتا گیا۔

چوپڑ سوار، نیچے والوں کو شاید میری "لوکیشن" سے
متعلق راہنمائی کر رہے تھے، یہی سبب تھا کہ میں نے اسی
رہداری کے سر پر، جہاں سے یہ تھوڑی بل کھا رہی تھی، وہاں

کچھ کھڑبڑ محسوس کی...... معاً ایک فائر ہوا اور میرے حلق سے سسکاری نما چیخ خارج ہوگئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے گرم سلاخ میرے بائیں شانے میں گھونپ دی ہو۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی، پشت کے بل راہداری کے فرش پر گرتے ہی میری لامحالہ نظریں، کیبن کی چھت پر پڑیں، وہاں، مجھے ایک دشمن کی جھلک دکھائی دی، اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا، جو اب تاک کر ایک اور فائر کرنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے زخمی ہونے کے باوجود اپنے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا، اسی وقت اس نے مجھ پر دوسری گولی داغی، میں فرش پر لیٹے لیٹے ماہی بے آب کی طرح تڑپا، جگہ بدلی، گولی اسی خالی جگہ پر پیوست ہوگئی، اب میری باری تھی...... تاک کر میں نے نشانہ لیا، ٹریگر دباتے ہی میرے پستول نے شعلہ اگلا، گولی کیبن کی چھت پر کھڑے دشمن کی پیشانی کو رنگین کرگئی، وہ وہیں کھڑے کھڑے میکانکی انداز میں دھپ سے میرے بالکل قریب گرا، میں اپنے زخمی شانے پر ہاتھ رکھے اس کی تکلیف کو دانتوں تلے دبائے آگے کو بڑھا، اپنی رائفل میں نے اُٹھالی تھی، پستول دوبارہ بیلٹ میں پھنسا دیا تھا۔

عقب میں اچانک، گولیوں کی پوری باڑ داغی گئی، خوش قسمتی سے میں اس وقت تک راہداری کے اس حصے کی طرف آچکا تھا، جہاں سے یہ بل کھا کر گھوم رہی تھی اور گولیوں کی تڑابڑی سنتے ہی میں خود کو چھلنی ہونے سے صاف بچا گیا، مگر پلٹ کر میں نے بھی ایک محتاط انداز سے پر آڑ سے تلے دو تین فائر جھونک مارے۔

متوقع دشمن حملہ آور کی چیخ سنتے ہی میرے بھینچے بھینچے ہونٹ، مسکرانے کے انداز میں کھنچ گئے۔ دفعتاً ہی گولیاں چلیں، میں بدکا۔ مگر اس کے آہنگ اور درمیانی وقفے سے مجھے فوری اندازہ ہوا کہ یہ کسی اور طرف داغی گئی تھیں اور رائفل کی نہیں، پسٹل فائر تھا۔ سمت وہی تھی، جہاں وہ تکونی شیپ ''قید خانہ'' تھا...... میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا، میرے ہونٹوں کی فاتحانہ مسکراہٹ ایک دم معدوم ہوگئی۔ گہری تشویش کے احساس تلے میرا چہرہ ستّ کے رہ گیا۔ دشمن جدید اسلحے سے لیس اور زیادہ تعداد میں تھے جبکہ میں اب تک دو دشمن گرا چکا تھا اور یہ دشمن کوئی عام حیثیت کے حامل نہیں تھے، انتہائی تربیت یافتہ بلیو تسی سیکریٹ ایجنٹ تھے۔

قید خانے کی طرف سے گولیوں کی آنے والی آوازیں اس بھیانک حقیقت کے منکشف ہونے کی دلیل تھیں کہ دشمن وہاں تک پہنچ چکے ہیں، جہاں سوشیلا بھی ایک طرح سے محبوس تھی، جبکہ مجھے ابھی تک سوشیلا سے واکی ٹاکی پر رابطہ کرنے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا۔ یوں بے چاری سوشیلا دو ہولناک خطرات کے بیچ ''سینڈوچ'' بننے والی تھی۔

اول تو کوہارا اور بھومک آزاد ہوتے ہی اس کا حشرناک انجام کرڈالتے، پھر وہ زخمی درندوں کی طرح پوری بوٹ میں میرے خون کی بو سونگھنا شروع کردیتے۔

ابھی میں اس طرف پیش قدمی کے ارادے سے ایک قدم اُٹھانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک فضا میں بدستور گڑگڑاتے ہوئے چوپڑ کی آواز مجھے عین سر پر سنائی دی، میں نے فوراً سر اٹھا کر اوپر دیکھا، اور میری آنکھوں میں چھائی تشویش ناک سی مُردنی، پل کے پل ایک شکارانہ چمک میں بدل گئی، مجھے چوپڑ پر فائر کرنے کا یہ دوسرا اور نسبتاً زیادہ بہتر موقع ملا تھا، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ خاصا نیچے اور کچھ ایسے زاویے پر تھا کہ مجھے کانوں پہ ہیڈفون وغیرہ چڑھائے ہوئے پائلٹ کا آدھا بدن دکھائی دے رہا تھا جبکہ اس کے کھلے دروازے سے نصف حد تک باہر نکلے ہوئے وہ دونوں مسلح اسکن ہیڈ ڈبری نیچے راہداری میں جھک کر مجھے تاڑنے کی جستجو میں تھے، یوں کہ ان دونوں نے اپنی اپنی ایک ٹانگ چوپڑ کے ''لینڈنگ اسکڈ'' پر ٹکا رکھی تھیں۔

مجھے ان کا حملہ اور جنگی حکمت عملی طے شدہ محسوس ہو رہی تھی، یعنی بوٹ کو کوئی بڑا نقصان بھی نہ پہنچنے پائے اور اپنا مقصد بھی خاطر خواہ طریقے سے حاصل کرلیا جائے، وجہ وہی رہی ہوگی، جس کا ذکر میں پہلے کرچکا تھا۔

اس دوران مجھے قید خانے کی سمت سے بھی گولیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، وہاں شاید وہ سوشیلا سے نبرد آزما تھے۔ میں جانتا تھا کہ سوشیلا زیادہ دیر تک ان گھاگ ایجنٹوں کے سامنے نہیں ٹک سکتی، اس کے مارے جانے کے یقینی احساس سے میرا دل ایک بے نام سے دکھ سے بھرنے لگا تھا، سوشیلا میرے آگے چل کر بہت کام آنے والی تھی اور دیارِ غیر میں اس سے وہی ایسی شخصیت تھی جس پر میں مکمل بھروسا کرسکتا تھا......

اسی وقت جب میں بہ سرعت رائفل سے پائلٹ کا نشانہ لینا چاہتا تھا، مجھے عقب میں کسی کی لپکتی ہوئی جھلک دکھائی دی، جیسے کوئی مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن بنا رہا ہو اور جسے میں اچانک ہی نظر آگیا تھا، اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس پر پہلے گولی چلاتا تو...... ایک تو چوپڑ سوار دشمنوں کو نہ صرف اپنے ''نشانے'' سے کھو دیتا بلکہ انہیں بھی خود پر ''نشانہ

بازی'' کا پورا موقع دے ڈالتا، اگر اپنے عقب والے دشمن کو نظر انداز کرتا تو وہ مجھ پر بلا دریغ گولی چلا سکتا تھا اور...... یہی آخر الذکر دشمن میرے لیے زیادہ خطرناک تھا، کیونکہ میں اس کے نشانے پر تھا......

فوری فیصلہ اور عمل کرنے کی اس کڑی اور جاں گسل صورتِ حال نے میرے جوشِ جنوں میں عجیب سا اضافہ کر ڈالا اور اسی خرد و جنوں کے جذبۂ جوش تلے میں نے اپنی اٹھی ہوئی رائفل کا رخ مذکورہ دشمن کی جھلک تاڑ کر برسٹ فائر کیا، مجھے اس کی کوئی چیخ سنائی نہ دی، تاہم اتنا تو ضرور ہوا کہ وہ چند لمحے کے لیے میری طرف سے بے خبر ہو گیا، اسی وقت جب میں اپنی گن کی نال کا رخ تیزی سے اوپر منڈلاتے چوپڑ کی طرف کرنے لگا تو مجھ پر یک بیک کئی گولیاں چوپڑ سے داغی گئیں، میرے دائیں بائیں پڑنے والی گولیوں کی باڑ سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی میں ان کے نشانے پر تو نہیں تھا مگر زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکتا تھا، میں نے اسی قلیل موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، تاک کر برسٹ مارا...... لینڈنگ اسکڈ پر ٹکا ہوا ایک گنجا برمی نیچے آ رہا، جبکہ شاید پائلٹ کو بھی کوئی گولی لگی تھی، جس سبب چوپڑ ذرا لہرانے لگا اور اسی وقت اس نے ایک طرف حرکت کی۔ اُوپر سے گرنے والا برمی پہلے تو کیبن کی چھت پر آن پڑا، پھر وہاں لڑھکتا ہوا راہداری میں میرے بالکل قریب ہی کسی بھینسے کی طرح زوردار آواز میں گرا تھا...... میں فوراً اسی طرف پلٹا، جہاں میں نے اپنے پہلے دشمن پر فائر جھونکا تھا، وہاں کوئی نظر نہ آیا تو میں اس برمی کی لاش کی طرف متوجہ ہوا، اس کی گن بھی اسی کے ساتھ راہداری میں آن پڑی تھی، میں اسے اٹھانے کے لیے لپکا یہ تو شکر ہوا کہ میں اپنے ''عقبی'' دشمن سے اب بھی محتاط تھا اور یہی احتیاط میرے کام آ گئی، کیونکہ میں اس جہنم واصل برمی کی گن اُٹھانے کے لیے لوحکنی لگا کر لپکا تھا اور اسی وقت میرے عقب میں گولیاں چلی تھیں جو پسٹل سے داغی گئی تھیں، مجھے چونکہ اس خطرے کا احتمال تھا اسی لیے میں نے گن پر پڑتے ہی، اسے دبوچا اور پشت کے بل پر آ کر اسی طرف اس کی نال کر دی۔ لبلبی دبانے کے دوران ہی مجھے وہ بلیوٹکسی ایجنٹ دکھائی دے گیا تھا جو کافی سامنے آ چکا تھا، اُسے شاید مجھ سے اس ڈبل ایکٹ اسالٹ کی اُمید نہ تھی، میری گن کی نال کے آہنی دہن سے ایک طویل آتشی قہقہہ اُگلا اور وہ چھلنی ہو کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میری سماعتوں نے ایک زوردار چھپاکے کی آواز سنی...... اور اس کے ساتھ ہی فضا میں مسلسل ابھرنے والی چوپڑ کی گڑگڑاہٹ بھی یکلخت معدوم ہو گئی۔ میں اپنی اس اہم فتح پر جی جان سے سرشار ہو گیا، جس نے مجھے مزید حوصلہ عطا کیا، نسبتاً طاقت ور گن ہاتھ آتے ہی میرے حوصلے کو وشکن ہونے لگے تھے، یہی نہیں، میرے ہاتھ اس گنجے برمی کی وہ گن بھی لگ چکی تھی جو ایک اسٹرپ کے ساتھ اس کی پشت پر بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہی ٹیلی اسکوپک گن تھی جس کی نال کے نیچے راکٹ فائر کرنے کی تقریباً ساڑھے چار سو میکنم پوائنٹ کی ایکسٹرا نال بھی جھانک رہی تھی، میں اب اسی سمت اندھا دھند دوڑتا چلا گیا، جہاں وہ قید خانہ تھا۔ وہاں اب خاموشی سی چھا گئی تھی، جس سے میری تشویش فزوں تر ہو رہی تھی۔

میں دوڑتا ہوا راہداری کے سرے سے ابھرا اور اس طرف کو گھوما جہاں قید خانے کی مختصر سی اوپن ٹاپ گلیاری گزرتی تھی، اچانک مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر کسی بھاری بھرکم بھینسے نے حملہ کر دیا ہو۔ وہ پانی سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے جنگلی بھینسے جیسی ہی غراہٹ سے مشابہ ڈکراہٹ سے مجھ پر اچانک ہی دھاوا بولا تھا اور نتیجے میں میرے ہاتھوں بھاری مشین گن چھوٹ کر گر پڑی، خود میں بھی حملہ آور کی زد میں آ کر گرا تھا، تاہم میں نے گرتے ہی سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی اور ایک قلیل موقع تاک کر اس کے چہرے پہ ایک زوردار گھونسا جڑ دیا مگر میں نے محسوس کیا اس کے بھاری جبڑوں اور چوڑی ہڈیوں والے چہرے پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ وہی چوپڑ سوار اسکن ہیڈ برمی تھا، جس کے ایک ساتھی اور پائلٹ کو میں جہنم واصل کر چکا تھا اور شاید اس نے چوپڑ کے سمندر میں گرنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں دشمنوں کے مشترکہ گروہ میں سے ایک گروہ (اسپیکٹرم) کو خاصی زک پہنچا چکا تھا۔ اب ان میں سے یہ آخری دشمن باقی بچا تھا جبکہ بلیوٹکسی کے بھی دو تین ایجنٹس میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے، اس انداز سے بلیوٹکسی کے صرف اب دو یا تین ہی ایجنٹ باقی بچے تھے، اور وہ شیام اور گوریلا ہی ہو سکتے تھے، یا پھر ایک دو مزید ان کے ساتھی۔

یہ گنجا برمی بری طرح بپھرا ہوا تھا، اس نے میرے بائیں شانے کے زخم پر اپنی فولاد جیسی سخت اور موٹی اُنگلیاں گاڑ دیں، درد و اذیت کی ایک جاں کش لہر میرے پیر کے انگوٹھے سے سر تک سرایت کر گئی اور میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی، میں بری طرح بلبلا گیا، کھلے زخم سے بھل بھل خون بہہ نکلا، مجھ پر نقاہت سی طاری ہونے لگی اور آنکھوں

کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میری فتح اگرچہ ہنوز دلی دور است...... کے مصداق سہی لیکن میں کافی حد تک اپنے مشترکہ دشمنوں کے اس ٹولے کو خاصا نقصان پہنچا چکا تھا۔ ایسے میں دشمن کے زیردست ہو جانا ملال آمیز کسک کا ہی باعث ہوتا، میں نے سر کو جھٹکے دے کر، ذہن پر طاری ہونے والی دھند کو جھٹکنے کی کوشش چاہی اور اسی دوران میں اس آخری گنجے برمی نے میرے زخمی شانے سے اپنے آہنی ہاتھ کا پنجہ، گرفت میں رکھا تھا اور میں درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا، دوسرے ہاتھ سے اس نے میری گردن دبوچ لی تھی، میں نے اپنے پورے وجود کی ہمت مجتمع کی اور جان کش اذیت کی پروا کیے بغیر جنوں خیزی کا سہارا لیا، یہی میرا وہ ہتھیار تھا جو مجھے ہر قسم کے درد اور تکلیف کے احساس سے عاری کر دیا کرتا تھا اور میں دشمن پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتا تھا۔ میری داہنی ٹانگ کا گھٹنا تیزی سے حرکت پذیر ہوا اور اس کی ضرب شدید اس گنجے برمی کے پیٹ کے نچلے نازک حصے پر پڑی، اس کے حلق سے برآمد ہونے والی اذیت ناک چیخ بھی مجھے ایک وحشیانہ غراہٹ سے ہی مشابہ معلوم ہوئی تھی۔ اس کی بیک وقت دونوں ہاتھوں کے شکنجوں کی گرفت کمزور پڑتے ہی میں مچھلی کی طرح تڑپا اور اپنے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا اور اس کی نال اس تنومند برمی کے پیٹ سے لگا کر ٹریگر دبا دیا۔ ”ٹز“ کی آواز کے ساتھ ہی گنجا برمی ٹھنڈا پڑ گیا، اس کے مردہ وجود کو ایک طرف دھکیل کر میں آگے بڑھا۔ پستول سنبھالنے اور گن اٹھانے تک میں نے چند سیکنڈ لگائے تھے۔ درد کی ابھرنے والی ٹیسوں کی پروا کیے بغیر میں اس قید خانے والے کمرے کی گیلری میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجھے اس طرف سوشیلا کی دل دہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں...... جس نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا...... میں اس طرف کو گرتا پڑتا لپکا، خود میری اپنی حالت گری گری سی ہونے لگی تھی، مگر میں نے خود کو سنبھالے رکھا تھا، لیکن یہ بھی تھا کہ مجھے اپنے بائیں شانے کے زخم کو پٹی وغیرہ کرنا لازمی تھا، کیونکہ وہاں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، اگرچہ میں نے اپنی شرٹ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر عارضی طور پر سہی، پٹی سی باندھ تو دی تھی اور اس سے کسی حد تک جریان خون کم بھی ہو گیا تھا مگر بہنا پھر بھی بند نہیں ہوا تھا۔

سامنے ہی مجھے ہولناک منظر دکھائی دے گیا۔ شیام اپنے ایک ساتھی کے ساتھ قید خانے کے دروازے پر موجود تھا، اس کی ساتھی ایجنٹ کوریلا اور دیگر ایک دو ساتھی غائب تھے، ان کی جگہ سے جی کوہارا اور اس کا ساتھی بھوک موجود تھے، اس طرح کہ، کوہارا نے سوشیلا کو کسی بے رحم شکرے کی طرح دبوچ رکھا تھا جبکہ بھوک اپنے ہاتھ میں ایک چنگیزی قسم کا خم دار چھرا لیے، جس پر لگا تازہ لہو ٹپک رہا تھا، اس طرح کھڑا تھا کہ اس کے قدموں میں، چندرکلا کسی ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح اپنی چری ہوئی گردن کو پکڑے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے خون بہہ بہہ کر فرش پر تالاب کی صورت بن رہا تھا اور بھوک نے نہایت سنگ دلی کے ساتھ اپنا ایک پاؤں اس کے تڑپتے وجود پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے اس نے کوئی جانور ذبح کیا ہو۔

بھوک کے ہاتھوں چندرکلا کا یہ عبرت ناک حشر دیکھ کر مجھے اپنے اندر ایک کرب کا احساس ابھرا، بے اختیار...... اس کا مجھے پیار بھرے انداز میں ”میرے پریتم“ کہنا یاد آنے لگا چندرکلا کی کج روی اپنی جگہ، لیکن اس نے بہرحال کوہارا اور بھوک جیسے درندوں کے سلسلے میں میری ہی نہیں سوشیلا کی بھی مدد کی تھی، چندرکلا کی تڑپتی موت پر اس کی دائمی جدائی کی ایک نامعلوم سی کمی کا اپنے دل میں دکھ بھرا احساس مجھے ادھ موا سا کر گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں بھوک سے چندرکلا کی جاں گسل موت کا انتقام لینے کے پر تول رہا تھا کہ کوہارا کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں کمزور اور بے بس چڑیا کے مانند دبی ہوئی سوشیلا کو اس نے بھوک کی طرف دھکیل دیا اور سوشیلا، جو پہلے ہی غالباً اپنی نگاہوں کے سامنے بدنصیب چندرکلا کا روح فرسا انجام دیکھ چکی تھی، خوف و دہشت سے گنگ سی ہو کر رہ گئی، دھکیلے جانے پر تھوڑی آزادی ملتے ہی، اس نے ان درندوں کے چنگل سے بھاگنے کی ایک دیوانہ وار کوشش چاہی تھی کہ بھوک نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے اسے راستے ہی میں دبوچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی نرم و نازک گردن پر چھری پھیرتا، میں نے اپنی گن سیدھی کر چکا تھا اور لبلبی پر میری انگلی نے ایک ذرا حرکت کی...... بھاری مشین گن زوردار آواز میں گرجی اور بھوک کے سر کے پرخچے فضا میں بکھر گئے......

خون کے چھینٹے سوشیلا پر ہی نہیں، قریب کھڑے کوہارا اور شیام پر بھی پڑے، ایک لمحے کو تو یہ سب دہل کر رہ گئے کہ یہ ہوا کیا تھا؟ کیونکہ شاید ابھی تک یہ لوگ میری طرف سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ان کے ساتھی میرے ساتھ نبرد آزما تھے اور یہاں یہ لوگ بڑے آرام سے اپنی کارروائی نمٹاتے رہیں گے، جو کسی حد تک یہ نمٹا بھی چکے تھے، جن میں جہنم واصل بھوک اور کوہارا کی رہائی کے علاوہ ان کے ہاتھوں

چندر کلا کی موت بھی تھا۔
دوسرا لمحہ ان کا تتر بتر ہونے کا تھا اور سوشیلا موقع غنیمت جان کر، بروقت عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طرف دوڑی۔ میں نے فوراً اسے کور کیا اور تتر بتر ہوتے دشمنوں پر ایک اور برسٹ داغا۔ شیام کا ساتھی اس کی بھینٹ چڑھا اور کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا، جبکہ کوہارا اور شیام نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنبالے کی طرف دوڑ کر اپنی جان بچائی۔ مجھ پر وحشتِ جنوں خیزی طاری تھی، میں آگے بڑھا اور فرش پر نمونۂ عبرت بنی چندر کلا کے جسدِ خاکی کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا۔ وہ مرغِ بسمل کی جاں گسل کیفیات سے آزاد ہو چکی تھی اور کٹی پھٹی لاش بن چکی تھی، جبکہ اسے اس حال کو پہنچانے والے درندے بھوک کی بے سر وجود کی لاش بھی قریب ہی آڑی ترچھی پڑی تھی۔

اس دوران میں سوشیلا میرے ساتھ آن لگی تھی، یوں جیسے میرے وجود کا حصہ بن جانا چاہتی ہو، اس کے نرم و نازک اور شاخِ گل جیسے وجود کا لمس مجھ میں پیوست سا ہو گیا تھا، کوئی اور لمحہ ہوتا...... کوئی اور حالات ہوتے...... یا میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً ان سرور آگیں لحات میں کوئی گستاخانہ سی جسارت ضرور کر ڈالتا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا تھا اور حسین چہرے پر بھی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ شاید اسے کوہارا وغیرہ نے دبوچتے ہی، ایک بار پھر انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔
''اس طرف آؤ...... جلدی۔'' میں نے فوراً اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا اور اس طرف کو دوڑ پڑا، جہاں کوہارا اور شیام غائب ہوئے تھے۔ سوشیلا کو میں نے اپنے عقب میں کر رکھا تھا۔ گن میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ پستول بیلٹ سے نکال کر میں نے ایک اضافی کلپ کے ساتھ سوشیلا کو تھما دیا تھا۔ ٹیلی اسکوپک راکٹ گن، اسٹرپ کے ساتھ میری پشت پر جھول رہی تھی۔
''تت...... تم بہت زخمی نظر آ رہے ہو......'' اس نے تفکر آمیز تشویش سے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھتا رہا۔
''تم نے بروقت پہنچ کر میری جان بچالی، ورنہ تو میں بھی چندر کلا کی طرح......'' اس نے کچھ قدم میرے ساتھ آگے جا کر پھر ہانپتے ہوئے کہنا چاہا۔
''ابھی خاموش رہو اور اپنے گردوپیش پہ نظر رکھو......'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''دشمن بوٹ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہماری گھات میں ہیں۔ ہم ابھی تک خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔''
اس نے فوراً چپ سادھ لی۔ اُسے غالباً ابھی تک موجودہ صورتِ حالات کی نزاکت کا اندازہ نہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوہارا جیسے درندے کی آزادی کے بعد ہم میں سے کوئی غفلت میں اس کے ہاتھوں مارا جاتا، کیونکہ کوہارا کی مثال اس وقت زخمی درندے جیسی ہو رہی تھی۔ وہ مجھے پھاڑ کھانے کو بے چین ہو رہا تھا۔ میں نے دنبالے کی طرف محتاط روی سے حرکت کی، یہاں میرے پیشِ نظر اب دو مقاصد تھے، کسی دشمن سے مڈبھیڑ ہونے پر اسے واصلِ جہنم کر ڈالتا یا پھر اس بوٹ سے راہِ فرار...... کیونکہ پسپا ہوتے دشمن پر میری فتح عارضی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ان کی مدد کو مزید ساتھیوں کی کمک یہاں اس سے زیادہ بھاری اسلحے اور نفری قوت کے ساتھ کسی بھی وقت پہنچ سکتی تھی۔ اس لیے میری زیادہ توجہ اس وقت بوٹ سے فرار اور کسی بھی قریبی ساحل پر پہنچنے پر مرکوز تھی۔
ایک ایسے ہی گوشے کی طرف آ کر میری آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ مجھے بوٹ کے بالکل قریب، دشمن کی وہی بوٹ ہلکورے لیتی ہوئی دکھائی دی جس میں سوار ہو کر بلیو ٹلسی کے گماشتے ایجنٹ (شیام اور کورنیلا وغیرہ) یہاں تک پہنچے تھے۔
ایسے ہی وقت میں بڑے زور سے بجلی کڑکی اور تیز بارش نے اچانک اپنا جوبن دکھایا، شرائٹے دار بارش کے ساتھ ہی تیز طوفانی ہواؤں نے سمندر میں جل تھل سا مچا دیا۔ شام میں رات کا گمان ہونے لگا۔ یہ میرے اور سوشیلا کے لیے فرار کا بہتر موقع بن سکتا تھا۔
میں نے تیز طوفانی ہواؤں اور شرائٹے دار بارش کے شور میں چلا کر سوشیلا سے کہا۔
''سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ...... ہمیں اس بوٹ کے نزدیک پہنچنا ہے۔ اپنا ہاتھ دو......'' اس نے بلا چون و چرا اپنا سا نرم و گداز ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور پھر میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بوٹ سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔
اُچھالیں مارتے سمندر کی لہروں نے ہمیں بچھاڑنے کی کوشش چاہی تھی، لیکن ہم دونوں نے مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رکھا تھا اور اپنی سی کوشش کرتے ہوئے تیرنے کے انداز میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بوٹ کے نزدیک جا پہنچے...... بوٹ کا ایک آہنی کنڈا ہاتھ میں آتے

ہی میں نے پوری قوت صرف کردی کہ اسے پکڑ کر میں سوشیلا سمیت بوٹ میں سوار ہوجاؤں...... لیکن میرے زخم نے بھی مجھے ادھ موا کر رکھا تھا، لیکن یہ میرے جوش اور قوتِ ارادی تھی کہ میں اپنی سی کوشش میں کچھ کامیاب رہا تھا، باقی کی کسر میری ''حالت'' دیکھتے ہوئے سوشیلا نے اس طرح پوری کرنی چاہی کہ...... میرے زور پر اُوپر اٹھتے ہی خود بھی چابک دستی کے ساتھ ایک دوسرا آہنی کنڈا پکڑ لیا اور مجھ سے پہلے نہایت پھرتی سے بوٹ میں جا سوار ہوئی، پھر مجھے اپنے جسم کا سارا زور لگا کر اُوپر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی، ٹھیک اسی وقت طوفانی بارش کے شور میں گولیوں کی بھیانک تڑابڑی ابھری، یہ وہی وقت تھا جب میں خود بھی زور لگا کر سوشیلا کا ہاتھ پکڑے بوٹ میں آنے کی کوشش میں تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز نے سوشیلا کو دہلا دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، میں دوبارہ اچھلتے پانیوں میں جا پڑا...... اور خاصی گہرائی تک چلا گیا۔ بھاری مشین گن میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر تہِ آب ہوگئی، لیکن ٹیلی اسکوپک راکٹ فائر گن، ابھی تک میری پشت پر بندھی ہوئی تھی۔

غالباً بوٹ سے ہم پر کسی دشمن کی نظر پڑ گئی تھی اور اس نے گولیوں کی بوچھار کر ڈالی تھی، مجھے تو کوئی گولی نہیں چاٹ سکی تھی اور سوشیلا کی طرف سے بھی مجھے تسلی تھی کہ وہ بھی بچ گئی ہوگی، کیونکہ اسے کوئی گولی لگتی تو اس کی چیخ ضرور ابھرتی، تاہم اس نے گھبراہٹ میں میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

میں نے اپنی سی سعی چاہتے ہوئے گہرے پانیوں میں ہاتھ پیر چلائے اور خود کو ایک بار پھر سطحِ آب پر اُبھارا...... تو دیکھا میں بوٹ سے تھوڑا دور تھا اور بوٹ سے بوٹ پر مسلسل گولیوں داغی جارہی تھیں، شاید یہ خبر ہوتے ہی کہ اب میں بوٹ میں نہیں تھا، دشمنوں کی ساری ''اٹینشن'' اس طرف ہوگئی تھی۔

گولیوں کی اس متواتر بارش میں، بوٹ تک میرا پہنچنا محال تھا، کیونکہ دشمنوں کی پوری کوشش تھی کہ وہ مجھے بوٹ تک نہ پہنچنے دیں۔ اسی وقت بوٹ سے تیز سرچ لائٹیں سمندر میں پھینکی جانے لگیں۔ میں نے اسی روشنی میں بوٹ کی طرف ذرا سر ابھار کر دیکھا تو بوٹ پر تین چار افراد گنیں تانے ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ میں نے اسی وقت ہلکا غوطہ لیا اور اسی دوران اپنی پشت سے راکٹ گن لے کر سنبھال لی۔ اس میں راکٹ کو دیکھا اور میرے ہونٹوں پہ زہر خند مسکراہٹ کھنچ گئی۔

دوسرے ہی لمحے میں پانی سے اُبھر آیا اور تاک کے اسی ریلنگ کی طرف نشانہ لے کر راکٹ فائر کردیا۔ ایک سنسناتی ہوئی آواز سے ہلکی سطح کا راکٹ فائر ہوا، اور تب ہی میں نے بوٹ کی ریلنگ سے کسی کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ شاید کسی نے میری یہ خطرناک حرکت بھانپ لی تھی۔

ایک دھماکا ہوا اور میں نے بوٹ میں آگ کا گولہ سا بنتے دیکھا۔ اتنا موقع میرے لیے کافی تھا، میں تیزی سے بوٹ کی طرف بڑھا، جہاں سوشیلا میری ''سودمند'' کارستانی ملاحظہ کرنے کے بعد قریب آگئی تھی اور جھک کر میرا ہاتھ تھامنے کی سعی میں مصروف ہوگئی۔ میں نے آہنی کنڈے کو پکڑا اور سوشیلا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے قدرے جھک کر مجھے اُوپر سوار ہونے میں مدد دی۔

بوٹ کے فرش پر گرتے ہی میں نڈھال سا ہو کر پڑ گیا، مگر ہانپتے ہوئے تیزی سے بولا۔

''سوشی! بوٹ بڑھاؤ، جلدی......'' وہ مجھے چھوڑ کر تھروٹل کی طرف لپکی اور اگلے چند سیکنڈوں میں بوٹ کے انجن کے غرانے کی آواز ابھری۔

بوٹ حرکت میں آتے ہی، ایک طرف کو روانہ ہوگئی۔ مگر جلد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ اس طوفان بادوباراں اور اچھلتی لہروں میں بوٹ اس بُری طرح ڈول رہی تھی کہ کسی وقت بھی اُلٹ سکتی تھی۔

''بوٹ کی رفتار کم کرو...... ورنہ ایک بار پھر ہم سمندر میں ہوں گے۔'' میں نے حلق کے بل چلا کر کہا۔

سمندر میں گرنے کی وجہ سے میرے زخم میں بندھی ہوئی عارضی پٹی کھل کر نجانے کہاں بہہ چکی تھی اور جو تھوڑا بہت زخم بند ہوگیا تھا وہ پھر ہرا ہو کے کھل گیا تھا۔ خون ایک بار پھر بہہ چلا تھا۔ شاید اب تک یہ سب میں نے اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر ہی کیا تھا، ورنہ تو یہ کہاں ممکن ہوتا......

اسی وقت مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ سر چکرانے لگا۔ میں ہوش وخرد کی دنیا سے شاید رخصت ہونے لگا تھا اور عین اس وقت جب میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں، میں نے بوٹ کو کسی بپھرتی اور اُونچی طوفانی لہر کے رحم وکرم پر بری طرح اُچھلتے دیکھا، نہ صرف یہ بلکہ سوشیلا کو بھی چیختے ہوئے اپنے بالکل قریب لڑھکتے ہوئے پایا، پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

☆☆☆

کب اور کتنی دیر بعد، میرا خرد سے یارا ہوا، مجھے نہیں

معلوم مگر آنکھ کھلی تو گھٹا ٹوپ اندھیاروں اور پُرہول سناٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہیں قریب جھینگروں کی جھائیں جھائیں کرتی گونج عجیب سا تاثر پیش کرتی تھی، مگر نہیں ایک اور بھی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، ہلکی اور دھیمی دھیمی سی، یہ موجوں کا شور تھا...... مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب خشکی تھی اور بائیں جانب کوئی ویران اور تاریک ساحل...... مگر دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا، چند لمحے تو میرا ذہن ماؤف سا ہی رہا تھا، پھر دھیرے دھیرے پیش آنے والے جاں گسل ساعتوں کا ادراک ہوتا چلا گیا۔ میں کروٹ کے بل تھا سیدھا ہوا تو زخمی شانے پر درد کی ٹیس سی اُٹھی، بے اختیار میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی...... نقاہت جوں کی توں تھی، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہو چلا تھا اب مجھ میں تو اُٹھ کر بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ ذہن ہنوز غنودگی کا شکار تھا۔ پیٹھ کے بل ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کے بطن سے جیسے جگنو چمک اُٹھے...... یہ کھلا اوپر کھلا آسمان تھا، جہاں اَن گنت تارے ٹمٹما رہے تھے۔ مطلع صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی گچھے دار ٹولیاں تیرتی ہوئی نظر آجاتی تھیں۔

میں نے ذہن پر طاری دھند کو جھٹکنے کے لیے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے اور گرد و پیش کا جائزہ لیا مگر چہار سو ایک دہشت ناک تاریک سناٹوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

''س...... سوشی...... سو...... شیلا......!'' میں نے بمشکل لرزیدہ ہونٹوں سے سوشیلا کو پکارا۔

مجھے یاد آ گیا تھا کہ عین آخری لمحات میں میرے اور سوشیلا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ایک تیز بپھرتی ہوئی اُونچی لہر نے ہماری بوٹ کو بُری طرح اچھالا تھا اور سوشیلا اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے، ایک غیر ارادی سی چیخ کے ساتھ میرے بالکل، بوٹ کے فرش پر آن گری تھی، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ اس پر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم غرقاب نہیں ہوئے تھے مگر یہ معجزہ آخر رونما کیسے ہوا تھا کہ میں ساحلِ سمندر کے بالکل قریب پڑا تھا۔

''کک...... کیا...... سوشی......؟'' ایک لرزا دینے والا اندیشناک خدشہ میرے دل میں ابھرا تھا کہ کہیں سوشیلا، بوٹ اُلٹنے کے باعث سمندر برد تو نہیں ہو گئی تھی؟ لیکن پھر میں کیسے بچ گیا؟

میں غیر یقینی حالات سے ہی نہیں بلکہ مخدوش حالات سے بھی گزر رہا تھا۔ ایک اجنبی سرزمین جہاں دشمنوں کے مشترکہ ٹولے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے اور جہاں میرا اللہ کے سوا کوئی مددگار بھی نہ تھا، سوشیلا کی صورت ایک مبہم سی اُمید ہوئی تھی کہ اس کی مدد سے ایک اجنبی سرزمین میں پاؤں جمانے کا کچھ موقع ملتا، اب وہ بھی دم توڑنے لگی تھی۔ خود میری اپنی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ دشمنوں کی طرف سے الگ مجھے بے چینی تھی کہ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔

سوشیلا کو کھویا تو احساس ہوا کہ وہ میرے لیے ان غیر یقینی قسم کے حالات میں کتنا بڑا آسرا تھی۔

کئی گھڑیاں اسی طرح بے سدھ ساحلی ریت پر مجھے پڑے پڑے بیت گئیں۔ طوفانِ باد و باراں کے بعد فضا اور بھی زیادہ پُرسکون اور دھلی دھلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ دور مدھم مدھم روشنی میں سمندر یوں پُرسکون دکھائی دے رہا تھا جیسے، اس پر کوئی طوفان ہی نہ گزرا ہو۔ البتہ اس کے سناٹے دار اُفق پر کبھی کبھی آسمانی بجلی کی چمک ابھرتی تو ایک عجیب سا پُرہیبت منظر دیکھنے کو ملتا۔ خنک ہواؤں کے چلتے جھونکوں میں ٹھنڈ کی کاٹ بڑھنے لگی تھی اور مجھے سردی کا احساس ہونے لگا تھا، خون بھی شاید اسی وجہ سے قدرے جم کر رک گیا تھا۔ خون میں بھی ایک ''نیچرل پروسس'' کے تحت خود ہی جم جانے کی قدرتی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

میں نے ذرا ہمت سے کام لیا، آخر کب تک اس طرح بے یار و مددگار ویران ساحل میں پڑا رہتا؟ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش چاہی اور دائیں بازو کی کہنی ریت پر ٹکا کر کسی نہ کسی طرح بیٹھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب ایک بار پھر میں نے ذرا آنکھیں سکیڑ کر گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہی تاریکی اور جھینگروں کی جھائیں جھائیں اور موجوں کی ''شررررر'' کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں اپنے تئیں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے دائیں جانب جنگل تھا یا بنجر ویرانہ؟ یا پھر کوئی آبادی یا کسی آبادی کے آثار......؟ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھٹا ٹوپ تاریکی میں اسی طرف ہی دیکھے جا رہا تھا پھر میں نے گردن گھما کر سمندر کی طرف دیکھا۔ وہاں تاروں کی مدھم مدھم روشنی اور پُرہول سناٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

معاً ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ آواز میرے دائیں جانب تاریکی سے ابھرتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ آواز کسی جانور کی آواز سے ہی مشابہ محسوس ہوئی تھی۔ آواز بس ایک بار ہی ابھری تھی۔ مجھے ڈر لگا کہیں اس طرف کوئی گھنا جنگل ہی نہ ہو اور اب وہاں سے کوئی خونخوار جانور مجھ پر حملہ نہ کر دے جبکہ میری اپنی حالت دگرگوں تھی۔ میں نے تن اور

پڑھ رکھا تھا کہ ہندوستان میں گھنے جنگلوں کی خاصی بہتات ہے۔ یہاں شکاری اور آدم خور درندوں کی بھی کمی نہیں...... یہ سوچ کر ہی میں اندر سے دہل سا گیا کہ اگر میرا ابھی کسی ایسے درندے سے یہاں سامنا ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ جبکہ میرے پاس تو ہتھیار نام کی کوئی شے بھی ساتھ نہ تھی۔ کجا ایک چاقو تک نہ تھا۔

اچانک میں بری طرح ٹھٹکا...... اسی سمت پر جہاں بدستور میری نظریں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک ٹمٹماتی روشنی سی دکھائی دی۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا مگر گہری تاریکی میں نظر آتی وہ روشنی بالکل واضح تھی۔ معاً ایک بار پھر مجھے کسی جانور کے زوردار خراٹے لینے کی آواز سنائی دی۔ میں پہلے ہی گھبرایا ہوا سا تھا، روشنی اور وقفے وقفے سے آتی ہوئی کسی جانور کی غراہٹ سے مشابہ آواز نے میری فکرمندی کو مزید سوا کر دیا۔ مجھے ادھر اُدھر کہیں چھپنے کی بھی کوئی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ناچار میں یونہی تن بہ تقدیر، اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ کچھ لمحات اور بیت چلے...... میری تکتی ہوئی نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں، روشنی کا بڑا دائرہ بھی کچھ پھیلنے لگا تھا اور ساتھ ہی مجھے تاریکی میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں بھی دکھائی دینے لگی تھیں، جو ادھر اُدھر ڈولتی، حرکت کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بلکہ اب تو وہ بدور نمار روشنی بھی کچھ واضح ہونے لگی تھی، جو کسی لالٹین کی ہی لگتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک وہ سب، کچھ غائب ہو گیا۔ مجھے اچنبھا ہوا، کہ یہ کیا ماجرا تھا؟ پھر سوچا، ہو سکتا ہے اس طرف کوئی آبادی وغیرہ اور یہ جو بھی تھے، کہیں اور طرف مڑ گئے ہوں۔ یہ سوچ کر میں اپنا سر جھٹک کے سمندر کی طرف دیکھنے لگا اور کوشش میں تھا کہ ذرا اٹھ کر کھڑا ہو سکوں، مگر مجھ میں اتنی بھی سکت نہ رہی تھی، اس نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ سے جی کوہارا اور شیام وغیرہ کی طرف سے الگ پریشانی تھی کہ اگر وہ بھی اس طرف نکل آتے تو ان کی گرفت سے بچنا میرا محال ہی ہوتا۔

اچانک مجھے فضا میں ایک گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک بڑا ہیلی کاپٹر ہی لگا تھا مجھے...... اور اس میں سے تیز سرچ لائٹ گردش کر رہی تھی۔ وہ ساحل کے رخ پر تھا اور ساحل پر روشنی پھینکتے، وہ میری طرف ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔

''دشمن'' میرے ذہن میں ابھرا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ مگر مجھ میں اتنی سکت پیدا نہ ہو سکی تھی کہ میں اُٹھ کر تاریک جنگل کی طرف دوڑ کر کسی محفوظ مقام میں چھپ سکتا، ہیلی کاپٹر تیزی سے اسی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا اور میں کسی بھی وقت، ساحلی ریت پر ان کی گردشی سرچ لائٹ کے ہالے میں آ سکتا تھا۔ میں نے اپنے وجود کی ساری طاقت مجتمع کی اور جنگل کی طرف گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت جانے کدھر سے میرے ریختہ و شکستہ وجود میں ...... قوت پیدا ہوئی کہ میں گرتا پڑتا تقریباً اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاید جان بچانے کا جذبہ، ہر قسم کی کمزوری پر غالب آ گیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی قریب آتی آواز مجھے انتہائی منحوس محسوس ہونے لگی۔ عین اسی وقت جب ہیلی کاپٹر اپنی تیز سرچ لائٹ سے ساحلی ریت کا جائزہ لیتا ہوا میرے بالکل قریب پہنچا، میں ایک گھنے جھنڈ میں خود کو گرا چکا تھا۔ لائٹ کا تیز روشن ہالہ میرے اُوپر سے گزر گیا، شکر تھا کہ میں نے خود کو گھنی جھاڑیوں میں گرا لیا تھا۔ ہیلی کاپٹر آگے نکل گیا تھا مگر ٹلا نہیں تھا۔ وہ تھوڑا آگے جا کر پھر منڈلانے لگا۔ میں اٹھ کر جنگل کی طرف بڑھا، مگر کسی جھاڑی سے میرا پاؤں رپٹا اور میں منہ کے بل گرا۔ میرے گرد و پیش تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاتی آواز مجھے منحوس لگ رہی تھی۔ وہ شاید تھوڑی دور جا کر فضا میں معلق ہو گیا تھا، میرے دل میں خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں انہیں اس جگہ پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا تھا، جہاں میں گرا تھا؟

ذرا ہی دیر ہیلی کاپٹر کی آواز پھر قریب آتی محسوس ہونے لگی۔ میں تشویش زدہ سا ہو گیا۔

میں نے ذرا سنبھل کر جھاڑیوں کے عقب سے اسی سمت دیکھا، جہاں مجھے ہیلی کاپٹر محض ایک روشنی کی صورت ہی دکھائی دے رہا تھا، اس کے بعد میں نے اُسے ساحل پر لینڈ کرتے دیکھا۔ اندیشناک خدشات تلے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شاید انہیں واقعی کچھ شبہ ہو گیا تھا، یا پھر یہ ویسے ہی یہاں اتر کر میری تلاش میں گرد و پیش کے مقامات کا جائزہ لینا چاہتے ہوں...... یہ سوچ کر میں آگے سرکا ہی تھا کہ اچانک ایک خوفناک سی غراہٹ نے مجھے دہلا دیا۔ میں وہیں ساکت و جامد ہو گیا۔

میرے سامنے ایک خوفناک جبڑے اور شکاری دانتوں والا خاصا جسیم کتا کھڑا غرا رہا تھا۔ اس کے کھلے جبڑوں سے تیز نکیلے دانتوں کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر کے، مجھے چیر پھاڑ ڈالنے کو تیار تھا۔ اس پر روشنی پڑ رہی تھی، جو اس کے ساتھ کھڑے ایک چادر پوش کے ہاتھوں میں پکڑی

ہوئی بڑی سی لالٹین سے پھوٹ رہی تھی۔ اس چادر پوش کا چہرہ، مجھے... تاریکی میں ملفوف ہی دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے ہولے سے کتے کو شُشکارا تھا۔ یہ اسی کا ہی لگتا تھا۔ شکاری کتے کی غراہٹیں معدوم تو نہیں ہوئی تھیں، البتہ مدھم ضرور پڑ گئی تھیں۔

میں اب اس چادر پوش کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، جس کا وجود مجھے کچھ جھکا جھکا سا ہی نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے اُوپر کوئی چادر سی لے رکھی تھی۔ جس کا گھونگھٹ اس نے شاید دانستہ ہی اپنے چہرے کے آگے کر رکھا تھا، وہاں مجھے تاریک خلا کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ چہرہ اس کے پس منظر میں تھا۔

"تت...... تم...... کون؟" میں نے بہ مشکل اسے دیکھ کر کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین سے بھی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا، اس کی روشنی، ہیلی کاپٹر سواروں کو اس طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

"تم زخمی دکھائی دیتے ہو۔" تاریک ہالے کے اندر سے ایک عجیب سے لہجے کی کھرکھراتی آواز برآمد ہوئی۔

"میرے دشمن...... یہاں بھی آ پہنچے ہیں، کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟" میں نے مناسب الفاظ کا استعمال کیا کہ وہ خود ہی سمجھ... جائے کہ میں کیا چاہتا تھا۔

"ہیلی کاپٹر کی آواز سن رہے ہو نا تم......؟ وہ شاید میری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ مم...... مگر اس لالٹین کی روشنی......"

"آجاؤ...... میرے پیچھے۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا، لالٹین کی لو ذرا دھیمی کی اور پلٹا۔ وہ شاید میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ خونخوار قسم کا شکاری کتا، سب سے آگے تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ہم تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے، شکر تھا کہ ایسے وقت میں میری ہمت کچھ سوا ہو گئی تھی، یا پھر جان بچانے کا جذبہ غالب تھا کہ میں اپنی قوت ارادی کے بل پر چلنے لگا، اگرچہ میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی، اور سر بھی شاید نقاہت کے باعث چکرا رہا تھا۔ میں چلتے چلتے پیچھے رہ جاتا تو چادر پوش اپنی رفتار دھیمی کر لیتا۔ یہ شاید وہی تھا جسے میں تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔

ابھی میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ چادر پوش شخص کون تھا؟ اور اس بیابان ساحل کنارے جنگل میں کیا کرتا تھا۔

سوشیلا مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی، پتا نہیں وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی، زندہ بھی تھی کہ نہیں بے چاری......

عقب میں دور مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز معدوم سی ہوتی محسوس ہوئی تھی، دشمن شاید میری تلاش میں نکل پڑے تھے۔ مجھے اس طرف سے بھی تشویش تھی، سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے اس چادر پوش کے پاس خاطر خواہ پناہ مل جائے گی، کیا میں اس کے پاس کچھ محفوظ وقت گزار پاؤں گا یا دھر لیا جاؤں گا؟

جنگل جتنا اندر تھا اتنا ہی گھنا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جنگل کی فضا میں نباتات اور جنگلی گل بوٹوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ سردی کا احساس بتدریج بڑھ رہا تھا۔ خنک ہواؤں کے سبک خرام جھونکے، خاموش جنگل کی سناٹے دار فضا میں عجیب سا تاثر پیدا کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

ایک مقام پر میں نڈھال سا ہو کر گر پڑا۔ مجھے شاید کمزوری کے باعث چکر سا آ گیا تھا۔ سانسیں بھی سینے میں اٹکنے لگی تھیں۔ میرا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں کی آماجگاہ بننے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں، میں نے اس چادر پوش کو اپنی جانب رک کر پلٹتے اور متوجہ ہوتے پایا...... وہ اپنے ہاتھ میں لالٹین پکڑے میرے قریب آ کر گھٹنوں کے بل اکڑوں بیٹھ گیا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی سیاہ چادر کے گھونگھٹ میں مجھے جو چہرہ نظر آیا تھا، وہ انتہائی مکروہ اور بھیانک تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کسی خاموش ماحول میں ہی کھلی تھی۔ بس! فرق اتنا تھا کہ میں بیرونی فضا کے بجائے کسی تنگ و تاریک مڑھی جیسی جگہ کے اندر موجود تھا۔ وہ کوئی جھلنگا سی کھری چارپائی تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اپنی آنکھیں گرم ہوتی محسوس ہونے لگیں، تب ہی مجھے احساس ہوا کہ میں بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ میرا پورا وجود تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کا تو اب یہ عالم تھا کہ میں ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا، نظر یہی آتا تھا کہ میں شاید اب اسی بے بسی اور بے کسی میں اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔ اپنے وطن سے میلوں دور، دیار غیر میں ایک دور دراز جنگل بستی میں میری قبر کھود کر کہیں مجھے دفنا دیا جائے گا۔

بخار کی شدت سے میرے حلق سے رہ رہ کر کراہیں سی خارج ہونے لگی تھیں۔

میرا اُوپری جسم برہنہ تھا۔ نیچے فقط جینز کی پینٹ تھی۔ میں نے اپنے شانے کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہ کھلا پڑا تھا۔ بے

ہوش ہوتے ہی مجھے اس پُراسرار چادر پوش کا چہرہ قریب سے دیکھنے کا جو قلیل سا موقع ملا تھا، اسی نے ہی مجھے دہلا دیا تھا، اُف...... کس قدر مکروہ اور کریہہ چہرہ تھا اس چادر پوش کا...... ہوش میں آنے کے باوجود وہ بھیانک چہرہ جیسے میری آنکھوں میں ثبت ہوکر رہ گیا۔ سیاہ توے جیسی رنگت، اُوپری ہونٹ کٹا ہوا، جہاں سے اس کی غلیظ اور بدنما دانتوں کی اُوپری... قطار صاف نظر آتی تھی، بہت ہی بھیانک محسوس ہوتی تھی۔ ایک آنکھ میچی ہوئی اور دوسری اُبلی پڑی ہوئی، جیسے ابھی اس کی اکلوتی آنکھ کا بڑا سا ڈیلا باہر کو اُبل پڑے گا...... چہرہ بھی تکونی اور چیچک زدہ تھا، ناک غائب تھی اور اس کی جگہ فقط دو سوراخ تھے۔

ایک عجیب سی ناگوار بو بھی میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جیسے کوئی کیچڑ پھیلا ہو کہیں۔

میں نے بمشکل تمام اپنی گردن موڑ کر کچھ اپنے اطراف کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ میں مڑھی کے صحن میں ہی، ایک مختصر سے برآمدے کی دیوار سے لگی چارپائی پر دراز تھا۔ قریب ایک بدنما سے بانس کے ساتھ ایک لالٹین جھول رہی تھی، جس کی یرقان زدہ سی روشنی میں مجھے کچھ گردوپیش میں دیکھنے کا موقع ملا۔

صحن کے کونے میں مجھے ایک مختصر سے حصے میں ''کیچ'' سی پھیلی نظر آئی۔ وہ ناگوار سی بو شاید اسی پھیلی ہوئی کیچ سے ہی آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس کا کیا مقصد تھا؟ پھر معاً ہی مجھے کیچ کی گدلی گدلی سطح پر کچھ رینگتا ہوا نظر آیا۔ ایک نہیں کئی ایسی عجیب سی کینچوے جیسے کیڑے...... ایک کمرہ نما گوشہ بھی اسی طرف مجھے نظر آیا تھا، جس کی چوکھٹ پر... پیوند زدہ ٹاٹ جھول رہا تھا۔ وہاں بھی اسی طرح کی لالٹین کی یرقان زدہ روشنی سی پھوٹتی نظر آئی۔ وہ چادر پوش نجانے کہاں غائب تھا، اس کا کتا بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اندازہ تو تھا مجھے کہ یہ اسی پُراسرار چادر پوش کا ٹھکانا ہوگا اور وہی مجھے بے ہوشی کی حالت میں ادھر لایا ہوگا۔

''کوئی ہے......؟'' میں نے پکارا مگر جواب ندارد۔

لیکن ذرا ہی دیر بعد میں نے کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز سنی، مخرج وہی مذکورہ گوشہ تھا، جہاں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پھر میں نے وہاں سے اسی بدہیئت شخص کو نکلتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک مٹی کی ڈولی سی پکڑ رکھی تھی، جس کے اُوپر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اب اس نے کوئی بھی چادر اپنے اُوپر نہیں اوڑھ رکھی تھی۔ اسے نکلتے دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ وہ شاید میرے پکارنے پر ہی نکلا تھا مگر اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور اسی صحن کے اسی گوشے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ''کیچ'' پھیلی ہوئی تھی۔

پھر میں نے اسے وہاں ڈولی کو اُلٹاتے ہوئے دیکھا، ڈولی کے اندر شاید کوئی گدلا سا پانی تھا اور اس کے اندر وہی کینچوے ٹائپ کیڑے نکل کر کیچ میں گر رہے تھے، وہ کیڑے خاصے پھولے پھولے اور موٹے ہو رہے تھے، جیسے کسی کا خون چوس کر موٹے ہو رہے ہوں۔

''جونک......''

میرے ذہن میں ابھرا اور میں سرتاپا کانپ اُٹھا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ یہ شخص ان جونکوں سے کیا کام لیتا تھا؟ مجھے کراہیت سی ہونے لگی۔ میں آنکھیں پھاڑے اسی طرف دیکھنے لگا، وہ جونکوں کو کچھ ڈالنے لگا۔ اس کے بعد وہ اندر جانے کے بجائے میری جانب بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے اس گوشے کی آڑ سے کسی کے ہولناک انداز میں چیخنے کی آواز ابھری۔ چیخ نسوانی تھی۔ میری روح تک فنا ہوگئی۔

وہ میرے قریب آگیا۔ اس کا مکروہ چہرہ ایک بار پھر میرے قریب تھا۔ مجھے کراہیت سی ہونے لگی، جی اُلٹنے لگا۔ اس کے ادھ کٹے بدہیئت ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

وہ ڈولی میرے قریب سرہانے رکھ کے پھر اسی آڑ کی طرف پلٹ گیا۔ میں اس قدر گنگ تھا کہ اسے مخاطب بھی نہ کر سکا تھا یا پھر شاید میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے اور مجھ سے دور ہی رہے، مگر اس نے جو غلیظ سی ڈولی میرے سرہانے رکھ چھوڑی تھی، اس میں سے مجھے سخت ناگوار سی بو آنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اسے دوبارہ نمودار ہوتے دیکھا۔ اندر سے اب کسی عورت کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پتا نہیں یہ کیا ماجرا تھا؟ اندر یہ کیسے جونکیں لگا رہا تھا؟

اب اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک آب خورہ نظر آرہا تھا، وہ اسے تھامے میرے قریب آگیا اور اُسے میرے لبوں سے لگانے کے لیے مجھ پر ذرا جھکا تو میں نے اپنا منہ پرے کرلیا اور اس سے بہ مشکل بولا۔

''ی...... ی...... یہ کیا ہے؟''

''دوائی ہے یہ، اسے پی لو...... منش شانت ہو جائے گا......'' وہ بولا۔ کٹے ہوئے ہونٹ کے باعث اس کے الفاظ مکمل نہیں تھے۔

''مم...... میں یہ دوائی نہیں پی سکتا۔'' میں نے انکار کیا تو وہ بولا۔

"تمہاری حالت بہت خراب ہے۔ اس بار بے ہوش ہوئے تو سیدھا گلے جہاں سدھار جاؤ گے۔ جونکی بابا کی بات غلط نہیں ہوتی۔ اس پوروائی (بستی) کے لوگوں کو میں زہر بھی پینے کے لیے دوں تو وہ کھوشی کھوشی (خوشی) پی لیتے ہیں، کیونکہ وہ میری ویدیا کو جانتے ہیں اچھی طرح۔ لو شاباش! پی لو دوا......"

"مائی گاڈ، جونکی بابا......" میرے اندر سرگوشی اُبھری۔ کیا یہ کوئی ویدیا حکیم تھا؟ مگر یہ کیسا حکیم تھا؟ اتنا بدہیئت اور مکروہ صورت؟ بہرطور اس کی بات نے مجھے فکرمند ضرور کر دیا تھا۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، بجز اس کے کہ اس کی بات مان لیتا۔ میں نے اس طرف منہ کیا، اس نے مٹی کا پیالہ نما آب خورہ میرے کپکپاتے ہونٹوں سے لگا دیا، میں نے لالٹین کی روشنی میں اس بے رنگ دوا کو دیکھنے کی بھی سعی چاہی۔ دوا نہایت کڑوی تھی۔ ایک گھونٹ بھرتے ہی میرا جی متلانے لگا۔ اس نے پھر مجھے دوا پینے پر زور دیا۔

"سانس روک کے دوا کو بغیر محسوس کیے پی جاؤ...... ترنت......" وہ بولا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور واقعی میں آنکھیں بند کر کے اور سانس روک کے دوا پی گیا۔

"اندر کون ہے؟" بالآخر ذرا دیر بعد میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میں نے اب خود کو ذہنی طور پر ان عجیب وغریب حالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ دوا پینے کے بعد میں حیرت انگیز طور پر اپنے اندر ایک توانائی سی دوڑتے محسوس کر رہا تھا اور خرابی طبیعت میں بھی کچھ افاقہ ہوتا محسوس کرنے لگا تھا اب......

جونکی بابا...... نامی اس بدہیئت آدمی نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر، میرے سرہانے رکھی ڈولی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک نظر میرے شانے کے زخم کا جائزہ لیا پھر پُرغور لہجے میں بڑبڑایا۔

"جراثیم کا شدید حملہ......" پھر میری پھٹی پھٹی آنکھوں نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ڈولی کے اندر ڈالا اور اس کے اندر سے ایک لجلجاتی ہوئی جونک نکالی، یہ جونک کوئی چار سے پانچ انچ لمبی تھی، اور ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر اور اسی جیسی لگتی تھی۔

"ی ی...... ی...... یہ...... گگ...... کیا کر رہے ہو تم میرے ساتھ؟" میں لرزیدہ سی آواز میں بولا۔

"ششش......" اس کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے وہ جونک میرے ایک زخم پر رکھ دی۔ میرے حلق سے بے اختیار ایک لرزتی ہوئی چیخ سی خارج ہوگئی۔ ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہو رہا تھا۔ مجھے جھرجھری سی آگئی۔ جونک میرے زخم کے ساتھ چپک گئی اور شاید میرا خون چوسنے لگی تھی اب......

"شش...... شش، چیخو مت، تمہارے دشمن ادھر کو آنکلیں گے۔" اس نے کہا اور پھر ڈولی کے اندر ہاتھ ڈال کر دوسری اور پھر تیسری جونک نکال کر میرے کھلے زخم پر لگاتا چلا گیا۔

جونکوں سے علاج کے سلسلے میں میری بھی فقط اتنی ہی معلومات تھی جتنی کہ ایک عام آدمی کی ہوسکتی تھی۔ یعنی آج کے جدید دور میں بھی کہیں کہیں جونکوں سے علاج کیا جاتا تھا۔ یہ جسم سے گندہ خون چوس لیتی تھیں۔ تھوڑی اضافی معلومات کے مطابق میں نے تو یہاں تک بھی سن رکھا تھا کہ جدید سائنس کے اس دور میں بھی بعض ترقی یافتہ ممالک میں سرجن ڈاکٹرز، سرجری کے دوران، انسانی رگوں میں جمنے والے خون (کلوٹس) کو ختم کرنے کے لیے بھی ان جونکوں کو استعمال کرنے لگے تھے۔ ویسکولر ہارٹ سرجری میں آنے والے ایسے کلوٹس رکاوٹ بنتے تھے تو انہیں جونکوں کے ذریعے ری موو (Remove) کر دیا جاتا تھا اور پھر باآسانی سرجری کا عمل کامیابی سے آگے بڑھایا جاتا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی، جونک چپکانے کا عمل اپنی جگہ ایک خوفناک سا تاثر تھا، لیکن اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ جونک کے منہ سے خارج ہونے والا ایک مخصوص مواد اس کی وجہ تھی، جو اس "لوکل اینستھیسیا" کا کام کرتی تھی، یعنی اس جگہ کو ہی بے حس کر ڈالتی تھی اور مریض کو کوئی درد یا تکلیف، خون چوسنے کے دوران میں نہیں ہوتی تھی۔

مگر یہاں بات کچھ اور تھی یہ کسی ترقی یافتہ ملک کے اسپتال کا کوئی جدید آپریشن تھیٹر نہ تھا۔ یہاں یہ سب ہوتے دیکھ کر میرا تو دم ہی باہر کو آنے لگا تھا۔ وہ جونکی بابا، جو وید کا دعوے دار تھا، یہ سب کچھ بڑے آرام سے کیے جا رہا تھا۔

لگ بھگ کوئی پانچ یا چھ جونکیں میرے زخم اور جسم کے دیگر حصوں میں چپکانے کے بعد اس نے خالی ڈولی پھر میرے سرہانے کے قریب رکھ دی پھر مجھ سے بولا۔

"اسی طرح شانت پڑے رہو اور جونکوں کو اپنا کام کرنے دو۔ تمہارا زخم جراثیم زدہ ہوگیا ہے۔ اسی کارن تمہیں تیز بخار نے آن لیا ہے۔"

مجھے اب پسینہ آنے لگا تھا۔ بخار کی شدت بھی کم ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے کچھ سکون محسوس کیا تو خود کو تن

یہ تقدیر کرتے ہوئے ایک بار پھر پوچھا۔

”کیا اس طرف اندر بھی کوئی مریض ہے تمہارا......؟“

”ہاں! ایک کنیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی تمہاری ہی کوئی ساتھی ہے......“ جوگی بابا کی اس بات پر میں ایک دم چونک پڑا۔ میرا خیال سیدھا سوشیلا کی طرف چلا گیا۔

”تت...... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ میری ساتھی ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”وہ بھی اسی طرح مجھے ساحل پر پڑی ملی تھی، جیسے تم ملے تھے مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس سے میرے دل و دماغ میں اَن گنت سوالات ابھر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”ہم سمندر میں ایک کشتی پر سوار تھے، طوفان میں گھر گئے اور ہماری کشتی الٹ گئی تھی، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں اور میری ساتھی زندہ سلامت ساحل تک کیسے آ پہنچے؟“

”تم دونوں یقیناً ساحل کے نزدیک پہنچ چکے ہو گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور...... خوش قسمتی سے طوفانی لہروں نے تم دونوں کو الگ الگ مقام پر ساحل پہ لا کر پٹخ دیا ہوگا۔“

مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ تاہم میں خوش تھا کہ سوشیلا بھی زندہ تھی، بشرطیکہ کہ اگر تو وہی تھی، لیکن وہ زخمی کب تھی؟ میں نے سوچا مگر اس جوگی نسل کے آدمی نے اُسے کیوں جونکیں لگا دی تھیں؟

”میں ایک نظر اس عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ بالآخر میں نے کہا۔ ”اگر وہ میری ساتھی نکلی تو مجھے یقیناً خوشی ہوگی۔ لیکن...... وہ زخمی تو نہ تھی، پھر تم نے اُسے کیوں جونکیں لگائی ہیں؟“ میں نے دیکھا میرے اس سوال پر اس کے ادھ کٹے ہونٹ والے چہرے پہ اسرار بھری سی مسکراہٹ اُبھری۔ بولا۔

”وہ تمہاری ساتھی ہی ہوگی، مگر بہت گھبرائی ہوئی اور ڈری ہوئی ہے۔ شاید تمہیں دیکھے تو خوش ہو جائے وہ کنیا۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے اصل سوال کا جواب دانستہ گول کر گیا تھا، سردست میں نے بھی اپنا سوال دہرانا ضروری نہیں سمجھا، میں پہلے اس ”کنیا“ کو دیکھنا چاہتا تھا، آیا وہ سوشیلا تھی بھی یا نہیں۔ میں نے مصلحتاً اس کی تائید ہی میں کہا۔ ”ہوسکتا ہے تمہاری بات ٹھیک ہی ہو۔ مجھے ایک نظر دکھا دو؟“

”دیکھ لینا کنیا کو...... وہ اب ادھر ہی ہے۔ پہلے تم ہلنے جلنے کے قابل تو ہو جاؤ۔“ وہ بولا۔ نجانے کیوں مجھے اس کے لہجے سے عیاری اور ایک اسرار بھری سی مکاری ٹپکتی محسوس ہونے لگی، یہی وہ وقت تھا جب میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا تھا۔

”آہ...... اوو......“ اچانک وہی نسوانی چیخ ابھری۔ میں چونک پڑا اور اسی گوشے کی طرف ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ پھر اسی لمحے مجھے کچھ اٹھا خ پٹاخ کی سی آوازیں سنائی دیں، جیسے کوئی اٹھ کر گرتا پڑتا، چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے دیکھا، جوگی بابا جلدی سے اسی طرف لپکا اور اسی وقت میں نے مذکورہ سمت سے کسی کی جھلک ابھرتے دیکھی، میرا دل دھک کرنے لگا، وہ جو کوئی بھی تھی، ابھی پوری طرح منظر عام پر بھی نہیں آئی تھی کہ اس جوگی بابا نے اُسے پھرتی کے ساتھ وہیں دبوچ لیا۔ وہ چلائی، میں نے آہنگ پر اپنی سماعتیں مرکوز کر کے اسے پہچاننے کی سعی چاہی تھی، مگر ناکام رہا۔ جوگی بابا نے شاید اُسے کچھ اس طرح سے دبوچ لیا تھا کہ وہ گھٹی گھٹی کراہ سی خارج کر کے رہ گئی تھی۔ میں نے چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا، میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک ناطاقتی سی مجھے محسوس ہوئی بلکہ ناطاقتی بھی کیا، مجھے تو یوں لگا جیسے میں بالکل ایک لاش میں تبدیل ہو گیا ہوں، محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک زندہ لاش...... اپنی اس حالت پر میں اندر سے بُری طرح دہل کر رہ گیا۔ یہ خبیث نجانے میرے ساتھ کیا کھلواڑ کرنے والا تھا یا کر رہا تھا؟ میں نہیں جانتا تھا پھر میں نے اپنے جسم کے ساتھ چمٹی ہوئی ان منحوس جونکوں کو دیکھا، جو بڑی خاموشی کے ساتھ میرے وجود سے کسی آسیب کی طرح چپکی ہوئی میرا خون چوسنے میں مصروف تھیں۔ تب ہی ایک بات محسوس کر کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے جسم پر اس نامراد جوگی بابا نے پانچ چھ جونکیں چھوڑ رکھی تھیں، ان میں سے دو تو میرے زخم سے رستا ہوا گندہ چوس رہی تھیں، لیکن باقی میرے اس حصے پر چپکی ہوئی تھیں جو بالکل صحت مند تھا، یعنی وہاں کوئی زخم نہ تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ مجھے یہیں کھٹکا ہوا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے، یہ خبیث جوگی بابا، کہیں اپنی جونکوں کے ذریعے، میرا علاج کرنے کے بہانے کسی اور مکروہ چکر میں تو نہیں تھا؟ اگر تو سوشیلا بھی اس کے قبضے میں تھی۔ چونکہ وہ زخمی بھی نہیں تھی تو کیا، اُسے بھی صحت مند خون سے ان جونکوں کو ”سیراب“ کیا

جارہا تھا...... ؟ مگر کیوں...... ؟ نجانے یہ کیا پر اسرار چکر تھا۔ اگرچہ میں اپنی تکلیف اور بخار وغیرہ میں کافی بہتری محسوس کررہا تھا لیکن ہلنے جلنے سے یوں قاصر ہو گیا تھا جیسے پتھر کا بن کر رہ گیا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ اس سیال مادہ دوا پینے سے تو نہیں ہوا تھا؟ یقیناً یہی بات ہوگی، مگر اس دوا کے پینے سے مجھے افاقہ بھی تو محسوس ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ دوا دہری تاثیر والی ہو؟

بہر حال جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ صحیح نہیں تھا۔ میں نے جوشِ غیظ سے ایک بار پھر اپنے جسم کو حرکت دینی چاہی مگر قاصر رہا، مارے بے بسی کے میں اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا۔ مجھے جیسے اپنی حالت زار پہ خود ہی رونا سا آنے لگا تھا۔ ایک مصیبت سے چھٹکارا ملا تو دوسری گلے کو آن پڑی تھی اور وہ بھی ایسی عجیب وغریب کہ میں ابھی تک اس کی کوئی توجیہہ پیش کرنے سا قاصر ہی تھا۔

میری نظریں اسی گوشے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری، میں نے جوگی بابا کو وہاں سے نمودار ہوتے ...... دیکھا اور چونک پڑا...... اس کے ہاتھ اور چولے دار قمیص جو خستہ حالت تھی، خون سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے قریب جھولتے ہوئے ایک چیتھڑے دار کپڑا اچکا اور اس سے اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اسے خون میں لتھڑا ہوا پاکر مجھے یہ سوچ کر ہول سا آ گیا کہ کہیں اس بدبخت نے اُس عورت (وہ جو کوئی بھی تھی) کو جان سے تو نہیں مار ڈالا؟

میں نے منہ سے آواز خارج کی، شکر تھا کہ میں بول سکتا تھا، میں نے اپنی طرف سے چلا کر کہا۔ ''تت...... تم نے اس عورت کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اور...... اور یہ میرے جسم کو کیا ہو گیا ہے؟ میں ہل جل بھی نہیں سکتا۔'' آواز میرے حلق سے زور لگانے کے باوجود بس اتنی ہی خارج ہو سکی تھی کہ وہ اس تک پہنچ جاتی۔ اس مردود نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی اس کے بعد وہ اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

کیچ کے قریب کئی ڈولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا اس کے بعد ایک ڈولی اُٹھا کر وہ میری طرف بڑھا۔ جھک کر میرے زخموں کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا، وہ جھک کر ان جونکوں کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا جو میرے جسم کے نسبتاً صحت مند حصے سے چمٹی خون چوس رہی تھیں۔ پھر اس نے بڑے مخصوص طریقے سے وہ جونکیں میرے جسم سے الگ کیں تو میں نے دیکھا وہ خاصی پھول کر کپا ہو رہی تھیں۔ گویا میرا خون چوس چکی تھیں۔ ان جونکوں کو اس نے ڈولی میں ڈال دیا اور آڑ کی طرف بڑھ گیا۔ ذرا دیر بعد واپس لوٹا، کیچ کی طرف گیا وہاں سے ایک اور ڈولی اٹھائی اور دوبارہ میری طرف بڑھا۔ اس دوران میں نے اپنے ہاتھوں پیروں اور جسم کو حرکت دینی چاہی مگر بے سود......

وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ اب اس نے میرے زخموں سے چپکی ہوئی جونکیں الگ کیں اور ڈولی میں ڈال دیں، تھوڑی دیر بعد وہ ان پر کسی مرہم کا لیپ کرنے لگا۔ میں نے اپنے طیش پر مصلحتاً قابو پا رکھا تھا۔ کیونکہ ابھی میں اس کے رحم و کرم پر ہی تھا۔ وہ ایسی حالت میں میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہا ہے تو میں نے بالآخر اس سے قدرے لجاجت آمیز انداز میں کہا۔

''کیا تم نے اس عورت کو مار ڈالا ہے؟''

''شش...... یہ پاپ ایک ویدکبھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے جواب سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔

''تو پھر یہ خون...... تمہارے ہاتھوں اور کپڑوں میں جو نظر آرہا ہے، کس کا ہے؟''

''اُسی کنیا کا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ پتا نہیں کیوں مجھ سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہے، اس کے شریر سے جونکیں الگ کرنے کے دوران اس نے مچلنا شروع کر دیا تھا تو ایک دو جونکیں دب کر پھٹ گئی تھیں۔ سسری نے اپنا ہی تازہ خون ضائع کر دیا۔ چچ...... چچ......'' مجھے اس کے بولنے کا یہ انداز نہایت مکروہ اور بھیانک لگا۔

''مجھے اسے دیکھنے دو...... تاکہ تسلی تو ہو جائے میری کہ وہ میری ساتھی ہے یا نہیں؟'' میں نے بہ دستور اس کے بدہیئت چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اچانک ایک تیز سی آواز ابھری۔

''جوگی بابا! اندر آسکتا ہوں؟'' یہ ایک مردانہ آواز تھی جو مڑھی کے باہر سے آئی تھی۔

''ہاں...... ہاں! نندو آجاؤ اندر۔'' جوگی بابا نے بھی اندر سے ہی ہانک لگائی تو اس کے کچھ ہی دیر میں ایک موٹا تازہ اور ٹھگنا سا سیاہ رو شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور گول تھیں۔ عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ وہ ہمارے قریب ہی چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھجی کی بنی ہوئی ایک ٹوکری سی تھی۔

''اوہ...... ہو...... لگتا ہے نیا شکار ہاتھ لگا ہے۔ آج تو تازہ اور بہوت سا مال لے کر ہی جاؤں گا۔ مہاراتی صاحب تو

کھوس ہو جاویں گی۔" اس موٹے ٹھگنے آدمی کی بات نے مجھے ایکا ایکی ایک تشویش آمیز اُلجھن میں ڈال دیا۔ اس کے بولنے کا انداز اور "شکار" کا لفظ استعمال کرنا، مجھے کسی ہولناک خطرے کی غمازی کرتا محسوس ہوا تھا۔ نجانے یہ کون سی مہارانی کا چیلا تھا؟ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی بات پر جوتگی بابا کے مکروہ چہرے پر ایک دم کرختگی کے تاثرات اُبھر آئے اور پھر وہ اس سے اسی لہجے میں اپنی اکلوتی آنکھ سے گھور کر بولا۔

"اُلٹی سیدھی بکواس مت کر نندو یے، ای ہمرے مہمان ہیں۔ زخمی اور بیمار ہیں بے چارے۔"

"اچھا..... اچھا، ناراض کیوں ہوتے ہو سوامی جی! چھما کر دو۔" نندو یہ یک ترنت مکارانہ فروتنی سے بولا تو جوتگی بابا نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اُسی گوشے کی طرف بڑھ گیا۔ میں حیران و پریشان انہیں جاتا دیکھتا رہا، تھوڑی دیر انہیں وہاں لگی تھی، جب یہ دونوں دوبارہ وہاں سے برآمد ہوئے تو میں نے دیکھا، نندو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھجی کی ٹوکری خاصی پھولی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ نندو خوش خوش چلا گیا۔ جوتگی بابا نے وہیں کھڑے کھڑے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد عجیب سے اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں مجھے ایک خبیثانہ قسم کا کمینہ پن محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔

"آخر یہ سب کون سا چکر چلا رہے ہو تم؟ مجھے جانے دو یہاں سے۔ اب میری طبیعت کافی بہتر ہے۔ تمہارا شکریہ۔" میرا انداز اس سے جان چھڑانے کا سا تھا۔ وہ چند قدم میری طرف چل کر آیا، پھر بولا۔

"ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، جب ٹھیک جاؤ تو چلے جانا۔"

"سچ سچ بتاؤ، تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟" میں نے اس کی طرف گھورنے والے انداز میں کہا۔ "میں اپنے جسم کو ذرا سی بھی حرکت دینے سے قاصر ہو گیا ہوں۔ مجھے حاجت کی ضرورت ہے۔" بالآخر میں نے آخر میں چالاکی سے کہا۔ وہ بولا۔

"میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا، تمہارا علاج کر رہا ہوں۔ حاجت ادھر ہی کر دو۔" وہ بے پروانہ انداز میں یہ کہتا ہوا، اسی طرف بڑھ گیا۔ میرا جی چاہا اسے خوب گالیاں دوں، مگر میں اسے غصہ دلانا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی اسے ناراض کرنا میرا مقصد تھا۔ ہو سکتا تھا، جب تک مجھے کوئی موقع ملتا یہ غصے میں آ کر پہلے ہی کچھ اور برا میرے ساتھ کر ڈالتا۔ میں بے بسی کے مارے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ چلا گیا، وقت گزرتا رہا۔ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے، اسی مصداق مجھے بھی نیند سی آنے لگی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا یا پھر شاید آخری تھا، کیونکہ صبح کاذب کی روشنی کا ہلکا ہلکا اُجالا سا مجھے اس منحوس مڑھی کے صحن کے اندر پڑتا محسوس ہونے لگا تھا۔ لالٹین کی لو خود ہی مدھم ہو گئی تھی، شاید اس میں تیل ختم ہونے لگا تھا یا پھر کوئی اور وجہ رہی ہو۔ ابھی میں نیم غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ اچانک میں نے صحن میں اندھیرا ہوتے دیکھا اور خنک ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی۔ اسی وقت کڑاکے کی آواز ابھری اور تیز بارش ہونے لگی۔ لالٹین کی لو بجھ چکی تھی۔

یہ شاید کوئی بارانی علاقہ تھا یا پھر ساحلِ سمندر کے قریب ہونے کے باعث یہاں ہر وقت بارش کا ہی سماں بندھا رہتا تھا۔ میری نیند ٹوٹ سی گئی، یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کو ہلانے جلانے کی کوشش جاری رکھی، تب ہی مجھے لگا کہ میں اپنے دائیں پیر کا انگوٹھا ہلانے میں کامیاب رہا ہوں، یہی حال میرے دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں کا ہونے لگا۔ میں انہیں تھوڑا تھوڑا ہلا رہا تھا۔ بے سدھ وہ بے حرکت پڑے وجود کو تھوڑا ہلتے جلتے دیکھ کر میرے اندر ایک نئے حوصلے اور امید بھری مسرت کی لہری دوڑ گئی۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی، شاید جو دوا میں نے پی تھی اس کا اثر زائل ہونے لگا تھا، اور اب میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دوبارہ اس دوا کو پینے سے صاف انکار کر دوں گا۔

میں نے اپنے جسم کو "وارم اَپ" کرنے کی یہ "ایکسر سائز" جاری رکھی۔ اب میرا گھٹنا بھی ذرا حرکت کرنے لگا تھا، دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں میں بھی حرکت پذیری جاگنے لگی تھی۔ میری یہی کوشش تھی کہ اس خبیث آدمی جوتگی بابا کے نمودار ہونے سے پہلے ہی میں چلنے پھرنے کے لائق ہو جاؤں۔ بارش بدستور جاری تھی اور رہ رہ کر بادلوں کے ہولناک انداز میں گرجنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی ہوئی تھی، میں کافی حد تک اب اپنے جسم کو ہلانے جلانے کے قابل ہونے لگا تھا، لیکن ابھی میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پا رہا تھا کہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ لہٰذا میں نے صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھا۔ کیونکہ میری کوششیں رنگ لاتی محسوس ہو رہی تھیں، کچھ دوا کا زائل ہوتا اثر اور کچھ میری اپنی کوشش تھی کہ

میں خاصی حد تک اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل ہوگیا۔

اس دوران بارش کا زور بھی ٹوٹنے لگا تھا، اگرچہ پوری طرح رکی نہیں تھی، البتہ بجلی کی چمک اور بادلوں کے گرجنے کی آوازیں کافی حد تک معدوم ہو چکی تھیں۔

اچانک میری تھکی ہوئی سماعتوں سے ایک عجیب سی آواز ٹکرائی۔ میں چونکا، یہ کراہتی ہوئی سی آواز تھی۔ میں نے گردن گھما کر اسی گوشے کی طرف دیکھا تو مجھے کوئی شے سی رینگتی ہوئی نظر آئی۔ میں ٹھٹکا اور یک ٹک اسی طرف دیکھنے لگا، نجانے وہ کیا شے تھی؟ اندھیرے کے باعث پورے طور پر نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ دوبارہ اندر کو سرک گئی۔ خدا جانے کیا شے تھی وہ؟ میں اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوبارہ اپنی ایکسرسائز میں مصروف ہوگیا۔

معاً ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی گھسٹ گھسٹ کر چلنے کی کوشش کررہا ہو۔ میں نے فوراً آواز کی سمت دیکھا اور دہل سا گیا۔ فرش پر، میری چارپائی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک استخوانی سا وجود، ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میری چارپائی کے قریب آرہا تھا۔ اس کی حالت کسی انسانی ڈھانچے جیسی ہی تھی، جسم ہڈیوں کا پنجر تھا، کھال سوکھ کر ہڈیوں کے ساتھ چپکی ہوئی نظر آتی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے، سر گنجا اور آنکھیں حلقوں سے باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ رنگت سیاہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ بہ مشکل ہاتھوں پیروں کی مدد سے تقریباً گھسٹنے کے انداز میں ہی میری چارپائی کی طرف چلا آرہا تھا۔ میں یہ ہولناک سا منظر دیکھ کر لرز سا گیا۔ خدا جانے یہ کیا عجیب سی بلا تھی، لیکن جلد ہی مجھے یہ ادراک بھی ہوا کہ یہ بے چارہ تو خود کسی خون چوسنے والی بلا کے زیراثر رہ چکا ہے شاید...... وہ میری چارپائی کے قریب آکر ٹھہر گیا۔

"کک...... کون؟ کون ہو تم؟" اس سے مخاطب ہوتے ہوئے میرا لہجہ بھی لڑکھڑا سا گیا۔ اسی وقت آڑے جونگی بابا نمودار ہوا۔ وہ خاصا غصے میں تھا۔ شاید اسی عجیب آدمی کو ڈھونڈتے ہوئے وہ اس طرف نکلا تھا۔ پھر اس پر نظر پڑی تو وہ چلایا۔

"او...... بدبخت! چل اندر......" اس کی آواز پر وہ عجیب آدمی چونکا اور باریک سی کمزور آواز میں چیختا ہوا مڑھی کے دروازے کی طرف کو لپکا، مگر وہ بے چارہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ جونگی بابا نے اس کا راستہ روک لیا اور اُسے بری طرح پیٹنے لگا، ساتھ ہی غصے میں بڑبڑاتا بھی جاتا۔

"اب تو میرے کام کا نہیں رہا، لگتا ہے تیری چتا بھی اب جلانا پڑے گی۔"

وہ استخوانی نما آدمی جو پہلے ہی نڈھال اور سوکھی سڑی لاش بنا ہوا تھا، بے دم سا ہو کر چت لیٹ گیا۔

"مر گیا......" جونگی بابا ہانپنے کے انداز میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔ وہ بدنصیب انسان شاید واقعی مر گیا تھا جو پہلے ہی ادھ موا ہو گیا تھا۔ اسی وقت جونگی بابا نے سر...... گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی باہر کو اُمڈتی ہوئی اکلوتی آنکھ میں مجھے سفاک چمک محسوس ہوئی جس نے مجھے اندر سے لرزا سا دیا۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے چند ثانیے تکتا رہا، میں نے دانستہ اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ پھر میں نے اس کے قدموں کی چاپ سنی، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہ میری چارپائی کے قریب آکر غور سے میرا جائزہ لینے لگا۔ اس خبیث کو اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے بھی دھیرے دھیرے اپنی گردن اس کی طرف موڑ کر دیکھا تو اس کی اکلوتی بھیانک سی آنکھ بڑے غور سے میرے جسم کو تکے جارہی تھی، یوں، جیسے اس کا ایکسرے کر رہی ہو...... پھر وہ میرے ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا، میں نے بھی جان بوجھ کر اسے یہی تاثر دیا کہ میں واقعی ابھی تک بے حس و حرکت ہوں۔

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں اس مردود کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟ لہٰذا میں نے اس کا دھیان اپنی طرف سے ہٹانے کی خاطر اسے باتوں میں لگانے کی کوشش چاہتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ کون تھا غریب؟ اس کے تو جسم میں خون ہی نہیں تھا اور گوشت بھی برائے نام منڈھا ہوا تھا اس کی سوکھی ہڈیوں پر......؟"

"ہوں ں......" اس نے ایک ہمکاری لی تو میں نے اس سے پھر دگر گوں آواز میں کہا۔

"میں ابھی تک کوئی حرکت نہیں کر پارہا ہوں...... آخر ایسا کب تک ہوگا میرے ساتھ؟" مگر وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے، خاموشی سے واپس پلٹ گیا اور دوبارہ اسی گوشے میں غائب ہوگیا، ذرا دیر بعد لوٹا تو میں سنسنا اُٹھا اس خبیث کے ہاتھ میں وہی آب خورہ تھا، جس سے یہ مجھے علاج کے نام پر کوئی ایسی دوا پلاتا تھا، اسے پیتے ہی میرا جسم بے حس و حرکت ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے بھی اس بار پکا تہیہ کر لیا تھا کہ یہ دوا نہیں پیوں گا، میں نے ایک بار پھر اپنے جسم اور ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر دیکھا تو میرے اندر ایک جوش آمیز سی مسرت جاگی، میری جسمانی طاقت زیادہ نہیں تو کسی حد تک ضرور بحال ہو گئی تھی۔ تاہم مجھے لگتا یہی

تھا کہ اس خبیث جوگی کو اس بات کا شبہ ہو چلا تھا کہ اس کی دوا کا اثر زائل ہونے لگا ہے۔ اب وہ دوبارہ ایک اور پیالہ لیے آرہا تھا۔

اس خبیث سے درانہ وار بھڑ جانے کو میں تیار تھا۔ چاہے جتنی بھی سکت مجھ میں اس سے مقابلہ کرنے کی بحال ہوئی تھی میں اُسے بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے میرے اعصاب یکلخت تن گئے پھر وہ میرے قریب آگیا اور مجھ پر ذرا جھک کر وہ آب خورہ میرے ہونٹوں کے قریب کیا تو میں بولا۔

”نہیں...... مجھے اب اس دوا کو پینے کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔“

”انکار مت کرو...... تمہیں یہ دوا پینا پڑے گی۔“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور زبردستی آب خورہ میرے ہونٹوں سے لگایا تو اب میرے پاس حرکت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا منہ پرے کر دیا اور ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ کا ایک گھونسا اس کے جھکے ہوئے مکروہ چہرے پر جڑنے کی کوشش چاہی، میرا ہاتھ اُوپر اُٹھ بھی گیا تھا اور اس کے چہرے سے لگا بھی تھا، مگر اس کی ضرب میں خاطر خواہ طاقت نہیں رہی تھی۔ بس، اتنا ہوا کہ اس کا چہرہ ذرا گھوما تھا اور آب خورے والا ہاتھ ہل گیا تھا، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی کہ وہ کم از کم آب خورے سے ٹکرا جائے اور یہی ہوا بھی...... آب خورہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ساری دوا میرے اُوپر برہنہ بدن پر بہہ گئی، لیکن میں نے دیکھا اس دوا کے محلول کے ساتھ ننھے طفیلیے قسم کے کیڑے بھی تھے، جو میرے برہنہ بدن پر رینگنے لگے، تب مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مجھے اس دوا میں ننھی جونکیں بھی پلائی جارہی تھیں۔ اس تصور سے ہی میں لرز اُٹھا کہ کہیں، پہلے والی جو دوا مجھے اس خبیث شیطان نے پلائی تھی، کہیں اس میں بھی تو یہی ننھی جونکیں نہیں تھیں؟

جوگی بابا نے ایک غصیلی غراہٹ حلق سے خارج کرتے ہوئے میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ جس کی تکلیف کا مجھے بس! ہلکا سا ہی احساس ہوا تھا۔ لیکن مجھ پر جنون آمیز طیش سوار ہو گیا تھا، میں نے ایک ہاتھ سے لیٹے لیٹے اس کی گردن دبوچ لی اور اسی کے سہارے چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہونے کی سعی چاہی تا کہ میں اسے اپنے بھاری کڑیل بدن کے بوجھ تلے زیر کرنے کی کوشش کر سکوں...... میں اپنی سی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا کیونکہ میں چارپائی سے نیچے گرا تو وہ بھی میرے نیچے دب گیا، میں نے اپنے مفلوج پڑتے وجود کی رہی سہی بحال شدہ ساری طاقت کو ایک ہاتھ میں مجتمع کیا اور اس کی گردن دبوچتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے خرخراتی سی آوازیں برآمد ہونے لگیں، مگر اس خبیث نے وہی پرانا داؤ کھیلا، یعنی میرے زخمی شانے کو اپنے ناخنوں سے کھرچ ڈالا، لیکن وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ مجھے ہر قسم کے درد سے اسی نے ہی ”بے حس“ کیا تھا اور وہی میرے کام بھی آیا، مطلب مجھے کچھ زیادہ تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا، لیکن میں نے اس کی گردن نہیں چھوڑی۔ وہ میرے ہاتھ کے شکنجے میں پوری طرح کسی جا چکی تھی، اس نے دوسرا داؤ کھیلا اور اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا سکیڑ کر اس کی زوردار ضرب میرے زیرِ ناف رسید کر ڈالی، یہاں مجھے تکلیف کا احساس ہوا اور میں درد سے دہرا ہو گیا، ہاتھ کی گرفت کمزور پڑتے ہی وہ کم بخت چکنی مچھلی کی طرح اپنی گردن میرے کمزور پڑتے ہاتھ کے شکنجے سے چھڑا گیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میرا سر پکڑ کر زور سے فرش پر دے مارا، میرے منہ سے تیز چیخ خارج ہوگئی، مگر میں نے اپنے حواسوں کو قابو رکھا اور اس تکلیف کو سہہ گیا، وہ اُٹھ کر بھاگنے لگا تو میں نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ پکڑ لی وہ منہ کے بل گرا اور اس کے حلق سے کریہہ چیخ خارج ہوگئی، میں پھر لیٹے لیٹے اس پر اچھل کر جا پڑا...... اس کشاکشی میں میرے جسم کی باقی ماندہ قوت بھی لوٹ آئی تھی اور میں نے اسی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ساتھ کیا تھا، میں نے بھی اس کا سر بالوں سے دبوچ کر بڑے زور سے فرش پر دے مارا۔ اس کے حلق سے بڑی کریہہ انگیز چیخ خارج ہوئی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سر بری طرح پھٹ گیا تھا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔ میں اس مردود کو اسی حال میں چھوڑ کر اٹھا تو مجھے چکر سا آگیا، میں نے سہارا لینے کے لیے مڑھی کے ایک بدنما بانس کا سہارا لیا اور ذرا دیر کھڑا ہو کے اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے لگا۔ شکر تھا کہ میں اب اپنے قدموں پر کھڑا تھا، مگر کمزوری اب بھی محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ میرا جی متلانے لگا تھا، پیٹ میں گراہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ میں نے ذرا دیر اسی بانس کو تھامے رکھتے ہوئے کھڑا رہا اور سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ ذہن پر طاری ہونے والی دھند

ذرا چھٹی تو میں نے ایک قدم آگے، بغیر کسی سہارے کے بڑھایا، میری ٹانگوں میں ابھی تک لڑکھڑاہٹ سی تھی، تاہم میں نے ہمت کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اسی گوشے کی طرف بڑھا۔

قریب پہنچ کر میں ذرا رکا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اندر وہ کون عورت تھی، جو شاید میری ہی طرح اس مصیبت کا شکار رہی تھی۔ میں نے پیوند زدہ سا کپڑا ایک طرف ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے نگاہ پڑی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆☆

اندر بھی اتنا ہی بڑا گوشہ تھا، جتنا کہ باہر صحن کا تھا بلکہ یہ شاید مڑھی کا کوئی عقبی حصہ تھا۔ اُوپر چھت کی طرف روشندان کے نام پر ایک چھوٹا سوراخ تھا، جہاں سے دن کی ہلکی روشنی اندر پڑ رہی تھی، ورنہ تو یہاں بھی اندھیرا سا ہی تھا۔ شاید آسمان پر ابھی تک کالے بادلوں کا جمگھٹا تھا مگر یہاں نجانے کیا کاٹھ کباڑ اور الا بلا بکھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ، ایک طرف کونے میں اسی طرح کا ایک کیچڑ سا بھی پھیلا ہوا تھا، جس کی حد بندی مٹی کی منڈیر بنا کر کی ہوئی تھی، وہاں یقیناً اس مردود جونکی بابا نے جونکیں پال رکھی تھیں۔ جونکوں کا گویا خود ساختہ ''فارم'' سا بنا رکھا تھا، کیونکہ وہاں مجھے مٹی کی ادھ کھلی بوریاں بھی رکھی نظر آئی تھیں۔ ایک طرف کونے میں مجھے چرمی تھیلیاں اور دوائیں وغیرہ گھوٹنے کا سامان نظر آیا۔ یہاں دو تین جھلنگا سی کھری چارپائیاں بھی بچھی ہوئی تھیں، دو خالی تھیں ایک پر میں نے کسی کو دراز پایا، وہ کوئی جوان عورت تھی، جس کا اُوپری بدن بالکل برہنہ تھا اور اس کے گورے جسم پر جونکیں چپکی ہوئی تھیں، میں یہ منظر دیکھ کر دہل سا گیا، تاہم آگے بڑھا۔ قریب پہنچا تو بری طرح چونکا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا وہ عورت سوشیلا ہی تھی، وہ نیم بے ہوش سی تھی، اور ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھتے ہی فوراً اس کی طرف بڑھا اور اسے آوازیں دیں۔

''س...... سوشی !...... سوشیلا......!'' میری آواز پر اس کے حلق سے زور سے کراہنے کی آواز خارج ہوئی تھی اور پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی حالت بھی میری طرح ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے کچھ بولنے کی سعی چاہی تھی کہ اچانک مجھے باہر کچھ شور زدہ سی آوازیں آتی سنائی دیں۔ یہ آوازیں بھاری گاڑیوں کی تھیں۔

''دشمن'' میرے تھکے ہوئے ذہن میں اُبھرا اور میرے خون کی گردش یکلخت تیز تر ہو گئی۔ اس دوران سوشیلا نے نحیف سی آواز میں مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، مگر میرے پاس اب اس کی بات سننے کا کہاں وقت تھا...... میں نے ایک قریب پڑی چادر اٹھا کر اسے دی اور کہا۔ ''سوشی! دشمن یہاں آن پہنچے ہیں، ہمت کرو، میری اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں......'' میری بات پر اسے بھی مخدوش صورتِ حالات کا اندازہ ہوا اور وہ اپنی ساری تکالیف بھلا کر اُٹھ بیٹھی۔ جونکیں ہنوز اس کے جسم سے چپکی ہوئی اس کا خون چوسنے میں مگن تھیں اور یہ اتنی آسانی سے چھوٹنے والی نہیں تھیں، بہر طور اس نے ہمت دکھائی اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''یہ تو کسی دیسی ساختہ وید کا جھونپڑا معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہاں کہاں آئے ہوں گے؟'' مجھے ایک کرخت سی آواز سنائی دی اور اس آواز کو پہچاننے میں مجھے چنداں دیر نہ لگی تھی، یہ ادھیڑ عمر چندر ناتھ تھا، بلیک سی کے کرنل جی جی بھوانی کا قریبی دست راست تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ پہلے والے خونی معرکے کے بعد دشمنوں کی نئی ''کھیپ'' پہنچ چکی تھی، یہ سوچ کر میرا پورا وجود سنسنا اُٹھا تھا۔

''شکار، چھپنے کے لیے ایسی ہی جگہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمیں اندر داخل ہونا چاہیے......'' یہ سے جی کوہارا کی آواز تھی۔ اپنے سفاک اور درندہ صفت دشمنوں کے مشترکہ ٹولے کو یہاں پا کر میرا پورا وجود سنسنا اُٹھا......

ایک بار پھر میں اور سوشیلا بدترین اور مخدوش تر صورتِ حالات کا شکار ہونے لگے تھے۔ ایسا اس مردود جونکی بابا کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس خبیث شیطان نے نجانے اپنے کون سے گھناؤنے مقصد کی خاطر نہ صرف مجھے اور سوشیلا کو ''جونک زدہ'' بنا ڈالا تھا بلکہ یہاں کل رات سے مقید کر کے ہمارا بہت سا وقت بھی برباد کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں ہمارے خطرناک دشمنوں کا مشترکہ ٹولہ ہماری تلاش میں بالآخر یہاں تک بھی آن پہنچا تھا۔ اب صورتِ حالات انتہائی کشیدہ تھی، یعنی میرے پاس تو ہتھیار نام کی کوئی شے تک نہ تھی...... جبکہ باہر دشمنوں کی خاصی تعداد بھاری اسلحے کے ساتھ موجود تھی۔ اس پر مستزاد میں اور سوشیلا خالی ہاتھ ہی نہیں، بلکہ ''حالتِ غیر'' میں بھی تھے، بے چاری سوشیلا کی حالت تو زیادہ پتلی ہو رہی تھی، اس کے جسم پر تو ابھی تک جونکیں چمٹی ہوئیں، مسلسل اس کا خون پینے میں مصروف

تھیں۔
بہرکیف اب کوئی معجزہ ہی ہمیں ان بھیڑیا صفت دشمنوں سے بچا سکتا تھا۔ کیونکہ مفر کی تمام راہیں مسدود... دکھائی دے رہی تھیں۔
میں نے ان کے اندر... آنے کے قدموں کی بھاری آوازیں سنیں، اسی دوران میری عقابی نظریں تیزی سے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں وارد ہو سکتے تھے۔ میں نے کیچڑ والے حصے کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر سوشیلا کو لیے تیزی سے اسی طرف بڑھا۔
''سوشی! جان بچانے کا یہ آخری راستہ ہے۔ ذرا حوصلے اور ہمت سے کام لینا اور آواز چاہے جتنی بھی تکلیف کیوں نہ پڑے، منہ سے آواز مت نکالنا۔'' میں نے اس سے کہا اور پھر جتنی تیزی کے ساتھ ایک دو ادھ خالی مٹی کی بوریوں کو کھینچ کر کیچڑ تک لا سکتا تھا، لے آیا اور پھر انہیں وہاں پھیلا کر، سوشیلا کو لیے اس جونک زدہ کیچڑ میں لتھڑ گیا اور ساتھ ہی سوشیلا کو بھی اس میں ڈبو دیا...... اب ہم دونوں کیچڑ میں لتھڑ کر ایک طرح سے ''کیموفلاج'' ہو چکے تھے۔ کیچڑ گہرا تھا، جس کی گدلی سطح ناہموار تھی، یعنی کہیں سے ابھری ہوئی اور کہیں دبی تھی۔ ایسا مٹی کے ان ڈھیروں کی وجہ سے تھا، جو یہاں جونکوں کا ''فارم'' بنانے کے لیے پھینک رکھی تھی، اب ہم دونوں نے کیچڑ سے اتنا منہ باہر کر رکھا تھا کہ سانسوں کی آمد و رفت جاری رکھ سکیں۔
ٹھیک اسی وقت، میں نے کئی مسلح افراد کو تیزی سے اندر در آتے دیکھا۔ میری ایک آنکھ کیچڑ کے اندر تھی، جسے ظاہر ہے میں نے بند کر رکھا تھا جبکہ دوسری آنکھ باہر...... میں اور سوشیلا کیچڑ سے بری طرح لتھڑ چکے تھے۔
دشمنوں کے جانے پہچانے چہروں میں مجھے چندر ناتھ، کورنیلا، شیام اور سے جی کو ہارا دکھائی دیے، دو اور بھی دشمن ساتھی تھے جو میرے لیے ان جانے تھے۔ گویا ''ہائی پروفائل'' دشمنوں کی ''کریم'' میرے سر پہ موجود تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ یہ لوگ میری ذرا سی جھلک دیکھتے ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ ڈالتے...... جبکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سے زیادہ تعداد میں باہر بھی موجود ہو سکتے تھے۔
''یہاں تو بڑا گند پھیلا ہوا ہے...... بڑی عجیب سی ہی جگہ ہے یہ۔'' میں نے کوہارا کی آواز سنی۔
''یہاں ضرور وہی بدصورت بڈھا... رہتا ہوگا جس کی لاش ہم نے دیکھی تھی۔'' یہ کورنیلا تھی۔ میں گویا دم سادھے کیچڑ میں لیٹا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا، جو میرے لیے حوصلہ افزا تھیں، ساتھ ہی میں یہ بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں سوشیلا کسی وجہ سے چیخ نہ پڑے۔ ہم دونوں جونکوں والی کیچ میں لیٹے پڑے تھے۔ میرے جسم کے ساتھ بھی لاتعداد چمٹ رہی تھیں بلکہ مجھے تو اپنے معدے میں بھی گراہیں پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔
''لیکن اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اچھی طرح تلاشی لے لینا چاہیے۔'' شیام کی آواز ابھری۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں ایک ہی رخ پر لیٹا ہوا تھا اسی لیے مجھے محدود حد تک ہی یہ منظر دکھائی دے رہا تھا، پھر میں نے انہیں دائیں بائیں پھیلتے دیکھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں ان کو اس کیچ پر شبہ نہ ہو جائے۔
مجھے اپنے وجود پر لاتعداد کیڑے سے رینگتے محسوس ہونے لگے، کراہیت اور بدبو کے باعث میرا برا حال ہو رہا تھا، مگر جان بچانے کا جذبہ ان سب پر غالب تھا۔ معاً میں نے ایک جونک کو اپنے کھلے منہ کی طرف رینگتے ہوئے آتے دیکھا۔ میری آنکھ کا ایک ڈیلا اسی کی رینگتی ہوئی حرکت دیکھ رہا تھا اور خوف سے پھیل سا گیا۔ انگوٹھے جتنی ایک جونک کیچ پر رینگتی ہوئی میرے کیچڑ زدہ گال پر آگئی تھی اور اب منہ کی جانب دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ میں نے منہ بند کر دیا اور ناک سے سانس لینے لگا۔ جونک ہونٹ پر آ کر رک گئی اور پھر اس نے ناک کی طرف سرکنا شروع کیا تو میں نے ہولے سے اسے پھونک ماری، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جونک کا ناک میں گھسنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ مجھے چھینک آسکتی تھی۔ پل کے پل میں نے سوچا اور اپنا منہ کھول کر جونک کو چبا ڈالا۔ یہ میری زندگی کا ہولناک اور انتہائی کریہہ آمیز لمحہ تھا۔ جونک چباتے ہی میرا منہ ایک عجیب سے مادے سے بھر گیا تھا۔ میرا جی اُلٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے معدے کے اندر سے اُمڈتی ہوئی قے کو روک رکھا تھا۔
''واپس چلو...... ہم نے یہاں بہت وقت ضائع کر لیا۔'' چندر ناتھ کی اس آواز نے میرے اندر طمانیت کی لہر دوڑا دی۔ میں نے کچلی ہوئی جونک کو ہولے سے تھوک دیا تھا۔
عین آخری لمحات میں جب یہ لوگ باہر نکل رہے تھے، ایک تیز سسکاری کی آواز ابھری۔ یہ یقیناً سوشیلا کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ ضرور اس کے ساتھ بھی میری طرح کوئی ایسی ناقابلِ برداشت سی صورتِ حال پیش آئی ہوگی۔ میں تو برداشت کر گیا تھا مگر شاید وہ نہ کر پائی تھی۔ تاہم سکی

کی آواز باریک سی ابھری تھی، لگ یہی تھا کہ اس بے چاری نے اسے روکے رکھنے کی پوری سی کوشش کی تھی، مگر بالآخر وہ اس کے حلق سے برآمد ہو ہی گئی تھی۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔

''یہ کیسی آواز تھی؟'' معاً ہی میں نے سے جی کو بارا کو نکلتے نکلتے رکتے پایا۔

''کیسی آواز؟'' چندر ناتھ کا سوالیہ لہجہ تھا۔ وہ شاید باہر نکل چکا تھا اور سب سے آخر میں سے جی کو بارا تھا اور وہ چونک کر رکا تھا۔

''پتا نہیں عجیب سی ہی آواز تھی۔''

''یہاں ہم نے تلاشی لے لی ہے۔ مجھے تو یہاں سخت کراہیت ہو رہی ہے۔ آجاؤ۔''

''شاید، میرا وہم ہی ہو......''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لیکن جب ذرا دیر بعد مجھے باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے روانہ ہونے کی آوازیں دور ہوتی سنائی دیں تو میں ایک دم کیچ سے اُٹھ گیا اور ایک زوردار اور بڑی سی قے کر ڈالی۔ یہی حال سوشیلا کا ہوا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قے کرنے لگی تھی، ساتھ ہی اس کے حلق سے عجیب و غریب ہسٹریائی آوازیں بھی برآمد ہونے لگی تھیں۔

میں اپنی زندگی کی بہت ہی عجیب و غریب اور ناقابلِ تصور صورتِ حالات سے دوچار تھا۔

''شش...... شہزی!...ی...... یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟ اُف...... میرا تو اب مر جانے کو جی چاہتا ہے۔'' سوشیلا بھی میری طرح بہت سی قے کرنے کے بعد ہانپتے اور روتے ہوئے بولی۔ اس کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ میری اپنی حالت غیر تھی، مگر میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''سوشیلا! میں بھی انہیں حالات سے دوچار ہوں، حوصلہ کرو، ہمارے اہم مقاصد کے سامنے ایسی تکالیف کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اگر تم بالکل ہی مایوس اور بددل ہو گئی ہو تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ تم میرا ساتھ چھوڑ سکتی ہو۔''

بالآخر مجھے یہاں تک بھی کہنا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے کسی کم ہمتی کا مظاہرہ کرے اور مجھے بھی اپنے ساتھ پھنسا دے، جیسا کہ ابھی ذرا دیر پہلے اس کے حلق سے سسکاری خارج ہو گئی تھی اور دشمن چونک پڑا تھا، مگر قسمت اچھی تھی کہ وہ تلاشی لینے کے بعد خود بھی یہاں سے مایوس ہو چکے تھے اور اسے اپنا واہمہ یا کچھ اور سمجھ کر چلے گئے تھے۔

''نن...... نہیں شہزی! پلیز...... سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' سوشیلا میری بات کا اثر لیتے ہوئے ایک دم بولی۔

''تمہاری بات کا کچھ بھی مطلب ہو سوشیلا......!'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''تم دیکھ رہی ہو کہ میری اپنی بھی حالت خراب ہے اور یہ محض میں اپنی ہمت، عزم اور قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو سنبھالے ہوئے ہوں۔ بے شک تم عورت ذات ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان باتوں سے گھبرا کر ایسی ویسی حرکت کر ڈالو، جیسی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکی تھیں، یہ تو قسمت مہربان تھی جو بچ گئے ورنہ تو تمہاری اس حرکت نے ایک جھٹکے میں سب کچھ تمام کر دینا تھا ہمارا......''

سوشیلا کو اس طرح کی تھوڑی سی ''ڈوز'' دینا ضروری تھا۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے ایسے کسی بھی نازک موقع اور صورتِ حالات میں کم ہمتی یا مایوسی کا مظاہرہ نہ کرے۔

''میرے منہ میں اور جسم کے ایک نازک حصے پر جونک رینگنے لگی تھی۔'' وہ بولی۔

''منہ میں آنے والی جونک کو تو میں نے کسی طرح سے تھوک دیا تھا مگر...... جسم کے نازک حصے پر رینگنے والی جونک......'' وہ چپ ہو گئی۔

''اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا، وہ خبیث جوگی بابا میرے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔ اس کی لاش ادھر ہی پڑی ہوئی ہے اب تک...... ایسا نہ ہو اس وجہ سے ہم ایک نئی مصیبت کا شکار ہو جائیں۔''

''لیکن تمہارا شانہ بری طرح زخمی ہے۔'' وہ میرے زخم کی طرف دیکھ کر تفکر سے بولی۔

''یہاں مرہم پٹی کا سامان موجود ہے۔ ہمیں ان منحوس جونکوں سے بھی جان چھڑانا ہے، جو ابھی تک ہمارے جسم کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔''

''میں نے ان جونکوں کو نوچنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''یہ کھینچنے سے کبھی نہیں اُتریں گی۔'' اس نے کہا۔ ''گرم دیا سلائی سے ہی الگ کی جاسکتی ہیں۔''

سوشیلا کی بات غلط نہیں تھی، سن میں نے بھی یہی رکھا تھا کہ جونکیں گرم سلاخ یا دیا سلائی سے ہی الگ کرنا ممکن ہوتا ہے۔

"جو بھی ہے ہمیں جلدی یہ سب کچھ انجام دینا ہے۔ اگر کوئی ادھر آنکلا تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ یہ جونگی بابا اس بستی کا وید کہلاتا ہے اور شاید اس کے یہاں کی کسی مہارانی کے ساتھ بھی روابط ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے تندو نامی اس موٹے ٹھگنے آدمی کے بارے میں بھی بتایا۔

"یہ کوئی گہرا چکر لگتا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، ٹھہرو میں پہلے تمہارے زخموں پہ مرہم لگا دوں۔" سوشیلا نے کہا اور پھر میں نے بھی حرکت کی۔

دوائیوں اور مرہم پٹی کا سامان وہاں موجود تھا۔ سوشیلا نے بڑی مہارت سے میرا زخم صاف کر کے اس پر مرہم لگایا اور پٹی کر دی، اس نے پٹی کرنے کے دوران بتایا کہ وہ بڑی اچھی نرس بھی رہ چکی تھی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دو تین ماچسیں تلاش کیں اور ایک ایک دیا سلائی جلا کر پہلے میرے جسم کے مختلف حصوں سے جونکیں الگ کیں اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ یہی عمل کیا، جبکہ اندرونی حصوں سے اس نے خود ہی یہ کام ایک الگ گوشے میں جا کر انجام دیا۔

ان پیچیدہ مسائل سے چھٹکارا پانے کے بعد کچھ سکون ملا۔ اس کے بعد ہم نے غسل وغیرہ بھی کر کے اپنی حالت کچھ سدھاری۔ شکر تھا کہ یہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔

"میں اس مڑھی کو آگ لگانا چاہتا ہوں۔" روانہ ہوتے وقت میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو سوشیلا بھی میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔

روانہ ہوتے وقت ہم نے اس مڑھی کو آگ لگا دی اور جنگل کی طرف نکل گئے۔

☆☆☆

جنگل خاصا گھنا تھا۔ دن میں بھی یہاں اندھیرا سا محسوس ہوتا تھا۔ اگرچہ سورج کی کرنیں چھتنار درختوں اور گل بوٹوں سے لدی پھندی شاخوں کے رخنوں سے چھن کر پڑ رہی تھیں، اسی کی مدد سے ہم راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ فضا جنگلی پرندوں کی مدھر بان چہچہاہٹ سے گونج رہی تھی۔ کبھی کسی جانور کی اُلسائی ہوئی آواز بھی سنائی دے جاتی۔

میری طبیعت گری گری سی ہو رہی تھی۔ جونکیں پیٹ میں چپک کر اپنا کام شروع کر چکی تھیں، یعنی خون چوسنے لگی تھیں، شانے کے زخم میں کافی حد تک افاقہ تو تھا مگر صرف اسی قدر... کہ درد کم تھا، لیکن کیچڑ اور دیگر خرابیِ وقت کے باعث مجھے لگتا تھا کہ زخم خراب ہونے لگا ہے اور اس میں پیپ (pus) پڑنے لگی تھی۔ کیونکہ اس میں سوجن ہو رہی تھی اور درد سے زیادہ دکھن کا احساس ہو رہا تھا۔ جو کبھی کم کبھی زیادہ ہونے لگتا۔ زخم جراثیم زدہ ہونے کے باعث مجھے بخار بھی ہو گیا تھا۔ جونگی بابا کی مڑھی میں مقدور بھر کوشش، سوشیلا نے زخم وغیرہ کے سلسلے میں کی تھی، میں سمجھتا تھا وہ عارضی ہی تھی۔ زخم میں انفیکشن پھیلنے کا خطرہ ہونے لگا تھا۔ پیٹ کی جونکیں الگ پریشان اور جی متلا رہی تھیں۔ یہ تو شکر تھا کہ سر پہ پہنچے ہوئے دشمنوں سے اللہ رب العزت نے بچا لیا تھا ورنہ دوسری بار دشمنوں کا یہ مشترکہ ٹولہ نئی "کمک" کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا اور میں نہتا بھی تھا، حالت بھی خراب تھی میری، میں ان سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں تو بالکل بھی نہیں تھا۔ ورنہ میری بڑی خواہش تھی کہ ان سے بھڑ جاتا اور بلیو تسی اور اسپیکٹرم کو ایک اور چوٹ دیتا۔ یہ اچھا موقع تھا، کیونکہ ایک طرف بلیو تسی کے تین ٹاپ ایجنٹ چندر ناتھ، کورنیلا اور شیام موجود تھے تو دوسری طرف اسپیکٹرم کا سے جی کو ہارا تھا۔ ان چاروں کو جہنم رسید کرنے سے بلیو تسی اور اسپیکٹرم کو اچھی خاصی چوٹ لگ سکتی تھی اور جب تک میری سرکوبی کے لیے یہ دونوں اگلے ایجنٹ بھیجنے کے لیے تیار کرتے، میں تب تک ان دونوں تنظیموں کی اعلیٰ قیادت کی ناک کے قریب ہو چکا ہوتا۔

"کسی قریبی آبادی کا رخ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہاں ہمارے لیے خطرات بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے سوشیلا سے کہا۔ میں دراصل دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ بلا ارادہ آگے بڑھی چلی جا رہی تھی میرے ساتھ...... یا اس نے کسی نسبتاً محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے پہلے سے کچھ سوچ رکھا تھا۔ اس لیے میں نے سرِدست اس سے کہا تو وہ بولی۔

"تمہاری حالت مجھ سے زیادہ خراب ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے تمہارا پہلے خاطر خواہ علاج ہو جائے، اس کے بعد آگے کا سفر کرتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے آگے کون سی آبادی ہے؟ میرا مطلب ہے، جہاں میرا علاج ہو سکے؟" مجھے اس کی بات اچھی لگی تھی کہ اُسے میری فکر تھی۔ وہ جواباً بولی۔

"آگے کون سی پوروائی (بستی یا گاؤں) ہے، مجھے اس کا علم نہیں لیکن میں نراش نہیں ہوں، پوری آشا ہے کہ وہاں تمہیں کم از کم ابتدائی طبی امداد تو مل ہی جائے گی۔"

"میں اسی لیے کہہ رہا تھا کہ وہاں جونگی بابا کے مرنے اور اس کے جھونپڑی سے آگ کی خبر ملتے ہی، سب سے پہلے ہم

پر شبہ کیا جائے گا، کیونکہ اس بستی میں نو وارد ہم ہی کہلائیں گے اور پھر جوگی بابا کے کسی مہارانی کے ساتھ کچھ پُراسرار قسم کے خفیہ روابط بھی تھے۔ اس کا کوئی تندو نامی ایک آدمی جوگی بابا کے پاس بھی آیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے تندو کی جوگی بابا سے کی ہوئی عجیب اور معنی خیز گفتگو کے بارے میں بھی اس بار ذرا تفصیل سے آگاہ کردیا تو وہ بولی۔

"میرے ذہن میں یہ بات ہے مگر ضروری نہیں کہ ہم پر ہی شبہ کیا جائے اور پھر یہ جوگی بابا کی جھونپڑی آبادی سے خاصی دور ہے۔ تب تک ہم اپنا کام کرکے نکل چکے ہوں گے۔"

"بشرطیکہ وہ سب کچھ وقت پر ہوتا چلا جائے جیسا ہم سوچ رہے ہیں۔ ہمارے دشمن بھی وہاں کا رخ کرسکتے ہیں۔"

"ہم اندھا دھند نہیں داخل ہوں گے، پہلے حالات کا جائزہ لیں گے۔" اس نے مختصراً کہا اور میرے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ میں کچھ زیادہ پُراُمید نہ تھا، تاہم سوشیلا کو بہتر ادراک تھا۔ اسی لیے خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ ایک مقام پر جنگل چھٹنے لگا اور کچا بل کھاتا راستہ دکھائی دیا۔ ہم اس پر چل پڑے۔ ابھی ہم اس راستے پر چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اچانک مجھے بڑے زور کی قے ہوئی اور مجھے چکر سا آگیا، میں گر پڑا۔ سوشیلا پریشان ہوگئی۔ میری سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

"ہے بھگوان...... !تمہیں تو بڑا تیز بخار ہورہا ہے۔"

وہ اپنے ایک ہاتھ سے میری پیشانی چھوتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔ میری طبیعت واقعی بہت خراب ہونے لگی تھی۔ سردی کا احساس بڑھ رہا تھا، حالانکہ موسم سردی کا بھی نہیں تھا۔ آنکھیں غنودگی اور نیم بے ہوشی کے باعث بند... سی ہونے لگی تھیں۔ خود مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اب شاید میرا آخری وقت ہی آپہنچا ہے۔ جی میرا الٹ رہا تھا اور اب خالی قے اور اُبکائیاں ہی آرہی تھیں۔

"اُف! تمہاری قے میں کتنی ساری ننھی جونکیں نکلی ہیں......" میں نے سوشیلا کو کہتے سنا تو اسی وقت میری بھی نیم باز سی نظریں بھربھری مٹی والی زمین پر پھیلی قے پر پڑی تو اس میں مجھے لاتعداد چھوٹی چھوٹی طفیلیے نما کیڑے حرکت کرتے نظر آئے۔

"چنتا کی ضرورت نہیں شہزی! یہ تمہارے لیے اچھا ہے کہ تم قے کرتے رہو۔ پریشان نہ ہونا میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑوں گی۔" وہ بے چاری مجھے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔ ورنہ تو میں مایوس ہی ہوچلا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی میں اس طرح کے بے بسی ولاچارگی جیسے حالات سے بھی دوچار ہوسکتا ہوں۔ سوشیلا ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اچانک شاید اس کی نگاہ کہیں پڑی اور وہ مجھے زمین پر اسی طرح نڈھال سا چھوڑ کر اسی طرف اُٹھ کر دوڑی۔ میں تب تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا اور اُٹھ کر بیٹھنے لگا۔

میں اب زمین پر ہی بیٹھا رہ گیا تھا۔ مجھ میں اپنی ٹانگوں پر بھی کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا شاید اس بار میری طبیعت بگڑی ہے تو اب سنبھل نہیں پائے گی اور میرے ساتھ وہی ہونے لگا تھا، کیونکہ میرا دل اب مالش کرنے لگا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے گرم ہوکر سوجنے لگے تھے۔ بڑی قابلِ رحم حالت میں تھا میں اس وقت...... اور ایسے ہی میں مجھے اپنے وہ سب ساتھی یاد آنے لگے جو مجھ پر جان چھڑکتے تھے، مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اول خیر۔ ماں جی، زہرہ بانو اور شکیلہ...... اب تو کمیل دادا بھی میرا یار بن چکا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو خندہ پیشانی سے میرے لاڈ اُٹھایا کرتے تھے۔ زہرہ بانو اور بالخصوص اول خیر تو میری ذراسی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے تھے۔ مجھے اول خیر کا بڑی محبت سے "او...... خیر کا کا!" کہنا یاد آرہا تھا۔ بڑا یار باش اور محبت آمیز تکیہ کلام تھا اس کا یہ۔ بلکہ وہ تو بے چارے اب بھی میری جدائی میں ادھ موئے ہورہے ہوں گے۔ میں نے بھی اُن سے بچھڑنے کے بعد بس ایک بار ہی رابطہ کیا تھا، جب میں نے سے جی کو ہارا کی بوٹ پر اپنا قبضہ جمایا تھا۔

ایسے میں مجھے عابدہ کی بھی یاد بھلا کیوں نہ آتی، وہ الم نصیب تو جیسے میرے لیے ایک خواب سی بن کر رہ گئی تھی۔ اب ان لوگوں کو کیا پتا تھا کہ میں کس حال میں تھا؟ عابدہ تو بے چاری خود بھی نجانے کیسے حالات کا شکار ہوگی، اس کے کیس کا بھی اب تک کیا بنا ہوگا؟ میں نے آنسہ خالدہ کی راہنمائی میں جو "ایفرتس" لینے تھے وہ تک میں نہیں لے سکا تھا اور ایک نئے جنجال میں پھنس گیا تھا۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے بے بسی اور دکھ کے مارے میری آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اچانک مجھے اپنے حلق میں خراش سی محسوس ہوئی۔ مجھے کھانسی کا دورہ پڑا اور میں لگاتار کھانستا ہی چلا گیا۔ کھانستے کھانستے میرا چہرہ سرخ ہوگیا اور میں اپنا سینہ پکڑے بے دم سا ہوکر رہ گیا۔ ایسے ہی وقت میں سوشیلا مجھے ایک بیل گاڑی کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ بیل گاڑی میں ایک بوڑھا اور ایک جوان مرد عورت سوار تھے۔ بیل گاڑی کی باگیں بوڑھے نے ہی سنبھالے ہوئی تھیں۔ چوبی طرز کی اس بیل گاڑی میں ایک ہی بیل جُتا

ہوا تھا۔ سوشیلا شاید انہیں ہی دیکھ کر یک دم اٹھ کر مدد کے لیے ان کے پاس دوڑی تھی۔ مجھے زمین پر بے سدھ پڑا دیکھ کر وہ تینوں گاڑی سوار فوراً نیچے اُتر آئے اور مجھے سنبھالنے کو لپکے۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، بس! نیم باز سی آنکھوں سے ان کی طرف تکے جا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرا آخری وقت آن پہنچا ہوا اور میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ ان تینوں بھلے مانس انسانوں نے مجھے جلدی سے اٹھا کر بیل گاڑی میں ڈالا پھر سوشیلا کو بھی سوار کرانے کے بعد بوڑھے نے بیل گاڑی دوڑا دی۔

چوبی پہیوں والی بیل گاڑی میں جھٹکے بھی خوب لگ رہے تھے اور میں ہولے ہولے منہ کھولے کراہے جا رہا تھا۔ ابھی میں ہوش وحواس کی دنیا میں تھا اور اپنی آنکھوں سے اپنی حالتِ زار دیکھ رہا تھا۔

بیل گاڑی جلد ہی کھیتوں کے درمیان بنے کچے بل کھاتے راستے پر آ گئی تھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد کچے پکے دیہاتی طرز کے گھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایسے ہی ایک ناپختہ گھر کے سامنے بیل گاڑی روک دی گئی۔ یہ شاید انہی لوگوں کا گھر تھا مگر وہاں خاصے لوگ موجود تھے۔

اچانک میں نے اس نوجوان کو چلاتے سنا۔

"ارے یہ کیا......! یہاں کون آیا تھا؟ کس نے ہمارے گھر کا دروازہ توڑا ہے۔"

"یہاں کچھ لوگ آئے تھے راجو......!" ایک آدمی کو میں نے کہتے سنا۔ "فوجی لگتے تھے، یا پھر سرکار کے آدمی تو دکھائی پڑتے ہی تھے، بڑی بڑی گاڑیوں میں تھے، اُنہوں نے صرف تمہارے ہی نہیں اور بھی یہاں گھروں کی تلاشی لی تھی اور دو مرد وعورت کے بارے میں ہر ایک سے پوچھتے پھر رہے تھے، جس گھر پہ تالا تھا، اُسے توڑ کر گھر کی تلاشی لی گئی، پرنتو چنتامت کر چوری کچھ نہیں کیا ہے اُنہوں نے۔"

میں اس آدمی کی بات پر دھک سے رہ گیا تھا تو گویا میرے دشمن ہم سے پہلے یہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ یقیناً یہ وہی ہوں گے۔ مجھے یہاں بھی اب خطرہ محسوس ہونے لگا، سوشیلا بھی ضرور، یہ سب سن کر پریشان ہو گئی ہو گی۔

"اچھا...... اچھا، ٹھیک ہے۔" گاڑی بان بوڑھے نے کہا تھا، پھر اس نے اترنے سے پہلے، گاڑی میں بیٹھے بیٹھے، اس نوجوان سے کچھ کہا تھا اور وہ جلدی سے اتر کر ایک جانب کو سرپٹ دوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد بوڑھے اور سوشیلا نے مجھے سنبھالتے ہوئے نیچے اُتارا۔ وہاں موجود باقی لوگ بھی جو مجمع سا لگائے کھڑے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں اور تبادلۂ خیال کر رہے تھے، ہمیں عجیب عجیب سی نظروں سے تکتے رہے تھے۔

بہرکیف...... اُس عورت نے جلدی سے آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ کھولا اور مجھے لیے اندر داخل ہو گئے۔

ناپختہ سے صحن کا وہی منظر تھا جیسا کہ ایک دور اُفتادہ دیہاتوں وغیرہ میں ہوتا ہے...... مجھے اندر ایک کوٹھڑی میں لایا گیا، وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر مجھے لٹا دیا گیا۔ عورت نے جلدی سے پانی کا ایک گلاس بھر کر سوشیلا کو تھمایا اور اس نے گلاس میرے کپکپاتے ہونٹوں سے لگا دیا۔

تازہ ٹھنڈے پانی کی برودت میرے حلق کو تر کرتی ہوئی معدے میں اُتری تو مجھے یک گونہ سکون سا ملا۔ کچھ حالت سنبھلی تو تھی مگر طبیعت ویسی ہی تھی۔ میں سارا پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

"ہے بھگوان! کیسا کڑیل جیوٹ جوان ہے، اس بے چارے کو ہوا کیا ہے؟" اس عورت نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ مخاطب سوشیلا ہی تھی، نیم واہ سی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا، جو مجھے زیادہ عمر کی نہیں لگی تھی، اٹھارہ، بیس ہوگی۔ رنگت سانولی مگر پرکشش تھی۔ جسم کسا ہوا تھا اور اس نے سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی جو خاصی پرانی تھی۔ وہ نوجوان شاید اس کا شوہر یا پھر بھائی تھا۔

"اس بے چارے کو زخم آ گیا تھا اور وہی خراب ہو گیا تو اس کی حالت بھی ایسی ہو گئی۔" سوشیلا نے جواب دیا اور آخر میں پوچھا۔ "یہاں ایسا کوئی ڈاکٹر یا حکیم مل تو جائے گا ناں...... جو اس بے چارے کا علاج کر سکے؟"

"وید تو ایک ہی یہاں، جونگی بابا کے نام سے مشہور ہے۔" وہ بولی۔ "مگر اس کی جھونپڑی دور ہے، پاس دوار (قریب) میں ایک ہی ڈاکٹر ہے تو...... مگر وہ ذرا چڑچڑے مزاج کا آدمی ہے۔"

جونگی بابا کے ذکر پر بے اختیار میری اور سوشیلا کی نگاہیں آپس میں ٹکرائی تھیں، پھر سوشیلا نے اس سے پوچھا۔

"کیوں...... کیا لوگ اس سے علاج کروانا پسند نہیں کرتے؟"

"کچھ ایسی بات بھی ہے، مگر وہ ڈاکٹر خود جونگی بابا کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اُس کے خیال میں وہ ایک مجرم ذہن کا وید ہے، جو لوگوں کا علاج کے بہانے خون چوس رہا ہے۔" اس عورت نے جواب دیا۔ "پوروائی کے سارے لوگ اسی پاس علاج کروانے جاتے ہیں، اس ڈاکٹر کے پاس چند ہی مریض آتے ہیں، شاید اسی لیے وہ جونگی بابا کی شہرت سے

جلتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ حویلی والوں کا تو جوگی بابا خاص وید ہے۔''

میں ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا، وہ عورت آگے بھی کچھ بتانے والی تھی کہ اسی دوران راجن نامی وہ نوجوان ایک درمیانی عمر کے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مجھے وہ صورت وشکل سے خاصا معقول لگا تھا۔ رنگ گورا تھا، جسم درمیانہ اور آنکھوں میں نظر کا نفیس فریم کا چشمہ پہن رکھا تھا۔ اس کا بیگ راجن نے ہی اُٹھا رکھا تھا۔ چہرے مہرے سے مجھے وہ سنجیدہ رو ہی دکھائی دیا تھا۔

اس نے پہلے میرا تفصیلی معائنہ کیا، پھر میرے زخم کا جائزہ لیا اور پھر جب اس نے سوشیلا سے کچھ دریافت کرنا چاہا تو سوشیلا نے اس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا، جس پر ڈاکٹر نے اپنے سر کو دھیرے دے تفہیمی جنبش دی اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسے میرے کلینک میں لانا ہوگا...... میں وہیں اس کا بہتر طور پر علاج کرسکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! جیسا آپ مناسب اور مریض کے لیے بہتر سمجھیں۔'' سوشیلا نے فوراً کہا۔ ''تو پھر لے چلیں ابھی مریض کو آپ کے کلینک میں؟''

سوشیلا کو بھی میری طرح اس بات کی تشویش ستانے لگی تھی کہ ہمارے دشمن یہاں بھی ہماری تلاش میں مصروف کار تھے اور کسی بھی وقت ہمارے سر پہ پہنچ سکتے تھے، یہی نہیں، یہاں کے لوگوں میں سے کوئی بھی ہمارے سلسلے میں انعام کے لالچ میں ان سے چغلی کھا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوشیلا نے ڈاکٹر کے مشورے پر فوراً اثبات میں جواب دیا اور یوں مجھے ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر کے پاس اپنی ایک دیسی ساختہ پرانے ماڈل کی فیاٹ گاڑی تھی۔ مجھے اسی میں کلینک پہنچایا گیا، جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

کلینک ایک بڑے سے نیم پختہ گھر کی بیٹھک میں قائم کیا ہوا تھا، جس کا ایک دروازہ باہر اور ایک گھر کے اندر صحن میں کھلتا تھا۔

مجھے اس کلینک نما بیٹھک کی پیشانی پر ایک سالخوردہ سا بورڈ لگا نظر آیا تھا، جس پر ڈاکٹر لیکھ رام لکھا تھا۔

مجھے اسی بیٹھک نما کلینک میں ایک کاؤچ پر لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر وہاں اکیلا نہیں تھا۔ ایک نوعمر لڑکا بھی اس کا ہیلپر تھا، جو بیک وقت اس کا کمپاؤنڈر، نوکر اور چپڑاسی بھی تھا۔ وہ مقامی ہی لگتا تھا اور غریب سا نظر آتا تھا۔

جب ڈاکٹر نے دوبارہ میرے زخم کا ذرا تفصیلی معائنہ کیا تو اس نے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے اور سوشیلا سے بولا۔

''یہ زخم تو ''گن شاٹ وونڈ'' ہے، یہ میڈیکولیگل کیس ہے، آپ کو پہلے اس کی متعلقہ تھانے میں رپورٹ کروانا ہوگی البتہ میں ابتدائی طبی امداد دے دیتا ہوں۔''

اس کی بات پر میں پریشان سا ہو گیا، سوشیلا البتہ ڈاکٹر کی منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! راستے میں ہم پر کچھ رہزنوں نے حملہ کیا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور ہم بالاسور سے کھمبات جا رہے تھے۔ راستے ہماری ان ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی، بڑی مشکلوں سے ان سے جان چھڑا کر بھاگے اور گرتے پڑتے اس بدبخت جوگی بابا کی جھونپڑی میں پناہ کی غرض سے آئے تو اس مردود نے علاج کے بہانے ہمارا یہ حال کر دیا۔''

جوگی بابا کے ذکر پر ڈاکٹر بھی چونکا تھا، پھر بولا۔

''مگر...... یہ پولیس کیس ہے۔ میری شکایت ہوسکتی ہے۔''

''لیکن یہ کسی دشمنی کا بھی کیس نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھگوان کا واسطہ...... پیسوں کی آپ چنتا نہ کریں، وہ میں آپ کو دے دوں گے۔''

''جوگی بابا کا کیا بنا؟''

''اگر تم یہ بات راز میں رکھو تو ہم تم سے جھوٹ نہیں بولیں گے کہ وہ ایک مجرم ذہنیت کا آدمی تھا۔'' اس بار میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''اس مردود سے تو میں خود بھی عاجز آیا ہوا تھا، اس حرام زادے نے حویلی والوں کو بالخصوص مہارانی صاحبہ کو میرے خلاف بھی بھڑکا رکھا تھا۔''

''وہ ڈاکو ہماری تلاش میں وہاں آن پہنچے تھے۔'' میں نے کہانی گھڑی۔ ''کیونکہ اپنی حفاظت کے لیے میرے پاس جو پستول تھا، اس سے میں نے اپنے اور اپنی پتنی کے بچاؤ کے ان پر جوابی حملہ کیا تھا اور ان کے دو آدمی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ اسی کا بدلہ لینے ہماری تلاش میں وہاں تک بھی آن پہنچے تھے ہم تو اس کے ہتھے نہیں چڑھے البتہ جوگی بابا کی جھونپڑی کو آگ لگا کر انہوں نے اس کی چتا بنا ڈالی۔ ہم دونوں مشکلوں سے چھپتے چھپاتے بھاگ آئے۔''

یہ ضروری نہ تھا کہ وہ .... ڈاکٹر رام میری گھڑی ہوئی جھوٹی کہانی پر بھروسا کرتا یا نہ کرتا، لیکن اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا حریف جہنم واصل ہو چکا تھا، اس بات نے اُسے ہم سے خوش اور مطمئن کر دیا۔ بس پھر کیا تھا، اس نے

بڑی تندہی سے میرا علاج شروع کر دیا۔ اس نے مجھے پہلے ایسی دوا پلائی جس سے مجھے تھوڑی دیر بعد ہی جلاب آنے شروع ہو گئے۔ جس سے میں مزید کمزوری محسوس کرنے لگا، لیکن اس کے بعد اس نے مجھے ایک ڈیکسٹروز واٹر (سوڈیم اور گلوکوز) کی ڈرپ لگا دی۔ دوسرے ہاتھ کی نس میں بھی ڈرپ لگا دی۔ میرے شانے کا زخم اس نے اندر گہرائی تک صاف کیا تھا اور دو گولیاں نکالی تھیں۔ پھر اس کے بعد اس کے اندر انڈے کی زردی جیسے رنگ کا مرہم بھر کے اُوپر پٹی کر دی۔ کچھ انجکشن بھی لگائے، جن میں درد کش کے علاوہ سریع الاثر اینٹی بائیوٹکس اور زخم جلد ٹھیک ہونے کے بھی انجکشن شامل تھے۔ پینے کو دوا بھی دی۔ پھر شاید میں پانچ چھ گھنٹوں تک نیند یا بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو خود کو کلینک والی جگہ کے بجائے ایک کمرے میں پایا۔ وہاں میں اکیلا تھا، ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میں اب خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ جسم میں پہلے جیسی بشاشت دوڑنے لگی تھی۔ مجھے پیاس اور بھوک کا احساس ہوا۔ لیکن میں حیران تھا کہ میری جگہ کیسے بدل گئی تھی؟ میں تو ڈاکٹر لیکھ رام کے گھر کی بیٹھک والی کلینک میں ایک کاؤچ پر تھا، یہاں کیسے آ گیا تھا اور کون مجھے یہاں لایا تھا؟ آیا یہ وہی جگہ تھی یا کوئی اور گھر تھا؟ یہ سوچ کر میں کچھ پریشان بھی ہوا۔ میں چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلا، میں نے قدرے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سوشیلا تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی ایک ٹرے تھی، جس پر کپڑا سا ڈھکا ہوا تھا، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، باہر شاید سہ پہر ہو رہی تھی۔ کیونکہ کمرے کے کھلے دروازے کے پار سے نظر آنے والی دھوپ سنہری دکھائی دے رہی تھی اور ادھر سے ہی مجھے اس بیٹھک کا وہ دروازہ بھی نظر آ رہا تھا، جس میں ڈاکٹر لیکھ رام نے اپنا کلینک کھول رکھا تھا۔

''اب کافی بہتر نظر آ رہے ہو؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''پہلے سے بہت زیادہ بہتر، لیکن میں یہاں کیسے آ گیا؟ میرا مطلب ہے اس کمرے میں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہاں کچھ مریضوں کا رش ہونے لگا تھا، وہ تمہیں اور مجھے کچھ عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہی ڈاکٹر...... سے کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی اندرونی کمرے میں لیٹا دے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پھر میں نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ ہم تمہیں اندر لے آئے تھے اور یہاں لا کر آرام سے لٹا دیا تھا۔'' کہتے ہوئے اس نے کھانے کی ٹرے میرے سامنے چارپائی پر رکھ دی اور آگے بولی۔

''تمہیں یقیناً بھوک تو لگی ہوگی، بھوجن کر لو تو پھر یہاں سے نکلتے ہیں، ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''اس کا خدشہ تو مجھے بھی ہے۔'' میں نے ایک نظر کھانے کی ٹرے پر ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔ ''ویسے کیا تم نے کوئی نیا خطرہ محسوس کیا ہے یہاں؟''

''ایک خطرہ تو حویلی والوں کی طرف سے ہونے لگا ہے۔'' وہ جواباً بولی۔ ''دوسرا خطرہ دشمنوں کا ہے۔''

''حویلی والوں سے کس قسم کا خطرہ ہے؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ بھی اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ اس نے شاید غسل وغیرہ کر کے نئے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔ یہ شاید اس بھلے مانس ڈاکٹر کی ''مہربانی'' کا نتیجہ تھا۔

''ڈاکٹر لیکھ رام نے ہی اس خطرے کا اظہار مجھ سے کیا تھا۔'' وہ میرے قریب چارپائی پر ٹک کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے سلک کی گلابی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پیروں میں نئے سینڈل بھی تھے۔ اس لباس میں وہ خاصی پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

''تم کھانا تو شروع کرو......'' اس نے گویا مجھے ٹوکا۔

میں نے ٹرے سے رومال نما کپڑا ہٹا دیا۔ کھانے میں ترکاری، آلو کی بھجیا اور دہی تھا، تین پھلکے (چپاتی نما انڈین روٹیاں) تھیں۔

''ڈاکٹر لیکھ رام نے تو جوگی بابا اور مہارانی کے درمیان خفیہ روابط کے بڑے سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں، جنہیں سن کر تو میرا دل ہی دہل کر رہ گیا ہے، یہی نہیں، جوگی بابا اس ڈاکٹر کی بیوی کا قاتل بھی ہے۔'' میں کھانے میں مصروف ہو گیا تھا اور سوشیلا بولے جا رہی تھی۔ نوالہ توڑتے وقت میرا ہاتھ رک گیا تھا...... ٹھیک اسی وقت کوئی دروازے پر حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پروان چڑھنے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ایک پرانی کہانی

سرور اکرام

کہاوتیں ہوں یا داستانیں... وقت کے بدلنے سے کبھی نہیں بدلتیں، وہ ہر زمانے میں وقت و حالات کے تقاضوں پر پورا اترتی ہیں... ایسی ہی ایک پرانی کہانی... نئے آہنگ اور جدیدیت کے پیراہن میں...

کچھوا اور خرگوش کی پرانی دوڑ ہار جیت کی جدید للکار

ایسوپ میرا پسندیدہ مصنف ہے۔

قدیم یونان کے اس مرد درویش نے پوری دنیا کے بچوں کے لیے اپنی حکایات کے جو خزانے دیے ہیں، وہ شاید قیامت تک کے لیے ہیں۔

وہ ایک غلام تھا۔ یہ ارسطو سے بھی پہلے کا زمانہ ہے۔

اس نے اپنے مالک سے اس بات کی اجازت لے رکھی تھی کہ وہ روز شام کو ایتھنز کے چوراہے پر کھڑے ہو کر کہانیاں سنایا کرے گا۔

سو اس نے درجنوں کہانیاں سنائیں اور اس کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ ہر کہانی میں اخلاق کے ایسے ایسے پہلو بیان کردیے ہیں کہ اس قدیم انسان کے وژن پر حیرت ہوتی ہے۔

کمال کی بات یہ ہے کہ اس کی ہر کہانی دنیا کے ہر بچے نے سن رکھی ہے اور اس کے بھی باپ اور اس کے بھی باپ نے سنی ہوگی۔

مثال کے طور پر چند کہانیاں ''بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا، پیاسا کوا، کچھوا اور خرگوش، انگور کھٹے ہیں، شیر آیا، شیر آیا۔'' وغیرہ۔

کیا خیال ہے، کیا آپ نے یہ کہانیاں نہیں سنیں؟ یقیناً سنی ہوں گی۔

آئیں اس کی ایک کہانی کچھوا اور خرگوش کو نئے انداز سے دیکھتے ہیں۔ آج کے زمانے میں یہ دونوں کردار کس قسم کی کہانی تخلیق کرسکتے تھے۔ پہلے تو اصل کہانی سن لیں۔

کسی زمانے میں ایک جنگل میں کچھوا اور خرگوش رہتے تھے۔ خرگوش کو اپنی تیز رفتاری پر ناز تھا۔ وہ اکثر کچھوے کا مذاق اڑایا کرتا۔ ''یار، آخر تم کس مرض کی دوا ہو تم سے چلا تو جاتا نہیں ہے۔ رینگ رینگ کر چلتے ہو۔ اگر کسی جگہ کام سے بھیجا جائے تو روتے روتے چھ مہینے میں پہنچتے ہو۔''

کچھوا بہت ہی مدبرانہ خاموشی اور صبر کے ساتھ خرگوش کی بکواس سنتا رہا۔

خرگوش نے پھر کہا۔ ''میری تیزی اور برق رفتاری تو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ انسان تک میری مثالیں دیا کرتے ہیں۔''

اب کچھوے سے نہ رہا گیا۔ وہ بول پڑا۔ ''اے شیخی خور قسم کے جانور۔ اگر تجھ میں تیز رفتاری کی خوبی ہے تو مجھ میں ایسی خوبیاں ہیں جو تیرے پاس سے نہیں گزریں۔''

''اچھا، وہ کیا؟'' خرگوش نے ہنس کر پوچھا۔

''صبر اور اطمینان کی، سکون اور آرام کی، میں جانتا ہوں کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوا کرتا ہے۔ میں ایسے کام نہیں کرتا جن سے شیطان خوش ہو۔ اور جہاں تک تیز رفتاری کا سوال ہے تو کبھی میں تجھ سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوجاتا ہوں۔''

''اچھا، وہ کب؟''

''جب بات عزت اور انا کی ہو۔'' کچھوے نے کہا۔

بہرحال ان دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ قریب ہی ایک لومڑی کھڑی بھی جو ان دونوں کی بحث سنتے سنتے بیزار ہوچکی تھی۔ اس نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو، تم دونوں فیصلہ کیوں نہیں کرلیتے کہ دونوں میں سے کون زیادہ تیز رفتار ہے۔''

''لیکن یہ فیصلہ کیسے ہوگا؟'' خرگوش نے پوچھا۔

''بہت آسان ہے، دونوں دوڑ کا مقابلہ کرلو۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوجائے گا۔''

دونوں نے اس بات کو پسند کرلیا۔

پورے جنگل میں اس دوڑ کی خبر پھیل گئی۔ جو سنتا کچھوے پر ہنسنے لگتا۔ ''ارے بھائی کیا سوجھی تھی بڑے میاں کو، بے چارے سے چلا تو جاتا نہیں ہے اور خرگوش کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کررہے ہیں۔''

''بس اپنی رہی سہی عزت ختم کروانے کے موڈ میں ہوں گے۔''

بہرحال دن اور وقت طے ہوگیا۔ دوڑ کہاں سے شروع ہوگی اور کہاں ختم ہوگی، یہ بھی طے ہوگیا۔ وقت مقررہ پر جنگل کے سارے جانور اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے۔

شیر نے دوڑ شروع ہونے کا اعلان کیا۔ خرگوش نے ایک جست لگائی اور دوڑتا چلا گیا جبکہ بے چارہ کچھوا رینگتا رہا، رینگتا رہا۔

بہت آگے جانے کے بعد خرگوش نے مڑ کر دیکھا۔ کچھوے کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ اسے سستی آگئی۔ وہ گھاس کے ایک ٹکڑے پر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

کچھوا اس کے برابر سے گزرا۔ اس نے خرگوش کو آرام کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا اور آخرکار منزل پر پہنچ گیا جبکہ خرگوش اسی طرح سویا رہا۔

اس کہانی کا مورال یہ ٹھہرا کہ زندگی کی دوڑ میں ایک لمحے کی غفلت بہت پیچھے لے جاتی ہے۔ چلتے رہو کبھی نہ کبھی منزل پا ہی لوگے۔

☆☆☆

تو یہ کہانی ایسوپ نے لکھی تھی۔

اب اس کہانی کا ماڈرن ورژن دیکھیں۔ یعنی آج کے دور میں یہ کہانی کس طرح ہوسکتی ہے۔

ایک جنگل ہے۔

یہ جنگل ویسے تو ہمارا آج کا پو[illegible]رہ ہے۔ لیکن فی الحال ایک بڑی فرم کو لے لیں۔ اس کا باس زمان شیر کی طرح ہے۔ اس کا منیجر حامد لومڑی کی طرح چالاک ہے۔ باس کی سیکریٹری عاصمہ ہرنی کی طرح خوب صورت ہے۔

اس دفتر میں ایک تیز طرار نوجوان بھی ہے، کسی خرگوش کی طرح تیز رفتار اور پھرتیلا۔ اس کا نام منور ہے اور

ایک کچھوا بھی ہے۔ سلمان نام ہے اس کا۔ ایک سیدھا سادہ نوجوان۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔

اسے یہ دیکھ کر کوفت ہوا کرتی کہ دفتر کا ہر شخص باس کی بے جا خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں آنے کی کوشش کرتا رہتا۔ سب کا ایک ہی نظریہ تھا کہ باس از آل ویز رائٹ۔ یعنی باس جو کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔ اس سے غلطی نہیں ہو سکتی۔

جبکہ سلمان اس نظریے کے خلاف تھا۔ وہ کہا کرتا۔ ''اگر باس کی نگاہوں میں آنا ہے تو اپنی ورتھ ثابت کرو۔ فرم کے وفادار رہو، باس کے نہیں۔ اپنے کام سے اپنی وفاداری اور اپنی قابلیت ثابت کرو، اپنی چمچہ گیری سے نہیں۔''

منور اس کا مذاق اڑایا کرتا۔ ''لگتا ہے تم میں کسی بوڑھے کی روح حلول کر گئی ہے۔ ارے بھائی یہ زمانہ اور ہے، آج ایسے نظریے کام نہیں آتے۔ آج کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ آج تو باس کو مکھن لگاؤ اور ترقی کرتے جاؤ، کام وام کو کون دیکھتا ہے۔''

لیکن سلمان اپنے نظریے کو ترک کرنے پر کبھی راضی نہیں ہوا۔ اسے منور کو دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اچھا خاصا ذہین نوجوان اپنی صلاحیتوں کو باس کی چمچہ گیری میں صرف کر رہا ہے۔

اس فرم کا یہ دستور تھا کہ ہر چھ مہینے کے بعد ایک تقریب ہوتی اور اس تقریب میں باس بہتر کارکردگی دکھانے والوں کو فرم کی طرف سے انعام بھی دیا کرتا۔

اس بار بھی یہ تقریب منعقد ہوئی۔

اس بار سلمان کو یہ امید تھی کہ باس اس کا نام ضرور لے گا۔ کیونکہ پچھلے مہینوں اس کی کارکردگی بہت شاندار رہی تھی۔ اس نے کچھ ایسے کام کیے تھے کہ فرم کو اچھا خاصا فائدہ ہو گیا تھا۔

فرم کے مرکزی ہال میں سب جمع ہو گئے۔ ایک طرف سلیقے سے میزیں لگا کر ان پر کھانے پینے کی بہت سی چیزیں رکھ دی گئیں۔ درمیان میں ایک ڈائس کا انتظام کیا گیا۔

مقررہ وقت پر سب اپنی اپنی امیدوں کے ساتھ جمع ہو گئے۔ باس بھی اپنے وقت پر آیا۔ اس نے مختصر سی گفتگو کے بعد اعلان کیا۔ ''پچھلے چھ مہینوں میں سب سے بہتر کارکردگی کا ایوارڈ منور کو دیا جا رہا ہے اور اس خوشی میں فرم کی طرف سے ایک بائیک ان کو تحفے میں دی جا رہی ہے۔''

سب منور کے گرد جمع ہو گئے۔ اسے مبارک بادیں دیے رہے تھے جبکہ سلمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا دل ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

منور پورے ہال میں خوشی سے چکراتا پھر رہا تھا۔ وہ سلمان کے پاس آ گیا۔ ''ہاں بھئی کیا حال ہیں تمہارے؟ تم نے مجھے مبارک باد نہیں دی۔''

''کس بات کی مبارک باد۔ خوشامد کا چیمپئن بننے کی؟'' سلمان جل کر بولا۔

منور ہنستا ہوا دوسروں کی طرف چلا گیا تھا۔

سلمان اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ کیا ملا تھا اس کو، منزل اسے ملی جو شریکِ سفر نہ تھا۔ اس نے اپنی فرم سے وفاداری کی تھی۔ پوری ایمان داری سے کام کیا تھا لیکن باس نے اس کے بجائے منور کو ترجیح دی تھی۔ جس کا کام صرف خوشامد تھا۔

اس دن کے بعد سے منور کھل کر سلمان کا مذاق اڑانے لگا تھا۔ ''کچھوے صاحب، سوری میرا مطلب ہے سلمان صاحب، زندگی میں ترقی کے لیے تیز رفتاری بہت ضروری ہے۔ رینگ رینگ کر چلنے والے کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''یاد رکھو، میں کسی دن تمہارا غرور خاک میں ملا دوں گا۔'' سلمان جل کر کہتا۔

''اوہو، تو چلیں، خود مجھے بھی اس دن کا انتظار رہے گا۔''

کچھ دنوں کے بعد باس نے پھر ان سبھوں کو ہال میں جمع کر لیا۔ اس بار وہ کوئی بڑی خبر سنانے والا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''اس فرم کے لیے آج کا دن بہت مبارک ہے۔ آج جاپان سے دو رکنی وفد ہماری فرم سے ایگریمنٹ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔''

سب نے تالیاں بجا دیں۔

''مسٹر اوشو اور مسٹر کی ہارا بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ان کو پورے پروٹوکول کے ساتھ پہلے ہوٹل لے جانا ہے۔ ہوٹل کی بکنگ ہو چکی ہے پھر کل صبح ان کو ہوٹل سے یہاں لانا ہے۔''

سب لوگ باس کی طرف متوجہ تھے۔ منور نے اس دن نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔

باس نے پھر کہا۔ ''ان دونوں کے پروٹوکول کی ذمے داری منور کو دی جا رہی ہے۔ منور ان دونوں کو ائرپورٹ سے ریسیو کر کے ہوٹل پہنچائیں گے اور کل صبح ان دونوں کو یہاں لے کر آئیں گے۔''

سب نے تالیاں بجادیں۔
اس وقت سلمان سے نہیں رہا گیا۔ اس نے کہا۔
''باس! آپ اتنی بڑی ذمے داری منور کو نہ دیں۔''
''وہ کیوں؟''
''وہ اس لیے کہ یہ غیر ملکیوں کا معاملہ ہے۔ وہ لوگ وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ منور ابھی ناتجربہ کار ہے۔''
''تو آپ کا خیال ہے کہ یہ کام آپ کو دے دیا جائے؟'' منور نے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا۔
سب ہنس پڑے۔
باس نے کہا۔ ''سلمان صاحب، مجھے احساس ہے کہ آپ نے یہ بات فرم کی بھلائی کے لیے کی ہے لیکن منور بہت ایکٹو ہے۔ تیز رفتار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اپنا کام وقت پر کرے گا۔'' پھر اس نے منور کی طرف دیکھا۔ ''منور ان کی فلائٹ چار بجے لینڈ کرے گی۔ ساڑھے چار تک وہ دونوں باہر آجائیں گے۔ تم پلے کارڈ لے کر کھڑے رہنا۔ اپنے نام دیکھ کر وہ دونوں خود ہی تمہارے پاس آجائیں گے۔ تم ان کو سیدھے ہوٹل فلورا لے جانا، جہاں ان کے کمرے بک ہیں۔''
باس اس کے بعد سمجھاتا رہا کہ اسٹاف کو ان مہمانوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے۔ ان کے سامنے ڈسپلن برقرار رکھنا ہے تاکہ مہمان اچھا امپریشن لے کر واپس جائیں۔
سلمان باس کی تقریر اور باتوں کے درمیان ہی اس ہال سے باہر آگیا۔ پھر وہ دفتر سے ہی باہر چلا گیا۔ وہ اپنے ایک دوست کی طرف جا رہا تھا جس کا دفتر قریب ہی میں تھا۔
اس کے ذہن میں خرگوش کے خلاف ایک سازش تھی۔
اس سازش کو عملی جامہ پہنانے میں اس کا وہ دوست اس کی بہت مدد کرسکتا تھا۔ وہ اسی قسم کا سازشی انسان تھا۔
چار بجے والی فلائٹ اپنے وقت پر آگئی۔
دونوں جاپانی باہر نکلے۔ انہیں اپنے ناموں کے پلے کارڈ دکھائی دے گئے۔ وہ کارڈ اٹھانے والے کے پاس پہنچ گئے۔ ایک دوسرے سے ہیلو ہائے ہوئی۔ پھر تینوں ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔
دوسری صبح جاپانی مقررہ وقت پر فرم پہنچ گئے۔ جہاں باس نے ان کا استقبال کیا۔ منور ان دونوں کے ساتھ ہی آیا تھا جبکہ سلمان اپنے دوست سے بھڑا ہوا تھا۔
دوست اس سے معذرت کررہا تھا۔ ''یار! میں کیا کرتا، میں نے تو اپنے بندے تیار کرلیے تھے۔ اسکیم یہ تھی کہ منور کو راستے میں گھیر کر اغوا کرلیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ منور تم سے زیادہ چالاک نکلا۔ وہ وقت سے پہلے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوا اور وقت سے پہلے ائرپورٹ پہنچ گیا جبکہ ہمارے بندے تمہارے دفتر سے باہر ہی اس کا انتظار کرتے رہ گئے اور ہماری اسکیم فیل ہوگئی۔''
''ہاں یار۔'' کچھوے نے ایک گہری سانس لی۔
''وہ کم بخت زیادہ ہی تیز رفتار نکلا۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ خیر، اب کیا ہوسکتا ہے۔''
کچھوے کی سازش تو بہت زبردست تھی یعنی منور کو اتنی دیر تک روکے رکھنا جب تک دونوں مہمان آکر واپس نہ چلے جائیں۔ پھر وہ خود ائرپورٹ پہنچ کر ان دونوں کو ریسیو کرلیتا۔ باس سے کچھ بھی کہا جاسکتا تھا کہ اس فلائٹ سے اس کا ایک رشتے دار بھی آنے والا تھا۔
وہ اس کو ریسیو کرنے ائرپورٹ گیا تھا۔ وہاں اس نے ان دونوں جاپانیوں کو دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی مہمان ہیں۔ کیونکہ وہ بے چارے چاروں طرف کسی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔
اس نے اپنے رشتے داروں کو تو ائرپورٹ ہی سے خدا حافظ کہا اور ان دونوں جاپانیوں کو اپنی ذمے داری پر ہوٹل پہنچادیا۔ کیونکہ وہ فرم کے مہمان تھے اور فرم کی بھلائی خود اس کی اپنی بھلائی تھی پھر جب سب کچھ ٹھیک ہوجاتا تو منور کو آزاد کردیا جاتا۔ اس دوران وہ اپنے باس کی نگاہوں میں آچکا ہوتا۔
یہ ایک اچھی پلاننگ تھی لیکن خرگوش زیادہ تیز رفتار نکلا اور وہ وقت سے پہلے ائرپورٹ پہنچ گیا جبکہ اس کے دوست کے بندے خرگوش کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔
جاپانیوں کے واپس چلے جانے کے بعد منور کی تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ کردیا گیا تھا جبکہ بے چارے کچھوے کو اپنی جیب سے دس ہزار روپے ان دونوں بدمعاشوں کو دینے پڑ گئے تھے۔ کیونکہ وہ تو اپنا کام تقریباً کرچکے تھے۔ اب کچھوے کی قسمت ہی خراب نکلی تو اس میں ان کا کیا قصور؟
ایسوپ کی اصل کہانی میں جیت کچھوے کی ہوئی تھی۔ لیکن اس کہانی میں جیت خرگوش کی ہوئی اور اس کہانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر سازش کامیاب ہی ہو۔
سازشیں ناکام بھی ہوجاتی ہیں اور سازش کرنے والے کے گلے پڑ جاتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ کچھوے ہیں تو اپنی رفتار کو تیز کرنے کی کوشش کریں، سازش نہ کریں۔

گمنام خط

باہر نعیم

مشرق کی فضائیں ہوں یا مغرب کے سرد خیز روز و شب... کچھ چیزیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہیں... چوری کی وارداتیں ہوں یا پڑوسیوں کی روزمرہ کی نوک جھوک... مالیاتی امور کی ذمے دار خاتون کو پیش آنے والے حادثے کی روداد۔اس کی نظر میں تمام پڑوسی مشکوک ہو چکے تھے...

چوری کی واردات سے شروع ہونے والی کہانی کے پرتجسس پیچ وخم

سانڈرہ کو پورا یقین تھا کہ وہ دروازہ مقفل کر کے گئی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ تالا لگائے بغیر اپارٹمنٹ سے باہر گئی ہو۔ یہ سوچنا بھی حماقت تھی کہ وہ دروازہ مقفل کرنا بھول گئی ہو لیکن جب وہ واپس آئی تو دیکھا کہ اس کے اپارٹمنٹ کا دروازہ مقفل نہیں تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں کندھے اچکائے اور دروازہ بند کر کے کچن میں چلی گئی۔ گروسری کا سامان میز پر، سوپ کے ڈبے الماری میں اور دہی ریفریجریٹر میں رکھا۔ اس نے ایک بار پھر گردوپیش

کا جائزہ لیا اور شکر ادا کرنے لگی کہ وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں کوئی اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہوا۔ وہ راہداری میں چلتی ہوئی باتھ روم، گیسٹ روم، اپنے دفتر کے پاس سے گزری اور عقبی بیڈ روم میں داخل ہوگئی۔ کھڑکی پر پڑے سلک کے پردوں سے سورج کی روشنی چھن کر اندر آرہی تھی۔ ہوا چلنے سے پردہ ہٹا تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی جبکہ اسے یقین تھا کہ اس نے کھڑکی نہیں کھولی تھی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اسے وہاں کی ترتیب بگڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے جوتوں کا ایک تھیلا بستر پر پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک خالی بالٹی رکھی ہوئی تھی جس میں وہ میلے کپڑے رکھا کرتی تھی لیکن اس کی جگہ یہ نہیں بلکہ بالکونی تھی۔

اس کے علاوہ بھی اسے مزید بے ترتیبی نظر آئی۔ الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور کپڑے تمام کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک آرائشی گملا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی مٹی قالین پر بکھر گئی تھی۔ اب وہ یہ سوچ کر حیران ہورہی تھی کہ اسے یہ سمجھنے میں اتنی دیر کیوں لگی کہ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمارے یہاں ڈاکا پڑا ہے'' اس نے زیرلب کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اب اس کا رخ اپنے دفتر کی جانب تھا۔ وہاں بھی اسے یہی منظر دیکھنے کو ملا۔ اس کا کمپیوٹر غائب تھا اور اس کی میز کی درازیں زبردستی کھولی گئی تھیں۔ چیک بک اور فائلیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے پوری دراز باہر نکالی۔ اور یہ دیکھ کر مطمئن ہوگئی کہ اس کے کریڈٹ کارڈ موجود تھے لیکن پاسپورٹ کہاں گئے۔ اس نے میز پر پڑے ہوئے کاغذات اٹھا کر دیکھا تو پاسپورٹ پرانے بینک اسٹیٹمنٹ کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کچن تک گئی اور پرس سے سیل فون نکال کر چارلی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پہلی کوشش میں اسے ناکامی ہوئی لیکن دوسری بار رابطہ ہوگیا۔ اس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہائے ڈولی، میں ابھی تمہیں فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ کیا ہورہا ہے؟''

''میرا خیال ہے......'' اس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' چارلی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''خیریت تو ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمارے گھر ڈاکا پڑا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس شام سانڈرہ کچن میں بیٹھی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھ رہی تھی۔ پولیس کے جانے کے بعد وہ کورٹ اسٹریٹ پر واقع کونے کی دکان سے سگریٹ کا پیکٹ خرید کر لائی تھی۔ اس نے کئی سالوں سے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب بھی اس کا یہی ارادہ تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی اس پیکٹ کے باقی سگریٹ پھینک دے گی لیکن اس وقت اسے سگریٹ کی شدید طلب ہورہی تھی تاکہ وہ اس کے دھوئیں میں اپنا غم غلط کرسکے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور نکوٹین کا زہر اس کے اندر اترنے لگا۔

پولیس اطلاع ملتے ہی جائے وقوعہ پر پہنچ گئی تھی کیونکہ پولیس اسٹیشن صرف دو بلاک کے فاصلے پر تھا۔ پہلے دو باوردی پولیس والے آئے پھر سادہ لباس میں دو سراغ رسانوں اور ایک فنگر پرنٹ ایکسپرٹ نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پولیس کے آجانے سے سانڈرہ کو خاصی ڈھارس ملی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آنسو خشک کیے اور بار باران کے ایک جیسے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔

''میں صرف آدھے گھنٹے کے لیے باہر گئی تھی۔ مجھے گروسری کا سامان لینا تھا۔ واپس آئی تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں دروازہ مقفل کر کے گئی تھی۔ میرا کمپیوٹر، کیمرا، کیمرا بیگ اور میرے والد کا تمغا غائب تھا۔''

''کیسا تمغا؟'' ان میں سے کسی ایک نے پوچھا۔

''میرے والد ایک ہیرو تھے۔ انہوں نے کوریا کی جنگ میں اپنی کمپنی کو بچایا جس کے صلے میں انہیں یہ خصوصی تمغا دیا گیا تھا۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ وہ کس قسم کا تمغا تھا؟''

''وہ خالص سونے کا تمغا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔'' ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں وہ روکنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ ''میرے پاس ان کی یہی ایک نشانی تھی۔ وہ بھی کوئی لے گیا۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دونوں سراغ رساں اس کے چپ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ انہوں نے اسے یقین دلایا کہ مجرم کو تلاش کرنے میں ان سے جو ہوسکا وہ ضرور کریں گے گوکہ اس کے پکڑے جانے کا امکان کم ہے لیکن وہ اس سلسلے میں پوری کوشش کریں گے۔ وہ ان پر بھروسا کرسکتی ہے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ اب وہ اپارٹمنٹ میں اکیلی تھی۔ جانے پہچانے کمرے اسے اجنبی اور منحوس لگ رہے تھے۔ اس نے بڑی شدت سے چارلی

کی کمی محسوس کی لیکن اس کی واپسی اگلے روز ہی ممکن تھی۔

کیا وہ کسی ہوٹل میں چلی جائے یا اپنی کسی دوست کے یہاں قیام کرے۔ اگر اس کی غیر موجودگی میں چور دوبارہ آگئے تو کیا ہوگا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کی جانب ہوئی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں اور منہ کھل گیا تھا۔ پھر کسی نے بیرونی دروازے پر لگی ہوئی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس نے اسے فرش سے اٹھایا اور ایش ٹرے میں ڈال کر مسل دیا۔ اپنی پتلون پر گرنے والی راکھ صاف کی اور ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں ایک چھوٹے قد کی فربہ اندام عورت کھڑی ..... مسکرا رہی تھی۔ اس کے بال سرخ تھے اور اس نے سبز رنگ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

''ہائے، مجھے ایرلین کہتے ہیں۔'' وہ عورت گرمجوشی سے بولی۔ ''ایرلین مرفی۔ میں تمہاری پڑوسن ہوں۔ نیچے رہتی ہوں۔''

ساندرہ تھوڑی سی شرمندہ ہوگئی کہ وہ پہلی نظر میں اس عورت کو نہ پہچان سکی۔ وہ بوکھلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، ہاں میں بھی کتنی پاگل ہوں، ہائے!''

''میں نے سنا ہے کہ تمہارے گھر چوری ہوگئی ہے، بہت افسوس ہوا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' ساندرہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے ڈوٹی نے بتایا تھا اور کون ہوسکتا ہے۔ وہ نیچے سیڑھیوں پر بیٹھی ہر آنے جانے والے کو یہ تفصیل بتا رہی ہے۔''

ڈوٹی پہلی منزل پر رہنے والی اطالوی عورت تھی۔ اسے اس عمارت میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا۔ اگر اسے چلتا پھرتا اخبار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ساندرہ کو یقین ہوگیا کہ اب تک یہ خبر پورے بروکلین کو معلوم ہوگئی ہوگی۔

ایرلین کے ہاتھ میں مشروب کی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں دو گلاس تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے سوچا کہ تم جس کیفیت سے گزر رہی ہو، اس میں تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ لیکن میں.....'' ساندرہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اگر تم خیال نہ کرو تو میں اندر آجاؤں۔''

ایک لمحے کے لیے ساندرہ نے سوچا کہ انکار کردے لیکن اس وقت اسے خود بھی کسی ایسے فرد کی ضرورت محسوس ہورہی تھی جو اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے اور اس کا غم ہلکا کرسکے۔ اس نے للچائی ہوئی نظروں سے مشروب کو دیکھا اور دروازہ پورا کھول دیا۔ ایرلین اس کے پاس سے گزرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ اس نے بوتل اور گلاس میز پر رکھ دیے۔

اس نے ایک گلاس میں مشروب انڈیلا اور ساندرہ کو دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ ووڈکا مارٹینی ہے۔ زیادہ تر عورتیں جن پسند کرتی ہیں لیکن مجھے ووڈکا میں ہی مزہ آتا ہے۔'' پھر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور بولی۔ ''مجھے امید ہے کہ پولیس ان لوگوں کو پکڑ لے گی جنہوں نے تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' ساندرہ بولی۔'' اس کا مزہ بہت اچھا ہے۔''

''اسی لیے میں اسے پسند کرتی ہوں۔'' ایرلین نے کہا۔

ساندرہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہ ہم لیونگ روم میں مل کر بیٹھیں۔ وہاں آرام سے باتیں کرسکیں گے۔''

''کیوں نہیں۔'' وہ بوتل اٹھاتے ہوئے بولی۔ ساندرہ نے بھی سگریٹ اور ایش ٹرے اٹھائی اور ایرلین کو لے کر لیونگ روم میں چلی گئی۔ ساندرہ کو سبزے سے عشق تھا۔ لیونگ روم میں جگہ جگہ گملے رکھے ہوئے تھے۔ جس سے کمرا پرسکون اور ہرا بھرا نظر آرہا تھا۔ ساندرہ کاؤچ پر بیٹھ گئی جبکہ ایرلین نے اپنے لیے کرسی کا انتخاب کیا۔ اس نے ووڈکا کی بوتل کافی کی میز پر رکھ دی۔

ساندرہ نے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور بولی۔ ''اگر میں ایک سگریٹ سلگالوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''بالکل نہیں، بلکہ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''میں نے کئی سالوں سے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن آج.....'' وہ سر کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''تم سمجھ سکتی ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔''

''میں بھی کبھی کبھی پیتی ہوں۔'' ایرلین نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اپنے شاگردوں کو بھی یہی کہتی ہوں کہ سگریٹ نوشی بہت بُری عادت ہے لیکن بعض اوقات.....'' وہ دھوئیں کا مرغولہ فضا میں چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''اس کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔''

"تم ٹیچر ہو؟" ساندرہ نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں تقریر اور زبان دانی سکھاتی ہوں۔ خاص طور پر مکالمے بولتے وقت کس طرح آواز کے اتار چڑھاؤ کا خیال رکھا جاتا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم کہاں پڑھاتی ہو؟"

"مڈ ٹاؤن میں ایک ڈراما اسکول ہے۔ تم نے اس کے بارے میں سنا ہوگا۔ میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ ڈراموں کی ہدایات بھی دیتی ہوں۔"

"تمہیں وہاں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟"

ایرلین نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ "کئی سال ہو گئے۔ اگر دوسری ملازمت مل جائے تو اسے ایک منٹ میں چھوڑ دوں۔"

"کیوں؟" ساندرہ چونکتے ہوئے بولی۔

"اس کا جواب ایک لفظ میں دوں گی۔ رونی۔" ایرلین نے ڈرامائی انداز میں جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "میرا باس۔"

"کیا تمہاری اس سے نہیں بنتی؟"

ایرلین نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ "وہ بہت پیچیدہ انسان ہے۔ کبھی ہم دوست ہوا کرتے تھے لیکن وہ بات پرانی ہوگئی۔ اب وہ میرا دشمن بن چکا ہے۔ تم میری بات یاد رکھنا۔ وہ دشمن بہت خطرناک ہوتا ہے جو کبھی دوست رہ چکا ہو۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے ملازمت سے فارغ کرنا چاہتا ہے۔"

ایرلین نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ "تھوڑی سی اور لوگی۔"

ساندرہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اس کے لیے گلاس بناتے ہوئے بولی۔ "چھوڑو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔ تم کیا کرتی ہو؟"

"کچھ خاص نہیں۔" ساندرہ نے کہا۔ "میں مالیاتی منصوبہ ساز ہوں۔ میرے شوہر کا چھوٹا سا کاروبار ہے۔ ان دنوں بھی وہ اسی سلسلے میں البانی گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی کل سے پہلے ممکن نہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "کاش وہ یہاں ہوتا تو میرے لیے اس واقعے کو برداشت کرنا زیادہ آسان ہوتا۔"

"کیا پولیس نے کوئی اندازہ لگایا کہ یہ کام کس نے کیا ہوگا؟"

"نہیں، لیکن وہ اس کی وجہ جانتے ہیں۔ منشیات کے عادی لوگ ایسی وارداتیں کرتے ہیں اور صرف ایسی چیزیں چراتے ہیں جنہیں آسانی سے فروخت کر کے منشیات خریدنے کے لیے رقم حاصل کر سکیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "وہ دس ڈالر بھی لے گئے جو میں نے لانڈری کے لیے رکھے ہوئے تھے۔"

"انہوں نے تمہارے گھر کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا پولیس سمجھتی ہے کہ تمہاری نگرانی ہو رہی تھی۔"

"وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں یہ محض ایک اتفاق ہے کہ میں گھر سے باہر گئی تو ایک کھڑکی کھلی رہ گئی لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں آج ہی اس کا انتظام کرتی ہوں۔" ساندرہ نے اپنے گلاس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے ایک اور دلچسپ بات بھی کہی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اندر کے کسی آدمی کا کام ہے۔"

ایرلین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں، کم از کم وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ اندر کے آدمی کو ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ تم باہر گئی ہو۔" ایرلین سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ کام اسی عمارت میں رہنے والے کسی شخص نے کیا ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ہوا ہوگا لیکن پولیس والے یہی کہہ رہے ہیں۔" ساندرہ نے اپنی طرف سے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

ایرلین نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ "تم جانتی ہو۔ یہ سن کر مجھے ایک بات یاد آگئی......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا؟"

"ایرلین اپنا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ مجھے اس کا ذکر کرنا چاہیے یا نہیں۔"

"کیسا ذکر؟" ساندرہ بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

"صاف صاف کہو، گول مول باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

ایرلین نے اپنا گلاس میز پر رکھا اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "تم لنکارڈ کو جانتی ہو؟"

"کون؟" ساندرہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"وہی جو ٹو ایل میں رہتا ہے۔ اس کا اصل نام نل ویلس ہے لیکن میں اسے لنکارڈ کہتی ہوں۔"

"تم اسے اس نام سے کیوں پکارتی ہو؟"

"کیونکہ وہ انتہائی احمق ہے۔ تم اس سے نہیں ملی

ہو۔‘‘

’’ونہیں، تم سے ہی اس کے بارے میں سُن رہی ہوں۔‘‘

’’ایک سال پہلے کی بات ہے کہ وہ کہیں باہر گیا اور چابیاں بھول گیا۔ اس نے اندر آنے کے لیے میرے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ دراصل میں ان دنوں اٹلی گئی ہوئی تھی اور میرا بھائی نِچ گھر پر تھا۔ وہ میری بلی کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو لنکارڈ نے کہا کہ وہ اسے اندر آنے کی اجازت دے دے تاکہ وہ عقبی کھڑکی کے ذریعے آہنی سیڑھی تک پہنچ سکے۔ اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی مقفل نہیں ہے۔ اس طرح وہ اپنے اپارٹمنٹ میں جا سکتا ہے۔‘‘

’’تمہارے بھائی نے کیا کیا؟‘‘

’’نِچ اسے لے کر پچھلے بیڈروم میں گیا اور اسے کھڑکی کے راستے سیڑھی پر اتار دیا۔‘‘ یہ کہہ کر ایرلین نے ایک ٹانگ دوسری پر رکھی اور بولی۔ ’’تم نے سنا، میں کیا کہہ رہی ہوں؟‘‘

ساندرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ شراب کا نشہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ وہ بولی۔ ’’تمہارا خیال ہے کہ لنکارڈ نے یہ حرکت کی ہے؟‘‘

’’میں یہ نہیں کہہ رہی۔ البتہ مجھے بالکل حیرت نہیں ہو گی اگر یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ کام اسی نے کیا تھا۔‘‘

ساندرہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ’’مجھے امید ہے کہ وہ اس عمارت کا رہنے والا نہیں تھا۔ میں لوگوں پر بھروسا کرنا پسند کرتی ہوں اور اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہے۔‘‘

’’تمہیں اس بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے یہ بات تم سے نہیں کہنا چاہیے تھی۔‘‘ یہ کہہ کر ایرلین کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ’’میں جانتی ہوں کہ اس وقت تمہارے لیے کیا بہتر رہے گا۔‘‘ اس نے خالی بوتل اٹھائی اور جاتے جاتے بولی۔ ’’میں پھر آؤں گی۔‘‘

☆☆☆

کچرا اٹھانے والے ٹرک کے بریک زور سے چرچرائے اور اس کی آواز سے ساندرہ کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا اور پردوں سے آتی ہوئی سورج کی مدھم روشنی میں وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی۔ ایرلین کی پلائی ہوئی مارٹینی کا سُرور ابھی تک اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا اور وہ مزید سونا چاہ رہی تھی لیکن ایک مصروف دن اس کا منتظر تھا۔ بالآخر اس نے جی کڑا کر کے چادر ایک طرف پھینکی اور بستر سے اتر کر باتھ روم میں چلی گئی۔ شاور سے غسل لینے کے بعد اس کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد پانی کی بوتل فریج سے نکال رہی تھی کہ عقب سے اسے ایک سرگوشی سنائی دی۔ ’’وہ لنکارڈ ہی تھا۔ اسی نے یہ واردات کی ہے۔‘‘ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ واپس بستر پر گئی اور دوبارہ سو گئی۔ اس کی آنکھ دوپہر کے بعد کھلی۔ اس نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے معمولات نمٹانے لگی۔

چارلی نے اسے شام کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا ہے اور اسے مزید ایک روز البانی میں رکنا پڑے گا۔ یہ سن کر اسے بہت غصہ آیا۔ اگر چارلی اس کے سامنے ہوتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔ اس سے پہلے

کہ وہ کوئی جواب دیتی، چارلی نے یہ کہہ کر اس کے تن بدن میں آگ لگا دی کہ اس بات کا برا تو نہیں منایا اور یہ کہ وہ ٹھیک تو ہے۔ ان بے تکی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ہوں ہاں کر کے ٹیلی فون رکھ دیا۔

دوسرے دن آئرن ورکس کی دکان سے ایک شخص آیا اور اس نے پچھلی کھڑکی میں لوہے کی مضبوط گرل نصب کر دی۔ اب اس کا گھر محفوظ ہو گیا تھا اگر کسی وجہ سے وہ کھڑکی بند کرنا بھول جاتی تب بھی اس راستے سے کسی چور کا اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ سوہو پر واقع ایپل اسٹور پر گئی اور ایک نیا لیپ ٹاپ خریدا۔ خوش قسمتی سے اس نے چوری ہونے والے کمپیوٹر کا ڈیٹا ایک علیحدہ ڈسک میں محفوظ کر رکھا تھا۔ اس وجہ سے اسے کمپیوٹر بدلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس وقت اسے اپنے باپ کا چوری ہونے والا تمغا بہت یاد آیا جس کا نعم البدل کسی دکان سے نہیں مل سکتا تھا۔

شام سات بجے کے قریب اس نے ایرلین کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے باتیں کرنے اور موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک سیاہ گھنگریالے بالوں والے خوش وضع جوان شخص نے دروازہ کھولا۔ اس نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے سانندرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یس!''

''معاف کرنا۔'' سانندرہ نے کہا اور جانے کے لیے مڑی۔ ''شاید میں غلط جگہ پر آ گئی۔''

اسی وقت ایرلین نوجوان کے عقب میں نمودار ہوئی۔ اس نے سرخ بلاؤز اور گہرے قرمزی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں مارٹینی کا گلاس تھا۔ سانندرہ کو دیکھتے ہی بولی۔ ''ہائے، کیسی ہو پڑوسن؟''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ پہلے سے بہتر ہوں۔''

''گزشتہ روز سانندرہ کے گھر چوری ہوئی تھی۔'' ایرلین نے نوجوان کو بتایا۔ ''کوئی شخص پچھلی کھڑکی سے اندر آیا اور کئی چیزیں چرا کر لے گیا۔''

''یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔'' نوجوان شخص نے کہا۔

''مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔''

ایرلین نے نوجوان کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹونی ہے۔''

''میرا نام سانندرہ ہے۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

نوجوان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''انٹونیو فرنانڈیز۔ یہی میرا پورا نام ہے۔ میں بھی تم سے مل کر خوشی محسوس کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کی انگلیوں کو بوسہ دیا تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔

''ٹونی میرا بہترین شاگرد ہے۔'' ایرلین نے کہا۔ ''اس وقت ہم ایک اسکرپٹ پر گفتگو کر رہے تھے۔ یہ میرے اگلے ڈرامے میں کام کر رہا ہے۔''

''تم یہ ڈراما دیکھنے ضرور آنا۔'' ٹونی نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان نگاہوں کی تپش اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ شخص عورتوں کو مسحور کرنے کا فن جانتا ہے۔

''ہم کھانا شروع کرنے والے تھے۔'' ایرلین نے کہا۔ ''کیا تم ہمارے ساتھ شامل ہونا پسند کرو گی؟''

''نہیں شکریہ۔'' ''میں تو صرف یہ دینے آئی تھی۔'' سانندرہ نے جیب سے وہ سگریٹ کا پیکٹ نکالا جو گزشتہ روز خریدا تھا۔

''یہ تقریباً آدھا بھرا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہو۔''

''یقیناً۔'' ایرلین نے سگریٹ کا پیکٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں ہمیشہ اپنے طالب علموں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کرتی ہوں۔ بہرحال تمہارا شکریہ۔''

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم بھی ہمارے ساتھ ڈنر میں شامل ہو جاتیں؟'' ٹونی نے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

سانندرہ کچھ کہے بغیر واپس چلی آئی۔

رات کافی گزر چکی تھی لیکن نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اس نے بستر پر جانے سے پہلے چائے میں خواب آور گولیاں گھول کر نگل لی تھیں لیکن ان کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ سونا چاہ رہی تھی کیونکہ صبح ساڑھے آٹھ بجے ایک کلائنٹ کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔ پوری رات اسی طرح سوتے جاگتے گزر گئی۔ صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے روانہ ہو گئی۔ جانے سے پہلے اس نے کھڑکی کی گرل کو چیک کیا۔ وہ کافی مضبوط تھی اور اب کوئی شخص اس کے ذریعے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ باہر جاتے ہوئے پریشان اور غیر مطمئن نظر آ رہی تھی۔

وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اسے پہلی منزل کی لینڈنگ پر لنکارڈ نظر آیا۔ وہ ڈوٹی کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا پھر اپنی جیکٹ کی جیب سے کوئی

چیز نکال کر ڈوٹی کے دروازے کے باہر میٹ پر رکھ دی۔ یہ پلاسٹک میں لپٹا ہوا ٹائمز کا شمارہ تھا۔ اس نے ڈوٹی سے اخبار مانگا ہوگا اور پڑھنے کے بعد واپس رکھ رہا تھا۔ 'نہیں' اس نے سوچا، لنکارڈ نے اخبار مانگا نہیں بلکہ چرایا ہوگا۔ وہ اپنی جگہ منجمد کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اتر کر سڑک پر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ساندرہ پلٹی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آگئی۔

لنکارڈ کے اپارٹمنٹ کی عقبی کھڑکی آسانی سے کھل گئی۔ اس نے پردے ہٹائے اور لوہے کی سیڑھی کے ذریعے اندر چلی گئی۔ کمرا تاریک تھا اور فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی۔ اس نے دیوار پر ہاتھ مار کر دروازے کے نزدیک ایک سوئچ تلاش کیا اور اس کا بٹن دباتے ہی کمرا روشن ہوگیا جو بے ترتیب حالت میں تھا۔ بستر کی شکن آلودہ چادر گدے سے نیچے لٹک رہی تھی۔ ایک کرسی پر زرد رنگ کی ٹی شرٹ اور میز پر سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ دیوار پر ایک کلاک آویزاں تھا جس کی سوئیاں ایک جگہ ٹھہر گئی تھیں۔

اس نے اوپر کی دراز کھولی جس میں استعمال شدہ بنیان اور انڈرویئر پڑے ہوئے تھے۔ اس سے نچلی دراز میں موزے، دستانے اور اسکارف وغیرہ تھے اور تیسری دراز میں ایک چیک بک رکھی ہوئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی اور راہداری سے گزرتی ہوئی دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی جس میں فرش سے چھت تک کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اس نے ایک بک شیلف کا جائزہ لیا۔ زیادہ تر کتابیں مجلد اور گرد آلود تھیں۔ فرش پر ایک پرانا قالین پڑا ہوا تھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ ایک الماری کے ساتھ فولڈنگ سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔

اس نے کمرے کی روشنی بجھائی اور ہال سے گزرتی ہوئی اگلے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے اپارٹمنٹ میں یہ کمرا مہمانوں کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا جبکہ ویلس نے پرانی اشیا کا اسٹور بنا رکھا تھا۔ اس نے کھڑکی کے شیشوں سے آنے والی روشنی میں دیکھا کہ وہاں ایک ویکیوم کلینر، ورزش کرنے کی مشین، وی سی آر، دو ٹیلی وژن سیٹ، کئی کرسیاں، ایک گلوب، کاغذوں سے بھرے ہوئے گتے کے ڈبے اور پرانے اخبارات کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس نے باتھ روم میں جھانک کر دیکھا۔ لگتا تھا کہ کئی دنوں سے اس کی

علاج

ایک کارخانے میں ملازمت حاصل کرنے والوں سے انٹرویو لیا جارہا تھا۔ آفس میں موجود منیجر نے ایک اُمیدوار سے سوال کیا۔

''تم محبت اور شادی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟''

ہوشیار امیدوار نے یہ جواب دے کر ملازمت حاصل کرلی کہ ''محبت اندھی ہوتی ہے اور شادی اس اندھے پن کا بہترین علاج ہے۔''

ناصر بیگ، دھاڑی

صفائی نہیں ہوئی تھی۔ کچن کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چیونٹیوں کی قطار چل رہی تھی جبکہ فرش پر ایک جلے ہوئے توس کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ زیادہ تر درازیں خالی تھیں۔ ویلس کے پاس صرف چند چھریاں، کانٹے اور چمچے تھے۔ سنک کے اوپر والے شیلف میں چند ٹوٹے ہوئے کناروں والی پلیٹیں، پانی کے گلاس، دلیے کے ڈبے، مکھن کا جار اور شہد کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ چولھے پر بھی چکنائی کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ سنک میں ایک سیاہ فرائی پان پانی میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ فریج میں ایک ڈبل روٹی اور سلاد کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

اب صرف لیونگ روم باقی رہ گیا تھا جہاں ٹیلی وژن اور اس کے سامنے ایک عجیب وغریب کاؤچ رکھا ہوا تھا۔ یہ کمرا بھی کتابوں کی الماریوں سے بھرا ہوا تھا۔ کلنٹن اسٹریٹ کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ ایک لکھنے کی میز رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی درازوں کی تلاشی لے رہی تھی جب اس نے دروازے میں چابی گھمانے کی آواز سنی۔ اب اسے اپنے جرم کا احساس ہوا جو اس سے سرزد ہو چکا تھا۔ وہ ایک اجنبی کے اپارٹمنٹ میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئی تھی۔ وہ لنکارڈ سے کیا کہے گی جب وہ اسے اپنے کاغذات کھنگالتے دیکھے گا۔ وہ پولیس کو کیا وضاحت پیش کرے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چارلی سے کیا کہے گی۔

اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کی کوئی وضاحت لوگوں کو مطمئن نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا پکڑا جانا یقینی تھا پھر جو بے عزتی ہوتی اور سزا ملتی وہ الگ۔ اس سے بھی زیادہ بری بات یہ کہ وہ اپنے شوہر کی

نظروں میں ہمیشہ کے لیے گر جاتی۔ دروازہ بند ہو گیا اور ایک نظر نہ آنے والے ہاتھ نے اسے اندر سے مقفل کر دیا۔ اب وہ ہال میں نہیں جا سکتی تھی۔ وہ تیزی سے عقبی کھڑکی کی طرف بھاگی۔ اب وہ صرف یہی کر سکتی تھی کہ...... لیکن کیا؟ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ اپنے پکڑے جانے کا انتظار کرے۔ آنے والے کے قدموں کی آواز کچن تک جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے الماری کھلنے اور سنک سے پانی گرنے کی آواز سنی۔ ویلس پانی پی رہا تھا۔ اگر وہ اپنے بیڈ روم میں چلا جائے تو وہ خاموشی سے بیرونی دروازہ کھول کر اپنے اپارٹمنٹ تک جا سکتی تھی پھر اسے کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہو گی اور اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔

اس نے الماری بند ہونے کی آواز سنی اور دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ وہ اپنے بیڈ روم میں چلا جائے۔ لیکن قدموں کی آہٹ سے اندازہ ہوا کہ وہ لیونگ روم کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔ اب چند ہی لمحوں بعد وہ اسے دیکھ کر پولیس کو فون کر دے گا اور پھر...... اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس سے آگے کا منظر نامہ بہت خوفناک تھا۔ قدموں کی آواز اب بہت قریب سے آ رہی تھی۔ وہ تقریباً چلانے والی تھی کہ ویلس کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ نیچے کوریئر سروس والا کھڑا ہوا تھا۔ ویلس نے اسے دیکھ کر پُرجوش انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہارے آنے کی امید تھی۔ ٹھہرو، میں نیچے آ رہا ہوں۔''

اس کے بعدساندرہ نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ جب ساندرہ کو اطمینان ہو گیا کہ ویلس نیچے جا چکا ہے تو وہ تیس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گئی۔

☆☆☆

اس روز چارلی کی ایک میٹنگ تھی۔ اس لیے اس کی واپسی دیر سے ہوئی۔ ساندرہ کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اچانک اسے ایرلین کا خیال آ گیا۔ وہ قریبی اسٹور پر گئی۔ وہاں سے اس نے ووڈکا، وائن اور برف خریدی اور ایرلین سے ملنے چلی گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اسے بہت تعجب ہوا کیونکہ وہ دوپہر میں اسے سیڑھیوں پر ڈوٹی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی اور جانتی تھی کہ وہ گھر پر ہی ہے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تب اسے معلوم ہوا کہ وہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ وہ کسی مہمان کا انتظار کر رہی ہو اور اندر سے دروازے کی چٹخنی نہ لگائی ہو یا یہ بھی ممکن ہے...... نہیں یہ دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک ہی عمارت میں دو ہفتوں کے اندر دوسری نقب زنی نہیں کریں گے۔

اسے کیا کرنا چاہیے، اندر جائے یا واپس چلی جائے۔ اندر جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ ایرلین کی آنکھ لگ گئی ہو لیکن دروازے کا کھلا رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ اسے حفاظتی اقدام کے طور پر اندر جانے کا خطرہ مول لینا چاہیے۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اندر جا کر بہ آواز بلند بولی۔ ''ہیلو؟''

کوئی جواب نہیں ملا۔ فضا میں ایک نامانوس بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کچن میں جا کر دیکھا۔ سوپ کا برتن چولھے پر رکھا ہوا تھا لیکن اس میں ابال آنے کے بعد کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس نے مارٹینی کی بوتل میز پر رکھی اور چولھا بجھا دیا۔ پھر ایک تولیے کی مدد سے برتن کا ہینڈل پکڑ کر اسے سنک میں رکھ دیا۔ جیسے ہی اس پر ٹھنڈے پانی کی دھار پڑی، برتن سے بھاپ اٹھنے لگی۔ اس نے تازہ ہوا کے لیے ایک کھڑکی کھول دی تاکہ جلے ہوئے سوپ کی بو باہر نکل جائے۔

ایرلین کہاں چلی گئی؟ ساندرہ نے لیونگ روم میں جھانکتے ہوئے سوچا۔ اس کی دیواروں پر سبز، نیلا اور سفید رنگ کیا گیا تھا اور ایک قطار میں نوجوان لڑکیوں کی پینٹنگز آویزاں کی گئی تھیں۔ کمرے کو خوب صورت فرنیچر اور قیمتی اشیا سے سجایا گیا تھا۔ ایک کونے میں آرام کرسی کے برابر لیمپ رکھا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی لکھنے کی میز تھی جس پر بہت سی مصوری اور کھانا پکانے سے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ قالین پر ایک سفید رنگ کی فائل اور بہت سے کاغذات بکھرے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی ایک تقریباً خالی جانی واکر کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔

وہ دوسرے کمروں میں جانے کے لیے مڑی تب ہی اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر اس جانب دیکھا جہاں سے وہ آواز آئی تھی۔ لیونگ روم کے برابر میں ایک چھوٹا کمرا تھا جس میں کپڑوں اور دیگر سامان کے لیے شیلف لگے ہوئے تھے۔ ایرلین پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بازو باہر کو نکلا ہوا جبکہ دوسرا اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس نے نائٹ گاؤن کے اوپر ارغوانی رنگ کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کا جسم بالکل سرد تھا۔ ساندرہ اس پر جھک گئی۔ اس کی نبض سست رفتاری سے چل رہی تھی اور وہ

پوری طرح نشے میں مدہوش تھی۔ساندرہ نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ خاصی وزنی تھی۔ساندرہ نے ایک تکیہ اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا پھر اس نے وہسکی کی بوتل اٹھا کر ایک طرف رکھی تبھی اس کی نظر ایک خط پر گئی جو ایرلین کے نام لکھا گیا تھا۔

اس کا مضمون کچھ یوں تھا۔"ایرلین! میں تمہیں یہ خط نہیں لکھنا چاہ رہا تھا لیکن معاملات ایسا رخ اختیار کر گئے ہیں کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔تم مجھے ایک ایسا شخص سمجھنے لگی ہو جو تمہیں ناکام دیکھنا چاہتا ہے اور تمہیں تکلیف پہنچانے یا مقصد میں ناکامی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔میں نہیں جانتا کہ تمہارے دماغ میں یہ بات کہاں سے آئی۔اگر میں واقعی دل سے تمہاری تباہی چاہتا تو یہ خط نہ لکھ رہا ہوتا۔اگر تمہارا دشمن ہوتا تو کبھی تمہیں سچ نہ بتاتا۔

تم واقعی مشکل میں ہو۔اگر تم نے اپنی اصلاح کے لیے عملی اقدامات نہ کیے تو میں بھی تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا۔چاہے تم یقین کرو یا نہیں۔میں نے گزشتہ چھ ماہ کے دوران تمہیں کئی مرتبہ نقصان سے بچایا ہے جو میری ذمے داری نہیں تھی۔میں نے صرف دوست سمجھ کر ایسا کیا لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔"

ساندرہ نے خط کے مسودے پر نظر ڈالی جو خاصا طویل تھا۔وہ صوفے پر بیٹھ کر دوبارہ خط پڑھنے لگی۔

"تمہاری کلاسیں متاثر ہو رہی ہیں اور تم اہم اسٹاف میٹنگز میں نہیں ہوتیں اور جب آتی ہو تو شراب کے نشے میں مدہوش ہوتی ہو۔اب ہر کوئی یہ جان گیا ہے اور سب لوگوں کو تمہاری وجہ سے شرمندگی ہوتی ہے۔ابھی تک کسی نے تام سے یہ بات نہیں کی لیکن اگلا قدم یہی ہوگا اور وہ تمہارے ساتھیوں کی طرح نظرانداز کرنے والا نہیں ہے۔وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

دوسرا معاملہ اس سے بھی زیادہ حساس ہے۔میں اس پر بات کرتے ہوئے جھجک رہا ہوں لیکن اس پر لوگ باتیں بنا رہے اور تبصرے کر رہے ہیں۔اس لیے یہ سلسلہ بھی رک جانا چاہیے۔تم کلاس سے باہر طالب علموں کو بہت زیادہ وقت دے رہی ہو جبکہ اسکول کی یہ پالیسی نہیں ہے۔استاد اور شاگرد کے درمیان مناسب فاصلہ ہونا چاہیے لیکن تم طالب علموں کو گھر بلا کر اس کی مسلسل خلاف ورزی کر رہی ہو۔یہ بھی اطلاعات ملی ہیں کہ تم ان کے ساتھ شراب نوشی کرتی ہو۔تمہیں یاد دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان میں سے زیادہ تر کم عمر ہیں اور انہیں قانوناً شراب نوشی کی اجازت نہیں ہے۔اس کے علاوہ یہ افواہ بھی گردش کر رہی ہے کہ ان میں سے کم از کم ایک کے ساتھ تمہارے تعلقات تمام حدیں پار کر چکے ہیں اور تم دونوں کے درمیان جسمانی رشتہ قائم ہو گیا ہے۔"

ساندرہ سمجھ گئی کہ اس خط میں جس نوجوان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔وہ وہی ہے جس سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایرلین کو سگریٹ کا پیکٹ دینے آئی تھی۔غالباً اس کا نام ٹونی تھا۔اس نے صفحہ پلٹا اور خط کا بقیہ حصہ پڑھنے لگی۔"یہ رویہ کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔اگر یہ الزامات درست ثابت ہوئے تو ملازمت سے برطرفی اور تمہارے خلاف قانونی کارروائی یقینی ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں اپنی پوزیشن کے نازک ہونے کا کتنا احساس ہے جس کی کم سے کم سزا تمہاری برطرفی ہے اور ممکنہ طور پر تمہارے خلاف مقدمہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔میں نہیں چاہتا کہ ایسا کچھ ہو گو کہ ہمارے درمیان پہلے جیسی قربت نہیں رہی اور مجھے افسوس ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک ہلکی سی ضرب تمہیں تباہ کر سکتی ہے۔تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ورنہ دوسرا موقع نہیں ملے گا۔تمہارا دوست جسے دشمن سمجھتی ہو، رون۔"

وہ صوفے پر بیٹھی ایرلین اور اس خط کے بارے میں سوچتی رہی۔کھڑکی سے باہر آسمان تقریباً سیاہ ہو چکا تھا۔اس نے سوچا کہ چارلی آتا ہی ہوگا۔اب اسے گھر جانا چاہیے۔اس نے بڑی کوشش کر کے ایرلین کو فرش سے اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔اس کی سانس بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔ساندرہ نے محسوس کیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔وہ اسے اس حالت میں چھوڑ کر جا سکتی ہے۔اس نے لیونگ روم کو درست کیا اور شراب کی بوتل ڈسٹ بن میں ڈال دی جو پہلے ہی خالی بوتلوں سے بھرا ہوا تھا۔

کچن کی میز پر مارٹینی کی بوتل رکھنے سے ایک دھبا پڑ گیا۔اس نے اسپنج کی تلاش میں درازیں کھولنا شروع کیں۔تیسری دراز میں اسے ایک صفائی کرنے کا کپڑا مل گیا جو کسی چیز کے گرد لپٹا ہوا تھا۔اس نے کپڑا کھول کر دیکھا تو اس کی نظر اپنے باپ کے تمغے پر پڑی۔حیرت اور خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔یہ تمغا اسے بہت عزیز تھا اور اس کے چوری ہونے کا صدمہ شاید وہ کبھی نہیں بھلا سکتی لیکن وہ اسے غیر متوقع طور پر مل گیا تھا۔اس نے وہ تمغا جیب میں ڈالا اور ایرلین پر نفرت بھری نگاہ ڈالتی ہوئی اپارٹمنٹ سے باہر چلی گئی۔

اسے یقین نہیں تھا کہ ایرلین ایسی حرکت کر سکتی ہے لیکن چوری کا مال اس کے گھر سے برآمد ہوا تھا۔ اس بے شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ غصے اور نفرت سے اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اس نے ایرلین سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کچن ٹیبل پر بیٹھی مسلسل اسی بارے میں سوچ بچار کررہی تھی۔ اس کے سامنے مارٹینی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ ایک گلاس ختم کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے دوسرا گلاس بنایا۔ اس کا خیال تھا کہ شراب پینے سے اس کے اندر اتنی جرأت آجائے گی کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھا سکے۔ لیکن اس سے اسے کوئی مدد نہیں ملی بلکہ اس کے غصے اور ناراضی میں اضافہ ہوگیا۔ اس کے سامنے کئی کاغذ رکھے ہوئے تھے جن پر وہ بار بار کچھ لکھنے کے بعد انہیں پھاڑتی جارہی تھی۔ بالآخر وہ اسے حتمی شکل دینے میں کامیاب ہوگئی۔ جب خط مکمل ہوگیا تو اس نے اسے تنقیدی نظر سے پڑھنا شروع کر دیا۔

''میں اپنا نام ظاہر کیے بغیر تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر ایرلین کو میرے بارے میں معلوم ہوگیا تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ میں گزشتہ مدت کے دوران اس کے شو میں تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر بلا کر شراب پلاتی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث کرنا چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے چھونے اور میرا بوسہ لینے کی کوشش کی۔ میری ایک گرل فرینڈ ہے۔ ایرلین اسے جانتی اور اس سے حسد کرتی ہے۔ وہ مجھے شراب پینے کے لیے بلاتی رہتی ہے اور میں انکار کرتا رہتا ہوں۔ اس وجہ سے اس نے مجھے خراب نمبر دینا شروع کر دیے اور کہتی ہے کہ اگر مجھے اس کے ڈرامے میں کام کرنا ہے تو اس کے کہنے پر چلنا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ دوسرے طالب علم بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ مجھے یہ اسکول پسند ہے لیکن اگر ایرلین کے بارے میں کوئی قدم نہ اٹھایا تو مجھے یہ اسکول چھوڑنا پڑے گا۔ میرے دوسرے ساتھی بھی ایسا ہی سوچ رہے ہیں۔''

خط کی عبارت پڑھ کر وہ مطمئن ہوگئی۔ اس نے اپنی تحریر کو صاف بنانے کے لیے کافی محنت کی تھی تاکہ آسانی سے پڑھی جاسکے۔ مارٹینی کے دوسرے گلاس نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے خط لفافے میں رکھ کر اس پر رون مارو کا نام اور مڈٹاؤن میں واقع اس کے ڈراما اسکول کا پتا لکھ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ صبح اٹھ کر وہ پوسٹ آفس گئی اور وہ لفافہ سپردِ ڈاک کرنے کے بعد دل ہی

اعتراف

''میں تمہاری خاطر ساری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ اتنی محبت کہ دنیا کا کوئی بھی شخص کسی سے اتنی محبت نہ کرتا ہوگا۔ میں تمہارے لیے اپنی جان تک قربان کرسکتا ہوں۔''

''کیا تم کو بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے ڈارلنگ؟'' نوجوان نے اپنی محبوبہ سے کہا۔

''سچ پوچھو تو اس سے کہیں زیادہ۔'' لڑکی نے نوجوان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مگر..... مگر میں کیسے یقین کرلوں؟'' نوجوان نے اضطراب سے پوچھا۔ ''کہیں تم میری طرح جھوٹ تو نہیں بول رہی ہو؟''

بی ایم سی کوئٹہ سے بسنت کمار کا نسخہ

دل میں بولی۔ ''اب اس کتیا کو مزہ آئے گا۔''

اگلے ہفتے کے دوران اس نے خط کے بارے میں بالکل نہیں سوچا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خط پوسٹ کر کے اسے بھول گئی ہے اور نہ ہی اس نے ایرلین کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سوچا۔ حسنِ اتفاق سے شیڈول میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے چارلی کو ویک اینڈ گھر پر گزارنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے ایک کار کرائے پر لی اور ہفتے کی صبح گھومنے نکل گئے۔ ساندرہ نے پرانی اشیا کی دکانوں سے خریداری کی اور پھر وہ دریا کی سیر کو نکل گئے۔ انہوں نے رات موٹیل میں گزاری اور لمبی تان کر سوئے۔ اتوار کا دن بھی سیر و تفریح اور کھانے پینے میں گزر گیا اور وہ رات نو بجے کلنٹن اسٹریٹ واپس پہنچے۔ ڈوٹی راہداری میں کھڑا ویلس سے باتیں کر رہا تھا۔ جس نے بغل میں سنڈے ٹائمز کا شمارہ دبا رکھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''تم نے کچھ سنا کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

''ہم اس ویک اینڈ پر گھر سے باہر تھے۔'' چارلی نے کہا۔ ''کیا ہوا؟''

مسٹر ویلس نے اخبار ایک بغل سے دوسری بغل میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''واقعی تمہیں کچھ معلوم نہیں؟''

''ظاہر ہے۔'' ڈوٹی بولی۔ ''انہوں نے ابھی بتایا ہے کہ یہ شہر سے باہر تھے۔''

''بہت افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے۔'' مسٹر ویلس نے کہا۔ ''اس نے اپنے آپ کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''وہ ممکن ہے کہ وہ کامیاب ہوگئی ہو۔'' ڈوٹی نے کہا۔

''فی الحال وہ اس بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔'' ویلس بولا۔

''مجھے یہ بات معلوم نہیں۔'' ڈوئی نے کہا۔

''میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔'' ویلس بولا۔ ''میں نے ایک ایمبولینس بوائے کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔''

''تمہیں بتانا چاہیے تھا۔'' ڈوئی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں کس کے بارے میں بات کررہے ہو؟'' چارلی نے پوچھا۔

''ایرلین۔'' مسٹر ویلس نے کہا۔ ''وہ جو تھری آر میں رہتی ہے۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟'' چارلی نے اگلا سوال پوچھا۔

''اسے ملازمت سے برطرف کردیا گیا تھا۔'' ڈوئی نے کہا۔ ''اس کے بعد وہ اپارٹمنٹ میں بند ہوگئی اور مسلسل شراب پیتی رہی، پھر گزشتہ شب اس نے بلیڈ سے اپنی کلائیاں کاٹ لیں۔ کیا تم اس پر یقین کرسکتے ہو؟''

''جب اس کے باس نے نہیں دیکھا تو اسے فکر لاحق ہوگئی۔'' مسٹر ویلس نے کہا۔ ''وہ اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو اسے ٹب میں لیٹا ہوا پایا۔'' مسٹر ویلس نے کہا۔ ''اسی نے اس کی جان بچائی ہے۔''

''بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔''ساندرہ نے کہا اور تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

دو دن بعد سراغ رساں بروسکی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ان سادہ لباس پولیس والوں میں سے ایک تھا جن سے ساندرہ اپنے گھر ہونے والی چوری کے موقع پر مل چکی تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا گنجا اور سیاہ آنکھوں والا شخص تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ اور سفید نیلی پٹیوں والی ٹائی لگا رکھی تھی۔ دیکھنے میں وہ خاصا محتاط نظر آرہا تھا۔

ساندرہ نے اسے اندر بلا لیا اور اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔ جسے اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے نوٹ بک بند کردی۔ ساندرہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ اس دوران اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی پوری کوشش کی، پھر وہ بولا۔ ''تمہارے لیے ایک خبر ہے۔''

''بتاؤ، میں سن رہی ہوں۔'' ساندرہ اعتماد سے بولی۔

''ہمیں تمہارا ایک کمپیوٹر مل گیا ہے۔''

وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تم نے تو کمال ہی کردیا۔''

''اس میں ہمارے کمال سے زیادہ چور کی غلطی کا دخل ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اسے خود بیچنے کی کوشش کرتا، وہ اسے گروی رکھنے چلا گیا۔ دکان دار نے اس کا نمبر چیک کیا اور ہمیں اطلاع دے دی۔ اس طرح ہم تمہارا کمپیوٹر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔''

''یہ تو بہت حیرت انگیز بات ہے۔'' ساندرہ بولی۔

بروسکی آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اس سے بھی زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ہم نے تمہارے چور کو پکڑ لیا ہے۔''

''واہ، یہ تو بہت زبردست خبر ہے۔'' ساندرہ بولی۔

''کون ہے وہ؟''

بروسکی نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''دو روز قبل اس عمارت میں ایک عورت نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس بارے میں معلوم ہوگا۔''

''ہاں، میں نے سنا تھا۔''

''اس کا نام ایرلین سرنی ہے۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ ہماری تھوڑی بہت جان پہچان تھی۔''

''ایسا لگتا ہے کہ اسے کئی ذاتی اور پیشہ ورانہ مسائل کا سامنا تھا۔''

''پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟''

بروسکی الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارا اشارہ اس کی خودکشی کی جانب ہے؟''

''نہیں، میں اپنے گھر ہونے والی چوری کی بات کررہی ہوں۔''

''اس نے تمہارے گھر چوری نہیں کی۔'' بروسکی نے کہا۔

''لیکن میں سمجھ رہی تھی......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آگے کیا کہے۔ اگر تمغا ملنے کا ذکر کرتی تو اس پر بھی الزام آسکتا تھا۔ بروسکی نے کچھ دیر انتظار کیا پھر بولا۔ ''اس کے بھائی نے تمہارے گھر چوری کی تھی۔''

''سچ!'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں، اس کے پاس اپنی بہن کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ہوتی ہے۔ اس نے تمہارے گھر میں چوری کرنے کے لیے ایرلین کے اپارٹمنٹ کو استعمال کیا۔ یہ راستہ اسے ڈوئی نے دکھایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ایرلین اس کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ لگتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔''

''میں یقین نہیں کر سکتی۔'' ساندرہ نے نرمی سے کہا۔
برونسکی نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسے جانتی ہو؟''
''نہیں...... ایرلین نے ایک بار اس کا ذکر کیا تھا۔''
برونسکی نے اپنی نوٹ بک دوبارہ نکالی اور اس کا ایک سادہ صفحہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''اس نے کیا کہا تھا؟''
''وہ ایرلین کی غیر موجودگی میں اس کے گھر رہتا اور اس کی بلی کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔''
''بس اس نے یہی کہا تھا؟''
وہ کچھ ہچکچائی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اس نے یہ بات تم سے کب کہی تھی؟'' برونسکی نے پوچھا۔
''ہمارے گھر چوری ہونے کے فوراً بعد۔ وہ مجھ سے اظہار افسوس کرنے آئی تھی۔''
برونسکی نے نوٹ بک میں مزید کچھ لکھا اور اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے وقت کا شکریہ۔''
وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟''
''فی الحال یہی سمجھو۔ تمہیں اپنا کمپیوٹر شناخت کرنا ہوگا۔''
وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی دروازے تک گئی۔ برونسکی نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔ ''کیا تم نے ایرلین کے بارے میں کچھ سنا ہے؟''
''وہ فلاڈیلفیا کے اسپتال میں ہے۔ اس کی ماں وہیں قریب ہی رہتی ہے۔''
''مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔''
''لگتا ہے کہ وہ مزید کچھ عرصے تک وہاں رہے گی۔''
ساندرہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بہت افسوس ہے، بہت زیادہ۔''
برونسکی کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ بولا۔ ''لیکن اس لڑکے کو اپنے کیے پر کوئی پشیمانی نہیں ہے۔''
''کون لڑکا؟'' ساندرہ چونکتے ہوئے بولی۔
''وہی جس نے خط لکھا تھا اور جس کی وجہ سے ایرلین کو نکالا گیا۔''
ساندرہ حیران و پریشان اس کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس کا شاگرد ہے ٹونی فرنانڈیز۔ ایرلین نے اسے اپنے ایک ڈرامے میں کام دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کی جگہ کسی اور کو رکھ لیا۔ اس لڑکے نے غصے میں آ کر اسکول کی انتظامیہ کو خط لکھ دیا اور دعویٰ کیا کہ اس کا ایرلین کے ساتھ جذباتی اور جسمانی تعلق رہا ہے۔ ایرلین نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس کے اشاروں پر نہیں چلا تو وہ اسے اپنے ڈرامے میں کام نہیں دے گی۔ اس خط کے ملنے کے بعد انتظامیہ نے ایرلین کو معطل کر دیا اور الزامات کی تحقیقات مکمل ہونے تک اس کی تنخواہ بھی روک لی۔''
''کیا انہیں صرف ایک ہی خط ملا تھا جو انہیں اس لڑکے نے بھیجا؟''
برونسکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک خط ہی کافی تھا۔ ٹونی کی عمر صرف سترہ سال ہے اور تم جانتی ہو کہ کسی نابالغ لڑکے کو ورغلانا اور اسے شراب نوشی پر مجبور کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔''
''وہ واقعی بہت بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے۔'' ساندرہ نے تاسف سے کہا۔
''اسپتال میں اس کا علاج ہو رہا ہے لیکن اگر ٹونی نے اپنے الزامات پر زور دیا تو اس کی مشکلات ختم نہیں ہوں گی۔''
''تمہارے خیال میں کیا وہ ایسا کرے گا؟''
''شاید، جو کچھ میں نے سنا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ گرم مزاج لڑکا ہے اور اسے سزا دلوائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے، ایک بار پھر تمہارے تعاون کا شکریہ۔''
اس نے بھی جواب میں شکریہ ادا کیا اور اندر چلی گئی۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ اس نے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گئی پھر وہ چلتی ہوئی عقبی بیڈ روم میں آئی۔ اس نے کھڑکی پر لگا ہوا ریشمی پردہ ہٹایا اور سلاخوں کو پکڑ کر باہر جھانکنے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ماتھا سلاخوں پر ٹکا دیا۔ اس کے اندر آوازوں کا ہجوم برپا تھا جو ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہو رہی تھیں۔
''یہ میری غلطی نہیں تھی۔ میرا خط ان تک نہیں پہنچا۔''
اسے غلط فہمی ہوئی تھی۔ ایرلین کے گھر سے تمغا برآمد ہونے کے بعد وہ اسے چور سمجھ رہی تھی اور اس نے جوشِ انتقام میں اسکول کی انتظامیہ کو گمنام خط لکھ دیا۔ اگر وہ خط انہیں مل جاتا یا برونسکی اسے حقیقت نہ بتاتا تو وہ اپنے آپ کو ہی مجرم سمجھتی رہتی۔ اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور چارلی کا انتظار کرنے لگی۔

مہرہ

محمد فاروق انجم

خوابوں... خیالات اور تخیلات کی دنیا میں آسائشاتِ زندگی ہی نہیں... انسانوں کے روپ بھی فرشتوں کے مانند معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں... میدانِ عمل میں اُترنا پڑے تو ارادوں اور سوچوں کے تاج محل ریت کے گھروندے کی طرح بکھرتے محسوس ہوتے ہیں... ایک ایسی ہی لڑکی کا زندگی نامہ... ایک غیر متوقع حادثے نے اس کی پُرسکون حیات میں ہلچل بپا کردی... پے در پے رونما ہونے والے واقعات زنجیر کی صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ جانے... انجانے چہروں کے پیچھے فریبی عکس اپنے ہنر آزماتے رہے۔ وہ گرتی... سنبھلتی... لڑکھڑاتی حیران و پریشان اپنے محاذ پر ڈٹی رہی...

شاطر و عیار ذہن کی مجرمانہ بساط کا کھیل..... ہر مہرہ اپنی جگہ بدل چکا تھا

”کروڑوں روپوں سے زندگی سنور جائے گی۔ ہمارے پاس اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ سوچ کے فیصلہ کرلو۔ میرا ساتھ دوگی تو فائدے میں رہوگی، رقم لوٹنے کا میرے پاس بہترین منصوبہ ہے۔“ کبیر نے اپنے سامنے براجمان سارہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور چہرہ اس کی بات سن کر تذبذب کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز اور سانس بھی مضطرب ہوگئی تھی۔

دونوں اس وقت شہر کے ایک عام سے لیکن اچھے اور صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ ان کی میز دیوار کے ساتھ تھی اور آس پاس کی میزیں ابھی خالی تھیں۔ ویسے بھی کبیر نے اپنی بات کہتے ہوئے لہجہ دھیما رکھا تھا۔ کبیر اب اس کے جواب کے انتظار میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سارہ کے خوبصورت چہرے، آنکھوں اور لمبے بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب سارہ کی خاموشی طوالت اختیار کرنے

لگی تو کبیر نے پوچھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

اس بار سارہ چونکی۔ اس کی نگاہیں کبیر کے چہرے پر جم گئیں۔ کبیر کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے سر کے بال گھنے اور لمبے تھے جنہیں اس نے خوبصورت انداز میں رکھا ہوا تھا کہ اس سے اس کی خوبصورتی اور شخصیت میں جاذبیت سی پیدا ہوتی تھی۔

سارہ نے اپنا پرس اُٹھایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں جارہی ہوں۔“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ کبیر جلدی سے بولا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“ سارہ نے کہا۔

”بیٹھ جاؤ اور میری بات کو دھیان سے سنو۔“ کبیر بولا تو سارہ بادلِ ناخواستہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور جسم میں عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کچھ کرنے سے قبل ہی اسے کسی انجانے خوف نے گھیر لیا ہو۔

کبیر بولا۔ ”میں نے پوری منصوبہ بندی کر لی ہے۔ بس مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ تم باس کی پرسنل سیکریٹری ہو۔ چوبیس گھنٹے کی مصروفیت تمہاری ڈائری میں لکھی ہوتی ہے۔ باس کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس میٹنگ کے بعد اسے کہاں جانا ہے۔ جو تم بتاتی ہو، اس کا رخ اسی طرف ہو جاتا ہے۔ تین سال سے میں باس کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ ان تین سالوں میں، میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ مجھے دولت کیسے حاصل کرنی ہے۔ اب موقع ہے تو میرا ساتھ دو۔ ہم وہ رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔ میرا منصوبہ ایسا ہے کہ کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا کہ یہ کام ہمارا ہے۔“

”میں اس وقت کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ کبیر کیا ہم اس موضوع پر کل بات کر سکتے ہیں؟“ سارہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور وہ جانے کے لیے بے چین تھی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ تم اطمینان سے سوچ لو۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ تم کب تک باس کی ڈائری ہاتھ میں لیے اس کے دائیں بائیں چلتی رہو گی اور کب تک اس کے وہ جملے سن کر برداشت کرتی رہو گی جو کسی شریف لڑکی کے لیے موت ہوتے ہیں۔ جتنی دولت اس کے پاس ہے اگر ہم اس میں سے کچھ لے اُڑیں گے تو اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن ہماری زندگیاں سنور جائیں گی اور ہم دونوں کو کرخت اور کالے دل والے باس سے نجات مل جائے گی۔“ کبیر نے ایک بار پھر سارہ کے گرد اُن مجبوریوں کی دیوار کھڑی کی جن کا سامنا سارہ کو تھا۔

کبیر کی باتوں میں سچائی تھی۔ ایک لمحے کے لیے سارہ کی آنکھوں کے سامنے وہ سب کچھ گھوم گیا جس کا وہ روز سامنا کرتی تھی اور اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی اپنا فیصلہ سنا دے لیکن اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکایا اور بولی۔

”میں چلتی ہوں۔ ہم کل بات کریں گے۔“ سارہ یہ کہہ کر ایک طرف چل دی۔ کبیر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب سارہ ریسٹورنٹ کے خارجی دروازے سے باہر نکل گئی تو کبیر کے چہرے پر ایک شاطر مسکراہٹ عیاں ہوئی اور دوسرے لمحے معدوم بھی ہوگئی لیکن اس کی آنکھوں کی چمک گہری ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

سارہ نے فلیٹ میں آکر دروازہ لاک کیا اور اپنا ہینڈ بیگ ایک طرف رکھ کر صوفے پر ڈھے گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کبیر کی باتوں پر غور کرتے ہوئے ماضی کی طرف چلی گئی۔

سارہ اس شہر میں اس اُمید کے ساتھ آئی تھی کہ اس کی دوست نبیلہ اس شہر میں ایک بڑی کمپنی میں نوکری کرتی تھی۔ سارہ شاید کبھی بھی اس شہر کا رخ نہ کرتی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے پُرسکون اپنے گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ سارہ کا باپ ڈھائی سال قبل ہارٹ اٹیک کی وجہ سے دنیا سے چلا گیا تھا۔ اب اس گھر میں دونوں ماں بیٹی ہی رہتے تھے۔

سارہ کی ماں پچاس سال کی عمر میں بھی خوبصورت اور پُرکشش عورت تھی۔ سارہ اس عمر میں اپنے مستقبل کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی کہ اس دن اچانک اس کے خواب چکنا چور ہو گئے جب اس کی ماں سارہ کو یہ کہہ کر گھر سے گئی تھی کہ وہ اپنی دوست کی طرف جارہی ہے۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہمراہ ایک شخص تھا جو اس کی ماں کا دور کا رشتے دار تھا اور کافی دولت مند تھا۔ جسے سارہ ہمیشہ ناپسند کرتی تھی۔

سارہ ان دونوں کو متحیر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک سارہ کی ماں نے یہ انکشاف کر کے سارہ کو حیرت کے سمندر میں دھکیل دیا کہ ان دونوں نے شادی کر لی ہے۔

اس حقیقت کو جان کر پہلے تو سارہ مبہوت کھڑی اُن کی طرف دیکھتی رہی، پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سارہ عام لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔ وہ ایک بہادر اور کچھ بھی کر گزرنے والی لڑکی تھی۔ ایک بار جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ سارہ کو ماں کے نکاح کرنے سے زیادہ اس بات کا صدمہ تھا کہ اس کی ماں جو اس کی دوست ہونے کا دعویٰ کرتی تھی، اس نے یہ قدم اُٹھانے سے پہلے ایک بار بھی اس سے بات نہیں کی۔

سارہ سوچ رہی تھی کہ جانے کب سے دونوں کے درمیان کھچڑی پک رہی تھی کہ آج انہوں نے نکاح کر لیا۔

سارہ ایک گھنٹے تک اپنے کمرے میں بند بیٹھی رہی۔ پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ جب سارہ نے کوئی جواب نہ دیا تو دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس کی ماں کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کی ماں کا چہرہ میک اَپ میں تھا، وہ اور بھی زیادہ خوبصورت اور پُرکشش لگ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم ناراض ہوگئی ہو اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کیوں ناراض ہوئی ہو۔ اس لیے کہ میں نے نکاح کرنے سے پہلے تم سے اس بارے میں بات کیوں نہیں کی۔'' اس کی ماں بولی۔

سارہ نے اپنی ماں کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس انتظار میں یہاں ہوں کہ وہ شخص اس گھر سے جائے تو میں کمرے سے باہر نکلوں۔''

''سارہ تمہارے باپ کے چلے جانے کے بعد گھر کے اخراجات پورے کرنا کتنا دشوار ہو گیا تھا، یہ تم نہیں جانتی ہو۔''

''کیا وہ شخص چلا گیا ہے؟'' سارہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

''وہ کوئی شخص نہیں ہے۔ اب وہ میرا شوہر اور تمہارا باپ ہے۔'' سارہ کی ماں نے نرمی سے سمجھایا۔

''میرا باپ ڈھائی سال پہلے مجھے چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میرے دل میں زندہ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا میرے دل میں نہیں آسکتا۔'' سارہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔ اس کی نگاہیں اپنی ماں کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔

''کیا تم اپنا غصہ تھوک کر مجھے کچھ کہنے کا موقع دو گی؟'' سارہ کی ماں مصلحت سے کام لے رہی تھی۔

''آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔''

''سارہ......''

''مجھے ایک بات بتا دیں کہ کیا وہ شخص اس گھر سے چلا گیا ہے۔'' سارہ نے اپنی ماں کو بولنے سے پہلے روک کر اپنا سوال کیا۔

اس کی ماں نے ایک لمحہ توقف کے بعد جواب دیا۔ ''ہاں وہ چلے گئے ہیں۔ شام کو آئیں گے۔''

جواب سن کر سارہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اپنا بیگ اٹھایا جو وہ ضروری سامان سے بھر چکی تھی۔ سارہ بیگ گھسیٹتے ہوئے کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو تم؟'' اس کی ماں جلدی سے اس کے سامنے آگئی۔

''میں بالغ ہوں، اپنا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔ اس لیے یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔'' سارہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' اس کی ماں پریشان ہوگئی۔

''آپ نے اپنی دنیا بسالی ہے اب میں اپنی دنیا خود بناؤں گی۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''خالی ہاتھ دنیا نہیں بنتی۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''ہاتھ خالی ہیں، دماغ خالی نہیں ہے۔'' سارہ نے اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی ماں اس کے پیچھے لپکی۔

''تم یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔''

''میں جا رہی ہوں۔ مجھے اس گھر میں نہیں رہنا ہے۔''

''تم بے وقوفی کر رہی ہو۔'' سارہ کی ماں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔

سارہ نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور بولی۔ ''آپ سے بڑی بے وقوفی نہیں کر رہی ہوں۔''

سارہ کی ماں نے کوشش کی کہ وہ کسی طرح سے اس کو روک لے لیکن سارہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اپنا فیصلہ وہ کسی قیمت پر بدلنا نہیں چاہتی تھی۔ ماں کے فیصلے نے اسے جو صدمہ دیا تھا، اس کی وجہ سے اس کا دل رو رہا تھا۔

وہ گھر سے نکل چکی تھی اور تیز تیز قدموں سے اسٹاپ کی جانب جا رہی تھی۔ اس کی ماں بے بسی سے دروازے میں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ باہر نکل کر اسے روک نہیں سکتی تھی کیونکہ سب کے سامنے تماشا نہیں بننا چاہتی تھی اور پھر اسے اس خیال نے بھی روک دیا کہ سارہ اپنی کسی سہیلی کے پاس رہ کر ایک، دو دن میں غصہ ٹھنڈا ہونے پر واپس آجائے گی۔ سارہ کی ماں نے دروازہ بند کر دیا اور سارہ وہاں سے سیدھی بس اسٹینڈ کی طرف چلی گئی۔ اس نے ٹکٹ لیا اور اس شہر کی جانب رواں دواں

ہوگئی جہاں اس کی قریبی دوست نبیلہ جاب کرتی تھی۔ اس نے ایک دو بار اسے کہا تھا کہ وہ اگر جاب کرنا چاہتی ہے تو اس کے پاس آجائے۔ وہ اسے جاب دلا دے گی۔ تب سارہ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا تھا۔

سارہ اس شہر میں پہنچی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سارہ نے اپنے بیگ کی زپ کھول کر اپنی ڈائری نکالی، اس میں لکھا نبیلہ کا پتا غور سے پڑھا اور رکشا اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

وہ جگہ بس اسٹینڈ سے تقریباً نو کلو میٹر دور تھی۔ وہ ایک بلند قامت عمارت تھی۔ اس کی چوتھی منزل پر نبیلہ کا فلیٹ تھا۔

سارہ لفٹ کی جانب بڑھی۔ لفٹ کے دروازے پر لکھی تحریر پڑھ کر چہرہ پہلے ہی تھکن میں ڈوب گیا کہ 'لفٹ خراب ہے۔'

سارہ اپنا بیگ اُٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر جب چوتھی منزل پر پہنچی تو اس کی سانس پھول چکی تھی۔ آخری سیڑھی سے اوپر [illegible] رکھ کر کچھ دیر رک کر پہلے اس نے اپنی سانس بحال کرنے کی کوشش کی اور پھر نبیلہ کے فلیٹ کی طرف چل دی۔ اس وقت تک اندھیرا اپھیل چکا تھا۔

نبیلہ کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے رک کر اس نے بیگ نیچے رکھا اور اپنے ہاتھ کی اُلٹی انگلیوں سے دستک دی۔ سارہ نے ایسی ہی تین بار کوشش کی تو دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نمودار ہونے والا نبیلہ کے بجائے کسی مرد کا چہرہ تھا۔

سارہ کی نظر جیسے ہی اس چہرے پر پڑی، وہ متحیر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''جی مجھے نبیلہ سے ملنا ہے۔ اسی فلیٹ کا پتا دیا تھا اس نے مجھے۔'' سارہ نے کہا۔

''نبیلہ صاحبہ رہتی تھیں...... اب یہاں میں رہتا ہوں۔'' نوجوان نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

''اس نے فلیٹ بدل لیا؟ کہاں چلی گئی ہے وہ؟'' سارہ نے جلدی سے پوچھا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے، ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس نے شادی کر لی تھی۔'' نوجوان بولا۔

''پلیز آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ شادی کے بعد کہاں رہ رہی ہے اور کس سے شادی کی ہے۔ میں اس شہر کی رہنے والی نہیں ہوں۔ میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

سارہ پریشان ہوگئی تھی۔

''نبیلہ دراصل اسی کمپنی میں کام کرتی تھی جہاں میں کام کرتا ہوں۔ چھ ماہ پہلے اس نے کمپنی بدل لی تھی اور پھر مجھے پتا چلا تھا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی ہے۔ اس فلیٹ میں، میں تین ماہ سے رہ رہا ہوں۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''آپ پتا کر کے بتا سکتے ہیں کہ نبیلہ کہاں مل سکتی ہے؟'' سارہ کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی تھی۔

''یقین کیجیے۔ مجھے قطعی علم نہیں ہے اور نہ ہی اس کا پتا چل سکتا ہے کیونکہ جب تک وہ ہمارے ساتھ کام کرتی رہی، وہ بہت محدود تھی۔ اس کی کسی سے بھی بے تکلف دوستی نہیں تھی۔ ویسے بھی میرا ڈیپارٹمنٹ الگ ہے، اس سے بھی کبھار ہی بات ہوتی تھی۔''

''اب میں کہاں جاؤں گی؟'' سارہ کے منہ سے نکلا۔ آواز دھیمی تھی لیکن نوجوان نے سن لی تھی۔

''میرا نام کبیر ہے۔ آپ چاہیں تو اندر آسکتی ہیں۔ پھر آپ اطمینان سے سوچ لیں کہ آپ کہاں جائیں گی۔'' نوجوان نے اپنا نام بتاتے ہوئے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے پیشکش کی۔

اس شہر میں وہ نبیلہ کی آس میں آئی تھی۔ گھر چھوڑتے وقت وہ اتنی جذباتی تھی کہ اس نے نبیلہ کو فون بھی نہیں کیا۔ فون کا خیال دل میں آتے ہی اس نے سوچا کہ ڈائری میں اس کا نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی غیر ارادی طور پر سارہ کے قدم فلیٹ کے اندر جانے کے لیے بڑھ گئے۔

اس نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور اس کی زپ کھول کر وہ ڈائری ایک بار پھر نکالی۔ نبیلہ کے پتے کے ساتھ اس کا موبائل نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ سارہ کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا تو کبیر نے جلدی سے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

سارہ نے اس کا نمبر پش کیا لیکن آگے سے آواز آرہی تھی کہ 'مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔'

سارہ کے چہرے پر پریشانی اور مایوسی کے تاثرات اور بھی گہرے ہو گئے۔

''کیا آپ کے آفس سے پتا چل سکتا ہے کہ نبیلہ کہاں رہتی ہوگی۔؟ شاید کسی کو پتا ہو؟'' ایک نئی اُمید کے ساتھ اس نے سوال کیا۔

''کوشش کی جاسکتی ہے لیکن صبح۔ کیونکہ اس وقت آفس بند ہے۔'' کبیر کے اس جواب نے سارہ جیسی مضبوط

لڑکی کو مزید پریشان کردیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اجنبی شہر میں وہ کہاں جائے گی۔ وہ اس شہر میں کئی بار کالج ٹرپ اور اپنے باپ کے ساتھ گھومنے کے لیے آئی تھی اور اس شہر کے بارے میں بہت کچھ جانتی بھی تھی لیکن ان کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار یہاں نہیں رہتا تھا۔ اسے سوچ میں گم دیکھ کر کبیر نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اطمینان سے یہاں رات گزاریں۔ صبح آپ میرے ساتھ میرے آفس چلیں۔ میں کوشش کروں گا کہ نبیلہ کا پتا معلوم ہوسکے۔''

سارہ نے کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ شکل وصورت سے پڑھا لکھا لگتا تھا۔

''اس فلیٹ میں اور کون رہتا ہے؟''

''فی الحال تو میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ لیکن آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ جس ہوٹل میں رکنا چاہیں، میں آپ کو وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔'' کبیر نے دوسری پیشکش کی۔

سارہ نے سوچا کہ بہتر ہے وہ اسی فلیٹ میں رک جائے۔ کسی ہوٹل میں رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے اور ساری رات ایک لڑکی کے لیے سڑکوں پر گھوم کر گزارنا اور بھی خطرناک تھا۔ اس نے سوچا کہ اب جو بھی ہو، اسے یہیں رکنا پڑے گا۔

''ٹھیک ہے میں یہاں رک جاتی ہوں۔'' سارہ نے بے چارگی سے کہا۔

''آپ اس کمرے میں چلی جائیں۔ کچھ کھانا پینا ہے تو مجھے بتادیں۔ میں نے ماش کی دال بنائی ہے۔'' کبیر نے سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کھانے پینے کا سن کر سارہ کی بھوک یکدم چمک اٹھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ اپنا نام بتانا چاہیں گی؟'' کبیر نے پوچھا۔

''جی میرا نام سارہ ہے۔''

''سارہ آپ سامنے والے بیڈ روم میں چلی جائیں اور بالکل بے فکر ہو جائیں۔ آپ بالکل محفوظ ہیں۔'' کبیر بولا۔

سارہ نے اپنا بیگ لیا اور سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔ جب تک وہ کمرے سے ملحق باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر نکلی، کبیر نے باہر سے ہی آواز دی کہ وہ کھانا لے کر کھڑا ہے۔ سارہ نے دروازہ کھولا تو کبیر ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑا تھا۔ سارہ نے ٹرے لی تو کبیر نے کہا۔

''برتن صبح لے لوں گا۔ آپ اندر سے کنڈی لگا لیں۔'' کبیر کہہ کر چلا گیا اور سارہ نے اندر سے کنڈی لگالی۔

رات اطمینان سے گزر گئی تھی۔

سارہ آٹھ بجے تیار ہو کر باہر آئی تو کبیر ناشتا تیار کر رہا تھا۔ کبیر نے سارہ کو خوشگوار لہجے میں صبح بخیر کہا۔ دونوں نے ناشتا کیا اور ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی باتیں بھی کرتے رہے۔ کبیر اسے اپنے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ کمپنی میں کیا کام کرتا ہے پھر وہ بولا۔

''اگر آفس سے بھی اس کا پتا نہ ملا تو پھر آپ کو واپس جانا پڑے گا۔ کیونکہ میں آپ کو مزید اپنے فلیٹ میں نہیں رکھ سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔''

''شاید میں واپس نہ جاؤں۔ شاید چلی بھی جاؤں۔ یہاں کہیں مجھے اگر پاؤں رکھنے کو جگہ۔۔مل جائے تو میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' سارہ مرجھائے ہوئے لہجے میں بولی۔

کبیر نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کچھ بتانا چاہو گی کہ واپس کیوں نہیں جانا چاہتیں؟''

سارہ نے پہلے تو سوچا کہ وہ حقیقت کبیر سے مخفی رکھے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ کبیر اچھا لڑکا ہے۔ شاید بتانے سے وہ اس کی کوئی مدد کردے اور اس شہر میں رہنے کا جواز پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اختصار سے اس شہر تک آنے کی وجہ بتادی۔ کبیر سنتا رہا اور پھر اپنا ناشتا ختم کرنے لگا۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر وہ آفس کے لیے نکل پڑے۔ گاڑی میں ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ یہ ضرور تھا کہ سارہ کبیر سے بہت متاثر ہوئی تھی کہ اس نے اس کا پوری طرح سے خیال رکھا تھا اور اس کی طرف بری نظر سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ عمارت آگئی جہاں کبیر کا آفس تھا۔

وہ بلند و بالا عمارت تھی۔ اس عمارت کے دوسرے اور تیسرے فلور پر کمپنی کے مالک کے دفاتر تھے جبکہ باقی فلورز اس نے دوسری کمپنیوں کو کرائے پر دیے ہوئے تھے۔

کبیر اسے لے کر پہلے فلور پر چلا گیا۔ ہال نما کمرے میں بہت سی میز کرسیاں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ تقریباً ہر میز پر کمپیوٹر موجود تھا۔ کمپنی کے ملازمین اپنی اپنی کرسی پر براجمان کام میں مصروف تھے۔

کبیر آگے آگے چل رہا تھا اور سارہ اس کے پیچھے تھی۔ کبیر ایک میز کے پاس رکا، وہاں ایک پچاس سال کی

عمر کا شخص بیٹھا کی بورڈ پر ہولے ہولے انگلیاں مار رہا تھا۔
کبیر نے اس کے پاس جاکر پہلے سلام کیا اور پھر حال چال پوچھنے کے بعد بولا۔
''ہمارے آفس میں نبیلہ نام کی ایک لڑکی کام کرتی تھی۔ آپ کے پاس اُن کا پتا لکھا ہوگا۔ وہ اِن کو چاہیے۔''
اس شخص نے ایک نظر سارہ کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''وہ تو پچھلے ہفتے دبئی چلی گئی۔''
''دبئی چلی گئی؟'' کبیر کے ساتھ ساتھ سارہ کا چہرہ بھی حیرت میں ڈوب گیا اور دونوں کی متحیر نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔
وہ مزید بولا۔ ''دراصل میں پچھلے ہفتے اپنی بیٹی کو ائرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں اچانک اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بہت خوش تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ دبئی جارہی تھی۔ اس نے مختصری ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مستقل دبئی جارہی ہے۔''
کبیر نے سارہ کی طرف دیکھا اور سارہ پریشانی کے عالم میں یہ سوچ رہی تھی کہ جس کی اُمید پر وہ اس شہر میں آئی تھی وہ تو شہر کیا، ملک چھوڑ کر جاچکی تھی۔ اب وہ کیا کرے گی، کہاں جائے گی؟ کیا واپس چلی جائے۔ اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے پاس؟
کبیر نے سارہ کے چہرے پر پریشانی دیکھی تو اسے ایک طرف لے جاکر بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں اور یہاں بیٹھ جائیں۔''
سارہ کرسی پر ٹک گئی۔ اس کی سوچ کا محور یہ بات تھی کہ وہ اب کہاں جائے گی۔ اس نے نبیلہ کی امید پر اس شہر تک کا سفر تو کرلیا تھا اور اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ کہیں بسیرا کرسکے۔ وہ عجیب صورتِ حال سے دوچار ہوگئی تھی۔
کبیر اس کمپنی میں صرف اپنے باس کے کام کرتا تھا۔ اس کا باس کئی کاروبار کرتا تھا جس میں سے ایک زمین کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ نئے گھر بنا کر بھی بیچنا تھا اور اس کاروبار میں باس کے لیے ساری بھاگ دوڑ کبیر ہی کرتا تھا۔ کبیر اپنے باس کے بہت قریب تھا۔
کبیر نے سارہ کو اس لیے ایک طرف بٹھا دیا تھا کیونکہ باس کے آنے کا وقت ہوچکا تھا۔ کبیر جلدی سے اپنی میز کی طرف بڑھا، اس نے دراز کھول کر ڈائری نکالی اور ورق پلٹنے لگا۔ ایک صفحے پر اس نے رک کر کچھ پڑھا اور ڈائری بند کردی۔ اچانک اس کی نگاہ داخلی دروازے کی طرف گئی اور وہ سیدھا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ اس کا باس داخل ہورہا تھا۔
کبیر کے باس کا نام احتشام بیگ تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ کلین شیو چہرہ اور آنکھوں میں عجیب سی روشنی تھی۔ سر کے بال بہت سے جھڑ چکے تھے اور جو بال سر پر تھے ان میں سے اس کے سر کی جلد دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے بالوں پر پیچھے کی طرف کنگھی کرتا تھا جو اس کے سر کی جلد کے ساتھ چپکے رہتے تھے۔ احتشام بیگ کے منہ میں سگار دبا ہوا تھا۔ سگار پینا اس کا شوق ہی نہیں اب کمزوری بن چکا تھا۔ اگر سگار سلگ نہ بھی رہا ہو تب بھی اس کی انگلیوں میں دکھائی دیتا تھا۔
احتشام بیگ شہر کا دولت مند کاروباری ہی نہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی بہت طاقتور تھا۔ اس کے چہرے کی نرمی کے پیچھے ایک بھیانک چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ چہرہ وہی لوگ دیکھ پائے تھے جن کو احتشام بیگ کی سختی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ احتشام بیگ کے پاس بے تحاشا دولت تھی لیکن وہ اور دولت کمانے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا تھا۔ کسی غلطی کی معافی دینا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ دولت کے ساتھ اس کی دوسری کمزوری حُسن تھا۔ وہ حُسن پر ایسا فریفتہ ہوتا تھا کہ بہت کچھ بھول جاتا تھا۔
احتشام بیگ اپنی مخصوص چال کے ساتھ چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ سگار کے کش بھی لے رہا تھا۔ اس کی گردن میں تمکنت تھی اور آنکھوں میں ایسی بے نیازی تھی جیسے وہ کسی کو دیکھ ہی نہ رہا ہو۔ جیسے ہی وہ کبیر کے پاس سے گزرا کبیر نے فوراً آگے بڑھ کر اپنی گردن کو خم دیتے ہوئے سلام کیا جس کا احتشام بیگ نے جواب دینے کے بجائے سوال داغ دیا۔
''کام ہوا؟''
''آج دوپہر کے بعد فائنل ڈیل ہے۔'' کبیر نے جواب دیتے ہوئے فوراً کمرے کا دروازہ کھولا اور احتشام بیگ اندر چلا گیا۔ کبیر نے بھی اندر جاتے ہی دروازہ بند کردیا۔
احتشام کا آفس کسی عالیشان تصویر کی طرح تھا۔ بڑی سی میز اور میز کے پیچھے قیمتی کرسی۔ ایک طرف پوری دیوار تک ریک تھا جہاں فائلیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے بائیں جانب دوسری میز پر قیمتی لیپ ٹاپ تھا۔ آنے جانے والوں کے لیے میز کے سامنے کرسیاں اور ایک طرف صوفہ اور اس کے درمیان شیشے کی میز تھی۔

''آج ڈیل فائنل ہو جانی چاہیے۔ بہت دن لے لیے ہیں۔ وہ بنگلا جب سے ہم نے لیا ہے، اس کو کوئی خریدنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہا ہے۔'' احتشام بیگ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے سگار منہ سے نکال کر اپنی انگلیوں میں دبا لیا۔

''میری پوری کوشش ہے اور امید ہے کہ آج فائنل ہو جائے گی۔'' کبیر کا لہجہ مؤدب تھا۔

احتشام بیگ کی نگاہ اپنے کمرے کی دیوار میں لگے شیشے سے پار باہر مرکوز تھی جہاں سارہ براجمان تھی۔

''وہ لڑکی کون ہے جو باہر بیٹھی ہے؟'' احتشام بیگ کے اس سوال نے کبیر کو بالکل بھی نہیں چونکایا کیونکہ وہ اپنے باس کو سب سے زیادہ جانتا تھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں پہلے سے تھی کہ جیسے ہی اس کی نگاہ سارہ پر پڑے گی، وہ سارے کام چھوڑ کر پہلے اسی کے بارے میں پوچھے گا اور ایسا ہی ہوا۔

''وہ سارہ ہے۔'' کبیر نے بتایا۔

''کون سارہ......؟'' سگار کا ایک کش لے کر احتشام بیگ نے اگلا سوال داغا۔

''ہمارے آفس میں ایک لڑکی کام کرتی تھی نبیلہ۔ یہ اس کی دوست ہے اور اس سے ملنے آئی ہے۔'' کبیر نے بتایا۔

احتشام بیگ کی نگاہیں مسلسل سارہ پر مرکوز تھیں ''اس سے ملنے آئی ہے تو یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''دراصل اس کے پاس اس آفس کا پتا تھا کہ وہ یہاں کام کرتی ہے۔'' کبیر نے اصل بات کو مخفی رکھا۔ اگر وہ یہ واضح کر دیتا کہ سارہ اس کے فلیٹ پر آئی تھی اور رات اسی کے فلیٹ میں قیام کیا تھا تو کبیر کے لیے اپنے باس کے سوالوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔ ''نبیلہ تو کام چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اب ہمارے پاس اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ سارہ شاید نوکری کے لیے آئی تھی۔ مجھے اس کی باتوں سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' کبیر نے سارہ کی نوکری کے لیے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔

احتشام نے اس کی بات سن کر کچھ سوچتے ہوئے سگار کے کش لیے اور پھر بولا۔ ''اسے اندر بلاؤ۔''

کبیر ایک لمحے کے لیے چونکا اور حکم کی تعمیل کرنے کے لیے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کبیر کے ساتھ اندر آ گئی۔ کبیر اسے باہر ہی سمجھا آیا تھا کہ وہ اس بات کا ذکر نہ کرے کہ وہ اس کے فلیٹ میں آئی تھی بلکہ پوچھنے پر یہی بتائے کہ وہ سیدھی اس جگہ آئی ہے۔

سارہ نے اندر آ کر سلام کیا۔ سارہ کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

احتشام بیگ نے سارہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور سگار کا کش لے کر اسے ایش ٹرے میں رکھ دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' احتشام بیگ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سارہ بیٹھ گئی جبکہ کبیر نے دوسری کرسی سنبھال لی۔

احتشام بیگ نے کبیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اس لڑکی کا پتا ہے تم لوگوں کے پاس جس کے لیے یہ یہاں آئی ہے۔''

''رحمانی صاحب بتا رہے تھے کہ وہ شادی کر کے دبئی چلی گئی ہے۔'' کبیر نے بتایا۔

احتشام بیگ کی نگاہیں سارہ کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

''کیوں ملنا چاہتی تھیں تم اس سے؟ نوکری کرنے کا ارادہ ہے؟''

''میرا تعلق اس شہر سے نہیں ہے۔ میں دراصل جاب کے لیے ہی آئی تھی لیکن وہ دبئی جا چکی ہے۔'' سارہ نے بھی فوراً کہہ دیا کہ شاید اس کا کام بن جائے۔

''وہ تو خود میرے پاس جاب کرتی تھی۔ وہ تمہیں جاب دینے کا اختیار نہیں رکھتی تھی کہ اس کے دبئی جانے کا تمہیں اتنا افسوس ہو رہا ہے۔'' احتشام بیگ کے ہونٹوں پر خفیف سی تمسخرانہ مسکراہٹ آئی اور معدوم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایش ٹرے سے اپنا سگار اُٹھایا اور دوبارہ کش لینے لگا۔

سارہ نے کہا۔ ''وہ ہوتی تو میری سفارش کر دیتی۔''

''تمہاری سفارش کے لیے میری آنکھیں ہی بہت ہیں۔'' احتشام بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی......؟'' سارہ نے چونک کر پوچھا۔

''میں اس وقت سے کاروبار کر رہا ہوں جب شاید تم دنیا میں بھی نہ آئی ہو۔ میری نظریں جان لیتی ہیں کہ کون کام کا آدمی ہے اور کون نہیں ہے۔ تمہارے چہرے کا اعتماد اور لہجہ بتاتا ہے کہ تم میری پرسنل سیکریٹری کے لیے بہت موزوں ہو۔ میری پرسنل سیکریٹری دو دن پہلے اچانک جاب چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اس کی کرسی خالی ہے۔ چاہو تو تم اس کرسی پر ابھی سے بیٹھ جاؤ۔ کبیر تمہیں سب سمجھا دے گا۔'' احتشام بیگ نے اپنے دل کے بھید کو چھپا کر وضاحت کی۔

احتشام بیگ کی پیشکش سن کر سارہ اندر سے کھل اٹھی۔ اسے اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا تھا کہ اسے آفس میں [illegible] یہ تو ایسے ہی ہے کہ اس نے

اپنا شہر چھوڑا اور کامیابی کے در کھلنے لگے۔ اس میں اہم کردار کبیر کا تھا۔ اگر وہ اسے نہیں ملتا اور اچھے انداز میں اس کے ساتھ پیش نہ آتا تو وہ شاید ساری رات سڑکوں پر دربدر ہونے کے خوف سے واپسی کی بس پکڑ کر اپنی ماں کے پاس چلی جاتی اور حالات کو قبول کر لیتی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' احتشام بیگ نے پوچھا تو وہ چونکی۔

''مجھے منظور ہے سر......لیکن......'' سارہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں ہاں بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔'' احتشام بیگ نے کہہ کر سگار کا کش لیا۔

''یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے۔ میرے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں ہے۔'' سارہ نے بلا تامل کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' احتشام بیگ نے بے پروائی سے کہہ کر کبیر کی طرف دیکھا۔ ''فی الحال اسے اپنے ساتھ والے فلیٹ کی چابی دے دو۔''

''اوکے سر۔'' کبیر نے جلدی سے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''اسے باہر لے جاؤ اور سارا کام سمجھا دو، کام مشکل نہیں ہے ابھی سمجھ جائے گی۔'' احتشام بیگ بولا۔

سارہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور کبیر کے ساتھ باہر آ گئی۔ احتشام بیگ اسے جاتا ہوا حریص بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایسی ہی نظروں اور جملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کی سیکریٹری اچانک جاب چھوڑ کر چلی گئی تھی اس نے اپنی تنخواہ کا بھی مطالبہ نہیں کیا تھا۔

کبیر کو یہ بات کھٹک رہی تھی کہ اس کے باس نے اچانک اسے نوکری پر کیوں رکھ لیا ہے۔ لیکن فی الحال وہ سارہ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ کبیر بھی اپنے دل میں کچھ عزائم لیے بیٹھا تھا۔

کبیر، سارہ کو سیکریٹری کی میز پر لے آیا۔ اس نے ڈائری نکال کر کچھ پڑھا تھا۔ اس میز کے عین سامنے احتشام کا کمرا تھا اور احتشام کے کمرے کی دیوار میں ایک بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا جس سے احتشام بیگ آسانی سے آر پار دیکھ سکتا تھا لیکن اس طرف سے کوئی بھی اپنے باس کے کمرے میں جھانک نہیں سکتا تھا۔ احتشام بیگ اس وقت بھی کرسی پر جھولتے اور سگار کے کش لیتے ہوئے اپنی نظریں سارہ پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ کبیر نے جس کرسی پر سارہ کو بٹھایا تھا وہ بھی اس رخ پر تھی کہ احتشام بیگ اپنی کرسی پر بیٹھے ہی سارہ کو دیکھ لیتا۔

کبیر ڈائری اس کے سامنے رکھے اسے سب کچھ سمجھا رہا تھا۔ سارہ کے لیے وہ کام مشکل نہیں تھا۔ احتشام بیگ نے کہاں جانا ہے اور کس نے کب اس سے ملنے آنا ہے، وہ اس نے اپنی ڈائری میں لکھ کر وقت کے مطابق اپنے باس کو مطلع کرنا تھا۔ احتشام بیگ کی مصروف زندگی اس ڈائری کی محتاج تھی۔

جب اچھی طرح سے کبیر نے سمجھا دیا تو اس نے پوچھا۔ ''اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے؟''

''بالکل' مجھے ہر چیز سمجھ میں آ گئی ہے۔ یہ کونسا اکاؤنٹ کا کام ہے کہ مجھے مشکل پیش آتی۔'' سارہ مسکرائی۔

''بس یہ سمجھ لو کہ باس کے چوبیس گھنٹے تمہاری اس ڈائری کے صفحوں پر ہیں اور ان کی لگام تمہارے ہاتھ میں ہے جس طرف چاہو گی وہ مڑ جائیں گے۔'' کبیر نے کہہ کر ہلکی سی مسکراہٹ عیاں کی۔

''ڈائری پر یہ دوائی کا وقت بھی لکھا ہوا ہے۔'' سارہ نے پڑھا۔

''باس کو شوگر اور ہائی بلڈ پریشر ہے۔ آفس آنے کے بعد وہ کب کونسی دوائی کھائیں گے۔ یہ بتانا بھی تمہاری ہی ذمے داری ہے۔'' کبیر نے کہا۔

''اوکے میں سب کرلوں گی۔''

''دیکھو تمہاری قسمت کہ تمہیں اس آفس میں قدم رکھتے ہی جاب مل گئی۔'' کبیر مسکرا کر بولا۔

''ہاں یہ تو ہے۔ بعض اوقات انسان کو وہ کچھ مل جاتا ہے جو اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں آپ کی مدد شامل نہ ہوتی تو شاید میں رات ہی واپس چلی جاتی۔ آپ کا شکریہ۔'' سارہ نے اس کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔

''کوئی مشکل ہو تو مجھ سے رابطہ کر لینا۔'' کبیر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے ارادہ بدل لیا اور باس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

سارہ ڈائری کے صفحات پڑھ رہی تھی۔ اچانک اس نے وقت دیکھا اور ڈائری لے کر باس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اُسے باس کو اطلاع دینی تھی کہ آدھے گھنٹے کے بعد ان کی ایک میٹنگ ہے۔

سارہ کے لیے وہ دن مصروف بھی تھا اور خوشگوار بھی۔ جس کام کی نوکری اسے ملی تھی، وہ اسے بہت دلچسپ لگا تھا۔ ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے احتشام بیگ اسے ایک ہوٹل میں بھی لے گیا تھا۔ وہ شہر کا بڑا ہوٹل تھا اور وہاں جا کر

سارہ بہت خوش ہوئی تھی۔
آفس ٹائم کے بعد کبیر اسے اپنے ساتھ کار میں لے گیا۔ راستے میں وہ ایک علاقے میں رک گئے۔ وہ اس علاقے کا بازار تھا۔ وہاں ایک گودام تھا جہاں بسکٹ وغیرہ کے بہت سے کارٹن ایک دوسرے کے اوپر ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ گودام کے دروازے کے پاس ہی ایک میز کرسی تھی جس پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ کبیر نے کار سے اتر کر وہاں سے بسکٹ کے کچھ ڈبے لیے اور واپس کار میں آ گیا۔ سارہ چپ چاپ ان کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اس اپارٹمنٹ آ گئے جہاں کبیر کا فلیٹ تھا۔ کبیر نے پہلے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا، اندر جا کر فوراً واپس آ گیا۔ اس کے فلیٹ کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے فلیٹ کا دروازہ تھا۔ کبیر نے اس فلیٹ کا دروازہ کھولا اور بولا۔
''فی الحال تم یہاں رہو گی۔'' کبیر نے کہا اور اندر جا کر فلیٹ کی تمام روشنیاں جلا دیں۔ سارہ نے فلیٹ دیکھا۔ سجا سجایا فلیٹ بالکل کبیر کے فلیٹ جیسا تھا۔
کبیر نے ایک طرف اشارہ کیا تو وہاں چابیاں لگی ہوئی تھیں۔ ''یہ کمروں کی چابیاں ہیں اور ان میں ہی ایک مین دروازے کی بھی چابی ہے۔''
''ٹھیک ہے۔''
''میں چلتا ہوں۔'' کبیر نے کہا۔
''اوکے......'' سارہ نے کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ کبیر کچھ دیر بند دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ پھر اپنے فلیٹ میں آ گیا۔
سارہ کو لگ رہا تھا کہ اس کی زندگی بدل گئی ہے مگر اتنی جلدی بدل جائے گی، اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اب تو اسے اپنی ماں کا فیصلہ بھی صحیح لگنے لگا تھا۔ اگر اس کی ماں دوسری شادی نہ کرتی تو وہ بھی گھر نہ چھوڑتی اور اپنی قسمت کا یہ روپ دیکھ نہ پاتی۔
سارہ کو اس آفس میں کام کرتے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس کے لیے وہ کام دلچسپ تھا۔ باس اسے اپنے ساتھ بھی لے جاتا تھا اور کبھی وہ آفس سے باہر قدم بھی نہیں رکھتے تھے۔ سارہ کو دن میں کئی بار باس کی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور جب وہ اس کے کمرے میں جاتی تھی تو احتشام بیگ مسکراتے ہوئے کوئی نہ کوئی معنی خیز بات کہہ دیتا تھا۔
اُس دن صبح سارہ نے تیار ہو کر آئینے میں جائزہ لیا۔ سارہ نے اپنا ہینڈ بیگ لیا اور جو نہی اس نے دروازہ کھولا، وہ چونک گئی، سامنے کبیر کھڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ رات سے ہی اسی طرح کھڑا ہو۔
''میں دستک دینے ہی والا تھا۔''
''کیوں خیریت ہے؟''
''ہاں آفس جا رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ ہی لیتا چلوں۔'' کبیر نے کہا۔
''تو پھر چلیں؟'' سارہ نے اس کی طرف دیکھا۔
''چلو۔'' کبیر لفٹ کی طرف بڑھا۔ سارہ نے دروازہ مقفل کیا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔
کبیر کار چلا رہا تھا اور اس کے برابر میں سارہ خاموش بیٹھی تھی۔ کبیر نے خاموشی توڑی۔
''جو کام میں کر رہا ہوں، یہ میری منزل نہیں ہے۔''
''آپ کی کیا منزل ہے؟'' سارہ نے پوچھا۔
''میری منزل وہ ہے جس بلندی پر احتشام بیگ کھڑا راج کر رہا ہے۔'' کبیر نے بتایا۔
''اس کے لیے ایک طویل سفر کی ضرورت ہے۔'' سارہ نے کہا۔
''طویل سفر بے وقوف لوگ تھکنے کے لیے کرتے ہیں، سمجھدار ایسا نہیں کرتے۔'' کبیر بولا۔
''شاید آپ اپنی جگہ صحیح سوچ رہے ہوں۔'' سارہ نے کندھے اچکائے۔
گاڑی چلاتے ہوئے کبیر نے...... سارہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''ایک بات کہوں۔''
''جی کہیں۔''
''تم جانتی ہو کہ باس نے اچانک تمہیں جاب پر کیوں رکھ لیا، اور رہنے کو اتنی اچھی جگہ بھی...... دے دی۔''
''میری قسمت اچھی ہے۔''
''تمہاری قسمت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن باس کی نیت خراب ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''میری بات کا مطلب تم بہت جلدی جان جاؤ گی۔''
''میرے جاننے سے پہلے اگر آپ بتا دیں تو؟''
''شاید میرے بتانے پر تمہیں یقین نہ آئے۔''
کبیر نے کار پارک کر دی تھی۔ ان کا آفس آ گیا تھا۔ بات اسی جگہ ختم ہو گئی تھی۔ دونوں کار سے باہر نکلے اور عمارت کے اندر چلے گئے۔
سارہ اپنی میز کی طرف چلی گئی جبکہ کبیر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ سارہ نے ڈائری کھول کر دیکھی تو سوچا کہ باس کا آج کا دن بہت ہی مصروف تھا۔ شام تک ان کی سب میٹنگز

آفس سے باہر ہی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد احتشام بیگ بھی اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر جاتے ہی اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے پہلے سارہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے حسن میں کھو سا گیا۔ اچانک انٹر کام کی بیل ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے سارہ کی آواز آئی۔
''سر آپ کو میٹنگ کے لیے فیکٹری جانا ہے۔''
''میں پانچ منٹ میں آرہا ہوں۔ تم بھی ساتھ چلو گی۔'' احتشام بیگ نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور ایک فائل کھول لی۔
پانچ منٹ بعد احتشام بیگ باہر نکلا تو دوسری طرف سے کبیر بھی نکل آیا تھا۔ سارہ بھی ڈائری اُٹھا کر احتشام بیگ کے پیچھے چل پڑی۔ تینوں نیچے گئے اور سیاہ رنگ کی پجیرو کی طرف بڑھے۔ پہلے احتشام بیگ پجیرو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا، سارہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں بیٹھے اسی اثنا میں کبیر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور سارہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر احتشام بیگ کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ پجیرو آگے بڑھ گئی۔
سب سے پہلے وہ فیکٹری گئے وہاں احتشام بیگ نے میٹنگ کی، وہاں سے اُٹھ کر وہ ایک اور آفس میں چلے گئے، اس جگہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا تک بند کمرے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروفیت رہی۔ اس دوران کبیر جانے کہاں چلا گیا اور سارہ جس کرسی پر بیٹھی تھی اسی جگہ بیٹھی احتشام بیگ کا انتظار کرتی رہی۔
جب احتشام بیگ میٹنگ ختم کر کے باہر نکلا تو جانے کبیر بھی کہاں سے نکل کر وہاں آگیا۔ تینوں پھر پجیرو میں بیٹھ گئے اور کبیر انہیں ایک جگہ زمین دکھانے کے لیے لے گیا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جو احتشام بیگ کو بڑی تفصیل سے اس زمین اور اس کے اردگرد کے ماحول کے بارے میں بتارہے تھے۔
ایک میٹنگ سے نکل کر جب احتشام بیگ باہر آتا تھا تو سارہ اسے ڈائری کھول کر بتادیتی تھی کہ اسے اب کہاں جانا ہے وہ اس سمت چل پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ سارہ کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور جب تک میٹنگ ہوتی رہتی تھی، سارہ بیزاری سے وقت گزارتی تھی۔ وہ تھک سی گئی تھی .... سہ پہر ہوگئی تھی۔ بھوک سے بھی اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ کل کی نسبت آج کا دن تھکا دینے والا اور بور تھا۔
زمین کے بارے میں معلومات لے کر احتشام بیگ نے واپسی کے لیے پجیرو کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اگلی میٹنگ احتشام بیگ کے آفس میں تھی اس لیے اب سارہ کو یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر کچھ سکون محسوس کرے گی۔ پجیرو کے پاس پہنچ کر احتشام بیگ نے کبیر سے کہا۔
''زمین مجھے پسند ہے۔ تم بات آگے بڑھاؤ۔''
''بہتر سر۔'' کبیر نے سر ہلا دیا۔
''اور دیکھو بات اسی قیمت سے شروع کرنا جو میں نے بتائی ہے۔'' احتشام بیگ نے تاکید کی۔
''ایسا ہی ہوگا سر۔ ایک بات اور بتانی تھی آپ کو۔'' کبیر نے کہا۔
''ہاں بولو۔'' احتشام بیگ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
''ہمارا وہ بنگلا وہی پارٹی پانچ کروڑ میں خریدنے کو تیار ہے۔ وہ بیعانہ دو کروڑ کیش دے کر باقی رقم کے لیے ایک ہفتے کا وقت مانگ رہی ہے۔'' کبیر نے بتایا۔
احتشام مسکرایا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے۔ فوراً سودا پکا کردو۔ بڑی مشکل سے اس بنگلے کا کوئی خریدار تیار ہوا ہے۔''
''اوکے سر۔''
''تم ان لوگوں کے ساتھ بات آگے بڑھاؤ۔ ہم جارہے ہیں۔'' احتشام بیگ نے کہہ کر پجیرو کا دروازہ کھولا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے برابر میں سارہ بیٹھ گئی۔ پجیرو وہاں سے نکل گئی۔ جاتے ہوئے احتشام بیگ نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہوٹل چلے۔
سارہ نے سنا تو برا سا منہ بنایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آفس جارہے ہیں لیکن باس نے ہوٹل چلنے کو کہہ دیا تھا۔ سارہ نے اپنی ڈائری کھولی اور ایک نظر اس صفحے پر دیکھ کر کہا۔
''سر آپ کی اگلی میٹنگ کسی ہوٹل میں نہیں بلکہ آپ کے آفس میں ہے۔''
''میں جانتا ہوں۔'' احتشام بیگ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ سارہ نے اپنی ڈائری بند کردی لیکن وہ محسوس کررہی تھی کہ اس کے باس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ سارہ جان بوجھ کر سامنے دیکھتی رہی۔
ڈرائیور نے پجیرو ہوٹل کے پورچ میں کھڑی کردی تھی۔ احتشام نے سارہ کو بھی باہر آنے کا کہا۔ دونوں ہوٹل کے اندر جانے کے لیے بڑھے۔

سارہ اپنے باس کے پیچھے چلتے ہوئے ڈائننگ ہال میں آ گئی۔ احتشام بیگ نے ایک خالی میز منتخب کی اور بیٹھنے کے بعد سارہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سارہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کھانے کے لیے جو منگوانا چاہو، منگوا لو۔'' احتشام بیگ نے مینیو کارڈ اُٹھا کر اس پر نظریں جما دیں۔ سارہ نے جھجکتے ہوئے کارڈ اُٹھایا اور کھانے پینے کی فہرست دیکھنے لگی۔ اسے بریانی پسند تھی اس نے اپنے لیے بریانی منگوا لی۔

دونوں نے اپنی اپنی پسند کا آرڈر دیا اور ویٹر چلا گیا۔ احتشام بیگ نے سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک عجیب سی مسکراہٹ عیاں کی اور بولا۔

''میری زندگی میں دو چیزوں کی بہت اہمیت ہے۔'' وہ جملہ کہہ کر چپ ہو گیا اور مسلسل سارہ کی طرف دیکھنے لگا جبکہ سارہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''اس وقت میں تمہارا باس نہیں ہوں۔ ہم دوست ہیں۔ اس لیے تم کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھ سے کچھ بھی پوچھ سکتی ہو۔'' جب سارہ کی خاموشی بڑھی تو احتشام بیگ نے بے تکلفی سے کہا۔

''جی آپ بتا رہے تھے کہ دو چیزوں کی بہت اہمیت ہے۔'' سارہ جلدی سے بولی۔

''میری پہلی کمزوری دولت ہے۔ دولت کمانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بڑے سے بڑا رسک لے سکتا ہوں اور میرا ایک پیسہ جب کوئی ناجائز اپنے منہ میں ڈالنا چاہے تو میں اپنا وہ پیسہ اس سے واپس لینے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتا ہوں۔ دولت میری کمزوری ہے۔'' احتشام بیگ نے زعم سے بتایا۔

اسی وقت ویٹر ان کا آرڈر لے کر آ گیا اور ان کے سامنے سجا کر چلا گیا۔

''کھانا شروع کرو۔'' احتشام نے کہا۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ احتشام نے اپنے لیے ہلکا پھلکا کھانا منگوایا تھا جس میں سلاد نمایاں تھی۔

پھر احتشام نے پوچھا۔ ''تم یہ نہیں پوچھو گی کہ وہ دوسری کونسی چیز ہے جس کی اہمیت میری زندگی میں بہت زیادہ ہے۔''

''جی آپ بتا رہے تھے۔'' ایک بار پھر سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

احتشام کی نگاہیں سارہ کے خوبصورت چہرے پر جم گئیں۔ وہ بولا۔ ''دولت کے بعد میری زندگی میں جس چیز کی اہمیت ہے، وہ حسن ہے۔ خوبصورتی ہے۔ جب میں خوبصورتی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کھو جاتا ہوں۔ جیسے جب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہارے خوبصورت چہرے اور ان جھیل سی آنکھوں میں ڈوب گیا۔''

احتشام کہتے ہوئے رکا اور سلاد کھانے لگا۔ جبکہ سارہ کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی تھی اور حیرت اس کے چہرے پر عیاں ہونے لگی تھی۔ ایک لمحے ہی میں اسے سمجھ میں آ گیا کہ اس کے باس نے اتنی جلدی اسے نوکری کیوں دے دی تھی۔ وہ مہربانی دراصل اس کے ہوس کی پہلی سیڑھی تھی۔ کبیر نے اسے ٹھیک ہی کہا تھا کہ باس کی نیت خراب ہے۔

احتشام نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سارہ کا پورا جسم کانپ گیا۔ وہ بولا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو۔ تم جیسی خوبصورت اور پرکشش لڑکی کبھی میری سیکریٹری نہیں رہی۔ تم سب سے بڑھ کر ہو۔''

سارہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گلاس میں پانی ڈال کر اپنے کانپتے ہاتھوں سے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔

''سر...... آپ کی میٹنگ کا وقت ہو چکا ہے۔ شاید آفس میں آپ کا انتظار ہو رہا ہو۔''

''میں اپنے بزنس کا بادشاہ ہوں۔ کوئی میرا انتظار کرے تو کرتا رہے، مجھے پروا نہیں ہے کیونکہ اس وقت میرے آفس میں جو میرا انتظار کر رہا ہے، وہ پیاسا ہے اور میں کنواں ہوں۔ وہ گھنٹوں میرا انتظار کرے گا۔ اس وقت مجھے اس کی نہیں تمہاری ایک مسکراہٹ کی پروا ہے۔'' احتشام پُرغرور لہجے میں بولا۔

سارہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ کچھ سہم اور گھبرا سی گئی تھی۔ احتشام نے اس کا پھر ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی خالی اُنگلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے ہاتھ کی اُنگلیاں خالی ہیں۔ جتنی تم خوبصورت ہو اتنی ہی خوبصورت ہیرے کی انگوٹھیاں تمہاری ہر انگلی میں ہونی چاہئیں، اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم وہی کرو گی جو میں کہوں گا۔''

سارہ کوشش کے باوجود اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکی۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی کہ اچانک احتشام کا موبائل فون بجا اور اس نے ناگواری سے میز پر پڑا فون دیکھا۔ اسکرین پر جو نام تھا وہ اس وقت کال کاٹ نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً اسے سارہ کا ہاتھ چھوڑ کر فون اُٹھانا پڑا۔ وہ کچھ دیر فون پر بات کرتا

رہا اور بات مکمل کرنے کے بعد اس نے سارہ سے مخاطب ہو کر کہا۔
''جلدی سے کھانا کھالو، ہمیں ابھی جانا ہے۔''
''میں کھانا کھا چکی ہوں۔''
احتشام نے چٹکی بجا کر ویٹر کو بلایا اور بل دے کر کھڑا ہو گیا۔
دونوں ہوٹل سے باہر پارکنگ میں کھڑی گاڑی تک آئے، اور ان کی پجیرو سڑک پر دوڑنے لگی۔ احتشام نے سارہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ایسی زہر آلود مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر کسی کو بھی نفرت ہو جائے۔ سارہ کی حالت ایسی ہی تھی جیسے وہ پنجرے میں بند اور بے بس ہو۔
آفس پہنچ کر سارہ جلدی سے اپنی میز کی طرف چلی گئی اور احتشام اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا دوست اس کا انتظار کر رہا تھا جو اچانک دبئی سے آیا تھا جبکہ جس سے اس کی میٹنگ تھی وہ ایک طرف بیٹھا، انتظار میں سوکھ رہا تھا۔
سارہ بظاہر ڈائری نکال کر اس میں کچھ پڑھ رہی تھی لیکن حقیقت میں وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس کے باس نے جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ فیصلہ کرنے لگی کہ وہ واپس اپنی ماں کے پاس چلی جائے۔ اپنے باس کی بے باکی اسے واپس لوٹانے کے لیے کافی تھی۔ وہ مزید یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ آگے کیا ہو گا، وہ سوچ کر ہی کانپ گئی۔
اچانک کبیر اس کے پاس چلا آیا۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر پوچھا۔
''کیسا رہا آج کا دن؟''
''اچھا رہا۔'' سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔
''لیکن تمہارا چہرہ تو کچھ اور بتا رہا ہے۔'' کبیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''میرا چہرہ کیا بتا رہا ہے؟''
''یہ کہ باس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر تمہارا ہاتھ پکڑ لیا ہو گا اور تمہاری خالی انگلیوں کو دیکھ کر کہا ہو گا کہ ان کو ہیروں سے بھر دوں...... '' کبیر کہہ کر ہولے سے مسکرایا۔
اس کی بات سن کر سارہ چونکی۔
''آپ کیسے جانتے ہیں؟'' سارہ کے منہ سے یکدم نکلا۔
''ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ اس کرسی پر بیٹھنے والی ہر سیکریٹری کو ایسے الفاظ ہی نہیں سننے پڑتے بلکہ......'' کبیر نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
سارہ نے کچھ دیر کے لیے کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں چرا کر بولی۔
''میں نے یہ نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''
''اتنی جلدی ہمت ہار دی۔''
''مجھے ایسی للچائی ہوئی اور ہوس میں ڈوبی نظروں کی عادت نہیں ہے اور نہ میں یہ برداشت کرتی ہوں۔'' سارہ متانت سے بولی۔
''تم نے کبھی سوچا تھا کہ تمہاری زندگی اتنی جلدی بدل جائے گی؟ تم اپنے شہر سے اپنی دوست کے پاس آنے کے لیے نکلو گی اور وہ تمہیں ملے گی۔ میں مل جاؤں گا اور پھر تمہیں میں یہاں آفس لے آؤں گا اور ایک نظر دیکھ کر باس تمہیں اپنی سیکریٹری رکھ لے گا اور وہ اپنے دل کی ہوس کی رال تمہارے کانوں میں ٹپکا دے گا۔'' کبیر کہہ رہا تھا۔
''میں سمجھتی تھی کہ میری قسمت اچھی ہے۔'' سارہ کا لہجہ مرجھا گیا۔
''قسمت اچھی ہو سکتی ہے اگر تم چاہو۔'' کبیر کا انداز معنی خیز ہو گیا۔ اس نے اپنی بات کہہ کر سارہ کی طرف دیکھا۔
''کیسے؟'' سارہ نے سوالیہ نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔
''باس کی نظر میں اس کے آفس میں کام کرنے والی کسی لڑکی کی کوئی عزت نہیں ہے۔ یوں اچانک خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے کہ تم میرا ساتھ دو اور ہم باس کو سبق بھی سکھا دیں اور تمہیں اپنی زندگی سنوارنے کا موقع بھی مل جائے۔'' کبیر کا لہجہ دھیما تھا۔
''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' سارہ نے کہا۔
''کیا ہم شام کو کہیں مل کر بات کریں۔'' کبیر بولا۔
''شام کو کہاں بات کریں؟'' سارہ نے پوچھا۔
''ہم ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے فلیٹ میں آ جانا۔'' کبیر بولا۔
سارہ نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کبیر کے دماغ میں کیا ہے۔ کبیر اسی وقت اس جگہ سے اٹھ گیا۔
سارہ نے آفس میں جو باقی وقت گزارا، اس میں باس اسے کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں اپنے کمرے میں بلا لیتا تھا اور پھر وہ اپنے دل کی باتیں شروع کر دیتا تھا۔ اس کی

باتیں، ہوس بھری نظریں اور سگار کا دھواں..... سارہ کے لیے سب ناقابلِ برداشت ہوتا تھا۔ اُس نے واپس جانے کا جوفیصلہ کیا تھا، وہ بھی بدل لیا تھا۔ وہ یاں کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اب وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ کبیر کے دل میں کیا ہے۔ ایسا کیا ہے کہ جس سے وہ باس کو سبق سکھا سکتے تھے۔

آفس ٹائم ختم ہوتے ہی سارہ سیدھی اپنے فلیٹ چلی گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد دروازے پر ہلکی دستک ہوئی تو سارہ نے پوچھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے کبیر کھڑا تھا۔

''کیا ہم ڈنر باہر کریں؟ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو تمہیں ناپسند ہو۔'' کبیر کہہ کر مسکرایا۔

سارہ بھی اس کی بات سن کر مسکرائی اور اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ دونوں ایک سستے لیکن اچھے ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ اس ریسٹورنٹ کا انتخاب کبیر نے اس لیے کیا تھا کہ کم از کم انہیں یہ ڈر نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کا باس بھی اس ریسٹورنٹ میں اچانک آجائے۔ وہ دولت مند شخص ایسے ریسٹورنٹ کا رخ نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی کبھی وہ اس طرف آیا تھا۔

دونوں الگ تھلگ بیٹھ گئے۔ دونوں نے کھانے کا آرڈر دیا پھر کبیر نے کہا۔

''باس کے پاس نوکری کرتے ہوئے تم کیا محسوس کررہی ہو؟''

''نفرت۔'' سارہ نے بلاتامل جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر کبیر مسکرادیا۔

''اس نفرت کو باس کے تابوت میں اس کی بربادی کی کیل بنا کر ٹھوک دو۔'' کبیر نے کہا۔

''کیسے؟'' سارہ نے پوچھا۔

کبیر کہنے لگا۔ ''میں اس شہر میں بڑا آدمی بننے کے لیے آیا تھا۔ مجھے کہیں اچھی نوکری نہیں ملی تو میں ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس کمیشن پر کام کرنے لگا۔ ایک دن احتشام بیگ کو ایک بنگلا دکھانے لے گیا تو اس سے بات چیت ہوئی اور اس نے مجھے پیشکش کردی کہ میں اس کے لیے کام کروں۔ وہ پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اس کے لیے اچھی زمین دیکھتا، اور باس کو اس زمین کے بارے میں بتاتا۔ خریداری سے لے کر..... بیچنے تک اس کے سارے کام میں کرتا ہوں۔''

ویٹر کھانا لے کر آگیا تھا۔ دونوں کھانا بھی کھاتے رہے اور کبیر بولتا رہا۔

''مجھے باس سے نفرت ہے۔ کیونکہ اس کی نظر میں کسی عورت کی کوئی عزت نہیں ہے۔ کئی بار میں بھی سوچ چکا ہوں کہ نوکری چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن پھر رک جاتا ہوں کہ میرے پاس اپنا کچھ کرنے کے لیے سرمایہ نہیں ہے۔ لیکن اب میں فیصلہ کرچکا ہوں اور میرے پاس اپنا سرمایہ بنانے کا بہترین موقع بھی ہے۔''

''آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' سارہ نے پوچھا۔

''باس ایک بنگلا بیچ رہا ہے۔ ایک خریدار اس بنگلے کو پانچ کروڑ میں خریدنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے کچھ ایسا جال بچھایا ہے کہ پارٹی ایڈوانس دو کروڑ کیش دینے پر راضی ہوگئی ہے۔ میں نے وہ رقم ہفتے کی صبح کو دینے پر راضی کیا ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو بینک بند ہوتے ہیں۔ باس کی فطرت میں ہے کہ وہ رات کے ڈھائی بجے آتا ہوا پیسہ بھی لینے سے انکار نہیں کرتا۔ دولت اور لڑکی دیکھ کر اس کی ہوس جاگ جاتی ہے۔ وہ دو کروڑ لے کر میں فرار ہوجانا چاہتا ہوں۔''

کبیر کی بات سن کر سارہ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور کبیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں حیرت تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے سارہ کا جسم ساکت ہوگیا ہو۔

''میں نے تم پر اتنی جلدی اعتبار اس لیے کیا ہے کیونکہ تم ان تمام لڑکیوں سے مختلف ہو جن لڑکیوں نے تم سے پہلے اس سیٹ پر کام کیا تھا۔ تم اپنے باس کی نظروں اور باتوں کو برداشت نہیں کرسکیں اور نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ جبکہ وہ تمام لڑکیاں برداشت بھی کرتی رہیں اور ہیروں کی انگوٹھیوں کے انتظار میں بھی رہیں۔'' کبیر نے کہا۔

''آپ کو نہیں لگ رہا ہے کہ آپ ایک خطرناک کام کرنے جارہے ہیں؟'' سارہ بولی۔

''اس سے اچھا موقع کوئی اور نہیں ملے گا۔ میں نے ایسا منصوبہ ترتیب دیا ہے کہ کسی کو ہم پر شک بھی نہیں ہوگا۔''

''دو کروڑ ایک بڑی رقم ہے اور دو کروڑ روپے لے کر بھاگنا مشکل کام ہے۔'' سارہ بولی۔

''سب کچھ میرے دماغ میں ہے۔ تم اندازہ بھی نہیں کرسکتیں کہ میں نے کیسا محفوظ منصوبہ تیار کیا ہے۔'' کبیر نے شہادت کی انگلی اپنی کنپٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔ سارہ چپ رہ کے سوچنے لگی۔ وہ کبیر کی بات سن کر کھانا اور بولنا بھول گئی تھی۔

جب سارہ چپ بیٹھی رہی تو کبیر نے سرگوشی کی۔ ''وہ کروڑ سے زندگی سنور جائے گی۔ ہمارے پاس اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ سوچ لو، فیصلہ کرلو۔ میرا ساتھ دوگی تو فائدے میں رہوگی۔''

کبیر کے وہ الفاظ سارہ کو یاد آرہے تھے۔ وہ اس کی بات سن کر ریسٹورنٹ سے واپس گھر آگئی تھی۔ تب اس نے اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جب سے وہ گھر واپس آئی تھی، مسلسل کبیر کی باتوں پر غور کررہی تھی اور کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ اس کا نوکری کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ واپس بھی نہیں جانا چاہتی تھی لیکن وہ کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پارہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ آفس پہنچی تو احتشام پہلے سے ہی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ آفس ٹائم سے پندرہ منٹ پہلے آگیا تھا۔ اس نے سارہ کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

''یس سر۔'' کمرے میں جاتے ہی سارہ نے کہا۔

احتشام نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''آج تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ تم آج دوپہر تک میری تمام میٹنگز کینسل کردو۔ میں ایک ضروری کام سے باہر جارہا ہوں۔ دوپہر تک واپس آؤں گا۔ اور پھر تم میرے ساتھ رہوگی۔ رات کا کھانا ہم ایک ساتھ کھائیں گے اور تم اب اس فلیٹ میں نہیں رہوگی بلکہ میں تمہیں ایک نئے فلیٹ کی چابی دوں گا بلکہ خود تمہیں اس فلیٹ میں چھوڑ کر آؤں گا۔'' احتشام کی نظریں اس پر مرکوز تھیں اور اس کے الفاظ میں عجیب وحشت تھی۔

''اوکے سر۔'' سارہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

''تمہارے ہاتھوں کی خالی انگلیاں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔'' اس نے ایک بار پھر اس کی طرف ہوس زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ تم کبھی کسی اچھے سے پُرفضا شہر میں گھومنے گئی ہو؟''

''نہیں سر کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' سارہ نے نفی میں گردن ہلادی۔

''اگلے ہفتے بھوربن میں میری میٹنگ متوقع ہے۔ اس کا پروگرام تمہارے پاس آجائے گا، تیار رہنا۔ تمہیں بھی ساتھ لے چلوں گا۔'' وہ بولا۔

''جی بہتر سر۔'' سارہ نا چاہتے ہوئے مسکرائی۔ ''اب میں چلوں سر۔''

''ہاں تم جاؤ۔ مجھے بھی جلدی جانا ہے۔'' اس کا اتنا کہنا تھا کہ سارہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ اس نے غصے سے دانت میسے اور اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی نوکری چھوڑ کر چلی جائے۔ لیکن کہاں جائے؟ اس سوال کی زنجیر نے اسے اپنی کرسی کی طرف جانے پر مجبور کردیا۔

تھوڑی دیر کے بعد احتشام بیگ چلا گیا اور کبیر یکدم اس کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا...... رنگ غصے سے سرخ ہورہا ہے۔''

''میں یہ نوکری چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ غصے سے بولی۔

''پھر کوئی بات ہوگئی ہے؟''

''میں نے ایسا شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔'' سارہ نے نفرت سے کہا۔

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہاں رہیں تو بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا تمہیں۔''

''میرے پاس پیسے ہوتے تو میں ابھی چلی جاتی۔'' سارہ نے بے چارگی سے کہا تو کبیر نے فوراً اپنا پرس نکالا اور کئی ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ سارہ نے ان نوٹوں کی طرف دیکھ کر کبیر سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ میرے پاس پیسے ہوتے تو میں ابھی چلی جاتی۔ پیسے لو اور چلی جاؤ۔''

سارہ نے پیسوں پر نظریں جما دیں اور پھر فیصلہ کرلیا۔ اس نے نوٹ اُٹھانے کے لیے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا، کبیر نے ان نوٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''اب تم واپس اپنی ماں کے پاس جاؤ گی جو شادی کرچکی ہے۔ تمہاری ماں کا دوسرا شوہر بھی اگر تمہارے اس باس جیسا ہوا تو؟'' کبیر کی بات نے سارہ کو سوچنے پر مجبور کردیا۔

سارہ چپ چاپ کبیر کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کبیر پھر بولا.... ''میں نے جو بات کی تھی اس کے بارے میں تم نے کیا سوچا۔ ایک بڑی رقم ہاتھ لگ جائے گی تو ہم دونوں اپنا اپنا مستقبل بہتر کرسکیں گے۔''

''تمہارا منصوبہ کیا ہے؟'' سارہ کا سوال سن کر کبیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اسے سارہ کے چہرے پر رضامندی دکھائی دے رہی تھی۔

''ہم لنچ بریک ایک ساتھ کریں گے اور اس دوران

میں تمہیں اپنا منصوبہ بتاتا ہوں۔'' کبیر نے فی الحال اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

سارہ وہاں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

☆☆☆

لنچ بریک کے لیے جب سب ہال سے باہر نکل گئے تو کبیر دو لنچ بکس سارہ کی میز پر لے آیا۔ اس نے ایک بکس سارہ کے سامنے رکھا اور دوسرا اپنے سامنے رکھ لیا۔

''ہم تو نیچے لنچ کرنے والے تھے۔'' سارہ نے کہا۔

''میں نے سوچا کہ ہم اس جگہ بیٹھ کر بھی بات کرسکتے ہیں۔ تم کھانا کھاؤ ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔'' کبیر کا دھیان اپنے لنچ بکس پر تھا۔ سارہ نے بھی لنچ بکس اپنی طرف کھسکا لیا اور اسے کھولنے لگی۔

کبیر نے بات شروع کی۔ ''ہمارے پاس وقت کم ہے اس لیے میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے بتایا تھا کہ باس کا ایک بنگلا میں بیچ رہا ہوں۔ اور کچھ ایسی سچی جھوٹی کہانی کا جال بُن کر پارٹی کو قائل کرلیا ہے اور پارٹی دو کروڑ کیش دینے پر راضی ہوگئی ہے۔ رقم ہفتے کی صبح باس کے فارم ہاؤس میں دی جائے گی۔ دو کروڑ روپے وصول کرکے جب ہم واپس آرہے ہوں گے تو راستے میں کچھ لوگ باس کی گاڑی کو گھیر لیں گے۔ وہ میرے آدمی ہوں گے۔ اسلحہ کے زور پر وہ دو کروڑ لے جائیں گے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ باس پولیس کو طلب کرے گا۔ بھاگ دوڑ ہوگی اور پھر کچھ گھنٹوں کے بعد سب کچھ نارمل ہونا شروع ہوجائے گا۔ ہم وہاں سے نکل کر اپنے اپنے فلیٹ میں چلے جائیں گے۔ میرے آدمی وہ دو کروڑ لوٹ کر کہاں رکھیں گے، اس کا مجھے علم ہوگا۔ میں وہاں جاؤں گا اور دو کروڑ نکال لوں گا۔ اس کے بعد ہم رقم آپس میں تقسیم کرلیں گے اور باس کے ساتھ ہی رہیں گے۔ تم بھی اسی سیٹ پر نوکری کرتی رہو گی اور میں بھی۔ ہفتہ دس دنوں میں یہ واقعہ وقت کی گرد کے نیچے دبنے لگے گا اور پھر ہم دونوں یہ شہر چھوڑ کر اپنی اپنی منزل کی طرف نکل کھڑے ہوں گے۔''

''رقم لوٹنے کے بعد بھی اگر میں یہاں کام کرتی رہی تو جانے باس میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔'' سارہ نے کہا۔

''باس دو کروڑ کے لٹنے پر اتنا رنجیدہ ہوجائے گا کہ اسے یہ بھی ہوش نہیں رہے گا کہ تم کون ہو۔ پھر جیسے ہی اسے ہوش آنا شروع ہوگا تب تک تم یہ نوکری چھوڑ کر جا چکی ہوگی۔ یہ بھی اطمینان رکھو کہ میں سائے کی طرح تمہاری حفاظت کروں گا۔ دوسری بات یہ کہ باس کی حرکتوں کی وجہ سے تم اسے سب کے سامنے بے عزت کرکے جاسکو گی۔ تمہارے پاس نوکری چھوڑنے کا بہترین جواز ہوگا۔'' کبیر بولا۔

''ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ کام تو آپ اکیلے بھی کرسکتے ہیں۔ مجھے کیوں شامل کررہے ہیں؟''

''تمہارے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ تم جانتی ہو کہ باس کے چوبیس گھنٹے تمہارے ہاتھ کی ڈائری میں لکھے پروگرام کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کی مصروفیات کا شیڈول سخت ہے۔ چار دن تک ان کی میٹنگ وغیرہ کا شیڈول سب کچھ تمہارے پاس لکھا ہوا ہے۔ بس تم ہفتہ صبح دس بجے اپنی ڈائری پر لکھ لو کہ باس کو ان کے فارم ہاؤس میں اپنے بنگلے کی ایڈوانس رقم دو کروڑ روپے وصول کرنے کے لیے جانا ہے۔''

''میں کیسے لکھ دوں جبکہ ان کے علم میں یہ بات ہی نہیں ہے۔'' سارہ نے کہا۔

''میں ان سے بات کرچکا ہوں۔ انہوں نے مجھے کہہ دیا ہے کہ جیسے ہی پروگرام طے ہو، سارہ کو بتا دینا اور ہم رقم وصول کرلیں گے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ بھی کہا تھا کہ اتنا بڑا رسک نہ لیں تو بہتر ہے۔ ہم پیر کو بینک ٹائم پر رقم وصول کرلیں گے۔ انہوں نے میری عین سوچ کے مطابق انکار کردیا کہ وہ آتا ہوا پیسہ دوری پر نہیں ڈال سکتے۔ ویسے بھی ان کا وہ بنگلا کئی مہینوں سے فروخت نہیں ہورہا۔ بڑی مشکل سے وہ پارٹی رضامند ہوئی ہے۔ اس لیے باس بھی چاہتے ہیں کہ اس کا ایڈوانس وصول کرنے میں دیر نہ ہو۔ بس تمہیں ایک دن پہلے انہیں یہ بتانا ہے کہ کل دس بجے فارم ہاؤس بنگلے کا ایڈوانس لینے جانا ہے۔'' کبیر نے کہہ کر لقمہ منہ میں ڈالا۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کرلیا کہ میں آپ کی بات اپنے تک محدود رکھوں گی؟'' سارہ نے ایک نظر کبیر کی طرف دیکھا۔

''سچ یہ ہے کہ جس کرسی پر تم بیٹھی ہو، تم سے پہلے یہاں بیٹھنے والیوں کا میں حال دیکھ چکا ہوں۔ بس یہ ہمدردی کہہ لو کہ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا حال بھی ان جیسا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ بات بھی اپنے تک محدود رکھو گی اور میرا ساتھ بھی دو گی کیونکہ تم بھی بند گلی میں کھڑی ہو۔''

سارہ کے دماغ میں اچانک باس کا بتایا ہوا رات کا پروگرام آگیا۔ وہ اس کے ساتھ ڈنر کرے گا اور نئے فلیٹ میں بھی خود چھوڑنے جائے گا۔ انگلیوں میں ہیرے کی

انگوٹھیاں پہنانا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی مچھلی کو پکڑنے کے لیے کانٹے کے ساتھ آٹے کی گولی لگائی جائے۔

سارہ اپنی سوچوں سے واپس آتے ہوئے بولی۔ ''مجھے منظور ہے۔ میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔''

''جو لوگ باس سے رقم لوٹیں گے، ان کو پیسے دینے کے بعد ہمارے پاس ایک کروڑ ستر لاکھ روپے بچیں گے جو ہم برابر برابر بانٹ لیں گے۔'' کبیر نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

کبیر نے جیب سے ایک سستا سا موبائل فون نکالا اور اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''تم یہ فون رکھ لو۔ آفس ٹائم کے بعد اپنے نام کی سم لے لینا اور مجھے اپنا نمبر دے دینا۔ یہ پیسے بھی رکھ لو۔ تمہارے کام آسکتے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے رابطے میں رہیں گے۔''

''لیکن...... ایک پریشانی ہے۔'' ایک نظر موبائل فون کی طرف دیکھتے ہوئے سارہ بولی۔

''وہ کیا؟''

''باس آج مجھے ڈنر پر لے جانا چاہتے ہیں اور رات کو وہ مجھے نئے فلیٹ میں بھی چھوڑیں گے۔'' سارہ نے بتایا۔

''ایسا وہ پہلے بھی کر چکے ہیں۔ تم نے شاید آج کے دن کا صفحہ غور سے نہیں دیکھا۔ آج ان کی بیوی کی سالگرہ ہے۔ وہ اپنی بیوی کی سالگرہ کی تقریب میں ضرور جائیں گے۔'' کبیر نے کہا۔

سارہ نے جلدی سے ڈائری دیکھی تو وہاں احتشام بیگ کی بیوی کی سالگرہ کی تقریب کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ سارہ کو پڑھ کر اطمینان ہو گیا۔

''تم آج باس کو آگاہ کر دینا کہ کل دس بجے انہیں اپنے فارم ہاؤس جا کر رقم وصول کرنی ہے۔ یہ تم ابھی اپنی ڈائری میں لکھ لو، بھول نہ جانا۔'' کبیر نے تاکید کی اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ کیونکہ آفس کے لوگ لنچ بریک کے بعد واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔

سارہ نے ہزار ہزار کے وہ نوٹ اور موبائل فون اُٹھا کر اپنی دراز میں رکھ لیا۔

☆☆☆

احتشام بیگ پوری تیاری میں تھا کہ وہ سارہ کو اپنے ساتھ ڈنر پر لے جائے گا۔ وہ کچھ پُرجوش بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بجے کے بعد احتشام نے اپنا سارا کام ڈائری پر لکھے پروگرام کے مطابق کیا تھا۔ جیسے ہی شام کے سائے

گھبرے ہونا شروع ہوئے، احتشام نے سارہ کو بتانے کے لیے کہ وہ تیار رہے انہیں جانا ہے، انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ انٹرکام کی بیل بج گئی۔ احتشام نے شیشے کے پار دیکھا کہ سارہ نے انٹرکام کا ریسیور اپنے کان سے لگایا ہوا تھا۔

"میں تمہیں اپنے آفس میں بلانے ہی والا تھا سارہ ڈارلنگ۔" احتشام نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

اپنے دل کی نفرت کو اندر دباتے ہوئے سارہ بولی۔

"سر میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ آٹھ بجے آپ کی بیگم صاحبہ کی سالگرہ کی تقریب ہے۔ اور آپ کو وہاں جانا ہے۔"

یہ سن کر احتشام کا منہ ایسا بن گیا جیسے اس نے کڑوی گولی چبالی ہو۔

"اوہ...... ہاں آج ان کی سالگرہ بھی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ یہ پروگرام مس نہیں ہوسکتا۔ کیا تم کل کے لیے تیار ہو؟"

"جو آپ کہیں گے سر۔" سارہ مسکرائی۔ اس کے علم میں یہ بات تو آہی چکی تھی کہ وہ باس کی نظروں کے سامنے ہے اس لیے وہ اپنے چہرے سے کوئی برا تاثر دے کر اسے کسی شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ احتشام اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہوگیا۔

"اور سر کل دس بجے آپ کو اپنے فارم ہاؤس جانا ہے جہاں آپ اپنے بنگلے کا ایڈوانس دو کروڑ روپے وصول کریں گے۔" سارہ نے ساتھ ہی کل کا بھی پروگرام بتادیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کبیر نے سب کچھ طے کرلیا ہے۔ کبیر میرا خوب بھاگنے والا گھوڑا ہے۔ اس نے وہ کام کرہی دیا۔ ہم ایک ساتھ فارم ہاؤس جائیں گے۔"

کچھ باتوں کے بعد احتشام نے ریسیور رکھ دیا

بیس منٹ کے بعد احتشام آفس سے چلا گیا۔ آفس ٹائم کے بعد سارہ نے مارکیٹ سے ایک سم خریدی اور اسے ایکٹو کرا کے اپنے موبائل فون میں ڈال لی اور اپنے فلیٹ کی طرف چل دی۔

سارہ اوپر جانے کے لیے لفٹ میں داخل ہوئی ہی تھی کہ ایک ماڈرن سی لڑکی تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھی اور سارہ کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی۔ لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا اور لفٹ اوپر جانے لگی۔

سارہ غیر محسوس طریقے سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے بلیک ٹائٹ ٹراؤزر کے ساتھ ریڈ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ ہلکے میک اپ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی دونوں کلائیوں میں سونے کا ایک ایک قیمتی کڑا تھا۔

لفٹ رک گئی اور دروازہ کھلا تو دونوں ایک ساتھ باہر نکل آئیں۔ سارہ اپنے فلیٹ کی طرف چلی گئی۔ سارہ اپنے دروازے کا تالا کھول رہی تھی کہ اسے عقب میں دستک کی آواز سنائی دی اور پھر نسوانی چہکتی ہوئی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

"کیسا سرپرائز ہے؟"

"ارے تم کب آئیں۔" سارہ کو کبیر کی آواز سنائی دی۔

"دو گھنٹے پہلے آئی ہوں۔"

"کراچی میں بہت دن لگا دیے تم نے۔" کبیر کا لہجہ بھی خوشگوار سنائی دیا۔ اس دوران میں سارہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور اس نے دروازہ پوری طرح سے بند کرنے کے بجائے دروازے کے تھوڑے سے رخنے سے دونوں کو دیکھا۔

لڑکی کہہ رہی تھی۔ "اب جلدی چلو ہم کھانا باہر کھا رہے ہیں۔ وہیں باتیں ہوں گی۔"

"میں تیار ہوں۔ ابھی چلتے ہیں۔" کبیر مسکرا کر بولا۔ سارہ نے دروازہ بند کردیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

سارہ بیڈ پر لیٹے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ جو کچھ کرنے جارہی ہے، کیا وہ ٹھیک ہے۔ باس کی بات اور پیشکش کے بعد اس کے پاس دو ہی راستے بچتے تھے کہ وہ اپنی عزت بچا کر بھاگ جائے، یا پھر اسے لوٹ کر شہر چھوڑ جائے۔ اسے دوسرا راستہ مناسب لگا تھا۔ وہ واپس اپنی ماں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی اور خالی ہاتھ وہ کہیں اور نوکری کرکے ایسے ہی کسی باس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

سارہ سوچ رہی تھی کہ پیسے اس کے ہاتھ میں آجائیں تو وہ پھر سوچ سکتی ہے کہ اسے آگے کیا کرنا ہے۔ ان ہی خیالوں میں وہ سوگئی۔

صبح جب وہ ناشتا تیار کررہی تھی اس کے دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کبیر کھڑا تھا۔

"تم نے سم لے لی ہے۔"

"میں نے سم بھی لے لی ہے اور ایکٹو بھی کرالی

ہے۔"
"باس کو پروگرام سے آگاہ کردیا تھا؟"
"ان کو بھی آگاہ کردیا تھا اور وہ ٹھیک دس بجے ہمارے ساتھ وہاں ہوں گے۔"
"تم مجھے اپنا نمبر دے دو۔"
"ابھی مجھے اپنا نمبر یاد نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ مجھے اپنا نمبر دے دیں، میں آپ کے نمبر پر میسج کردیتی ہوں۔"
کبیر نے اسے اپنا نمبر بتایا تو سارہ عجلت میں نمبر کہیں لکھنے کے لیے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ کبیر نے اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر اپنا نمبر لکھ دیا۔ سارہ نے کارڈ لے کر مطلوبہ نمبر پر سینڈ کر کے کبیر کا نمبر سیو کرلیا۔
"تم رکشا لے کر آفس چلی جاؤ۔ دیکھو بالکل بھی نہیں گھبرانا۔ سارا کام محفوظ طریقے سے ہوجائے گا اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔" کبیر نے اسے تاکید کرتے ہوئے مزید کچھ باتوں سے آگاہ کیا اور چلا گیا۔
کبیر کے جانے کے بعد سارہ نے ناشتا کیا۔ اس نے جینز کے اوپر لونگ شرٹ زیب تن کی۔ جو پیسے اسے کبیر نے دیے تھے، سارہ نے جینز کی ایک جیب میں رکھے اور دوسری جیب میں سائلنٹ پر موبائل فون رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے گلے کے گرد لمبا اسکارف لپیٹ لیا تھا۔ آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لینے کے بعد سارہ نے اپنے کمرے کا سامان ٹھیک کیا، بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے اس نے وہ وزیٹنگ کارڈ جس پر کبیر نے اپنا موبائل فون نمبر لکھا تھا، اٹھا کر اپنی جینز کی جیب میں رکھ لیا تاکہ اگر فون ٹھیک سے سیو نہیں ہوا تو وہ دوبارہ دیکھ سکے اور اسے کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
سارہ رکشے میں بیٹھ کر آفس پہنچ گئی۔ آفس میں ابھی باس نہیں آیا تھا۔ کبیر دائیں بائیں اپنے کام میں مصروف تھا۔ سارہ نے وقت دیکھا سوا نو بج چکے تھے۔ سارہ کا دل دھڑک رہا تھا کہ اگر آج باس آفس میں نہ آیا اور اس نے کسی وجہ سے فارم ہاؤس جانے سے انکار کردیا تو پھر وہ اپنے منصوبے پر کام نہیں کرسکیں گے اور اس کا باس رات کو اسے اپنے ساتھ ڈنر پر لے جائے گا اور اس کے بعد...... سارہ یہ سوچ کر ہی کانپ سی گئی۔ اس صورت میں سارہ کو مجبوراً اپنی ماں کے گھر واپس جانا پڑے گا۔
سارہ ابھی سوچ رہی تھی کہ باس تیزی سے نمودار ہوا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد کبیر بھی اس کے کمرے میں چلا گیا اور سارہ نے فوراً انٹر کام اٹھا کر باس سے بات کی۔
"سر آپ کو دس بجے فارم ہاؤس جا کر اپنے بنگلے کا ایڈوانس وصول کرنا ہے۔"
"ابھی جانے کی تیاری کرو۔ میں لیٹ ہوگیا ہوں۔" باس کی آواز آئی۔
سارہ نے انٹر کام نیچے رکھ دیا۔ اس نے ڈائری اور ایک فائل اٹھالی۔ سارہ نے اپنا ہینڈ بیگ اسی جگہ چھوڑ دیا تھا۔ اسی اثنا میں احتشام بیگ اور کبیر کمرے سے باہر نکلے۔
باہر نکلتے ہوئے کبیر نے باس سے آہستہ سے کہا۔ "سر ہمارا بنگلا جو لوگ خرید رہے ہیں، انہیں آج کی فلائٹ سے سنگاپور جانا ہے۔ جانے سے پہلے وہ اس بنگلے کا بیعانہ دے دینا چاہتے ہیں۔ آپ سوچ لیں کہ بینک بند ہے اور اتنی بڑی رقم کا اپنے پاس رکھنا خطرہ ہے۔"
"دولت سے مجھے پیار ہے اور میں اسے لینے سے انکار نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی بنگلا کئی مہینوں سے فروخت نہیں ہو رہا تھا اور تم نے خود کہا ہے کہ وہ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں دے رہے ہیں۔ کوئی مشکل نہیں ہے۔" احتشام نے بے پروائی سے کہا۔
کبیر محض اپنا اطمینان چاہتا تھا۔ باس کی بات سن کر کبیر دل ہی دل میں مسکرایا اور ایک نظر سارہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے ایسا اشارہ کیا جیسے وہ اسے بتا رہا ہو کہ سب ٹھیک ہے۔
تینوں پجیرو میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ کبیر تھا جبکہ وہ دونوں پیچھے بیٹھے تھے۔ احتشام بیگ نے اس بار کسی بات کی کوئی پروا کیے بغیر سارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سارہ بمشکل برداشت کر کے بیٹھی رہی۔
پجیرو تیزی سے فارم ہاؤس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ سارہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ راستہ چٹکی بجاتے ہی ختم ہوجائے اور وہ احتشام بیگ سے اپنا ہاتھ چھڑا سکے۔
آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد فارم ہاؤس آگیا۔ فارم ہاؤس کے باہر ایک اور پجیرو کھڑی تھی۔ اس میں چار افراد براجمان تھے۔ وہ وہی لوگ تھے جو اس بنگلے کو خریدنا چاہتے تھے۔ وہ وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچ گئے تھے۔ احتشام بیگ کے ڈرائیور نے ہارن دیا تو فارم ہاؤس کا گیٹ کھل گیا۔ دونوں گاڑیاں اندر چلی گئیں۔
اپنے دیر سے پہنچنے پر احتشام بیگ نے کوئی معذرت

نہیں کی اور تمکنت سے چلتا ہوا ایک کشادہ کمرے میں آ گیا۔

''باس کو اگلی میٹنگ کے لیے جانا ہے اس لیے وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا کام کریں؟'' کبیر نے خریدار سے کہا۔

''ہم خود بھی مصروف ہیں۔ بہتر ہے کہ یہ کام جلدی کرلیں۔'' اس نے کہا۔

کبیر نے کاغذات نکالے جس پر ان کے درمیان بنگلے کی خریداری کا معاہدہ لکھا ہوا تھا۔ وہ کاغذات اس نے اس شخص کی طرف بڑھا دیے۔ اس شخص نے وہ کاغذات پڑھے اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنے پاس پڑا بریف کیس اس شخص کی طرف بڑھا دیا۔ اس شخص نے بریف کیس کھول کر اندر سے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سامنے میز پر رکھ دیں۔ احتشام بیگ نے نوٹوں کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ سارہ نے دیکھا کہ وہ کسی بچے کی طرح للچائی ہوئی نظروں سے پیسوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دونوں طرف سے معاہدے پر دستخط ہوئے اور باقی رقم پانچ دن کے بعد دینے کا وعدہ ہوا اور وہ لوگ چلے گئے۔

''رقم کو دیکھ کر میرے خون میں تیزی آجاتی ہے۔'' احتشام بیگ نے نوٹوں میں سے ایک گڈی اُٹھا کر دیکھی اور کبیر سے بولا۔ ''رقم سنبھال لو۔''

کبیر اپنے ساتھ چمڑے کا ایک بیگ لے کر آیا تھا۔ سب سے پہلے کبیر نے ان نوٹوں کی گڈیوں کو پلاسٹک کے لفافوں میں تہ در تہ رکھا اور پھر چمڑے کے بیگ میں رکھ کر زپ بند کی اور زپ پر چھوٹا تالا لگا دیا۔

''سر آپ کی اہم میٹنگ آفس میں ہے۔ آپ سے چیمبر آف کامرس کے صدر ملنے کے لیے آرہے ہیں۔'' سارہ نے جلدی سے یاد دلایا۔

''ہاں وہ بہت اہم میٹنگ ہے۔ ابھی چلو۔'' احتشام بیگ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کبیر نے وہ بیگ اپنے کندھے سے لٹکا لیا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے سارہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا جیسے وہ اسے کہہ رہا ہو کہ اب اور بھی زیادہ ہوشیار رہے۔ جواب میں سارہ نے بھی اشارہ کر دیا کہ وہ بالکل تیار ہے۔

وہ تینوں اسی طرح پجیرو میں بیٹھ گئے۔ اس بار احتشام بیگ اور سارہ کے درمیان نوٹوں کا بھرا ہوا بیگ تھا۔ کبیر نے خود وہ بیگ اس جگہ رکھ دیا تھا۔ شاید لڑکی سے بھی زیادہ نوٹوں کی قربت احتشام کے لیے باعثِ سکون تھی کہ اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہ بیگ اُٹھا کر کہیں اور رکھ دو۔

پجیرو چل پڑی۔ اس جگہ دور تک سکوت تھا۔ ابھی ان کی پجیرو زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اچانک ایک تیز رفتار کار آئی اور اس نے عین پجیرو کے سامنے بریک لگا دیے۔ احتشام بیگ کے ڈرائیور کو بھی فوری بریک لگانے پڑے ورنہ ان کی پجیرو اس کار سے ٹکرا جاتی۔ پجیرو رک گئی۔

آناً فاناً اس کار میں سے چار نقاب پوش باہر نکلے۔ وہ ... سرعت سے باہر نکلے تھے ادھر ایک نے فوراً پستول ڈرائیور کے سر پر رکھ دیا۔ دوسرے نے کبیر کو پستول کی زد میں لے لیا جبکہ تیسرے نے دروازہ کھول کر احتشام کو باہر کھینچ لیا اور زمین پر لٹا کر اس پر پستول تان لیا۔ چوتھے نے نوٹوں کا بھرا ہوا بیگ پکڑا اور اس سے مخاطب ہوا جس نے ڈرائیور کے سر پر پستول رکھا ہوا تھا۔

''سارہ میم کو کو نکالو...... جلدی۔''

وہ آدمی جلدی سے سارہ کی جانب بڑھا اور وہ دروازہ کھولا جس طرف سارہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے احترام سے کہا۔

''میم جلدی باہر آئیں۔ ہمیں نکلنا ہے۔''

سارہ کو کبیر نے جو منصوبہ بتایا تھا، اس میں یہ سب شامل نہیں تھا۔ وہ حیران پریشان سوچ رہی تھی جبکہ جس نے نوٹوں کا بیگ پکڑا ہوا تھا، وہ تیز تیز کہہ رہا تھا۔

''کوئیک...... کوئیک......''

سارہ نے ایک لمحے میں سوچا کہ شاید کبیر نے ایسا کچھ سوچ کر کیا ہے اور اس وقت سوچنے کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں تھا اس لیے سارہ باہر نکلی اور اس کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گئی۔ وہ سب اسی سرعت سے کار میں بیٹھے اور ان کی کار پستول سے نکلی گولی کی طرح ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ سب کچھ انھوں نے اس قدر آناً فاناً کیا تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ان کے جاتے ہی کبیر باہر نکلا اور اس نے فوراً احتشام بیگ کو پکڑ کر اُٹھایا۔

''بھاگ گئے؟'' احتشام اس طرف دیکھتے ہوئے بولا جس طرف وہ بھاگے تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور غصہ سرخ انگاروں کی طرح اس کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔

''جی سر وہ بھاگ گئے ہیں۔'' کبیر نے کہا۔

''وہ سارہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ کیا کہہ

رہے تھے۔ سارہ میم...... وہ اسے سارہ میم کہہ کر مخاطب کررہے تھے؟" احتشام نے کبیر سے پوچھا۔

"یس سر...... وہ اسے سارہ میم کہہ کر مخاطب کررہے تھے۔" کبیر بولا۔

احتشام نے غصے سے زمین پر تھوکا۔"اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ سارہ کا کیا دھرا ہے۔ اسی کے آدمی تھے یہ۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے سر۔ ہم نے پارٹی سے دو کروڑ روپے وصول کرنے تھے، یہ بات سارہ کے علم میں تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کی مدد سے دو کروڑ روپے لے گئی ہے۔" کبیر مکاری سے بولا اور احتشام کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ کبیر نے بڑی ہوشیاری سے سارہ کو اس واردات کا ماسٹر مائنڈ بنا دیا تھا اور خود سارہ پر لگائے الزام کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

☆☆☆

احتشام کسی پاگل بھینسے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ پولیس اس کے اردگرد جائے وقوعہ پر کھڑی تھی۔ صورت حال سے پولیس کو آگاہ کردیا گیا تھا۔ احتشام نے یہ بھی بتادیا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی سیکریٹری سارہ کا کام تھا۔ اس نے پہلے اس کے پاس نوکری کی اور پھر یہ واردات کرائی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہوگئی۔

احتشام کو اپنے پیسوں کے علاوہ جس چیز کا تاسف اور غصہ تھا، وہ یہ تھا کہ ایک لڑکی نے اسے دھوکا دے دیا۔

رپورٹ درج کرانے کے بعد وہ آفس کی طرف چل پڑے۔ پجیرو سڑک پر دوڑ رہی تھی اور احتشام غصے سے غرا رہا تھا۔

"مجھے کبھی شک بھی نہیں گزرا کہ وہ مجھے لوٹنے کا منصوبہ بنا کر یہاں آئی ہے۔"

"سر میں تو آپ کو کہنا چاہتا تھا کہ آپ ان لڑکیوں پر اتنا اعتماد نہ کیا کریں۔ آپ نے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں لی اور اسے دیکھتے ہی نوکری پر رکھ لیا۔" کبیر نے جھجکنے کے انداز میں بات کی۔

اب احتشام اسے یہ بات کیسے کہتا کہ حسن اس کی کمزوری ہے اور وہ اس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اندھا ہوجاتا ہے۔

"پولیس تو اسے تلاش کرے گی ہی...... لیکن پولیس سے پہلے میں اسے تلاش کروں گا اور پھر اس کا ایسا حال کروں گا کہ وہ یاد رکھنے کے بھی قابل نہیں رہے گی۔" احتشام نے کبیر کی بات کا جواب دینے کے بجائے سفاک لہجے میں کہا۔

کبیر دل ہی دل میں مسکرایا۔"اگر آپ نے اسے نوکری پر رکھنے سے پہلے اس کا سی وی لیا ہوتا تو اس کی تلاش میں آسانی ہوجاتی۔"

"وہ نبیلہ کی دوست ہے۔ نبیلہ کو تلاش کرو۔ اسے پتا ہوگا کہ اس کا تعلق کس شہر سے ہے اور اس کے ماں باپ اور بہن بھائی کہاں رہتے ہیں۔" احتشام بیگ بولا۔

"نبیلہ شادی کرکے دبئی جاچکی ہے اور دبئی میں کہاں رہتی ہے اس کا معلوم نہیں ہے۔" کبیر نے کہا تو احتشام بیگ نے غصے سے اپنے ہاتھ میں پکڑا سگار مسل دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سگار کو نہیں بلکہ سارہ کا گلا دبا رہا ہو۔

احتشام پچھلی سیٹ پر غصے میں غوطے کھاتا ہوا اس کے بارے میں سوچتا رہا اور کبیر آگے بیٹھا دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ وہ کس خوبصورتی سے اپنے باس کو دھوکا دے کر بھی اس کے ساتھ مطمئن انداز میں بیٹھا ہوا ہے۔

☆☆☆

جب کار اس علاقے سے نکل کر دور چلی گئی تو وہ کار پانچ منٹ کے لیے ایک جگہ رکی تھی۔ ان پانچ منٹوں میں دو آدمیوں نے باہر نکل کر کار کے جعلی نمبر تبدیل کیے، کار کے دروازوں پر جو بڑے اسٹیکر لگے ہوئے تھے، وہ اتار دیے تھے کہ کار کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں کار میں بیٹھے اور کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

سارہ کار میں بیٹھی یہی سوچتی رہی کہ جس طرح اسے کار میں بٹھا کر وہ لوگ لے آئے ہیں، وہ سب ان کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع نہیں ملا اور وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی؟

ان کی کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سارہ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کار کے شیشے کالے تھے اور ابھی تک ان چاروں نے اپنے اپنے نقاب نہیں اتارے تھے۔

پھر اچانک کار رکی اور دو ساتھی باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے نقاب جلدی سے اتار لیے تھے۔ کار آگے چل پڑی۔ کچھ دور جاکر کار پھر رکی اور تیسرا ساتھی بھی باہر نکل گیا۔ وہ تینوں کبیر نے کرائے پر حاصل کیے تھے جو اس شہر کے جرائم پیشہ تھے اور پیسے لے کر کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہوجاتے تھے۔

اب گاڑی میں دونوں رہ گئے تھے۔ کار تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ سارہ نے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ گے کہ تم کون ہو؟ اور مجھے کہاں لے

جا رہے ہو؟''

اس شخص نے اپنا نقاب اتار دیا۔ وہ بڑھی ہوئی شیو کے چہرے والا نوجوان تھا۔ وہ کبیر کا ہم عمر تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی سارہ چونکی۔ اسے یاد آیا کہ وہ وہی نوجوان تھا جب کبیر، سارہ کو اپنے ساتھ فلیٹ کی طرف لے جا رہا تھا تو اس نے راستے میں بسکٹ کے ایک گودام کے پاس اپنی گاڑی روک کر اس سے کچھ بسکٹ کے ڈبے لیے تھے۔ سارہ نے اسے پہچان کر یہ عیاں نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے پہچان چکی ہے۔

''دیکھ لیا مجھے؟'' وہ بولا۔

سارہ نے پوچھا۔ ''مجھے کیوں لائے ہو اپنے ساتھ؟''

''آپ ہماری میم ہیں۔ آپ کے کہنے پر ہی ہم نے یہ سب کیا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''میرے کہنے پر کیا ہے؟'' سارہ چلائی۔

''چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اطمینان سے سنو۔ کبیر نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہیں کار سے اتارنے سے پہلے میں سب کچھ بتا دوں تاکہ تمہیں اندازہ ہو سکے کہ تم کتنی پھنس چکی ہو اور تمہیں اپنے بچاؤ کے لیے کیا کرنا ہے۔ ویسے بھی جس دلدل میں ہم نے تمہیں دھکیل دیا ہے، تم کو بتا کر بھی ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' کبیر نے کار کی رفتار آہستہ کر دی تھی اور وہ شہر کی مصروف سڑکوں پر بے فکری سے کار چلا رہا تھا۔

''کیا بتانا چاہتے ہو تم؟'' سارہ نے اپنا لہجہ دھیما کر لیا اور وہ اب جاننا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔

''میں اور کبیر پرانے دوست ہیں۔ اس شہر میں ہم دونوں نے بہت دھکے کھائے ہیں۔ پھر میں بڑی ایجنسیز سے کھانے پینے کا سامان اٹھا کر فروخت کرنے لگا۔ اور کبیر نے نوکری کر لی۔ ہم اس زندگی سے غیر مطمئن یہ سوچ رہے تھے کہ ہم بڑے بزنس مین کیسے بنیں گے۔ پھر ہم نے احتشام بیگ کو لوٹنے کا پروگرام بنایا۔ اور کبیر نے ان کا ایک بنگلا جان بوجھ کر نہیں بیچا کہ احتشام بیگ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ بنگلا کیسے بکے گا۔ ہماری منصوبہ بندی تیار تھی اور پھر اچانک اس بنگلے کا خریدار ایسا تیار ہوا کہ وہ ہر حال میں اس بنگلے کو خریدنا چاہتا تھا۔ اب ہمیں ایک قربانی کے بکرے کی ضرورت تھی۔''

وہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ سارہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر بولا۔ ''اچانک تم نبیلہ کی تلاش میں اس کے فلیٹ میں آ گئیں۔ تمہیں دیکھتے ہی کبیر کو پہلا خیال یہی آیا کہ تم ہی تھیں جس کی ہمیں تلاش تھی۔ کیونکہ تم جیسی لڑکی پر نظر پڑتے ہی باس بغیر سوچے سمجھے تمہیں نوکری پر رکھ لے گا۔ اسی لیے وہ تمہیں نبیلہ کا پتا معلوم کرانے کے بہانے آفس لے گیا اور ایسا ہی ہوا کہ ادھر باس نے تمہیں دیکھا اور وہ تمہارے حسن کے آگے موم ہو گیا۔ تم بھی مجبور تھیں اس لیے تم نوکری پا کر خوش ہو گئیں، باس کے اپنے ارادے تھے اور ہم کو تمہاری شکل میں اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے شکار مل گیا۔ یاد ہے کبیر میرے گودام میں آیا تھا اور کچھ بسکٹ کے ڈبے لیے تھے۔ وہ ایک بہانہ تھا، دراصل وہ مجھے یہ دکھانے آیا تھا کہ یہ ہے ہمارا مہرہ جس کے سہارے ہم ساری گیم کھیلیں گے۔'' وہ کہہ کر ہنسا۔ سارہ متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کس غیر محسوس طریقے سے کبیر نے اسے اپنی باتوں کے حصار میں لیا تھا۔

کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''ہم نے تمہیں باس کے سامنے سارہ میم کہہ کر مخاطب کیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ ہم تمہارے حکم پر وہ واردات کر رہے ہیں۔ کام اس سرعت سے کیا کہ تمہیں سوچنے اور بولنے کا موقع نہیں دیا اور اب تم اس ساری واردات کی ماسٹر مائنڈ ہو۔ تمہارے خلاف تھانے میں رپورٹ لکھی جا چکی ہے۔ مجھے کبیر کا میسج موصول ہو گیا ہے۔''

''کبیر نے مجھے پھنسا دیا.....''

''دیکھو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب تم شرافت سے اس کار سے باہر نکل کر اس شہر سے کسی محفوظ جگہ جانے کی فکر کرو۔ پولیس اور باس کے آدمی تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اپنا موبائل فون کھلا رکھنا کبیر تمہیں بتاتا رہے گا کہ تمہاری تلاش میں پولیس اور باس کے آدمی کہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم انہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ تم کہاں ہو۔ اور جو پیسے کبیر نے تمہیں دیے تھے، وہی تمہارے اس کام کا معاوضہ ہیں جو تم نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ انجوائے کرو اور شہر سے جتنی جلدی ہو سکتا ہے باہر نکل جاؤ۔'' وہ بولا۔

حقیقت منکشف ہونے پر سارہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کبیر نے اسے کس خوبصورتی سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ بری طرح سے پھنس گئی تھی۔

اچانک اس لڑکے نے کار روک دی اور ساتھ ہی اپنا پستول نکال کر اس کا رخ سارہ کی طرف کر دیا۔ اس وقت وہ

ایک مصروف سڑک پر کھڑے تھے۔

''جلدی باہر نکلو۔''

سارہ نے ایک نظر اس کی طرف اور پھر پستول کی طرف دیکھا۔ کبیر کا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ سارہ کو کار سے باہر نکلنا ہی پڑا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلی۔ اس نے کار آگے بڑھا دی اور ٹریفک کے ہجوم میں گم ہوگئی۔

سارہ کا اس جگہ کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ بغیر سوچے ایک رکشے کی طرف بڑھی اور اس میں بیٹھتے ہی بولی۔

''چلو۔''

''کہاں جانا ہے۔''

سارہ سوچنے لگی کہ وہ کیا جواب دے۔ ایسی واردات کے بعد پولیس کا زیادہ تر دھیان ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈ ہوتے ہیں اس لیے وہ فی الحال اس طرف کا رخ نہیں کر سکتی تھی۔

''مال روڈ چلو۔'' سارہ نے اس خیال سے مال روڈ کا نام لے دیا تاکہ وہ اس جگہ سے چلے اور اس دوران میں وہ یہ سوچ لے گی کہ اسے کہاں جانا ہے۔ رکشا وہاں سے چلا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ سارہ سوچنے لگی کہ وہ کہاں جائے؟ اس کے پاس کوئی ایسی محفوظ جگہ نہیں تھی جہاں وہ چھپ کر کچھ دن انتظار کرے اور معاملہ ٹھنڈا ہونے پر اس شہر کو چھوڑنے کی فکر کرے۔

اچانک سارہ کو لگا جیسے کوئی بھونچال آ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ دراصل ایک تیز رفتار ویگن نے رکشے کو ٹکر ماری تھی اور رکشا الٹ بازیاں کھاتا ہوا سڑک پر گر گیا تھا اور سارہ زخمی ہو کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ لوگوں کا وہاں رش جمع ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

کبیر اس واردات کے بعد مسلسل اپنے باس کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے باس کو حوصلہ بھی دے رہا تھا اور اس کی دلجوئی کے لیے یہ تسلی بھی دے رہا تھا کہ بہت جلد سارہ اور اس کے گینگ کو پولیس پکڑ لے گی۔ جیسے ہی وہ سارہ کا نام لیتا تھا، احتشام دانت پیس کر کہتا تھا۔

''بس ایک بار سارہ پکڑ میں آ جائے..... بس ایک بار......''

اس کی بات سن کر کبیر دل ہی دل میں مسکرا دیتا تھا۔

''سر پولیس کو رپورٹ ہو چکی ہے، وہ اس کی تلاش میں ہے۔ آپ آرام کریں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے گھر جانا چاہیے۔'' احتشام نے کہا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا۔ ''دو کروڑ تو کیا، دو روپے بھی میں سارہ کو حلق سے نیچے اتارنے نہیں دوں گا۔''

''سر بس ایک بات کہنا چاہتا ہوں...... آئندہ آپ حسن کی تپش میں پگھلنا چھوڑ دیں۔'' کبیر نے کہہ دیا۔

''سامنے پیسہ اور حسن ہو تو ضبط نہیں ہوتا۔ موم کی طرح پگھل جاتا ہوں۔'' احتشام کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور جانے کے لیے چل پڑا۔ پھر وہ دروازے کے پاس جا کر رکا اور کبیر کی طرف دیکھ کر سفاک لہجے میں بولا۔ ''اگر سارہ گرفتار نہ ہوئی تو...... مجھے دبئی سے نبیلہ کو تلاش کرنا پڑا تو میں اسے بھی تلاش کروں گا اور سارہ کے گھر تک پہنچ کر رہوں گا۔'' احتشام کہہ کر چلا گیا اور کبیر کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ عود کر آ گئی کہ اس سے زیادہ مکار مسکراہٹ کسی کی کیا ہوگی۔

کبیر اس جگہ بیٹھا مسکراتا رہا اور پھر اس نے ایک نمبر ملایا۔ اس سے کچھ کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

کبیر نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا ایک معروف شاہراہ پر چلا گیا۔ کبیر ٹیکسی سے اتر کر فٹ پاتھ کے کنارے ٹہلنے لگا۔ دس منٹ کے بعد اس کے سامنے وہی کار رکی جس کو کبیر کا ساتھی نومی چلا رہا تھا۔ اس نے کار کھڑی کی اور باہر نکل کر ایک طرف چل دیا جبکہ اس کی جگہ کبیر بیٹھا اور کار آگے بڑھا دی۔ جب سے انہوں نے واردات کی تھی، نومی کار کو بغیر کسی مقصد کے شہر کی سڑکوں پر دوڑا تا رہا تھا۔

کبیر کار کو معروف شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں لے گیا۔ اس نے گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا، نوٹوں سے بھرا بیگ نیچے سیٹ کے پاس پڑا تھا۔ اس نے باہر نکل کر کار مقفل کی اور شاپنگ سینٹر کے اندر چلا گیا۔

جب کبیر باہر نکلا تو اس کے ایک ہاتھ میں کھانے پینے کے سامان کے شاپر بیگ تھے۔

وہ واپس اپنی کار میں بیٹھا اور کار کا رخ اپنے فلیٹ کی طرف کر لیا۔ اپنے فلیٹ میں جاتے ہی اس نے دروازہ مقفل کیا اور جلدی سے ان شاپنگ میں سے ایک بڑا شاپر نکالا اور نوٹوں سے بھرے بیگ پر وہ شاپر چڑھا دیا۔

اس کام کو کرنے کے بعد وہ مضطرب سا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے دروازے پر ایک مخصوص سی

دستک ہوئی اور کبیر نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے نومی کھڑا تھا۔
کبیر واپس کمرے میں گیا اور وہ شاپر جس میں بیگ تھا، اُٹھا لایا اور وہ نومی کے حوالے کر دیا۔ وہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اسی وقت لفٹ کا دروازہ کھلا اور چار افراد باہر نکلے۔ ان کے ساتھ آفس کا ایک آدمی بھی تھا۔ اس نے کبیر کے دروازے پر دستک دی۔ کبیر نے دروازہ کھولا تو سامنے اس آدمی کے ساتھ چار اجنبی افراد دیکھ کر وہ چونک گیا۔
ان کے ساتھ آیا ہوا وہ آدمی جو کبیر کے ساتھ آفس میں کام کرتا تھا، بولا۔ ''یہ سادہ لباس میں پولیس والے ہیں۔ یہ مس سارہ کے فلیٹ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ باس نے کہا تھا کہ میں پہلے انہیں آپ کے پاس لے جاؤں۔''
''ہا......ں کیوں نہیں۔ میں چابی لے آؤں۔'' کبیر نے کہا اور چابی لینے چلا گیا۔ وہ اس بات پر شکر کر رہا تھا کہ یہ لوگ اس وقت نہیں آئے جب وہ بیگ نومی کے حوالے کر رہا تھا۔
کبیر نے اس فلیٹ کا دروازہ کھولا جس میں سارہ رہائش پذیر تھی۔ پولیس نے خوب اچھی طرح سے تلاشی لی۔ وہاں سارہ کی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو پولیس کو سارہ تک پہنچانے میں مدد دے سکتی۔ سارہ کے کچھ کپڑے تھے جو اُن کے کسی کام کے نہیں تھے۔ پولیس باہر نکل گئی۔ کبیر نے دروازہ لاک کر دیا۔
''ہم اس لڑکی کو تلاش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہم اس تک جلدی پہنچ جائیں گے۔ اوپر سے بھی بہت پریشر ہے، اس لیے ہم پوری بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔'' ایک نے کہا۔
''اس کی تلاش بہت ضروری ہے۔ معاملہ دو کروڑ کا نہیں ہے بلکہ اس گینگ کا ہے جو اس لڑکی کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔'' کبیر بولا۔
''ہمیں اندازہ ہے۔ اس وقت پورے شہر میں اس کی تلاش جاری ہے اور اہم جگہ پر پولیس سادہ کپڑوں میں تعینات ہے۔ سب کے پاس سارہ کا تصویری خاکہ موجود ہے۔''
''مجھے امید ہے کہ آپ سارہ کو جلدی گرفتار کر لیں گے۔'' کبیر بولا اور پولیس چلی گئی۔ اسی وقت احتشام کا فون آ گیا۔ پہلے اس نے پولیس کے بارے میں پوچھا اور یہ معلومات لی کہ اس کے فلیٹ سے کچھ ملا۔ جواب سننے کے بعد باس نے اسے حکم دیا کہ وہ اس کے پاس گھر آ جائے۔ کبیر نے کچھ دیر میں پہنچنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

کبیر واپس اپنے فلیٹ میں گیا اور نومی کو فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔
''تم پہنچ گئے ہو؟''
''ہاں میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے وہ بیگ اپنے گودام میں دوسرے مال کے ساتھ رکھ دیا ہے۔''
''خیال رکھنا کہیں مال کے ساتھ وہ بھی نہ چلا جائے۔'' کبیر نے تاکید کی۔
''ایسا نہیں ہوگا۔ وہ محفوظ جگہ پر ہے۔'' اس نے تسلی دی۔
''ٹھیک ہے۔ میں باس کے پاس جا رہا ہوں۔ تم سے رابطہ رکھوں گا۔'' کبیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
جب کبیر فلیٹ سے باہر جانے لگا تو اس نے سارہ کو کال کرنے کا سوچا۔ اس خیال سے اس کے ہونٹوں پر مکار سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

سارہ کی اچانک آنکھ کھلی تو اس کی نظروں کے سامنے چھت تھی۔ اس کے دائیں بائیں چہل پہل اور آوازیں تھیں۔ اس نے یکدم گردن گھما کر دائیں جانب دیکھا وہاں ایک قطار میں بیڈ لگے ہوئے تھے اور ان پر مریض لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت سرکاری اسپتال میں تھی۔ سارہ کے جسم پر چوٹیں آئی تھیں لیکن ایسی شدید نہیں تھیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتی۔ سر کسی سخت چیز سے ٹکرا گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ سر پھٹا تو نہیں تھا البتہ اس جگہ ایک ابھار سا ابھر آیا اور اس جگہ وہ درد محسوس کر رہی تھی۔
سارہ نے اپنی گردن اُٹھا کر بائیں اور پھر سامنے کا جائزہ لیا، وہ سرکاری اسپتال کا ایمرجنسی وارڈ تھا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو ایک نرس بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔
''کہاں جا رہی ہو۔''
''مجھے باتھ روم جانا ہے۔'' سارہ بولی۔
''باتھ روم اس طرف ہے۔'' نرس کہہ کر پھر اپنی کرسی کی طرف چلی گئی۔ سارہ کھڑی ہوئی تو اسے چکر سا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی جینز کی جیب پر ہاتھ رکھا، اس کا موبائل فون موجود تھا۔
سارہ چلتی ہوئی اس وارڈ سے باہر نکل گئی۔ اچانک اس کے موبائل فون پر تھرتھراہٹ ہوئی۔ اس نے موبائل فون باہر نکالا تو کبیر کی کال تھی۔ اس نے موبائل فون کان سے لگا لیا۔
''کیسی ہو سارہ؟'' دوسری طرف سے کبیر کی آواز

اس کی سماعت میں پڑی۔ سارہ کو ایسا لگ جیسے اس کے کان میں کسی نے سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہو۔ لیکن کبیر کی بات سننا اس کے لیے ضروری تھا۔

''تم اپنی سناؤ'' سارہ تیز تیز قدم اٹھاتی خارجی دروازے کی طرف جارہی تھی۔ اس وقت فون کال سننا اس کے حق میں اس لیے بہتر تھا کہ اس نے فون کو کان سے لگا کر اپنے چہرے کو بہت حد تک چھپا لیا تھا۔

''کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''تم پوچھ کر کیا کرو گے؟''

''مجھے تسلی ہو جائے گی کہ تم پولیس کے ہاتھ آنے سے پہلے شہر چھوڑ چکی ہو۔''

''اب اتنی ہمدردی کیوں جتا رہے ہو۔ پولیس گرفتار کرلے تو تمہیں کیا۔''

''مجھے کیا...... لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ان کے ہاتھ نہ لگو۔ ورنہ وہ بھیڑیا باس تمہارا بہت برا حال کرے گا۔''

''جو حال تم نے میرا کر دیا ہے، اب اس سے برا کیا ہوگا۔ اب بس جیل جانا باقی رہ گیا ہے۔'' سارہ چلتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک پولیس کی گاڑی داخل ہوئی تو سارہ اپنے قدموں کا رخ موڑنے کے بجائے اسی سمت چلتی رہی۔ اس نے چہرے کے آگے ہاتھ اس طرح سے کرلیا تھا کہ اس کی شکل دکھائی نہ دے۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا لیکن اب وہ ایک فیصلہ اور کر چکی تھی کہ اسے ڈر کر کہیں بیٹھنے کے بجائے کبیر اور اس کے ساتھی کا اصل چہرہ احتشام کو دکھانا پڑے گا۔ پولیس کی گاڑی اس کے برابر سے گزر گئی اور سارہ باہر نکل گئی۔

''یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم جیل نہ جاؤ۔ پولیس تمہارا تصویری خاکہ لیے پورے شہر میں گھوم رہی ہے۔ اور میں اس وقت تم سے بات کرتا ہوا لفٹ میں کھڑا ہوں۔ مجھے باس نے بلایا ہے۔ ابھی ابھی پولیس اس فلیٹ کی تلاشی لے کر گئی ہے جس میں تم رہائش پذیر تھیں۔ دیکھو کیسی دلچسپ بات ہے کہ باس کی دولت میں نے لوٹی ہے اور وہ مجھ پر ہی اعتماد کررہا ہے۔'' یہ کہہ کر کبیر نے ایک قہقہہ لگایا۔

اس کی بات سن کر سارہ نے فوراً اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا، جب وہ ہاتھ باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں اس فلیٹ کی چابی تھی۔ سارہ نے صبح موبائل فون، نقدی اور فلیٹ کی چابی اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ اس نے وہ سب چیزیں اس لیے اپنی جیبوں میں رکھی تھیں کیونکہ وہ آفس سے پرس اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی تھی۔

''اگر تمہاری بات مکمل ہو چلی ہے تو فون بند کردوں؟'' سارہ بولی۔

''بالکل...... لیکن سارہ کہیں چلی جاؤ۔ اگر پولیس نے تمہیں گرفتار کرلیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ میں تم سے مسلسل رابطے میں رہوں گا۔'' وہ کہہ کر پھر ہنسا جیسے وہ سارہ کا تمسخر اڑا رہا ہو۔

سارہ نے اسی وقت کبیر سے رابطہ منقطع کردیا۔ ایک عجیب سوچ اس کے دماغ میں آئی تھی۔ ابھی کبیر نے بتایا تھا کہ پولیس اس کے فلیٹ کی تلاشی لے کر گئی ہے۔ یعنی کہ اس فلیٹ کی تلاشی ہو چکی ہے اور اب اس فلیٹ سے محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔

یہ سوچتے ہی سارہ نے رکشا روکا اور اس میں بیٹھ گئی۔ رکشا اس اپارٹمنٹ کی طرف دوڑنے لگا جہاں کبیر اور سارہ کا فلیٹ تھا۔ رکشے میں بیٹھے بیٹھے سارہ نے اپنا اسکارف اس طرح سے باندھ لیا کہ اب اس کا سر، ماتھا اور گردن اس اسکارف سے ڈھک چکی تھی اور صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

سارہ نے رکشا اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر ہی رکوالیا تھا۔ اس نے کرایہ دیا اور مناسب رفتار سے چلتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر سارہ نے اپنی رفتار تیز کردی۔ وہاں پر موجود چوکیدار موبائل فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ اس نے ایک نظر سارہ کی طرف دیکھا لیکن سارہ نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور وہ لفٹ کی طرف چلی گئی۔

وہ اکیلی ہی لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچی اور راہداری میں جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کبیر اپنے فلیٹ میں تھا کہ واقعی وہ باس کی طرف چلا گیا تھا۔ سارہ کو اتنا یقین تھا کہ وہ اس سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوگا۔ وہ اس نشے میں اس سے سچ بول رہا ہے کہ سارہ اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

سارہ تیز تیز چلتے ہوئے کبیر کے فلیٹ کا دروازہ عبور کرکے اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چابی قفل میں گھمائی، ایک لمحے میں اس نے دروازہ کھولا اور دوسرے لمحے وہ اندر چلی گئی اور دروازہ بند کرکے دروازے کے ساتھ لگ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

اس نے اس فلیٹ میں آکر بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ کوئی بھی یہاں آسکتا تھا لیکن اسے یہ امید بھی تھی کہ اب کوئی نہیں آئے گا اور کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ اس فلیٹ

مس ہے۔

سارہ نے ابھی اپنی سانس درست کی ہی تھی کہ اسے لگا جیسے کوئی کسی فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ سارہ کو لگ رہا تھا کہ کبیر کے دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اس نے بغیر آہٹ پیدا کیے اپنا دروازہ کھول کر تھوڑا سا رخنہ پیدا کیا اور باہر جھانکا۔ کبیر کے فلیٹ کے دروازے پر ہی خوبصورت لڑکی کھڑی تھی جو ایک بار اس کے ساتھ ہی لفٹ سے اوپر آئی تھی اور وہ کبیر کو لینے آئی تھی۔

جب کبیر کے فلیٹ کا دروازہ نہ کھلا تو اس لڑکی نے اپنے بیگ سے قیمتی موبائل فون نکالا اور ایک نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ہوتے ہی وہ لڑکی بولی۔

''کبیر تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہے ہو...... میں تمہارے فلیٹ کے باہر کھڑی ہوں...... کیا......؟ تم اپنے باس کے پاس ہو...... پھر کل تم نے مجھے ڈنر کے لیے کیوں کہا تھا...... اب کیا کروں...... ایک ڈیڑھ گھنٹا......؟ ٹھیک ہے...... تب تک میں شاپنگ مارٹ جارہی ہوں...... تم واپس آؤ تو مجھے فون کرلینا میں جہاں ہوں گی تمہیں بتادوں گی مجھے وہیں سے لے لینا...... میں تمہارا ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ انتظار نہیں کروں گی...... او کے۔''

لڑکی نے فون بند کرکے اپنے بیگ میں رکھا اور جانے لگی تو سارہ نے بجلی کی تیزی سے دروازہ کھول کر اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''ایکسکیوزمی......''

وہ لڑکی رک گئی اور اس نے گھوم کر سارہ کی طرف دیکھا۔ ''جی......''

''آپ کبیر سے ملنے آئی ہیں؟ کبیر میرا کولیگ ہے۔ ہم ایک ہی آفس میں کام کرتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میرے پاس بیٹھ کر ان کا انتظار کرسکتی ہیں۔ میں آپ کو اچھی سی چائے پلاسکتی ہوں۔'' سارہ نے مسکرا کر پیشکش کی۔

لڑکی نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ اسے سارہ کی پیشکش اچھی لگی۔ چنانچہ اس نے سارہ کے فلیٹ کی طرف قدم بڑھادیے۔ جونہی وہ لڑکی فلیٹ کے اندر گئی سارہ نے دروازہ بند کرکے سکھ کی سانس خارج کی۔ وہ لڑکی بولی۔

''بجلی بند ہے کیا؟''

سارہ نے کمرے کی لائٹ جلادی۔ ''میں ابھی باہر سے آئی تھی۔ اور دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی کہ آپ کی آواز سنی۔ مجھے سارہ کہتے ہیں۔''

''مجھے مناہل کہتے ہیں اور میں شہر کے بہت بڑے رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرنے والے جی اے نذیر کی اکلوتی بیٹی ہوں۔'' اس نے زعم سے بتایا۔

''اچھا...... اور کبیر......؟'' سارہ نے پوچھتے ہوئے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

''کبیر میرا منگیتر ہے۔'' مناہل مسکرائی۔

''آپ اتنے بڑے رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرنے والے باپ کی بیٹی ہیں اور آپ کی منگنی کبیر سے ہوئی ہے وہ تو کمپنی میں معمولی ملازم ہیں۔'' سارہ نے اچانک سوال کردیا۔

''کبیر اس کمپنی کے مالک کے لیے پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ شاید آپ کے علم میں نہیں ہے کہ کبیر کی ساری فیملی امریکا میں رہتی ہے اور وہ پراپرٹی کے کاروبار کی اونچ نیچ جاننے کے لیے کام کررہا ہے۔ کبیر میرے پپا کے ساتھ بھی کام کرتا رہا، ویسے بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ شادی کے بعد ہم امریکا شفٹ ہوجائیں گے۔'' مناہل نے بتایا۔

سارہ نے اپنی گردن ہلادی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شاطر کبیر نے پہلے امیر کبیر لڑکی کو اپنی محبت کے دام میں پھنسایا ہوگا اور یہ کہانی سنادی کہ اس کی فیملی امریکا میں رہتی ہے۔ وہ یقیناً اسے بھی دھوکا دینے کے چکر میں ہوگا۔

''میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' سارہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔ کچن میں جو دودھ تھا، وہ اس نے صبح ہی اپنے لیے چائے بنا کر ختم کردیا تھا۔ اس نے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیا اور کچن سے باہر آکر اسٹور میں چلی گئی۔

وہاں اس نے نائیلون کی رسی دیکھی تھی۔ سارہ نے وہ رسی نکال کر سامنے رکھ لی اور اسٹور روم سے باہر آگئی۔ مناہل اپنے موبائل فون کو کان سے لگائے بیٹھی تھی۔

''میں کبیر کو فون کررہی ہوں۔ سوچا کہ اسے بتادوں کہ میں یہاں آپ کے ساتھ ہوں۔''

سارہ نے سنا تو وہ اس کے پیچھے چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ فون اٹینڈ ہوتا، سارہ نے پاس پڑا گلدان اُٹھا کر مناہل کے سر پر دے مارا۔ اچانک گلدان کی چوٹ سے مناہل کی چیخ نکل گئی اور موبائل فون نیچے گر گیا۔ سارہ نے موبائل فون اُٹھا کر کال کاٹ دی۔ مناہل اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے تکلیف سے چیخ رہی تھی۔ اسی اثنا میں سارہ تیزی سے اسٹور روم سے نائیلون کی رسی نکال لائی اور مناہل کے ہاتھ پیچھے کی طرف لے جاکر باندھنے لگی۔

''تم ...... کیا کر رہی ہو؟'' تکلیف بھری آواز میں مناہل نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔
سارہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف اچھی طرح سے باندھ دیے۔ مناہل کے سر پر ابھی تک تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مزاحمت بھی کر رہی تھی۔
''تم کون ہو؟ اور تم نے یہ میرے ساتھ کیا کیا ہے؟'' مناہل کی آواز میں ابھی تک تکلیف تھی۔
''خاموش......'' سارہ نے اسے چپ رہنے کے لیے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ سارہ نے اسے دھکا دے کر صوفے پر گرا دیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر متوحش نگاہوں سے سارہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے سر کی تکلیف کی شدت کم ہو گئی تھی۔
مناہل کے موبائل فون پر کبیر کی کال آرہی تھی۔ سارہ نے فرش سے اس کا قیمتی موبائل فون اُٹھایا اور ایک بار پھر مناہل کی طرف دیکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے عقب میں جاکر ٹوٹے ہوئے گلدان کو اُٹھا کر اس کی نوک کمر کے ساتھ لگا دی۔ مناہل اور بھی ڈر گئی۔ سارہ نے فون آن کر کے کان سے لگایا تو دوسری طرف سے کبیر کی آواز آئی۔
''کیا بات ہے، مناہل تمہاری کال آرہی تھی؟''
''میں سارہ ہوں۔'' سارہ نے متانت سے کہا۔
''سارہ ہو؟'' کبیر نے بے یقینی کے انداز میں اپنا فون کان سے الگ کر کے اسکرین کی طرف دیکھا کہ اس نے کال مناہل کے بجائے کہیں سارہ کو تو نہیں کر دی۔ اس کا ابہام اس وقت دور ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ اس نے مناہل کو ہی کال کی ہے۔
''تم سارہ ہو؟'' اس نے ایک بار پھر حیرت سے کہا۔
''کیا تم میری آواز نہیں پہچان رہے ہو؟ وہی سارہ جس کو تم نے ایک بڑی ڈکیتی میں پھنسا دیا ہے۔''
''تمہارے پاس مناہل کا فون کیا کر رہا ہے؟'' کبیر نے اور بھی زیادہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
''میرے پاس مناہل کا فون ہی نہیں ہے بلکہ اس وقت مناہل بھی میرے قبضے میں ہے۔'' سارہ نے انکشاف کیا۔
''یہ کیا بکواس ہے؟'' کبیر عجیب شش و پنج کا شکار ہو گیا۔
''میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' سارہ نے کہہ کر فون مناہل کے کان سے لگا دیا اور اسے بولنے کے لیے اپنے ہاتھ میں پکڑا ٹوٹا ہوا نوک دار گلدان کا حصہ اس کی کمر میں مزید پیوست کر دیا۔ مناہل کو تکلیف ہونے لگی۔ مناہل گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''کبیر...... یہ کیا ہے، اس نے مجھے باندھ رکھا ہے......''
سارہ نے فون الگ کر کے اپنے کان سے لگالیا۔
''یقین آگیا؟''
''تم نے مناہل کو باندھا ہوا ہے؟'' کبیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ سارہ، مناہل کو کیسے اپنے قبضے میں کر سکتی ہے۔ اور سارہ، مناہل کے بارے میں کیسے جانتی تھی کہ وہ اس کی منگیتر ہے۔
''شہر سے پچیس کلومیٹر دور ہوں۔ یہ ایک ویران جگہ ہے۔ اب تم سوچ رہے ہو گے کہ مناہل میرے ہاتھ کیسے لگی۔ اس کا جواب تب دوں گی جب تم مجھے ملو گے۔ تمہیں یہ یقین دلانا تھا کہ وہ میرے پاس ہے۔'' سارہ نے بات مکمل کرتے ہی نوک اس کی کمر میں چبھوئی تو مناہل کی چیخ ہی نکل گئی۔ ''مناہل کی چیخ سنی تم نے۔''
''تم...... وہی سارہ ہو؟'' کبیر ابھی تک اسی شش و پنج میں مبتلا تھا۔ لیکن یہ جھوٹ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کی بات مناہل سے ہوئی تھی۔ کبیر کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔ وہ حیرت سے باہر ہی نہیں نکل رہا تھا۔
''اب یہ سوچنا چھوڑو کہ میں وہی سارہ ہوں کہ بدل گئی ہوں۔ میں نے مناہل کو کیسے اغوا کیا؟ بس یہ سوچو کہ تم نے زبان کیسے بند رکھنی ہے اور جو میں حکم دوں گی اسے کیسے پورا کرنا ہے۔ میں تمہیں دوبارہ فون کروں گی۔ اس سے پہلے تم مجھے سچ بتاؤ کہ اس وقت کہاں ہو؟'' سارہ کا لہجہ کسی بھی خوف سے مبرا اور پُراعتماد تھا۔
''میں بابا کے پاس ہوں۔'' اس نے بتایا۔
''میری اگلی کال کا انتظار کرنا۔'' سارہ نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
سارہ فون بند کر کے سوچنے لگی کہ وہ اب کیا کرے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون میز پر رکھا اور اپنی جیبوں میں جو کچھ تھا وہ نکال کر اپنے سامنے رکھنے لگی۔ اس کی جیب سے وہ کارڈ بھی نکل آیا جس پر کبیر نے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔ سارہ نے کارڈ پلٹ کر دیکھا تو وہ چونک گئی۔ وہ کارڈ نعمان احمد عرف نومی کا تھا۔ اس پر اس کا فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ سارہ نے سوچا کہ دونوں نے مل کر یہ کھیل کھیلا تھا، یقیناً وہ

یہ بات نومی سے کرے گا کہ سارہ نے اس کی منگیتر مناہل کو اغوا کرلیا ہے۔ سارہ سوچنے لگی اور پھر اس نے گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے اپنا وہ موبائل اُٹھالیا جو کبیر نے اسے دیا تھا۔ مناہل اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔

سارہ نے ایک نظر مناہل کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایم سوری...... مجھے تمہارے ساتھ ایسا کرنا پڑا۔ دراصل کبیر نے ایک واردات کی ہے اور سارا الزام اس نے میرے سر پر رکھ دیا ہے۔ مجھے اس الزام سے نکلنا ہے۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' مناہل نے فوراً اس کی بات کو رد کردیا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''ایسا ہوچکا ہے اور تم سچ بھی خود دیکھ لوگی۔ ایک بات اور...... کبیر نے تم سے جھوٹ بولا ہے کہ اس کی فیملی امریکا میں رہتی ہے۔ اس کی نظر یقیناً تمہاری دولت پر ہوگی۔ وہ تمہیں بھی دھوکا دے گا۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں ہے۔''

''یقین نہیں ہے تو پھر انتظار کرو۔ تمہیں سب پتا چل جائے گا۔'' سارہ کہہ کر کمرے میں ٹہلنے لگی اور مناہل اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

کبیر اس فون کال کے بعد بہت پریشان ہوگیا تھا۔ جس بازی کو اس نے بڑی خوبصورتی سے کھیلتے ہوئے اپنے آپ کو بچا کر رکھا ہوا تھا، اچانک ہی اس کے مہرے کو مات ہوگئی تھی۔ مناہل سے بات کرنے کے باوجود اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ مناہل کو سارہ نے اغوا کرلیا ہے۔

کبیر اس وقت احتشام بیگ کے وسیع وعریض گھر میں تھا۔ احتشام نے اپنی لوٹی ہوئی رقم کو حاصل کرنے اور سارہ کو گرفتار کرنے کے لیے بڑے بڑے لوگوں کو فون کیا تھا اور اوپر کی سطح تک کے پولیس افسران اس کے در پر پہنچ گئے تھے اور احتشام کو تسلی دے رہے تھے کہ وہ راتوں رات مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔ اس ساری صورتِ حال کا اصل مجرم ان کے درمیان بیٹھا سن رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کئی بار مسکرایا تھا۔ لیکن اب اچانک اس فون کال نے اس کی مسکراہٹ معدوم کردی تھی اور دل میں پریشانی کے کانٹے چبھ گئے تھے۔

اس وقت سب لوگ چلے گئے تھے اور احتشام کرسی پر براجمان سگار کے کش لے رہا تھا۔ تب کبیر نے ہمت کی۔ ''سر اگر اجازت ہو تو میں جاؤں؟''

''ہاں تم جاؤ۔ تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔'' احتشام نے کہا اور کبیر اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

کبیر سیدھا نومی کے پاس گیا تھا جس جگہ نومی کا گودام تھا، اس کے اوپر دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں اس کی رہائش تھی۔

''کیا بات ہے خیریت تو ہے؟'' نومی اسے دیکھتے ہی بولا۔

''مجھے سارہ کا فون آیا تھا۔ اس نے مناہل کو اغوا کرلیا ہے۔'' کبیر نے بتایا۔

اس کی بات سن کر نومی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ''کیا ڈرامے بازیاں کررہے ہو۔ جسے وہ جانتی تک نہیں ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس نے مناہل کو اغوا کرلیا ہے۔ اور وہ بھی سارہ نے؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے کبھی مناہل کا اس سے ذکر نہیں کیا اور نہ ہی وہ کبھی اس سے ملی تھی۔ میں بھی جھوٹ ہی سمجھ رہا تھا لیکن اس نے مجھے کال بھی مناہل کے فون سے کی تھی اور مناہل سے میری بات بھی ہوئی ہے۔ وہ اس کے قبضے میں ہے۔'' کبیر بولا۔

''یہ کیسے ممکن ہوگیا؟'' نومی اس کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہی تو میں سوچ سوچ کر پریشان ہورہا ہوں۔''

''اب کیا کرنا ہے؟''

''مناہل کو اس سے چھڑانا ہے۔''

''وہ اس کا تاوان دو کروڑ روپے مانگے گی۔ وہی دو کروڑ جو ہم نے لوٹے ہیں۔'' نومی بولا۔

''میرا دل بھی یہی کہتا ہے، وہ ایسا ہی کرے گی۔''

''تو پھر چپ ہوکر بیٹھ جاؤ۔ مناہل کو اس کے پاس رہنے دو۔'' نومی بے پروائی سے بولا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے مناہل کے گرد جھوٹ کی چمکتی ہوئی دیوار کھڑی کرنے میں کتنی محنت کی ہے، اس کا اندازہ ہے تمہیں؟ اس امیر کبیر خاندان کی لڑکی سے منگنی کرنے کے لیے میں نے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں، یہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو بلکہ تم میرے ساتھ شامل رہے ہو بلکہ تم نے ہی میرے امریکی جعلی ماں باپ کا انتظام کیا تھا۔ میں نے یہ دو کروڑ کی واردات اس لیے کی ہے تاکہ مناہل کے ساتھ شادی سے پہلے اپنے ٹھاٹ باٹ بنا سکوں۔ اور تم کہہ

رہے ہو کہ میں سونے کی چڑیا کو چھوڑ دوں۔''

''منابل کو چھڑانے کے لیے ہم کیا اسے دو کروڑ روپے دے دیں۔ اور اس انتظار میں بیٹھ جائیں کہ کب تمہاری شادی منابل سے ہوگی اور کب ہم روز انڈا کھائیں گے۔ جب تمہارے پاس وہ پیسہ ہی نہیں ہوگا تو تم اپنے ٹھاٹ باٹ کیسے بنا سکو گے۔''

''تم یہ سوچو کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی میں منابل کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ وہ کتنی قیمتی مرغی ہے۔ مجھے وہ دو کروڑ روپے بھی بچانے ہیں۔''

نومی سوچنے لگا۔ پھر پوچھا۔ ''وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ بتا رہی تھی کہ وہ شہر سے پچیس کلومیٹر دور کسی ویران جگہ پر ہے۔'' کبیر سوچتے ہوئے بولا۔ وہ ابھی تک سوچ کے اس محور سے نہیں نکلا تھا کہ منابل کیسے سارہ کی گرفت میں آگئی۔ یہ کیسے ممکن ہوگیا؟

''تم ایک کام کرو۔ اپنے فلیٹ میں جاؤ۔ وہاں سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہیں گے اور تسلی سے سوچ بھی لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ سارہ کا ارادہ کیا ہے۔'' نومی کہا۔

''کیوں نا ہم ایک ساتھ رہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ اگر تمہارے باس کو ذرا بھی شک پڑ گیا تو مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔'' نومی بولا۔ کبیر نے سوچا کہ نومی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے فلیٹ میں رہے گا تو بہتر ہے کیونکہ احتشام کا کیا بھروسا کہ وہ کسی بھی وقت اس کے فلیٹ میں آجائے۔ کبیر نے دو کروڑ روپے لوٹنے کی کتنی بھی اچھی منصوبہ بندی کی ہو لیکن احتشام کے دل کا حال تو وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں اس کے بارے میں بھی شک کا کوئی کانٹا ابھر آیا ہو۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں چلتا ہوں۔ ہم فون پر رابطہ رکھیں گے۔ ہمیں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔'' کبیر کہہ کر جانے کے لیے ایک طرف بڑھ گیا۔

جونہی کبیر وہاں سے چلا، نومی نے دل ہی دل میں سوچا کہ کبیر اسے بے وقوف بنا رہا ہے اور منابل کے اغوا کا ڈراما کر کے وہ اسے حصہ دینے کے بجائے سارے پیسوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی سوچ کبیر کے دل میں بھی سر اٹھائے کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے کہہ تو دیا تھا کہ اسے اپنے فلیٹ میں جانا چاہیے لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ نومی کی نیت خراب ہوگئی ہے۔ اسے منابل کی پروا نہیں ہے بلکہ وہ پیسوں کو بچانا چاہتا ہے۔ اور اس نے جان بوجھ کر اسے فلیٹ میں جانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ یقیناً اس کا ارادہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ دیکھتا ہوں کہ یہ کیا کرتا ہے۔

کبیر چکر کاٹ کر ساتھ والی گلی میں چلا گیا۔ جس جگہ نومی کا گودام تھا، اس کے سامنے ایک نیا گودام زیرِ تعمیر تھا جس کے دروازے آر پار دونوں گلیوں میں تھے۔

اس گودام کا آج ہی لینٹر ڈلا تھا اس لیے چھت کے نیچے بانسوں کی جا بجا قطاریں تھیں۔ کبیر پچھلے دروازے سے اندر چلا گیا اور ایک ایسی جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں وہ نومی پر پوری نظر رکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا فون سائلنٹ پر کر دیا تھا۔

☆☆☆

سارہ نے بہت سوچ بچار کے بعد اندھیرے میں تیر چلانے کا سوچا اور نومی کے نمبر پر اس موبائل فون سے کال کی جو اسے کبیر نے لے کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بیل جانے کے بعد دوسری طرف سے نومی کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

سارہ نے اپنی آواز اس طرح دھیمی رکھی تھی جیسے وہ کہیں چھپ کر بات کر رہی ہو۔ ''میں سارہ بول رہی ہوں۔ ابھی میں نے کبیر کو فون کیا تھا۔ مجھے اس شہر سے فرار ہونے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اور کبیر نے کہا ہے کہ وہ باس کے پاس ہے اس لیے میں تمہیں فون کردوں۔ اسی نے مجھے تمہارا فون نمبر دیا ہے۔''

''وہ تو ابھی یہاں سے گیا ہے۔'' اس کی بات سنتے ہی نومی کے منہ سے فوراً نکلا۔ سارہ کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا تھا۔

سارہ نے اس کی بات کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے یہی کہا تھا۔ پلیز مجھے کچھ پیسے دے دو میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

''کبیر نے تمہیں پیسے دیے تو تھے اور پھر تمہارے پاس کبیر کی منگیتر بھی تو ہے۔'' نومی منہ بنا کر بولا۔

''کبیر کی منگیتر......؟ میرے پاس......؟ ایک کمزور لڑکی جو اس وقت ایک مصیبت میں مبتلا ہے اور پھر میں یہ جانتی بھی نہیں ہوں کہ اس کی منگیتر کون ہے، وہ میرے پاس کیسے ہوسکتی ہے۔'' سارہ کو یہ سن کر ایسا لگا تھا جیسے اس کا کام بن گیا ہے۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا کہ نومی اس کے ساتھ ہر کام میں شریک ہے اور کبیر اس کے ساتھ منابل کی بات ضرور کرے گا۔

''کیا اس کی منگیتر واقعی تمہارے پاس نہیں ہے؟ تم نے اسے اغوا نہیں کیا ہے؟'' نومی نے پوچھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے، مجھے شہر چھوڑ کر جانا ہے۔ براہِ مہربانی میری مدد کردو۔ جو پیسے کبیر نے مجھے دیے تھے وہ اسپتال سے کسی نے نکال لیے ہیں۔ میں جس رکشے میں بیٹھی تھی اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔'' سارہ نے اپنا لہجہ کچھ ایسا بے چین اور ضرورت مند کی طرح سے رکھا تھا کہ نومی کو اس کی بات کا یقین آجائے۔

نومی تو پہلے ہی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ سارہ نے منابل کو اغوا کیا ہوگا۔ وہ کیسے اغوا کرسکتی تھی۔ نومی کا شک ٹھیک تھا کہ کبیر اب ساری رقم خود ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔

''ہیلو...... ہیلو......'' جب نومی نہ بولا تو دوسری طرف سے سارہ ہیلو، ہیلو کرنے لگی۔ نومی کے سامنے حقیقت آگئی تھی اس لیے اس نے فون بند کردیا۔

سارہ ہولے سے مسکرائی۔ وہ منابل کے پاس بیٹھ گئی۔ ابھی نومی نے بتایا تھا کہ کبیر اس کے پاس سے گیا ہے۔ چنانچہ اس نے منابل کے فون سے کبیر کو فون کیا اور اسپیکر آن کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کبیر کی آواز آئی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''تم مطلب کی بات کرو، کیا کرنا چاہتی ہو۔''

''پاس سے رقم لوٹنے کے لیے تم نے مجھے پھنسادیا۔ رقم تمہارے اور نومی کے پاس ہے۔ اور میں اذیت بھگت رہی ہوں۔ مجھے ان دو کروڑ میں سے میرا حصہ بھی چاہیے ورنہ میں منابل کو جان سے ماردوں گی۔''

''ان پیسوں میں سے انہیں بھی پیسے دیے ہیں جو میں نے کرائے پر آدمی لیے تھے۔ پیسہ میرے پاس نہیں ہے، نومی کے پاس ہے اور مجھے اس کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔'' کبیر جلدی سے بولا۔ اس کا لہجہ دھیما تھا۔ منابل نے بھی کبیر کی وہ بات سن لی تھی۔ سارہ نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ اب یقین آگیا۔

''جیسے بھی ہو وہ سارا پیسہ مجھے دو۔ ورنہ میں منابل کو واقعی ماردوں گی۔ سوچو جو منابل کو اغوا کرسکتی ہے، وہ اس کے ساتھ کیا نہیں کرسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے منابل کو بھی اپنے مقصد کے لیے اس کے باپ کی دولت پانے کے لیے اپنی محبت کے دام میں پھنسایا ہے۔ اگر تم نے مجھے پیسہ نہ دیا تو میں منابل کو ماردوں گی اور تم اپنا وہ مقصد کبھی پورا نہیں کرسکو گے جو تم منابل سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔''

''منابل کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ دوسرے کمرے میں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو۔''

''میں کہیں بھی ہوں تمہیں اس سے کیا؟''

''مجھے ابھی پیسہ چاہیے۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو، میں منابل کے ساتھ اس کی گاڑی میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔'' سارہ نے زور دیا۔

''میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔'' کبیر الجھن کا شکار ہوگیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بتاؤ تم کہاں ہو ورنہ میں منابل کا کان کاٹ دوں گی اور پھر......'' سارہ نے درشت مگر دھیمے لہجے میں دھمکی دی۔

''ایک منٹ...... تم کچھ نہیں کرو گی۔'' کبیر بولا۔ وہ منابل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے دولت کی کان تھی۔ اس نے ایک فیصلہ کیا اور بولا۔

''میں نومی کے گودام کے سامنے ہوں۔ تم اسی جگہ منابل کو لے آؤ۔ میں نومی سے پیسہ لیتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ تم منابل سے کوئی بات نہیں کرو گی۔ میں تم کو پیسہ دوں گا اور تم پیسہ لے کر چلی جاؤ گی۔''

''منابل کو کیا بتاؤ گے کہ تم نے اسے میرے چنگل سے کیسے چھڑایا ہے؟'' سارہ نے یہ سوال منابل کی طرف دیکھ کر کیا۔

''بس تم اپنی زبان بند رکھو گی۔ یہ ہم دونوں کے درمیان معاہدہ ہے۔ اس کا تاوان دینے سے میرا اعتماد اس پر اور مضبوط ہوجائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسے لے کر آرہی ہوں۔ لیکن یاد رکھنا اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تو مروں گی ہی، منابل کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' سارہ نے کہہ کر فون بند کردیا۔

اب کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ کبیر کی حقیقت کھل گئی تھی۔ یہ واضح ہوگیا تھا کہ انہوں نے اپنے پاس کی دو کروڑ کی رقم لوٹی تھی۔ وہ منابل سے .... بھی اس کی دولت کے لیے محبت کررہا تھا۔ وہ لوٹا ہوا دو کروڑ روپیہ دے کر منابل پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کا تاوان اپنی جیب سے دیا ہے۔ منابل کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔

اس دوران میں اپنے فون سے سارہ نے نومی کو فون کیا۔ بہت زیادہ بیل ہونے کے بعد نومی کی آواز آئی۔

"کیابات ہے؟"

"کبیر کہاں ہے؟"

"مجھے کیا پتا؟"

"ہوشیار ہوجاؤ۔ وہ تم سے لوٹا ہوا پیسہ لینے کی تیاری میں ہے۔" سارہ نے کہہ کر فون بند کیا اور منابل کے ہاتھ پیر کھول دیے۔ پھر بولی۔

"تم حقیقت جان چکی ہو۔ کیا تم میری اتنی مدد کرسکتی ہو کہ مجھے اپنی گاڑی میں ان تک لے جاؤ۔"

"ہاں لے جاسکتی ہوں۔" منابل نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

سارہ نے اس کا موبائل واپس دیتے ہوئے کہا۔

"سوری...... میرا مقصد تمہیں کوئی تکلیف دینا نہیں تھا لیکن......"

"مجھے تو تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مجھے حقیقت سے آگاہ کردیا۔ میں اب تمہاری مدد ان تک لے جانے میں ہی نہیں کروں گی بلکہ تمہیں بچانے کے لیے بھی اپنا وکیل کھڑا کردوں گی۔"

"شکریہ...... اب جلدی چلو یہاں سے۔"

دونوں فلیٹ سے باہر نکلیں اور لفٹ سے نیچے پہنچ گئیں۔ پارکنگ میں منابل کی کار کھڑی تھی۔ دونوں کار میں بیٹھ گئیں اور سارہ نے بتادیا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ منابل جانتی تھی کہ نومی کا گودام کہاں ہے۔ اس نے کار کا رخ اس طرف کرلیا تھا۔

راستے میں سارہ نے اپنے باس کو فون کیا۔ دوسری طرف سے اس کے باس کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے بولتے ہوئے اپنے ہونٹوں میں سگار دبا رکھا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں سارہ ہوں۔"

"سارہ تم...... تم میری رقم لے کر فرار ہوگئیں اور......" احتشام بیگ کا پارا یکدم آسمان کو چھونے لگا۔

"سارہ جلدی سے بولی۔" وہ واردات میں نے نہیں کبیر اور اس کے دوست نومی نے کی تھی۔ مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ مجھے سب کچھ مل رہا تھا۔ آپ کی محبت، آپ کی چاہت اور ہیروں کی انگوٹھیوں کے ساتھ رہنے کے لیے ایک عالیشان فلیٹ۔ میرا نہ آگے ہے اور نہ پیچھے میں ساری زندگی آپ کے ساتھ رہنے کو تیار تھی لیکن کبیر نے کھیل کھیلا اور سارا الزام میرے سر پر رکھ دیا۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو، کبیر ایسا نہیں ہے۔" اس بار احتشام کا لہجہ کچھ نرم ہوگیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سارہ کی ان باتوں سے پگھل گیا تھا۔

"وہ کیسا ہے۔ یہ جاننا چاہتے ہیں تو ابھی اپنے آدمیوں کے ساتھ اس جگہ پہنچ جائیں، میں آپ کو وہ پتا سینڈ کررہی ہوں۔ دیر کریں گے تو اپنی رقم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجائیں گے۔" سارہ نے کہہ کر منابل سے پوچھ کر اس جگہ کا پتا سینڈ کردیا۔

☆☆☆

کبیر کے لیے رقم سے زیادہ منابل اہم تھی۔ وہ منابل کو بچانا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور نومی کو فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی وہ بولا۔

"نومی میں پانچ منٹ میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ میرا انتظار کرنا۔"

کبیر نے فون بند کردیا اور اسی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ فوراً اس جگہ سے نکل کر اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پندرہ منٹ ابھی اسی جگہ بیٹھنا تھا۔ تاکہ اسے شک نہ ہو کہ وہ اس کے پاس ہی کہیں تھا۔

کال سنتے ہی نومی کو سارہ کی بات یاد آگئی کہ اس نے ابھی مطلع کیا تھا کہ کبیر اس سے رقم لینے آرہا ہے، وہ ہوشیار ہوجائے۔ یقیناً سارہ کو اس بات کا پتا چلا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نومی نے اسے خود بتایا ہو کہ وہ نومی سے رقم لینے جارہا ہے۔ کبیر کا سارہ سے رابطہ تو تھا۔ ایسی ہی سوچیں سوچتا ہوا نومی کمرے کی کھڑکی میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کبیر اس کے ساتھ بھی کھیل کھیل رہا تھا۔

اچانک نومی کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے گودام کو آگ لگادے۔ آگ لگنے کا جواز وہ یہ پیش کرے گا کہ شارٹ سرکٹ سے آگ لگ گئی۔ آگ لگانے سے پہلے وہ گودام سے رقم نکال کر محفوظ جگہ پر رکھ دے اور کبیر آئے گا تو وہ کہہ دے گا کہ اچانک آگ لگ گئی اور رقم بھی جل گئی۔

یہ سوچتے ہی وہ پھرتی سے گودام کی چابی لے کر نیچے آیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل سے پیٹرول نکالا اور گودام کی طرف چلا گیا۔

اچانک کبیر نے دیکھا کہ ہاتھ میں پیٹرول کی بوتل لیے نومی گودام کے تالے کھول رہا ہے۔ جب شٹر کھل گیا تو نومی نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ رہائشی علاقہ نہیں تھا کہ وہاں لوگوں کا آنا جانا ہوتا، مغرب کے وقت گودام بند ہوجاتے تھے۔ نومی گودام میں پڑے مال پر پیٹرول

چھڑ کنے لگا تو کبیر کی حیرت میں دو چند اضافہ ہو گیا کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے۔

اسی اثنا میں نومی گودام سے وہ بیگ نکال لایا جس میں دو کروڑ روپے تھے۔ وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں کی طرف جارہا تھا کہ کبیر نے فوراً اسے فون کیا۔ نومی رک گیا اور اس نے فون کان کو لگالیا۔

''نومی تم کہاں ہو......؟'' کبیر نے پوچھا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' نومی نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال کردیا۔

''میں فلیٹ سے نکل رہا ہوں......'' کبیر بولا۔

''جلدی سے آجاؤ میرے گودام میں شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگ گئی ہے اور آگ بڑھتی ہی جارہی ہے۔'' نومی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

کبیر کچھ بولنے کے بجائے اس جگہ سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ نومی کا کیا ارادہ ہے۔ اچانک کبیر کو دیکھ کر نومی پریشان ہوگیا۔ نوٹوں سے بھرا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا اور گودام میں ایک چنگاری بھی نہیں تھی۔

''تم مجھے دھوکا دینا چاہتے تھے؟ اپنے گودام کو خود ہی آگ لگا کر مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ نوٹ جو ہم نے لوٹے تھے، وہ آگ میں جل گئے ہیں۔'' کبیر بولا۔

''مجھے جھوٹی کہانی سنا کر تم دھوکا دینا چاہتے تھے کہ سارہ نے مناہل کو اغوا کرلیا ہے۔ تم اس کہانی کی بنیاد پر مناہل کو اس سے چھڑانے کے لیے یہ دو کروڑ روپے تاوان کی نذر کردیتے، جو دراصل تمہارے پاس چلے جاتے اور میں تمہارا منہ دیکھتا رہ جاتا۔''

''میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ سارہ نے مناہل کو اغوا کیا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سارہ کی اتنی جرأت ہو ہی نہیں سکتی اور پھر وہ یہ کیسے کرسکتی ہے؟''

''میں خود نہیں جانتا کہ اس نے کیسے کیا۔ لیکن تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ اب بہتر ہے کہ یہ بیگ مجھے دو اور اپنا راستہ الگ کرلو۔''

''اب نہیں کبیر...... اب یہ رقم میری ہے۔''

''کیا کہا تم نے؟ یہ رقم تمہاری ہے؟ ساری منصوبہ بندی میری اور رقم تمہاری؟''

''تم نے مجھے دھوکا دیا ہے......''

''دھوکا تم دے رہے ہو۔ تم اس طرح نہیں مانو گے۔'' کبیر نے کہتے ہی اپنا پستول نکال کر اس پر تان لیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک پجیرو آندھی کی طرح وہاں آگئی اور یکدم اس کے دروازے کھلے اور احتشام بیگ کے آدمی تیزی سے باہر نکلے اور وہ کبیر کے ہاتھ میں پکڑے پستول کی پروا کیے بغیر ان کی طرف بڑھتے چلے گئے اور ان دونوں کو قابو میں کرلیا۔ وہ دونوں حیران تھے کہ یہ لوگ کیسے اچانک وہاں پہنچ گئے۔

اس کے بعد منہ میں سگار لیے احتشام بیگ باہر نکلا اور دونوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر اس بیگ پر چلی گئی جو نومی کے ہاتھ میں تھا۔ وہی بیگ تھا جس میں اس کے نوٹ تھے۔

''کبیر مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اب تم نہیں بچو گے۔''

''سر میں نے تو اسے پکڑا ہے۔ یہ اس علاقے کا جرائم پیشہ ہے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ واردات کرکے یہاں چھپا ہوا ہے اور......'' شاطر کبیر نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے لیے کہا لیکن اس کی بات مکمل نہیں ہوئی اور اس کی نگاہ سامنے چلی گئی۔ وہاں مناہل کی کار رکی تھی اور مناہل تیزی سے باہر نکل کر کبیر کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے رک گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک مناہل نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کبیر کے منہ پر طمانچہ مارا اور اسی تیزی سے اپنی کار کی طرف چلی گئی۔ کبیر کے ہاتھ سے سب کچھ نکل چکا تھا۔ اس کی منصوبہ بندی بکھر گئی تھی اور وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح کھڑا تھا۔

مناہل کی کار واپس جانے کے لیے مڑ رہی تھی اور اس دوران میں سارہ نے احتشام بیگ کو فون کیا۔ جیسے ہی احتشام بیگ نے اپنا فون کان سے لگایا، سارہ بولی۔

''آپ کے مجرم اور رقم آپ کے سامنے ہیں۔ میں ایک مہرہ تھی جو اُن کے ہی گلے میں پھنس گئی اور یہ مجھے اُگل نہیں سکے۔''

''سارہ تم جہاں بھی ہو میرے پاس آجاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' احتشام بیگ نے کہا۔

''سوری سر...... میں اب نہیں آسکتی کیونکہ مجھے ایک بوتیک میں بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔'' سارہ نے کہتے ہوئے مناہل کی طرف دیکھا اور مناہل بھی اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرادی اور ان کی کار وہاں سے نکل گئی۔

خونِ وفا

امجد رئیس

وارداتِ قلبی اور ذہنِ انسانی کی ناقابلِ فہم کرشمہ سازیوں کی ایک یادگار کہانی

کوئی قربانی مانگتا ہے اور کوئی قربان ہو جاتا ہے... کوئی ساتھ ہی لے ڈوبتا ہے۔ محبت، چاہت، دوستی اور نفسِ انسانی کی پیچیدگیوں کو کوئی سمجھ سکا ہے... نہ کبھی سمجھ پائے گا۔ جذبہ ایک ہی ہو پھر بھی ہر کردار کے ساتھ اس کے نئے نئے رنگ سامنے آتے ہیں... کوئی مرنے والے کے ساتھ مر جاتا ہے، کوئی کچھ دن رو دھو کر نئے رنگوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے... کوئی خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کا خون کر دیتا ہے... محبت، دوستی اور ذہنی گتھیوں کے پیچاک میں لپٹی ایک عجیب تر کہانی جو ابتدا سے انتہا تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھے گی...

"وہ تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتا...... کبھی نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے......"

چاندنی کا آخری مکالمہ سرگوشی نما اور تاثر سے بھرپور تھا۔ ناظرین کی تالیوں سے کالج آڈیٹوریم گونج اٹھا۔ دھیمی رفتار سے پردہ نیچے گرنا شروع ہو گیا۔ چاندنی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ حسین چہرے سے خوشی کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس نے بالائی دھڑ کو ذرا سا خم دے کر ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس حرکت کے باعث سیاہ زلفیں ہالے کے مانند اس کے روشن چہرے کے گرد لہرزن ہو گئیں۔

ساتھی اداکاروں نے بھی اسی طرح شکریہ ادا کیا۔ پردہ پورا نیچے آنے کی وجہ سے اسٹیج کا منظر اوجھل ہو گیا۔ چاندنی ساتھی اداکاروں میں گھل مل گئی۔ مرکزِ نگاہ چاندنی تھی۔ "یہ لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں، یہ اسٹیج میرا ہے۔" چاندنی نے سوچا۔

کرن نے اپنے چہرے سے بال ہٹائے۔ بیک اسٹیج کی روشنی میں اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ "اس رخ سے لائٹ مجھے پرابلم کرتی ہے۔ تم نے غور کیا؟"

"نہیں، مجھے ایسا نہیں لگا۔" چاندنی نے اپنی بہترین سہیلی کرن کو جواب دیا۔

کرن نے غیر مطمئن انداز میں سر ہلا کر بلندی کی جانب دیکھا۔ "موقع ملتے ہی میں اوپر جا کر کونے والی اسپاٹ لائٹ چیک کروں گی۔" کرن نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ چاندنی نے بھی سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے بدن میں جھرجھری محسوس کی۔ بلندی کا خوف ہمیشہ سے چاندنی کی نفسیات میں بیٹھا ہوا تھا۔ کرن کا عندیہ جان کر چاندنی نے خوف تو محسوس کیا۔ تاہم وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ کرن اس معاملے میں ہمیشہ سے نڈر ثابت ہوئی تھی۔ بچپن میں وہ جب کرن کے ساتھ باغ میں کھیلتی تو کرن بہ آسانی اور بلاخوف و خطر درختوں پر چڑھ جایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کرن، اداکاروں کے علاوہ اسٹیج کریو میں بھی شامل تھی اور

وہ اوپر بھی چلی جاتی تھی۔

چاندنی، غائب دماغی کے ساتھ لاکر روم کی جانب چل پڑی۔ کرن بھی ہمراہ تھی۔

''لاکرز کی تنگ میری سمجھ سے بالا ہے۔'' کرن نے تبصرہ کیا۔ ''جبکہ ہم انہیں لاک بھی نہیں کر سکتے۔''

چاندنی نے شانے اچکائے۔

''تم اپنے اگلے رول کے لیے تیار ہو؟'' سیما، طالب علموں کی بھیڑ میں جگہ بناتی ہوئی نمودار ہوئی۔

کرن کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''یہ بھی کوئی سوال ہوا؟ ہر ایک کہہ رہا ہے کہ ہیر (ہیر رانجھا) کا کردار صرف چاندنی کے لیے ہے۔'' کرن نے جواب دیا۔

''ہونہہ، لیکن کوئی ضمانت نہیں ہے کہ میں ''ہیر'' کا کردار قبول کرلوں۔'' چاندنی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

کرن نے منہ بنایا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ پورے کالج میں کوئی اور یہ کردار کر ہی نہیں سکتا۔ یہ آخری سال ہے...... یہی کردار تمہیں اسٹار بنائے گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم نے انکار کیا تو ''ہیر رانجھا'' اسٹیج ہی نہیں ہوسکے گا۔'' کرن نے منہ بنایا۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ ہیر رانجھا اسٹیج ہونے والا ہے؟''

''ایکٹنگ کوچ ضیا اسد نے۔'' کرن نے بتایا۔ ''اور انہوں نے اپنے گھر پر پارٹی کا بھی اعلان کردیا ہے۔''

بیک اسٹیج پر سب خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ چاندنی نے اپنے لاکر کا رخ کیا۔ عقب سے سلیم کی آواز آئی، وہ ہیر کے کردار کی پیشگی مبارک باد دے رہا تھا۔ چاندنی نے مڑے بغیر شکریہ ادا کیا۔

کالج کی تقریباً تمام لڑکیاں سلیم سے متاثر تھیں، سوائے چاندنی کے۔ اگرچہ چاندنی نے کبھی سلیم کے ساتھ ناشائستہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ تاہم اسے احساس تھا کہ سلیم اس کے قریب آنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ دفعتاً تیز قدمی سے چاندنی کے سامنے آگیا۔ ''ہیر رانجھا تو یقیناً کروگی؟'' وہ بولا۔

''ہاں، شاید۔'' چاندنی نے راستہ بنا کر آگے نکلنا چاہا لیکن سلیم نے سرک کر پھر راہ روک لی۔

''سلیم، دیکھو میں عجلت میں ہوں۔''

''ہیر تو تم کو بننا ہی ہے، یہ بتاؤ کہ رانجھا کون ہوگا؟''

''کالج کا کوئی چوکیدار ہوگا۔'' چاندنی جھنجلا گئی۔

''چاندنی!'' سلیم نے شکوہ کناں انداز میں ٹوکا۔

اسی دوران میں کرن آن دھمکی۔

''بہت خوب...... غالباً ہیر رانجھا، ڈسکس ہو رہا ہے۔'' کرن نے کہا۔

''پتا نہیں، ابھی تو رانجھے کا ہی نہیں پتا۔'' چاندنی نے قصداً معصوم سا طنز کیا۔

''کیا مطلب ہے؟'' سلیم بھڑک اٹھا۔ ''سب جانتے ہیں کہ رانجھے کا رول میں کروں گا۔''

''ہاں، بالکل...... چاندنی تم کیا کہہ رہی ہو؟'' کرن نے اعتراض کیا۔

''ارے زبان پھسل گئی تھی۔''

''سب سمجھتا ہوں، تم یہ رول میرے ساتھ نہیں کرنا چاہتیں۔''

''کیا ہوگیا ہے تمہیں...... تو کیا میں ڈراما کسی چوکیدار کے ساتھ کروں گی؟'' چاندنی مسکرائی۔ بے ساختہ تین قہقہے بلند ہوئے اور چھت سے ٹکرانے سے قبل ہی رک گئے۔

''کیا ہورہا ہے؟'' ضیا اسد کی شکل نظر آئی۔

''ہم، ہیر رانجھا کے بارے میں ڈسکس کررہے تھے۔'' کرن نے کھٹ سے جواب دیا۔

ضیا اسد نے سر ہلایا۔ ''گڈ، یہ بہت اہم ڈراما ہے۔''

''کیوں سر؟'' کرن بولے بغیر نہ رہ سکی...... چاندنی اسے گھور کر رہ گئی۔

''انٹرنیشنل آرٹ اسکوپ کا منتخب وفد خصوصی طور پر یہ ڈراما دیکھنے آئے گا۔'' ضیا اسد نے کرن کے بجائے چاندنی کو دیکھا۔

کرن کہاں باز آنے والی تھی۔ ''س...... سر لیکن کیوں؟''

اس مرتبہ ضیا اسد نے براہِ راست کرن کو گھورا اور جواب دیے بغیر چل پڑا۔ پھر اچانک مڑا اور چاندنی کو دیکھا۔ ''وہ لوگ بہترین ٹیلنٹ منتخب کریں گے۔'' ضیا اسد آگے بڑھ گیا۔

''عجیب آدمی ہے۔'' کرن بڑبڑائی۔ ''سوال میں کررہی ہوں اور گویا جواب، وہ تمہیں دے رہا ہے۔''

''کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ''بہترین ٹیلنٹ'' کون ہے؟'' سلیم کافی دیر بعد بولا۔

''بس جناب، مسکہ نہ لگائیں۔'' کرن نے انگوٹھا دکھایا۔

کالج میں رش کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہوگیا تھا۔

''تم کس انتظار میں ہو، چلو ہوا آنے دو۔'' کرن نے سلیم کو اشارہ کیا۔

''عجیب لڑکی ہے۔'' سلیم نے منہ بنا کر قدم بڑھائے۔

چاندنی نے اپنا لاکر کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا۔ اس کی اشیا ویسے ہی رکھی تھیں۔ تاہم ایک نئی چیز کا اضافہ ہوگیا تھا۔ سرخ گلابوں کا ''بوکے'' کافی نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ ''بوکے'' بڑے سے نیلے رنگ کے پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' کرن نے چاندنی کے شانے پر سے جھانکا۔

''خوب! کوئی میرے لیے پھول چھوڑ گیا ہے، کون ہے؟'' چاندنی نے ''بوکے'' اٹھا کر لپٹا ہوا کاغذ الگ کرنا شروع کیا۔ کاغذی بندھن پوری طرح الگ ہونے سے پہلے ہی ''بوکے'' چاندنی کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ چاندنی کا منہ دہشت سے کھل گیا تھا۔

☆☆☆

دونوں سہیلیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بکھرے پھول اور پتیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ مڑ چکے تھے اور نمی کی وجہ سے بُو اٹھ رہی تھی۔ مزید یہ کہ ان کے اندر مختلف قسم کے حشرات رینگ رہے تھے۔ وہ دونوں گم صم تھیں۔ چاندنی کی نظر سفید لفافے پر پڑی جس پر ربر بینڈ لپٹا ہوا تھا۔ چاندنی نے جھک کر کانپتے ہاتھوں سے لفافہ اٹھایا۔ ربر ہٹا کر اندر سے کاغذ کا ٹکڑا برآمد کیا اور مختصر تحریر پڑھنی شروع کردی۔

پیاری چاندنی،

ڈھیروں مبارک۔

تمہارے آخری مکالمے کی ادائیگی بہت شاندار تھی...... تم نہیں جانتیں کہ پردہ گرنے کے بعد بھی میں تمہارے بہت قریب تھا۔ ہمیشہ تمہارے قریب رہوں گا۔

چکور۔

نوٹ کے ساتھ چکور کا اسٹیکر بھی موجود تھا۔

چاندنی ساکت و جامد کھڑی کاغذ کے ٹکڑے کو گھور رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف، غصے میں تبدیل ہونے لگا۔ کرن نے بُو سے بچنے کے لیے چٹکی سے ناک دبائی ہوئی تھی۔ ''آخر یہ کس کی حرکت ہے...... ؟ اور کیوں؟'' وہ بولی۔

''دیکھو۔'' چاندنی نے کاغذ کے نیچے اشارہ کیا۔ ''یہاں کسی کے دستخط نہیں ہیں بلکہ چکور کا ایک اسٹیکر لگا ہوا ہے۔'' چاندنی نے کہا۔

''بہت بامعنی اسٹیکر ہے۔'' کرن اس حال میں بھی ناک پکڑے پکڑے منمنائی۔ ''چاند اور چکور۔''

''کرن، تو پاگل ہے۔''

''میں تیرے لیے پاگل ہوں۔''

''کیوں تو چکور ہے؟''

''یہی سمجھ لے۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' چاندنی نے کہا۔

''مجھ سے؟''

''تو مار کھائے گی۔'' چاندنی نے بیگ اٹھا کر لاکر بند کردیا۔ ''خیر کون پروا کرتا ہے...... کسی بدذوق نے مذاق کیا

ہوگا۔ چل نکل یہاں سے۔''

''بڑا بھونڈا مذاق ہے۔ جمیل کا کام ہو سکتا ہے۔''

''جمیل؟''

''ہاں، میں اسے طویل عرصے سے جانتی ہوں۔ ہمارے محلے میں ہی رہتا ہے۔ اگر میں یہاں نہ آتی تو وہ کسی اور کالج میں نظر آتا۔ وہی شروع سے الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہا ہے۔'' چاندنی نے تفصیل بتائی۔

''یار ایک بات بتا۔'' کرن نے آنکھیں گھمائیں۔

''تو نے کتنے چکور پالے ہوئے ہیں؟''

''تو کسی ڈرامے میں مسخرے کا رول کر لے۔''

چاندنی نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

''مسخرہ نہیں مسخری۔'' چاندنی بے ساختہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

چاندنی کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چاندنی کو اپنا گھر اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی ماں ایک باحوصلہ اور پڑھی لکھی خاتون تھی۔ وہ نیٹ پر آرڈر لے کر کڑھائی کے نمونے فروخت کرتی تھی۔ پہلا سال سخت گزرا تھا لیکن چاندنی کی ماں نے ہمت نہیں ہاری۔ بالآخر یہ بات ثابت ہو گئی کہ خوش قسمتی ہمیشہ بہادروں پر مسکراتی ہے۔ اگلے دو سال میں وہ لوگ مناسب حد تک مستحکم ہو گئے۔ چاندنی، ماں کی بہت عزت کرتی تھی۔

اداکاری اس کے خون میں تھی۔ اس کا خواب تھی۔ مشکل یہ تھی کہ شہر کے چند پوش علاقوں میں گنتی کے کالج تھے جہاں غیر نصابی سرگرمیاں سنجیدگی سے کرائی جاتی تھیں۔ اداکاری کے نقطۂ نظر سے اس نے ''گرین ہلز کالج'' کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں فیس کی مد میں خاصی رقم وصول کی جاتی تھی۔ چاندنی کئی روز تک سوچ بچار کرتی رہی کہ کس طرح ماں سے بات کرے۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ ماں نے خود ہی تاڑ لیا کہ اس کی حور جیسی ذہین بیٹی کسی کشمکش کا شکار ہے۔ لہٰذا ایک روز اس نے خود ہی بیٹی کی مشکل آسان کر دی۔

چاندنی کیا جواب دیتی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری تہ نظر آ رہی تھی۔ چاندنی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''کل رات میں بات کریں گے۔'' ماں مختصر جواب دے کر اٹھ گئی۔ وہ بیٹی کو امید و بیم کی کیفیت میں چھوڑ گئی۔ چاندنی کے لیے دن بتانا دشوار ہو گیا۔

بالآخر فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ چاندنی سخت اضطرابی کیفیت کا شکار تھی۔ ماں نے دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ چند باتیں سمجھائیں اور کچھ وعدے لیے۔ چاندنی لب بستہ سنتی رہی۔ آخر میں ماں نے اسے اجازت دے دی۔

''ماں، میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔'' چاندنی کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اس کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ماں، لیکن پیسے......''

''تمہارا مسئلہ نہیں ہے...... شاید مجھے کچھ زیادہ کام کرنا پڑے۔''

تاہم یہ بات صرف ماں ہی جانتی تھی کہ زیادہ کام سے بھی کام نہیں چلے گا۔ جن زیورات کو وہ کسی نہ کسی طرح سنبھالتی آئی تھی، ان میں بیشتر کو وہ بیچنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ چاندنی بے خبر تھی، اگر اسے علم ہو جاتا تو وہ اپنا خواب توڑنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ لگاتی۔ وہ جو کچھ تھی، ماں کی انتھک محنت کی وجہ سے تھی۔

☆☆☆

کرن، چاندنی کی خواب گاہ میں موجود تھی۔ کرن اپنی اداکاری سے متعلق تشویش کا شکار تھی۔ چاندنی اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ کرن کا وزن لگ بھگ بیس پونڈ کم ہونا چاہیے تھا۔ وزن کے بارے میں وہ زیادہ ہی حساس تھی۔ چاندنی اسے سمجھا رہی تھی کہ وہ کون کون سے رول ادا کر سکتی ہے۔

''وزن کو ناقابلِ عبور رکاوٹ مت جانو۔'' چاندنی نے کہا۔ ''حتیٰ کہ تم ''ہیر'' کی سہیلی کا کردار بھی کر سکتی ہو۔'' چاندنی نے سمجھایا۔

کرن خاموش رہی۔

''چاندنی۔'' وہ کچھ دیر بعد مخاطب ہوئی۔ ''جب ہم دونوں بہت چھوٹے تھے، تو کیا تم نے سوچا تھا کہ تم بڑی ہو کر ایسی شہرت حاصل کرو گی؟''

''نہیں، ظاہر ہے یہ میرے گمان میں نہ تھا۔'' چاندنی نے جواب دیا۔ ''میرا خیال تھا کہ میں موٹی اور غیر معروف ہی رہوں گی۔''

''میری طرح۔'' کرن نے سرگوشی کی۔

چاندنی نے اس کی سرگوشی نظر انداز کر دی۔ ''لیکن جب میں نے ڈرامے میں دلچسپی محسوس کی تو میرے خیالات بدل گئے۔ نہ صرف مجھے اپنی خفیہ صلاحیتوں کا علم ہوا بلکہ میں

ایک نامور اداکارہ بننے کے لیے تیار ہوگئی۔"
"یہ سب بہت تیزی سے ہوا۔" کرن نے کہا۔
"صرف ایک ڈرامے کے بعد ہی تم کلک کر گئیں..... تمہارا وزن کم ہو گیا اور سلیم سے بھی دوستی ہوگئی جو مشکل سے ہی کسی کو منہ لگاتا تھا۔ بعدازاں تم نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ لڑکیوں کی حد تک ڈراما سرکل میں تم واحد اسٹار ہو۔"
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... لیکن کیا اس میں قسمت کا بھی دخل نہیں تھا؟ کیونکہ مجھ سے پہلے جو لڑکی تھی اس نے کالج چھوڑ دیا تھا۔"
"ہاں، میں جانتی ہوں۔" کرن نے اعتراف کیا۔
"تاہم ہر کوئی جانتا ہے کہ "گرین ہلز" کی تاریخ میں تم سے زیادہ پرکشش اور بہترین اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال لڑکی، پہلے نہیں آئی..... پیشہ ورانہ کیریئر کے لیے تم حقیقی معنوں میں موزوں ترین ہو۔"
کرن گہری سانس لے کر چاندنی کے بستر پر نیم دراز ہوگئی۔
"میری ایک بے معنی سی اور خود غرضانہ امید تھی۔"
"وہ کیا؟" چاندنی نے سوال کیا۔
"تم بہت زیادہ مشہور و مقبول نہ ہوتیں تاکہ ہم ہمیشہ دوست رہتے۔"
"تو واقعی پاگل ہے۔" چاندنی چیخ پڑی۔ "اگر مجھے اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا تو میں تجھے اسٹیج پر بلا کر کہوں گی..... یہ میری بہترین سہیلی ہے جس کی وجہ سے آج میں یہ ایوارڈ وصول کر رہی ہوں۔"
دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔
چاندنی نے عام لباس تبدیل کر کے سلیپنگ سوٹ زیب تن کر لیا۔
"کیسی لگ رہی ہوں؟"
"تو ہر لباس میں دلربا لگتی ہے۔"
"کیا مردوں کی طرح کمنٹ کر رہی ہے۔"
"کاش میں مرد ہوتی۔"
"اب تو میرے ہی گھر میں مار کھائے گی۔" چاندنی نے آنکھیں دکھائیں۔
"اوہ تو....." کرن نے گھڑی دیکھی۔ "نکلو بھی۔" وہ یک دم اٹھی اور اٹھتے ہی سکتے کی حالت میں چلی گئی۔
اس کی کیفیت دیکھ کر چاندنی بھی بری طرح چونکی تھی۔ خواب گاہ کی کھڑکی پر دستک ہوئی تھی۔ وہ اسے وہم سمجھ رہی تھی۔

"کرن، کوئی کھڑکی پر ہے..... جو ہمیں دیکھ رہا ہے۔"
کرن بھی بری طرح بدحواس ہو چکی تھی۔ دونوں کھڑکی کی طرف گئیں اور اسی وقت کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ کوئی چیز گرنے کی آواز آئی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ کیا کیا جائے۔
"ہم دوسری منزل پر ہیں..... کھڑکی تک کیسے آیا جا سکتا ہے؟"
"شاید ہم گھبرا گئے ہیں..... ہوا کا جھونکا ہوگا۔" کرن نے کہا۔
"نہیں، کوئی چیز گری ہے باہر۔" چاندنی نے کھڑکی کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔
"چاندنی، مت کرو۔"
لیکن وہ کھڑکی کھول چکی تھی۔ مدھم روشنی میں اس نے باہر جھانکا..... پھر نیچے دیکھا۔ "کوئی نہیں ہے۔" کرن ابھی تک کمرے کے مرکز میں ایستادہ تھی۔ چاندنی نے کھڑکی بند کر دی۔
"ضیا اسد کی پارٹی کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔"
دونوں ضروری دروازے لاک کر کے نیچے آگئیں۔
"ہوا کا جھونکا تھا۔" کرن نے پھر کہا۔
"وہ دیکھو" چاندنی نے اشارہ کیا۔ کرن نے اشارے کی جانب دیکھا۔ گھاس میں المونیم کی سیڑھی پڑی تھی۔ سیڑھی کے اوپر دوسری منزل پر چاندنی کی خواب گاہ تھی۔ چاندنی کی آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔
"ہوا نے اسے گرایا ہوگا۔" کرن کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
"لیکن سوال یہ ہے کہ سیڑھی وہاں کیا کر رہی تھی؟" چاندنی نے اعتراض کیا۔ "پہلے کسی نے پھولوں کا مذاق کیا، اگر وہ مذاق تھا..... پھر پُراسرار کارڈ، اور اب یہ سیڑھی....."
"تم کہنا چاہ رہی ہو کہ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے..... ہمیں ہراساں کرنا چاہتا ہے؟"
"یہ خیال، دیوانگی جیسا ہے..... ہوا تو چل رہی ہے۔ سیڑھی بھی ہے لیکن سڑک خالی ہے، نہ کوئی گاڑی..... نہ آدم نہ آدم زاد۔ اگر کوئی گاڑی میں بھاگا ہے تو انجن کی آواز آنی چاہیے تھی۔ ذرا سوچو اگر کوئی کھڑکی سے جھانک رہا تھا تو کیا وہ خود سیڑھی کے ساتھ نہیں گرتا؟" چاندنی نے تجزیہ پیش کیا۔
"پھر؟"

''کوئی اور ہی بات ہے، ممکن ہے ماں نے کسی وجہ کے تحت سیڑھی وہاں رکھی ہو پھر اسے ہٹانا بھول گئی ہوں۔ کل ماں سے پوچھوں گی۔ اس وقت ان کو بیدار کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کو پتا ہے کہ ہم دونوں پارٹی میں ہیں۔''

''ہاں، ہاں...... تمہاری بات میں وزن ہے لیکن مجھے اب بھی کچھ شک ہے۔'' کرن نے کہا۔

''وہم کا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔''

''لقمان؟ ہماری ٹیم میں تو کوئی لقمان نہیں ہے۔''

''لگتا ہے، تمہارا خوف ختم ہو گیا ہے۔'' چاندنی نے کرن کا کان مروڑا۔

''چلو اسے اٹھا کر گیراج میں رکھ دیتے ہیں۔''

دونوں سیڑھی کے قریب آ گئیں۔ ''تم اُدھر سے اٹھاؤ۔'' چاندنی نے جھکتے ہوئے کہا۔ اپنی جانب سیڑھی اٹھانے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھائے اور بمشکل چیخ کا گلا گھونٹتے ہوئے اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا؟''

چاندنی منہ پر ہاتھ رکھے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

سیڑھی پر ''چکور'' کا اسٹیکر چسپاں تھا۔

☆☆☆

گاڑی کرن ڈرائیو کر رہی تھی۔ چاندنی مُصر تھی کہ یہ سب کسی مریضانہ ذہن کی کارستانی ہے۔

''مریضانہ ذہن؟''

''ہاں، کوئی نفسیاتی مریض یا پھر دہشت گرد۔''

''دہشت گرد؟''

''میرا مطلب ہے کہ اس قسم کے لوگ، افراد خصوصاً لڑکیوں اور اسٹارز کو خوامخواہ ہراساں کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ایسے مریضانہ ذہن، خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے تعاقب کرنے والے کو زندگی کے بوجھ سے ہی آزاد کر دیتے ہیں۔'' چاندنی نے سمجھایا۔

''لگتا ہے کہ کسی ڈرامے کے مکالمے ادا کر رہی ہو۔'' کرن نے اعتراض جڑا۔ ''بہرحال اگر ایسا ہے تو میں کم از کم محفوظ ہوں، کیونکہ اسٹار تو تم ہو۔''

''یعنی تمہیں صرف اپنی فکر ہے؟ آج بات کھل گئی۔''

''بکواس مت کرو، مذاق کر رہی تھی۔''

''جانتی ہوں۔'' چاندنی بولی۔

''اگر یہ ایسا ہی کوئی بندہ ہے تو خطرے والی بات نہیں۔ خوف و ہراس سے خوشی حاصل کر کے ایک دن غائب ہو جائے گا۔

''لیکن اگر اسے مزید لذت حاصل کرنے کے لیے نمک مرچ کی ضرورت پیش آئی تو پھر وہ اپنے ہدف کو ہلاک کر کے دم لے گا کیوں یہی مطلب ہے نا؟'' کرن نے سوال کیا۔

''ڈرا رہی ہے؟'' چاندنی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''پوچھ رہی ہوں۔''

''ایسا ممکن ہے۔ تاہم مجھے وہ صرف اسٹیکر ہی پیش کر رہا ہے...... اور آثار و شواہد بتا رہے ہیں کہ وہ جو بھی ہے، ہمارے ساتھ کالج میں ہی ہے...... اور ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کون ہو سکتا ہے؟''

''اداکارہ کے ساتھ تم فلسفی بھی ہو۔'' کرن نے کہا۔

''سلیم۔'' چاندنی بڑبڑائی۔

''سلیم؟'' کرن کے لہجے میں حیرت کا عنصر شامل ہو گیا۔ ''اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمہیں ہراساں کرے؟''

''وہ مجھے ہراساں نہیں کر رہا۔''

''کیا؟''

''تعلقات بحال کرنے کا یہ اس کا طریقہ ہو سکتا ہے۔''

''اس کا امکان تو نظر نہیں آتا...... تم دونوں کی دوستی ایک سال قبل ختم ہو گئی تھی۔'' کرن نے اپنا اندازہ پیش کیا۔

''ہاں امکان تو بظاہر نہیں ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ اس نے خود کو بہت حد تک تبدیل کر لیا ہے۔ سگریٹ نوشی تک ترک کر دی ہے۔''

''یعنی تمہارے معاملے میں سنجیدہ ہے؟''

''اطوار تو ایسے ہی ہیں۔'' چاندنی نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میں نہیں چاہتی...... اگر میرا اندازہ ٹھیک ہے تو اسے یہ گھٹیا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ شاید وہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس کی مدد لینے...... دوڑ پڑوں گی۔''

''تو تم اس کے بارے میں خاصی بُری رائے رکھتی ہو؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ وہ بدل گیا ہے لیکن میری نظر میں ٹوٹا ہوا پُرخلوص رشتہ پھر جوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ ممکن ہے میں غلط سوچ رہی ہوں۔ البتہ اگر میرا اندازہ غلط نکلا یعنی وہ مجھے ہراساں نہیں کر رہا ہے۔ ایسی

صورت میں، میں اس کی مدد حاصل کرسکتی ہوں لیکن غیر مشروط!''

''تم واقعی فلسفی اداکارہ ہو۔''

چاندنی نے گھڑی دیکھی۔ ''پارٹی اس وقت پورے عروج پر ہوگی۔''

''ہاں۔'' کرن نے غائب دماغی سے کہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں۔'' اس کی آواز بھٹک گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' چاندنی نے غیر متوقع جواب پر تعجب محسوس کیا۔

کرن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں ریئر ویو کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ اچانک اس نے بغیر کسی تنبیہ کے رفتار دھیمی کیے بغیر سیدھا موڑ کاٹا۔

''کرن؟'' چاندنی خود کو سنبھالتے ہوئے چلائی۔ ساتھ ہی ٹائر بھی چرچرائے تھے۔ ''ضیا اسد کا گھر دوسری سمت میں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اس کی سہیلی نے جواب دیا۔ ''مگر کوئی ہمارا تعاقب کررہا ہے۔''

چاندنی نے گھوم کر عقب میں دو ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ کرن نے ایک اور نازک موڑ کاٹا۔ عقبی روشنیاں غائب ہو گئیں مگر ایک منٹ سے قبل دوبارہ نمودار ہوئیں۔ اس مرتبہ وہ ان دونوں کی گاڑی سے قریب تھا۔

''وہ ہمارے بالکل پیچھے ہے۔ وہ ہمیں روڈ سے ہٹانا چاہ رہا ہے۔'' کرن چلائی۔ چاندنی نے دونوں ہاتھ ڈیش بورڈ پر جما دیے۔ کرن کی گاڑی نے ٹائروں کے ذریعے احتجاج کیا۔ گاڑی پھسلی اور فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ تاہم کرن اناڑی عورتوں کے مانند نہیں تھی۔ اسے لائسنس حاصل کیے ہوئے آٹھ سال ہوگئے تھے۔ گاڑی کو جھٹکا لگا تھا تاہم حادثہ پیش آنے سے پہلے ہی اس نے گاڑی دوبارہ سڑک پر اتارلی۔

''ہوشیاری سے...... وہ اب بھی پیچھے آرہا ہے۔'' چاندنی نے کرن کو ہوشیار کیا۔

''وہ بمپر سے ٹکرانے والا ہے۔'' کرن نے عالم گھبراہٹ میں اعلان کیا۔

''حواس میں رہو۔'' چاندنی نے ہدایت دی۔ ''گاڑی کا رخ ضیا اسد کے گھر کی طرف موڑ دو۔ ہم پارٹی کے مقام پر پہنچیں گے تو یہ خود ہی بھاگ جائے گا۔''

''پاگل ہوگئی ہو؟''

''یقین کرو، وہ اندر گھسنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ہمارے وہاں رکتے ہی بھاگ جائے گا۔'' چاندنی نے پھر یقین دہانی کرائی۔ ''یہاں اکیلے میں، سنسان جگہ پر زیادہ خطرہ ہے۔''

''لیکن......''

''اوکے، تمہارے پاس اس سے بہتر آئیڈیا ہے؟''

''نہیں۔'' کرن کو تسلیم کرنا پڑا۔

کرن نے گاڑی کا رخ ضیا اسد کے گھر کی جانب موڑ دیا۔ رفتار خاصی تیز تھی۔ متعاقب نے بھی رفتار بڑھا دی تھی۔ جلد ہی وہ آگے پیچھے نیم دائرہ نما بڑے سے ڈرائیو وے میں پہنچ گئے۔ چاندنی حیران تھی کہ پیچھا کرنے والا اب بھی ساتھ لگا ہوا تھا۔ کرن نے گاڑی روک کر ہینڈ بریک کھینچے اور عقب نما آئینے کو گھورنے لگی۔

''وہ جب تک یہاں ہے۔ میں باہر نہیں نکلوں گی۔'' وہ بولی۔

''مجھے نہیں معلوم، اب کیا کرنا چاہیے۔'' چاندنی کی آواز میں خوف تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ہارن پر ہاتھ رکھ دو۔''

کرن آنکھیں سکیڑ کر عقب نما آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کا عنصر واضح تھا۔

''نہیں، نہیں۔'' کرن کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ''وہ گاڑی سے اتر کر ہماری طرف آرہا ہے، ہم پھنس گئے ہیں۔''

☆☆☆

''سلیم!'' کرن پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان چلائی۔

''یقین نہیں آتا۔'' چاندنی کی تیوریوں پر بھی بل پڑ گئے۔ ''تم کیوں ہمارا تعاقب کررہے تھے۔ ہمیں ڈرا کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

سلیم نے دانت نکالے۔ ''ارے بھئی مذاق تھا۔ میں تو تھرل پیدا کررہا تھا۔''

''مذاق؟ تھرل؟'' کرن برس پڑی۔ ''ہوش میں ہو، تم نے ایکسیڈنٹ کرا ہی ڈالا تھا۔''

''سوری۔'' سلیم کی مسکراہٹ مدھم پڑگئی۔ ''میں نے سوچا تھا کہ چاندنی اس طرح لطف اندوز ہوگی۔''

''بہت خوب، کیا خیالات ہیں۔'' چاندنی نے سوچا۔ ''ہینڈسم سہی، لیکن بچکانا حرکات کا ارتکاب کررہا ہے۔''

''چاندنی۔'' سلیم کی آواز نرم پڑگئی۔ وہ چاندنی کے قریب آگیا اور قریب، اس کے منہ میں غالباً پیپرمنٹ تھی۔

اتنے قریب سے چاندنی کی قوتِ شامہ نے پیپرمنٹ کی خوشبو محسوس کرلی، اسے ایک انجانی لمحاتی خوشی ہوئی کہ سگریٹ کی بُو نہیں ہے...... وہ بہت نزدیک آگیا تھا۔

''کہاں چڑھے چلے آرہے ہو؟'' کرن چیخ پڑی۔

''چاندنی، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' سلیم نے کرن کا فقرہ سنا ہی نہیں۔

معاً چاندنی کے تاثرات میں برہمی شامل ہوگئی۔ سلیم بہت نزدیک آگیا تھا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''جو کچھ کہنا ہے بعد میں کہنا۔'' چاندنی نے قطعی انکار بھی نہیں کیا تھا۔ فوراً ہی وہ کرن کے ہمراہ اندرونی سمت چل پڑی۔ آخری نظر میں اس نے سلیم کے وجیہہ تاثرات میں اداسی کے سائے کی جھلک دیکھ لی تھی۔

چلتے چلتے نامعلوم کس چیز نے اسے پلٹنے پر مجبور کیا۔ سلیم پلک جھپکائے بغیر اسی کو تکے جارہا تھا۔ چاندنی کے سینے میں انجانی ہلچل ہوئی۔ وہ سمجھ نہ سکی، لاشعوری طور پر یادداشت کے دریچے سے ایک شعر نکل کر شعور کی سطح پر آگیا۔

میں ترے عکس کو آنکھوں میں چھپا لیتا ہوں
میری سانسوں میں تو بول رہا ہے اب تک

ہاں یہی شعر اس کے چہرے پر لکھا تھا...... کتنے اچھے مراسم تھے۔ ان دونوں میں...... محض طبقاتی فرق تھا۔ سلیم، چاندنی کی افتادِ طبع کو آغاز میں سمجھ گیا تھا۔ چاندنی کی خاطر اس نے خود کو بدلنا چاہا...... تاہم چند ایک چیزوں سے جان چھڑانے میں ناکام رہا، انہی میں ایک شراب بھی تھی۔ تاہم وہ چاندنی کے سامنے مے نوشی سے پرہیز کرتا تھا۔

حادثہ ہونا تھا، ہوگیا۔ اتفاقاً ایک روز چاندنی نے اسے دوستوں کے ساتھ شغلِ مے نوشی کرتے دیکھ لیا۔ وہ سکتہ زدہ رہ گئی۔ بعدازاں غصے سے پیر پٹختی چلی گئی۔ سلسلۂ کلام جوڑنے میں سلیم کو چار ہفتے لگ گئے، اس نے شراب کے ساتھ سگریٹ بھی ترک کردی۔

اب سال بھر ہو چلا تھا۔ اجنبیت اور بے رخی ختم ہوگئی تھی۔ تاہم سلیم کی مقدور بھر کوشش کے باوجود احساسات وجذبات میں سال بھر پہلے جیسی بات نہ تھی۔ حالانکہ اونچی سوسائٹی کی رنگ برنگ تتلیاں اس کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں...... تاہم سلیم کی روح، دل، جسم وجان میں تو چاندنی خیمہ زن تھی۔ سلیم کی آنکھ کسی اور جانب اٹھتی ہی نہ تھی۔ وہ معاملہ ہی نہ تھا کہ تو نہیں اور سہی...... اور نہیں...... اور سہی......

اب سلیم نڈھال اور شکوہ کناں تھا۔ اور چاندنی کے التفات کا منتظر تھا۔ چاندنی مڑے بغیر محسوس کررہی تھی کہ سلیم وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

ان دونوں کے پارٹی میں شامل ہوتے ہی شور مچ گیا۔ موسیقی اور پھولوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا۔ ضیا اسد کے لیونگ روم میں سرخ وسفید غبارے چھت کے ساتھ تیر رہے تھے۔

''دیکھو کون آیا ہے؟'' ضیا اسد کی آواز گونجی حسبِ عادت اس کے ہاتھ میں سگار تھا۔ ''لیڈنگ لیڈی، چاندنی عرف ہیر۔'' کئی جانب سے تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں۔

چاندنی نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بار بار شکریہ کے الفاظ ادا کیے۔

''بس اب پیٹ پوجا شروع کی جائے۔ بعدازاں سب لوگ پھر یہاں آجائیں۔ ہمیں ایک اہم اعلان کرنا ہے۔'' ضیا اسد نے کہا۔

چاندنی نے دیکھا کہ سیما ایک طرف جمیل کے ساتھ گپ لگانے میں مگن ہے۔ چاندنی نے خود کو یاددہانی کرائی کہ وہ لاکر سے برآمد ہونے والے پھولوں کے بارے میں جمیل سے بازپرس کرے گی۔

عشائیے سے شکم پُری کے بعد سب سے پہلے کرن نے ہی زبان کھولی۔

''اعلان سننے کے لیے تیار ہوجائیے...... میرا خیال ہے کہ نئے ہیرو یا ہیروئن کی آمد آمد ہے۔'' کرن نے کوک کی بوتل چاندنی کو پکڑائی۔ چاندنی نے سامنے کمرے کی جانب نگاہ ماری۔ جہاں ضیا اسد کسی نئے چہرے کے ہمراہ کھڑا تھا۔

وہ لڑکا دراز قامت تھا، بال لمبے اور آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ چہرہ متانت کا آئینہ دار تھا۔

''اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' چاندنی نے کرن کی جانب نگاہ کی۔

''حاضرین متوجہ ہوں۔'' ضیا اسد کی آواز بلند ہوئی۔ ''میرے ساتھ سکندر علی موجود ہے۔ سکندر، سیکنڈ ایئر کا ڈراما اسٹوڈنٹ ہے۔ ان کا تعلق آرٹ اسکوپ سے ہے۔ سکندر نہ صرف یہاں سیکھنا بھی پسند کرے گا، بلکہ آرٹ کلاسز میں اپنے مطالعے اور تجربے سے بھی ہمیں آگاہ کرے گا۔ یہ کہنا اضافی معلوم ہوتا ہے کہ سکندر ایک ٹیلنٹڈ طالب علم ہے۔''

''کچھ عجیب بات ہے۔'' کرن نے سرگوشی کی۔

"پہلے کبھی ایسا نہیں سنا۔"

چاندنی بغور سکندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ سب کو فرداً فرداً دیکھ رہا تھا۔ گویا مسکراہٹ کے ذریعے مصافحہ کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ تھی۔ پھر سیاہ مسکراتی آنکھیں، چاندنی کی غزالی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ یوں لگا جیسے وہ وہیں تھم جائے گا۔ کوئی انجانا تاثر اس کی سیاہ آنکھوں میں ابھرا اور فوراً غائب ہوگیا۔ اس نے چاندنی کی جانب سے نظر ہٹالی تھی۔ وہ اداکار تھا تو چاندنی بھی کم نہیں تھی۔ اس نے سکندر کی موہوم سی تبدیلی کو نوٹ کرلیا۔ تاہم وہ اس قلیل تاثر کو کوئی معنی نہ دے سکی۔

"کوئی بات ہے، اس میں۔" چاندنی نے کرن سے سرگوشی میں کہا۔ "یوں لگتا ہے، میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔"

"میں نے کہیں دیکھا ہوتا تو فوراً پہچان لیتی۔" کرن نے ڈینگ ماری۔

"قریب سے دیکھوں تو شاید پہچان لوں۔" چاندنی نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں، ابھی مزاج پوچھ آؤ۔" چاندنی بلاتامل اٹھ گئی۔

سکندر، ضیا اسد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چاندنی نے سکندر کے قریب نشست سنبھال لی۔ "میرا نام چاندنی ہے۔" اس نے اپنی بہترین مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ "سکندر صاحب آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"شکریہ، لیکن اگر ہم تکلفات سے پرہیز کریں تو اچھا لگے گا کیونکہ تکلفات آنے والے دنوں میں ویسے بھی ختم ہو جانے ہیں۔ چاندنی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" اس نے بول کر رسمیات کی دیوار گرانے میں پہل کردی۔

"تمہارا انداز پسند آیا، سکندر۔" چاندنی نے بھی اس کا نام لیا۔

"چاندنی، میں نے تمہارے تقریباً سارے ڈرامے دیکھے ہیں...... تکلف سے ہٹ کر کہہ رہا ہوں کہ تمہارے اندر خاصا ٹیلنٹ موجود ہے۔"

"یقین نہیں آتا...... بہرحال بہت نوازش۔" چاندنی نے انکساری سے جواباً کہا۔

سکندر نے ماضی میں چاندنی کے دو چار ڈراموں کے حوالے دیے اور بتایا کہ ان میں اس نے کتنا زوردار کردار ادا کیا تھا۔ چاندنی، سکندر کی معلومات اور پیشہ ورانہ مشاہدات کے ساتھ اس کی یادداشت پر بھی رشک کر رہی تھی۔

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"ظاہر ہے میں نے وہ ڈرامے دیکھے تھے۔"

"مذاق کر رہے ہو۔" چاندنی کی حیرانگی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

ضیا اسد دلچسپی سے دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

"مذاق کی کیا بات ہے...... کیا میں نے کوئی غلط بات بتائی؟" سکندر نے مسکرا کر سوال کیا۔

چاندنی کے بعض ڈراموں کے کرداروں کو اس نے بے حد سراہا۔ ان کرداروں کی جزئیات تک اسے یاد تھیں۔ کچھ دیر مزید گفتگو ہوئی اور سکندر کی معلومات کے باعث چاندنی کی حیرانگی بڑھتی چلی گئی۔ خاص طور پر وہ چاندنی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ چاندنی کے بچپن کی بعض باتیں بھی اس کے علم میں تھیں۔ چاندنی کے والد کا انتقال کب اور کیسے ہوا؟ وغیرہ وغیرہ۔

تم اداکار ہو یا جاسوس؟ چاندنی نے خود سے سوال کیا۔ چاندنی نے ایک اور بات نوٹ کی کہ سکندر نے ایک بار بھی اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ تاہم اس کی نگاہ میں خلوص اور دوستی کے ساتھ ستائش کا رنگ تھا۔ اس کے بارے میں چاندنی نے مجموعی طور پر اچھا تاثر لیا تھا۔

"سکندر، تمہاری سرگرمیاں کب سے شروع ہوں گی؟"

"ہیر رانجھا۔" وہ بولا۔" ہاتھ میز پر رکھ کر تھوڑا آگے جھکا۔ "ہیر کا کردار دیکھنے کے لیے میں انتظار نہیں کرسکتا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

چاندنی کے لیے یہ انداز اور فقرہ غیر متوقع تھا۔ تاہم وہ سمجھ نہیں سکی کہ یہ فقرہ اسے اچھا کیوں لگا۔

"کچھ انتظار تو کرنا پڑے گا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

اس وقت ضیا اسد نے مداخلت کی۔ "آؤ، تمہیں ٹیم کے دوسرے ارکان سے ملواتا ہوں۔"

چاندنی واپس اپنی نشست پر آگئی۔

"کافی پُراسرار بندہ ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"وجاہت کے بارے میں کیا خیال ہے؟" کرن نے سوال کیا۔

"تمہیں دلچسپی ہے تو ٹرائی کر ڈالو۔" چاندنی نے بڑھاوا دیا۔

"ٹھیک ہے، ٹرائی کروں گی۔"

چاندنی کی نظر پھر جمیل اور سیما پر پڑی اور وہ اٹھ گئی۔

''کرسی میں کھٹمل ہیں کیا؟'' کرن نے چھیڑا۔

''آ کے بتاتی ہوں۔'' چاندنی نے جمیل کی میز کی طرف پیش قدمی کی۔

''کیسے ہو تم دونوں؟''

''ٹھیک ٹھاک۔ تمہارا کیا حال ہے؟'' جمیل نے رسمی انداز میں استفسار کیا۔

''ٹھیک ہوں، تم کچھ پریشان نہیں ہو؟'' چاندنی نے کہا۔

''کیا مطلب؟ کوئی قانون بنا ہوا ہے کہ ہر لمحے ہنستے رہنا چاہیے؟'' جمیل نے قدرے بدلحاظی کا استعمال کیا۔

''ہاں، ایسا کوئی قانون نہیں ہے لیکن تم بدمزہ کیوں ہو رہے ہو؟ بائی دی وے، میرے لاکر میں تم نے ایک تحفہ رکھا تھا؟''

''معاف کرنا؟ کیا کہا؟''

''میرا مطلب ہے پھولوں کا بوکے۔''

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟'' جمیل یک دم پھٹ پڑا۔ ''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟ کیسے پھول؟ کیسا بوکے؟''

''ایزی، ایزی...... محض ایک سوال تھا۔ ممکن ہے کسی اور نے رکھا ہو۔ تم سے اس لیے پوچھ لیا کہ ماضی میں تم عجیب قسم کے مذاق کرتے رہے ہو...... اس میں گرم ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔''

''مذاق، وغیرہ...... میں چھوڑ چکا ہوں۔ اور پھول رکھنا تو مذاق نہ ہوا۔''

چاندنی نے اسے پیغام اور دیگر تفصیل بتائی تو اس کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ ''یہ تو مذاق نہ ہوا۔ یہ صریحاً پاگل پن ہے۔'' جمیل نے فیصلہ صادر کیا۔

چاندنی نے سیڑھی والا واقعہ بھی گوش گزار کر دیا۔ جمیل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''میرا مشورہ ہے کہ ضیا اسد کو مطلع کر دیا جائے یا پھر پولیس سے رابطہ کیا جانا چاہیے۔''

''او کے، شاید مجھے ضیا اسد کو بتا دینا چاہیے۔'' وہ معذرت کر کے وہاں سے ہٹ گئی۔

کرن غائب تھی۔ سکندر اکیلا میز کے قریب نشست پر موجود تھا۔ غالباً اس نے محسوس کر لیا تھا کہ چاندنی کسی الجھن میں ہے۔

''کیا معاملہ ہے، چاندنی؟'' اس نے استفسار کیا۔

''تم پُرسکون نہیں ہو؟''

''ہاں، کچھ الجھن ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گی۔ پتا نہیں یہ سب کچھ میرا وہم نہ ہو۔'' چاندنی کے چہرے پر گومگو کی کیفیت تھی۔

''کوئی بھی الجھن ہے، تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو...... وہم بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' سکندر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''لیکن......''

''بینگ...... گ......'' دھماکے کی آواز زوردار نہیں، تاہم اتنی ضرور تھی کہ ملحقہ کمرے کے شور اور موسیقی پر غالب آ گئی۔ وہاں یک لخت خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ چاندنی اور سکندر والے کمرے میں آ گئے۔ کیونکہ دھماکے کی آواز جس کمرے سے آئی تھی، اس کا راستہ وہیں سے ہو کر گزرتا تھا۔

چاندنی کے چہرے پر سراسیمگی تھی۔ سب سے پہلے چاندنی نے ہی پیش قدمی کی۔ معاً کسی نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ چونک کر مڑی۔ وہ سکندر تھا۔ سکندر کی گرفت نرم تھی۔

''سوری، تم میرے پیچھے آؤ۔'' اس کی سیاہ آنکھوں میں تشویش تھی۔ دھماکے کی وجہ سے یا چاندنی کے لیے؟ چاندنی فیصلہ نہ کر سکی۔ بظاہر یونہی معلوم ہوتا تھا کہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے چاندنی کو روکا تھا۔

دیگر افراد دروازے سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ سکندر نے ایک کان دروازے پر رکھ دیا۔ اندر سناٹا تھا۔ پھر اس نے ناب گھما کر دروازہ کھول دیا۔ چاندنی اس کے قریب تھی۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

چاندنی کی دلخراش چیخ نے ہلچل مچا دی۔ پھر اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ چاندنی، شاک کی حالت میں تھی۔

''سلیم...... م......'' وہ پھر چلا اٹھی۔ سلیم کا چہرہ خون میں لت پت تھا۔ وہ دروازے کی جانب آنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑا۔

''چاندنی، ہیلپ...... پ......'' اس کے حلق سے اذیت میں ڈوبی ہوئی کراہ خارج ہوئی۔ اس کے ہاتھ بھی خون سے آلودہ تھے۔ اس نے پھر رینگنے کی کوشش کی اور چاندنی کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ سلیم کا جسم غیر متحرک ہو گیا تھا۔

چاندنی کا سر گھوم رہا تھا۔ رگوں میں لہو منجمد ہو گیا تھا۔ دفعتاً سلیم کے جسم نے حرکت کی۔ اس نے سر اٹھا کر چاندنی کو دیکھا۔ ''چاندنی، میں تمہارے بغیر مر سکتا ہوں،

لیکن تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں ہے۔''

چاندنی کے بدن کی لرزش جوں کی توں تھی۔ کیا سلیم اتنا سنجیدہ ہے؟ کیا اس نے چاندنی کی خاطر خود کو لہولہان کر لیا ہے؟

''سلیم، نہیں۔'' چاندنی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

سلیم ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کرنے کے بجائے وہ چاندنی کے آنسو خشک کرنے لگا۔

حقیقی ڈرامے کو وہاں موجود حاضرین، خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ چند ایک قہقہے لگا رہے تھے۔

چاندنی نے رومال چھین کر ایک طرف پھینک دیا۔

سلیم نے سر پیچھے کر کے قہقہہ لگایا۔ ''چاندنی، میں جانتا ہوں کہ تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا کہ میں تمہاری خاطر جان دے سکتا ہوں۔''

چاندنی کو احساس ہوا کہ وہاں وہ دونوں اکیلے نہیں ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سلیم کے ساتھ سب ہنسنے لگے۔ چاندنی کو لگا کہ اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اس نے سرد آواز میں سلیم کو مخاطب کیا۔

''تم اکیڈمی ایوارڈ جیتو گے لیکن پاگل پن کا۔ بہترین پاگل۔''

''یہ ایک فضول اسٹنٹ تھا۔'' ضیا اسد نے تبصرہ کیا۔

''میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ رانجھا کے کردار کے لیے مجھ سے بہتر فنکار یہاں نہیں ہے۔'' سلیم نے کہا۔

''تمہاری اس حرکت کے بعد مجھے سوچنا پڑے گا کہ رانجھا کا کردار کون ادا کرے گا؟'' ضیا اسد نے کہا۔

سلیم نے احتجاج کیا لیکن ضیا اسد نے موسیقی شروع کرنے کا اشارہ دیا۔ چاندنی وہاں سے نکل کر کھلی فضا میں چلی گئی۔ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسے شخص کے ساتھ تمہاری دوستی رہی ہے؟''

چاندنی نے چونک کر گردن گھمائی۔ سکندر کا وجیہہ چہرہ سامنے تھا۔

''تم کیسے جانتے ہو؟ بہرحال وہ دوستی نہیں تھی۔ وہ خود اسے دوستی کا رنگ دیتا رہا ہو تو اسی کا قصور ہے۔'' چاندنی نے جواب دیا۔

''یہیں کے کسی طالب علم سے سنا تھا...... اچھا میں چلتا ہوں۔ ضیا اسد سے ملنا ہے۔''

چاندنی وہاں کھڑی اس کے بارے میں سوچتی رہ گئی۔ وہ سکندر کے لیے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ سلیم کے مقابلے میں زیادہ میچور تھا۔ سلیم نے آج جو کچھ کیا، وہ نرم الفاظ میں چھچھورپن ہی کہہ سکتی تھی۔ چاندنی نے خاصی سبکی محسوس کی تھی۔

کرن اسے تلاش کرتی ہوئی باہر آئی۔

''واپس نہیں چلنا کیا؟''

''ہاں، چلنا چاہیے۔'' چاندنی نے اکتاہٹ سے کہا۔ سلیم نے پارٹی کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ چاندنی نے آسمان کی جانب نگاہ کی۔ ان گنت ستارے جیسے سیاہ چادر میں ٹانک دیے گئے تھے۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ یہ ستارے سب آنکھیں تھیں، جو چاندنی کو دیکھ رہی تھیں۔

ان دونوں نے گاڑی کا رخ کیا۔ ایک سایہ لہرایا اور چاندنی کے بڑھتے قدم رک گئے۔ سایہ مجسم ہو کے اس کے سامنے آ گیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ سلیم تھا۔

''گھر۔'' چاندنی نے بے اعتنائی سے خشک لہجہ اختیار کیا۔ اس کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔

''چلو، میں چھوڑ دیتا ہوں۔'' سلیم نے پیشکش کی۔

''خواب دیکھ رہے ہو۔'' چاندنی بھڑک اٹھی۔

معاً سلیم نے سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''چاندنی!'' اس کی گرفت میں سختی لیکن آواز میں فریاد تھی۔

''چھوڑو مجھے۔'' چاندنی نے جھٹکا دیا۔

''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔'' اس نے پھر التجا آمیز لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے، وہاں؟'' کوئی بلند آواز میں بولا۔

چاندنی نے جمیل کو اس طرف بڑھتے دیکھا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' سلیم نے غرا کر پھر چاندنی کا بازو تھام لیا۔

''دماغ چل گیا ہے کیا؟'' جمیل نے مشتعل ہو کر سلیم کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

''کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ، چھوڑو اسے۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' سلیم نے کینہ توز نظروں سے جمیل کو گھورا۔

''چاندنی سے میری بھی دوستی ہے۔ اگر اسے لفٹ کی ضرورت ہے تو وہ مجھے بھی کہہ سکتی ہے...... اول تو وہ کرن کے ساتھ جا رہی ہے۔ لہٰذا ہوشمندی کا مظاہرہ کرو۔''

سلیم نے ''ہوشمندی'' کا مظاہرہ کیا۔ چاندنی کو چھوڑ

کر جمیل کو دھکا دیا۔ سلیم نے کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ جمیل نے گرتے گرتے حیرت سے چاندنی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''سلیم، تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' کرن سخت آواز میں پہلی بار بولی۔ تاہم معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ جمیل فٹ پاتھ سے ٹکرا کر لڑھک گیا۔ چاندنی کی چیخ نکل گئی۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت پڑا رہا، چاندنی کا دل خشک پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔

''جمیل!'' وہ چیخ اٹھی۔

''اٹھو۔'' سلیم آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ جمیل نے کراہتے ہوئے حرکت کی۔ چاندنی اس کی مدد کے لیے بڑھی ہی تھی کہ اس نے اچھل کر سلیم کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ سلیم بھی نیچے جا گرا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ چاندنی چیختی ہی رہ گئی۔ اتفاقاً وہاں کوئی اور بھی وارد نہیں ہوا کہ معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

بہرحال کرن اور چاندنی خود ہی درمیان میں آ گئیں۔ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ تو ہو گئے تاہم دونوں ہی مشتعل تھے۔

''تم لوگ نکلو گے یہاں سے تو ہم روانہ ہوں گے۔ مجھے کرن کے ساتھ ہی جانا ہے اور تم جانتے ہو۔'' چاندنی سخت برافروختہ تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح الارم کی آواز نے چاندنی کو بیدار کیا۔ یہ احساس کرنے میں اسے کچھ وقت لگا کہ الارم نہیں فون بج رہا ہے۔ اس نے وقت دیکھا، صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

''ہیلو۔'' وہ خمار آلود آواز میں بولی۔

''گزشتہ شب بھی ہم دونوں ساتھ تھے۔'' اجنبی آواز آئی۔

''کون؟'' چاندنی کا گلا خشک ہو گیا۔

''میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔'' آواز آئی۔ ''میں ہر وقت تمہیں دیکھتا رہتا ہوں، چاندنی۔''

''سنو، ایک منٹ رکو۔'' وہ بولی۔

''جلد ہی ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔''

چاندنی، پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ریسیور سختی سے پکڑا ہوا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے ڈرنے کے بجائے غصے سے سوال کیا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

☆☆☆

''ہیلو، چاندنی، رات کیسی گزری؟''

''وہی مذاق، ہراس...... کرن...... میرا خیال تبدیل ہو گیا ہے۔ صبح ہی صبح پھر اس کا فون آیا تھا۔ یہ محض ہراساں کرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ سنجیدہ ہے۔'' چاندنی نے کہا۔

''کیا پولیس کو بتا دیں؟''

''ہاں، کچھ کرنا پڑے گا...... وہ سلیم ہی ہے۔''

''تم نے آواز پہچان لی؟''

''آواز بدلی بھی جا سکتی ہے۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے لاکر روم کی طرف جا رہی تھیں۔ سلیم کو وہاں دیکھ کر دونوں کا منہ بن گیا۔ سلیم، چاندنی کے لاکر کے پاس کھڑا تھا۔

''اب کیا کرنے آئے ہو؟''

''کیا مطلب ہے؟''

''میرے لاکر سے دور رہو...... مجھ سے بھی دور رہو۔'' چاندنی نے سرد آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں تو صرف تمہارے لیے ایک نوٹ چھوڑنا چاہتا تھا۔'' سلیم نے وضاحت کی۔

''خوب، بہت خوب...... صرف نوٹ؟ اور پھول؟''

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' سلیم کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔

''پہلے تم نے نوٹ کے ساتھ سڑے ہوئے پھول بھی میرے لاکر میں رکھ دیے تھے۔''

''چاندنی، کیا مذاق ہے؟ اس سے قبل میں تمہارے لاکر کے قریب پھٹکا بھی نہیں۔ تم پتا نہیں کیا باتیں کر رہی ہو...... میں اس وقت صرف رات والے جھگڑے کی معذرت کے لیے نوٹ رکھنے آیا تھا۔'' وہ بولا۔

''اوہ، واقعی...... ذرا دکھانا۔'' چاندنی نے ہاتھ بڑھایا۔

''بھول جاؤ...... افسوس ہوا تمہارے الزامات پر۔ کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے معذرت کی۔'' وہ غصے میں پلٹ کر جانے لگا۔

چاندنی سوچ رہی تھی۔ کیا واقعی وہ معذرت نامہ لے کر آیا تھا یا پھر کوئی اور دھمکی...... چوکور کے اسٹیکر کے ساتھ۔

چاندنی نے اس پہیلی سے ذہن ہٹا کر ڈرامے کی طرف توجہ دی۔ ڈرامے کے اسکرپٹ کی کاپی لے کر وہ آڈیٹوریم کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ جمیل اور کرن اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد ضیا اسد وہاں پہنچا۔ رمی

کلمات کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

''ہم کاسٹ میں شامل میجر پارٹس سے آغاز کریں گے۔'' اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا۔ ''سیما اور چاندنی، ہیر کے کردار کے لیے مقابلہ کریں گی۔ رانجھے کے کردار کے لیے سلیم اور جمیل نے اپنی اہلیت ثابت کرنی ہے...... یہ مرکزی کردار ہیں۔ اس کے بعد ہم آگے چلیں گے۔''

چاندنی جانتی تھی کہ سیما نے کبھی مقابلے کے اظہار میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ ایک باصلاحیت فنکارہ تھی۔ چاندنی خود بھی مقابلے کی قائل تھی۔ اسی لیے اس کے تعلقات تقریباً سب سے یکساں تھے۔ مقابلے کے بغیر فن کیونکر نکھر سکتا ہے۔

''میں چاہوں گا کہ پہلے ہیر رانجھا اپنا اپنا اسکرپٹ یاد کرلیں۔ سکندر بھی وہاں موجود تھا۔ انگوٹھا بلند کر کے اس نے چاندنی کو کامیابی کا اشارہ دیا۔ چاندنی نے آہستہ سے سر کو جنبش دی۔

چار امیدوار تھے اور دو نے ہیر رانجھا کا رول پلے کرنا تھا۔ چاروں اسکرپٹ لے کر اپنے اپنے پسندیدہ مقامات پر چلے گئے۔

چاندنی، اسٹیج کراس کر کے وارڈ روب ایریا میں چلی گئی۔ وہ ہمیشہ وہیں اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھ کر مکالمے یاد کرتی تھی۔

وہاں سیما کو بیٹھے دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اسکرپٹ تھا۔ پشت پر بڑے سائز کا بھاری بھرکم چوبی وارڈ روب تھا۔ سیما نے اپنی پشت وارڈ روب سے ٹکائی ہوئی تھی۔

''ہیلو، سیما۔'' چاندنی نے خوش دلی سے اسے مخاطب کیا۔

سیما نے گھنیری پلکیں اٹھائیں۔ ''اوہ، سوری...... میں جانتی ہوں کہ تم ہمیشہ یہاں بیٹھ کر اپنے مکالمے یاد کرتی ہو۔ میں کہیں اور جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے، ڈیئر...... میں نے یہ جگہ خریدی نہیں ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں پہلے ہی اپنے مکالمے اتنی مرتبہ دہرا چکی ہوں کہ اب بور ہوگئی ہوں...... گڈ لک ٹو یو۔''

''شکریہ، کوئی تکلف تو نہیں ہے؟'' سیما نے کہا۔

''ارے نہیں، تم بیٹھو۔ میں باہر کھلی ہوا میں جارہی ہوں۔''

چاندنی، وہاں سے نکل کر ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ ایک دلدوز چیخ نے اسے مفلوج کر دیا۔ فوراً ہی کسی وزنی چیز کے گرنے کی دھمک گونجی اور سناٹا چھا گیا۔

چونکہ وہ اپنی پسندیدہ جگہ سے زیادہ دور نہیں گئی تھی، لہٰذا اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

☆☆☆

اوہام وخدشات کے زیرِ سایہ وہ پلٹی۔ وہ اسی کمرے کی طرف جارہی تھی، جہاں اس نے سیما کو اسکرپٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ دل و دماغ میں ایک انجانا خوف سر اٹھا رہا تھا۔ اس نے کئی افراد کو اسی جانب بڑھتے دیکھا۔ ایک طرف سے کرن نمودار ہوئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے چاندنی سے سوال کیا۔

''پتا نہیں...... لیکن آواز اسی کمرے سے آئی تھی۔ کرن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم دیکھ کر بتاؤ، میں یہیں رکی ہوں۔''

''تم بھی آؤ۔'' کرن نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''اور لوگ بھی تو ہیں، تم اکیلی نہیں ہو۔''

کئی لڑکے لڑکیاں وہاں پہنچ گئے تھے۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ چاندنی دانستہ آگے نہیں گئی۔ تاہم اس نے وہ بھیانک منظر بخوبی دیکھ لیا، اس منظر نے اس کے چہرے سے خون نچوڑ لیا۔ وہاں شور بڑھنے لگا۔ چیخیں، سسکیاں، مشورے......

وزنی وارڈ روب کیبنٹ کے نیچے سے سیما کے سینڈل اور پنڈلیوں کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایڑیوں سے پتا لگ رہا تھا کہ وہ اوندھے منہ فرش پر پڑی ہے۔ وارڈ روب پہلو کے بل اس کے اوپر گرا تھا۔ زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں اسکرپٹ اب تک دبا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ چاندنی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا...... یہ سب کیسے ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر ابکائی روکی۔

کرن کی رنگت بھی اڑی ہوئی تھی۔ ''یہ کیونکر گر گیا؟''

مختلف آوازیں......

''وہ سیما ہے۔''

''وہ زندہ ہے؟'' سیما کی سہیلی کومل کی آواز آئی۔

''اسے نیچے سے نکالو۔''

''نہیں، نہیں...... ہلانا مت۔''

''پولیس کو فون کرو۔''

چاندنی نے آنکھیں بند کرلیں۔

''میں فون کر چکا ہوں۔'' سلیم کی آواز آئی۔

''ایمبولینس بلواؤ...... وہ زندہ ہے۔'' ضیا اسد چیخا۔

چاندنی نے آنکھیں کھول دیں۔
ضیا اسد گھٹنوں کے بل سیما کے پاس بیٹھا تھا۔
''ہلو مت، حرکت نہیں کرو۔'' ضیا اسد نے ہدایت دی۔ سیما کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔
''یہ سب کیسے ہوا؟'' کومل نے پھر سوال کیا۔
''شاید وارڈ روب میں وزن بہت زیادہ تھا...... یا پھر سیما ہی کچھ بتائے گی۔ اس کی حالت خطرے میں معلوم نہیں ہوتی۔ خون بھی کہیں نہیں نظر آرہا...... شاید بینچ کی وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی۔'' ضیا اسد نے ٹوٹی ہوئی بینچ کو دیکھا۔
چاندنی کے چہرے کی رنگت لوٹ رہی تھی۔ سیما آہستہ سے کراہی۔
''ایمبولینس آرہی ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' کومل اپنی سہیلی کے قریب بیٹھ گئی۔
''یہ تمہاری پسندیدہ جگہ تھی۔'' کسی نے چاندنی کے کان میں کہا۔
چاندنی نے گردن گھما کر سلیم کو دیکھا۔ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر چاندنی کی پیشانی پر پسینا آگیا۔ وہ سرتا پا لرز اٹھی۔ وہ خود اگر سیما کی جگہ ہوتی...... کیا یہ اتفاق تھا؟ کیا وارڈ روب اتفاقاً گرا...... اگر نہیں تو کیا چاندنی کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی جو کچھ بھی تھا، یہ بات یقینی تھی کہ اس وقت سیما کی جگہ چاندنی کو بے دست و پا وارڈ روب کے نیچے دبا ہونا چاہیے تھا۔
اس کے ستارے کام کررہے تھے یا کوئی دعا گو تھا۔ ہاں ماں جیسی عظیم ہستی اس کے لیے دعا گو رہتی تھی لیکن یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہر روز نت نیا اسرار۔ ہر مرتبہ اسرار کا ہالہ چاندنی کے گرد چکرا رہا تھا۔
اس نے گہری سانس لی اور دل سے سیما کے لیے دعا کی۔
بعد ازاں جمیل نے بھی وہی خیال ظاہر کیا جو سلیم نے کیا تھا۔
افواہوں کی دو اقسام گردش کرنے لگیں۔ وارڈ روب از خود کسی وجہ سے گرا یا گرایا گیا۔
معاً ہڑ بونگ یکایک ختم ہوگئی۔ طبی عملہ اور پولیس ایک ساتھ وہاں پہنچے تھے۔ طبی عملے نے پولیس اہلکار کے ساتھ مل کر احتیاط سے سیما کو نکال کر اسٹریچر پر منتقل کر دیا۔
سیما کو رک رک کر بات کرتے دیکھا تو چاندنی نے اطمینان کی سانس لی۔ تاہم اس کی آواز میں کرب کی آمیزش موجود تھی۔ اس کی خاص سہیلی کومل مستقل اس کے قریب تھی۔
ایمبولینس روانہ ہوگئی تھی۔ سیما کے گھر والوں کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ پولیس وہیں موجود تھی۔
پولیس ... اہلکار ضیا اسد سے بات کررہے تھے۔ سکندر بھی ساتھ کھڑا تھا۔ پولیس نے سیما سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ساتھ موجود میڈیکل افسر نے اجازت نہیں دی۔ لہٰذا اس کا انٹرویو اب اسپتال میں ہی ہونا تھا۔
گفتگو کا محور وارڈ روب کا وزن، گویا حادثہ تھا۔ پولیس کی دلچسپی بھی حادثے کی جانب تھی۔ بصورت دیگر انہیں خوامخواہ مغز کھپانا پڑتا۔ دو اہلکار گرے ہوئے وارڈ روب کا جائزہ اس طرح لے رہے تھے گویا وہ کوئی لاش رہی ہو۔
لیکن وہ لاش نہیں تھی۔ لاش کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں۔ وہاں چار ٹانگیں تھیں۔ ایک کانسٹیبل ''لاش'' کی ٹانگوں میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔ بالآخر اسے مطلب کا کوئی سرا ہاتھ آہی گیا۔
''سر جی!'' اس نے اٹھ کر سینہ پھلایا۔ تھانے دار ضیا اسد کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ اسے سینہ چوڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی توند ہی اس کے لیے کافی وشافی تھی۔ اس نے موٹی گردن گھمانے پر ہی اکتفا کیا۔ کمرا آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا۔
''سر جی، یہ خود ہی گری تھی۔'' کانسٹیبل نے فیصلہ سنایا۔
''کون گری تھی؟'' تھانے دار چونکا۔
''یہ جناب...... یہ......'' کانسٹیبل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وارڈ روب کو کیا بولے۔ اس نے اشارے سے کام لیا۔
''وہ کیسے؟'' تھانے دار نے اطمینان ظاہر نہیں ہونے دیا۔ البتہ رعب کو نمایاں چھوڑ دیا۔
''یہ اس طرف والی ٹانگ دیکھیں جی۔'' کانسٹیبل نے اشارہ کیا۔
''ٹانگ؟'' افسرانہ اعتراض آیا۔
''مم...... میرا مطلب ہے...... یہ والا پایہ دیکھیے۔'' وہ پھر نیچے بیٹھ گیا۔ سب کی نگاہ پائے کی جانب گئی۔ سکندر بھی نیچے بیٹھ کر بغور جائزہ لے رہا تھا۔ البتہ تھانے دار نے ایسی کوئی جسارت نہیں کی۔ بیٹھنے کی کوشش میں توند کا بھاری اثاثہ کسی بھی نوعیت کی مشکل کھڑی کرسکتا تھا۔
''ہاں، ہاں، دیکھ رہا ہوں۔'' تھانے دار نے ایک نگاہ ماری اور دائیں بائیں دیکھا۔ ضیا اسد نے مسکراہٹ

دباتے ہوئے اسے کرسی پیش کی۔ خود اس کی تیز نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ پایہ کمزور تھا اور خم کھا گیا تھا۔

''جناب، یہ دیکھیں۔'' دوسرے کانسٹیبل نے کھڑے ہو کر ہاتھ تھانے دار کے سامنے پھیلایا۔ اس وارڈ روب کے ہینڈل پر سے کوئی چیز اتاری تھی۔

چاندنی جاتے جاتے ٹھہر گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' تھانے دار نے کرخت آواز میں سوال اٹھایا۔

''پپ...... پتا نہیں جی۔''

''پتا نہیں تو مجھے کیوں دکھا رہا ہے؟ اوئے جاسوس۔'' تھانے دار نے دوسرے کانسٹیبل کو پکارا۔

''جی سر؟'' وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ اسٹیکر ہے جناب۔''

''اس پر کیا بنا ہوا ہے؟''

''یہ کسی پرندے کی تصویر ہے، جناب۔'' کانسٹیبل نے سر کھجایا۔ چاندنی کے اعصاب تناؤ کا شکار ہو گئے۔

''یہ چکور کی تصویر ہے۔'' سکندر نے اٹھ کر آہستہ سے کہا اور گویا پولیس کی مشکل آسان کر دی۔

''آ...... آچھا...... اچھا، چکور ہے، تو پھر؟'' تھانے دار نے اسٹیکر پیش کرنے والے کو گھورا۔ ''دیکھ نہیں رہے کیس حل ہو چکا ہے اور تم مجھے فضول تصویریں پیش کر رہے ہو۔'' تھانے دار نے خمیدہ پائے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسٹیکر والے کو جھاڑا۔ وہ جھینپ کر پسپا ہو گیا۔

''جہاں سے اکھاڑا، وہیں چپکا دو۔'' تھانے دار نے حکم دیا۔ ''پولیس کی نوکری کرنی ہے یا آرٹش (آرٹسٹ) بننا ہے؟''

بعد ازاں پولیس نے اسپتال میں سیما سے چند سوالات کرنے کے بعد رسمی کارروائی ڈال کر کیس لپیٹ دیا۔

☆☆☆

اگلے دن چاندنی بذریعہ بس کالج کے بعد گھر پہنچی۔ دورانِ سفر اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خود سے متعلق ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے بمشکل خیالات کا رخ بدلا۔ بطور ''ہیر'' وہ بلا مقابلہ ہی منتخب ہو گئی تھی۔ کیونکہ سیما اسپتال میں تھی۔ چاندنی کو مزہ نہیں آیا تھا۔ وہ مقابلہ پسند کرتی تھی، پھر خیالات کی رو چکور کی جانب چلی گئی۔ کرن اور جمیل نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ چکور کو اتفاقات کے زمرے میں ڈال دیا جائے اگر وہ یہ سمجھ لے تو خسارہ بھی کیا ہے۔ اول تو چاندنی کا ذہن بار بار نمودار ہونے والے چکور کو اتفاقات کے خانے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دوسرے تنہائی میں اس نے کرن پر اعتراض کیا کہ چکور والی بات جمیل تک کیسے پہنچی۔

گھر پہنچ کر وہ تازہ دم ہوئی، ماں سے ملی اور اپنے کمرے میں تکیہ لے کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کا ذہن ڈرامے کی طرف چلا گیا۔

فون کی گھنٹی نے اس کا ارتکاز توڑا۔

''ہیلو۔''

''چاندنی، میں ہوں، سلیم۔''

چاندنی کو توقع نہیں تھی کہ وہ فون کرے گا۔ چند ثانیے وہ خاموش رہی۔

''ہیلو، کیا بات ہے؟'' اس نے فون بند کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' چاندنی نے رکھائی سے جواب دیا۔

''سمجھ نہیں آ رہا، کیا کہوں...... بہت عرصہ ہو گیا ہم ایک ساتھ کھانے پر بھی نہیں گئے۔ سمندر تمہیں پسند تھا۔ وہاں بھی نہیں گئے؟''

''بھول جاؤ، سلیم۔''

''ہم کچھ دیر کے لیے ساتھ بیٹھ کر بات بھی نہیں کر سکتے؟''

''تم سمجھتے کیوں نہیں؟''

سلیم خاموش رہا، پھر ایک دم پھٹ پڑا۔

''آخر کیوں؟ آسمان ٹوٹ جائے گا...... چند گھنٹے ہی تو مانگ رہا ہوں۔ جہاں کہو گی آ جاؤں گا۔ کیا تم مغرور ہو گئی ہو؟''

''مجھے نفرت ہے غرور سے اور تمہارے بار بار کے گھٹیا مذاق سے بھی۔''

''معاف کرنا، کون سے گھٹیا مذاق؟''

''بار بار چکور کی تصویریں بھیجنے کا کیا مقصد ہے...... اور...... اور سیما پر وارڈ روب گرانا؟ تمہیں پتا ہے کہ وہاں میں بیٹھتی تھی۔''

''آخری بار کہہ رہا ہوں، چاہے بات کرو نہ کرو...... لیکن میرے اوپر جھوٹے الزامات مت لگاؤ۔ جو تم کہہ رہی

ہو، اس طرح میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' سلیم کی آواز میں واضح تپش تھی۔

''کون، پھر کون میرے پیچھے پڑا ہے......؟''

چاندنی سسک اٹھی، اور ریسیور پٹخ دیا۔ وہ تکیے میں منہ چھپا کر باقاعدہ رو رہی تھی۔ دفعتاً ایک نیا خیال اس کے ذہن میں سرسرایا۔ سلیم اور وہ دونوں ہی فنکار تھے۔ فنکار، فنکار کو پہچانتا ہے۔ سلیم آخری فقروں میں جب الزامات کی تردید کر رہا تھا تو اس کی آواز میں سچائی شعلوں کے مانند لپک رہی تھی۔

کہیں وہ اب تک غلط فہمی کا شکار تو نہیں۔ سلیم کے بجائے وہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ جوں جوں وہ غور کر رہی تھی، توں توں اس کا احساس قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ ''چکور والا'' سلیم نہیں، کوئی اور ہے۔ کون؟ کون؟ کون؟

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ چاندنی نے فون کی جانب دیکھا۔ دل و دماغ یکسو تھے کہ سلیم نہیں ہو سکتا۔ اس نے فون اٹھایا۔

''ہیلو؟''

''چاندنی؟'' کوئی نئی آواز تھی۔

''ہو از دز؟'' چاندنی نے غور کیا۔

''میں ہوں، سکندر۔''

یکبارگی چاندنی کا دل دھڑکا...... تال جدا تھی۔ قریب رگِ جاں، رگِ دل و جاں کوئی خفتہ سی آرزو تھی۔ وہ خود بھی نہ جان سکی۔ دل دھڑکا تھا یا کسی نے بازیٔ دل کی بساط بچھا دی تھی۔

''ہیلو، چاندنی؟'' نام کیا لیا، جیسے غرورِ حسن کے خرمن کو پھونک دیا۔

''ہاں، سکندر کیسے ہو؟''

''میں تو ٹھیک ہوں۔ تم کچھ خاموش سی ہو۔''

''ہاں، میں، وہ...... اسکرپٹ، مطلب اسکرپٹ دیکھ رہی تھی۔''

''میرے خیال میں تو تم پہلے ہی سب کچھ ازبر کر چکی ہو۔''

''وتمہیں ہر بات کا پہلے ہی سے پتا چل جاتا ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''کیا نہیں پتا؟''

''تمہارا پتا؟''

''اوہ ایڈریس چاہیے...... وہیں سے لے لو جہاں سے فون نمبر لیا ہے۔'' چاندنی کا موڈ یکسر بدل گیا تھا۔

''وتمہیں برا لگا کیا؟''

''ارے نہیں، کیسے فون کیا؟''

''ریہرسل میں تمہاری لاجواب اداکاری پر مبارک باد کے لیے۔ چاندنی تم نیچرل ہو...... رئیلی نیچرل۔''

''اچھا، پھر؟''

''کیا پھر؟''

''پھر یہ کہ سکندر، اتنی تعریف کے بعد کوئی جواب تو ہونا چاہیے۔''

''ایسی بات ہے تو پھر...... پھر...... کہیں ڈنر کر لیتے ہیں۔''

''بہت خوب، مگر اس کے لیے تو جو تعریف تم نے کی ہے وہ کم پڑ جاتی ہے۔'' چاندنی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مسکرائی۔

''بات تو ٹھیک ہے، بلکہ زیادہ ہی درست ہے۔ لو پھر مزید سنو...... اپنی تعریف......'' وہ عالمِ سرشاری میں اپنے خوابیدہ لہجے میں اس کی تعریف کرتا رہا اور وہ سنتی رہی مدہوش سی۔

''تم واقعی سکندر ہو...... بس اب کل ڈنر پر ملیں گے، بائے ناؤ۔''

''اوکے، بائے چاندنی۔''

وہ اپنی حالت پر خود ہی حیران تھی۔ رُواں رُواں رقص کر رہا تھا۔ عجب عالمِ سرشاری تھی جنوں، بے کلی، بے خودی و بے قراری...... وہ ایسی تو نہ تھی۔ کتنے ہی لڑکے اس کے ساتھ سر پھوڑ چکے تھے۔ سلیم کو بھی اک تعلقِ خاطر بنانے میں ایک عرصہ لگا تھا۔ تاہم پھر بھی سلیم کے ساتھ چاندنی نے کبھی خاص قسم کی الفت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اسے ایک اچھا انسان اور دوست سمجھتی تھی۔ شاید وہی دوسروں کو ناکام ہوتے دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کیا کرتی، دل کے معاملے بھی ماورائے فہم ہوتے ہیں۔

آسمانی بجلی کڑکی تو چاندنی کا خمار ٹوٹا۔ انگڑائی لے کر وہ اٹھی...... چند منٹ کے اندر ہی رم جھم شروع ہو گئی۔ چاندنی نے کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیں۔ ماں کا کمرا چیک کیا۔ نیچے کچن کی کھڑکی پوری طرح بند نہیں تھی۔ وہاں پڑی گول میز بھی آدھی بھیگ چکی تھی۔ چاندنی لپکی، بارش تھی یا طوفان۔ کھڑکی بند کرتے کرتے اس کی نظر کچن سے ذرا دور گیٹ کے اندر پڑے بنڈل پر پڑی۔ بجلی کے کڑکنے سے جو روشنی کا جھما کا ہوا، اس نے بنڈل کو اجاگر کیا۔ ورنہ چاندنی اسے دیکھ نہ پاتی۔ کیا ماں کوئی چیز بھول گئی ہیں؟

سوچتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا اور پھرتی سے بارش میں بنڈل اٹھانے چلی گئی۔ وہ محتاط تھی کہ پھسل نہ جائے۔ بنڈل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایسا ہی تھا جیسے جوتوں کا ڈبا۔ فرق یہ تھا کہ وہ گتے کے بجائے موٹے کاغذ کا تھا۔ کچن میں واپس آتے آتے وہ بھیگ چکی تھی۔

بالوں اور چہرے سے پانی ہٹاتے وقت کاغذی پیکٹ فرش پر جا گرا۔ ناگوار سڑاند نے اس کی قوتِ شامہ کا امتحان لیا۔ وہ سانس روک کر سنک کی طرف جھپٹی...... سانس روک کر وہ مڑی اور فرش کو دیکھا۔ کاغذی فولڈر کھل چکا تھا۔ سیاہ بلی کا بچہ نظر آ رہا تھا، اس کا سر کٹا ہوا تھا۔ سر کی جانب سے وہ کافی گل سڑ چکا تھا۔ سانس لینا دوبھر تھا۔ چاندنی نے رومال منہ پر رکھ لیا۔ عالم سراسیمگی میں اس نے جیسے تیسے وائپر کے ذریعے اسے کچن ڈور سے باہر پھینکا۔ اس دوران اس نے کئی مرتبہ ابکائی روکی۔

کاغذ کے ٹکڑے کچن میں ہی پڑے تھے۔ بھیگے ہوئے کاغذوں پر نظر پڑی، ایک پر اس نے چکور کا اسٹیکر دیکھ لیا۔ پھر چکور، چکور، چکور...... اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ریپنگ پیپرز کو بھی باہر پھینکنے کے لیے وائپر کو حرکت دی تو اسے نوٹ کی جھلک نظر آئی۔ موٹے موٹے الفاظ میں لکھا تھا، چاندنی نے کھڑے کھڑے ہی پڑھ لیا۔

چاندنی!

یہ بلی نہیں، تم ہو!

یہ تم ہو...... ڈراما نہیں چھوڑو گی تو یہی حالت ہوگی۔ پچھلی بار مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ ورنہ سیما کی جگہ تم اسپتال میں ہوتیں۔ اب میں غلطی نہیں دہراؤں گا۔ اگر میں تمہارے ساتھ نہ رہوں گا تو کوئی بھی نہیں رہ سکے گا۔ سر کٹی بلی بننے کی کوشش مت کرو، کیونکہ...... اگلے الفاظ نمی کی وجہ سے پھیل کر ناقابلِ شناخت ہو گئے تھے۔

چاندنی پلکیں جھپکائے بغیر نوٹ کی تحریر پڑھ رہی تھی۔ دل اس کا حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے کئی بار تحریر پڑھی اور وائپر سے کاغذات باہر پھینک کر دروازہ بند کر دیا۔ بدبو اتنی تیز تھی کہ اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کیبنٹ پر سے ایئر فریشنر اٹھا کر اس نے اسپرے کیا۔

یہ مذاق نہیں ہے۔ معما کھلتا جا رہا تھا۔ بات دور نکل گئی تھی۔ سیما کا ذکر اور ڈرامے سے علیحدگی کے مطالبے نے معمے کی گرہیں کھول دی تھیں۔ یہ کھلی اور سنجیدہ دھمکی تھی۔

کل کچن دھونا پڑے گا، اس نے سوچا اور گم صم سی دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے کچن سے نکل گئی۔

☆☆☆

ڈرامے کی پرفارمنس پر اسے اسکالرشپ ملنی تھی۔ جس کے بغیر وہ انگلینڈ نہیں جاسکتی تھی۔ ماں کے اوپر مالی بوجھ پہلے بہت زیادہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ انگلش تھیٹر کی دنیا میں وہ تیزی سے نام پیدا کرے گی اور ماں کو بھی وہیں بلا لے گی۔

آخر کون چاہتا ہے کہ وہ ڈراما چھوڑ دے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اسکالرشپ سے چاندنی کی محرومی یا پھر وہ چاندنی کو خود سے دور نہیں جانے دینا چاہتا۔ وہ جو بھی ہے، ڈراما سرکل کے اندر ہے...... اگر نہیں بھی ہے تو یقیناً کالج میں ہی ہے۔ کالج میں طالب علموں کی ایک بڑی تعداد تھی۔

چاندنی کے سر میں درد ہونے لگا۔

اس نے کرن کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہی اس کی سب سے بڑی ہمدم و ہم راز تھی۔ اس سے بات کر کے اسے سکون ملتا تھا۔

''ہیلو......''

''ہاں، چاندنی، کیا بات ہے؟ تمہاری آواز......'' کرن نے ذرا دیر سے فون اٹھایا تھا۔

چاندنی نے لرزاں آواز میں اسے کہانی سنائی۔

''کوئی دیوانہ تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ واقعی یہ مذاق نہیں ہے۔ مجھ سے جو ہوسکا، ضرور کروں گی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''دیوانہ'' ڈراما سرکل میں ہے۔ ہمیں وہاں موجود ہر فرد پر نظر رکھنی پڑے گی۔ حتیٰ کہ کریو کو بھی نظرانداز نہیں کرنا۔'' کرن نے ہمت بندھائی۔

''شکریہ۔'' چاندنی نے کہا۔ ''لیکن وہ میری رہائش گاہ سے واقف ہے۔''

کرن کچھ سوچ کر بولی۔ ''کیا تم نے ڈراما چھوڑنے کے امکان پر غور کیا؟'' کرن نے ہراساں لیکن نرم آواز میں سوال کیا۔

''ہاں، مجھے خیال آیا تھا۔'' چاندنی نے جواب دیا۔ ''لیکن میری اسکالرشپ کا کیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے، اب تو میں کامیابی کی دہلیز پر کھڑی ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن تم نے ایک ہی ڈراما تو چھوڑنا ہے، کوئی ہمیشہ کے لیے تو اداکاری ترک نہیں کرنی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر دوبارہ پتا نہیں کب موقع ملے؟''

''صحیح ہے، لیکن زندگی کی تو کوئی قیمت نہیں۔''

''کرن، میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔''

''اچھا تم پریشان مت ہو، کل بات کریں گے۔ اس معاملے پر کم سے کم سوچو اور سو جاؤ...... کہو تو میں آجاتی ہوں۔''

''اوہ نہیں، شکریہ۔ کل ٹھیک ہے، بائے۔''

''بائے، ٹیک کیئر۔''

☆☆☆

سینٹر اسٹیج تیار تھا۔ ضیا اسد جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ دیگر تمام متعلقہ فنکار موجود تھے۔ ''کردار پر توجہ رکھو۔'' چاندنی دل ہی دل میں خود کو ہدایت دے رہی تھی۔ سلیم اور جمیل بھی موجود تھے۔ سلیم رانجھا بنا ہوا تھا جبکہ جمیل کے خیال میں اس نے سلیم سے کہیں بہتر آڈیشن دیا تھا۔ ضیا اسد کی خوشامد نے اسے مرکزی کردار دلوا یا تھا۔

ریہرسل شروع ہوتے ہی چاندنی اپنے کردار میں ڈھلتی چلی گئی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ ہر چیز اس کے ذہن سے نکل چکی تھی۔ وہ فطری انداز میں اسٹیج پر متحرک رہتے ہوئے مکالمے ادا کر رہی تھی۔ جلد ہی وہ سب ایک ٹیم کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ ناظرین میں سکندر بھی بیٹھا تھا۔ اس کی نشست اگلی رو میں تھی۔

چاندنی اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب برت رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ صرف اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

سین کٹ ہوا تو چاندنی نے سکندر پر نظر ڈالی۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ چاندنی نے نظر ہٹالی۔

اگلا سین...... مکالمے رومانوی تھے۔ چاندنی کی فنکاری عروج پر تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مکالمے سلیم کے لیے نہیں تھے۔ اس کے ذہن میں سکندر کا عکس تھا۔ چاندنی نے ڈوب کر فن کا مظاہرہ کیا۔

آڈیٹوریم تالیوں سے گونج اٹھا۔ چاندنی نے دیکھا کہ سکندر تالیاں بجاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ عالم سرشاری میں بمشکل اس نے سکندر کی جانب سے نگاہ پھیری۔

اگلے سین میں صرف چاندنی اور جمیل تھے۔ ضیا اسد اسے بتا رہا تھا کہ ان دونوں نے کیا کرنا ہے...... جمیل معذرت کر کے پانی کے لیے بیک اسٹیج پر چلا گیا۔

''اگلی بار بریک لینے کے لیے انتظار کرنا۔'' ضیا اسد نے برہمی سے کہا۔ وہ مزید کچھ بولنے والا تھا کہ ایک تیز نسوانی چیخ نے سب کو بوکھلا دیا۔ ضیا اسد کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ جمیل بھی جاتے جاتے ٹھہر گیا۔

چاندنی نے کرن کی چیخ پہچان لی تھی۔

''اوغ...... غ......'' چاندنی کراہی۔ کرن بھاگتی

ہوئی اس کے پیٹ سے ٹکرائی۔ بالکل جیسے ایک ریسلر دوسرے ریسلر کو اسپیئر (SPEAR) (ایک داؤ) لگاتا ہے۔ اسپیئر کے نتیجے میں دونوں لڑکیاں کئی فٹ دور جا گریں۔ اوپر سے فانوس نما اسپاٹ لائٹس کا وزنی گھیرا عین اس جگہ گرا جہاں چاندنی کھڑی تھی۔ سیٹ جس نوعیت کا تھا، اس اعتبار سے زیادہ روشنیاں آن نہیں کی گئی تھیں، تاہم فانوس نما گھیرے کا وزن اپنی جگہ تھا۔

دھما کا سا ہوا اور شیشے کے ٹکڑے دور دور پھیل گئے۔ کرن کی چیخوں کے ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ چاندنی مفلوج ہو چکی تھی۔ ذہن سن تھا، آنکھوں کے آگے اندھیرا...... خیال یہی آیا کہ وہ مر چکی ہے۔

''میں مر چکی ہوں...... کرن بھی...... ہم دونوں مر چکے ہیں۔'' لائٹس کے ساتھ وزنی میٹل راڈز بھی تھیں...... کوئی درد نہیں، کوئی احساس نہیں...... اندھیرا، تاریکی...... ہاں، یہی موت ہے۔

کسی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ چاندنی نے آنکھیں کھول دیں۔ نہیں، وہ زندہ...... تاریکی کم ہونے لگی۔ اندھیرا شاک کی وجہ سے تھا۔ پیشانی پر سکندر کا ہاتھ تھا۔ چاندنی نے آنکھیں کھولیں تو اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ سکندر کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں وحشت...... تاثرات میں رنج و غم کا سایہ۔

چاندنی نے اٹھنے کی کوشش کی۔ دائیں گھٹنے میں ٹیس اٹھی۔

''لیٹی رہو۔'' سکندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کرن؟'' اس نے سسکی لی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ چاندنی کے پاس سے اٹھ گیا۔ صورتِ حال انڈر کنٹرول دکھتے ہوئے، افراتفری میں ٹھہراؤ آ گیا۔ کرن پیٹ کے بل گھوم کر گری تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ٹوٹنے والی اسپاٹ لائٹ کی زد میں آ گیا تھا۔

چاندنی ایک گھٹنے اور ایک پنجے کے بل اٹھی پھر آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

سکندر، ضیا اسد کے ساتھ مل کر کرن کو سنبھال رہا تھا۔ چاندنی اور کرن دونوں کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ کرن کی کہنی کے قریب قدرے گہری خراش تھی۔ کچھ اور لڑکے اور لڑکیوں کو بھی شیشے کے ٹکڑوں نے گزند پہنچایا تھا۔ تاہم کوئی سنجیدہ بات نہیں تھی۔ پتا نہیں کرن کی نظر کیسے اوپر اٹھ گئی تھی۔ اگر وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بروقت حرکت میں نہ آتی تو کوئی بھی المناک حادثہ ظہور پذیر ہو سکتا تھا۔

پہلے سیما اور اب کرن...... چاندنی سوچ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے دو لڑکیاں زخمی ہو چکی تھیں۔ اسکالرشپ کی خاطر میں اپنے دوستوں کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ چاندنی نے فیصلہ کر لیا۔ وہ ضیا اسد کی جانب متوجہ تھی۔

''کیا میں چند منٹ لے سکتی ہوں؟'' اس نے ضیا اسد کو مخاطب کیا۔

''کیوں نہیں۔ ایک منٹ رکو۔'' وہ بولا۔ اور کریو کو ہدایت دینے لگا کہ حادثے کی وجوہات معلوم کریں۔ نیز اوپر لائٹوں کی چیکنگ ہر مہینے ہوا کرے گی۔

''ہاں، چاندنی...... کیا بات ہے؟'' اس نے چاندنی کی جانب رخ کیا۔

''کچھ بہت خوفناک ہو رہا ہے...... کئی ہفتے ہو گئے...... کئی بار میں نے بتانا چاہا...... سمجھ میں نہیں آ رہا کہاں سے شروع کروں...... کیا ہم کچھ دیر کے لیے بیک اسٹیج پر نہیں آ جائیں؟''

''میں سمجھ نہیں پا رہا...... تاہم چلو۔''

اسی وقت چاندنی کی نظر سکندر پر پڑی۔ وہ پُرسوچ انداز میں چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی عجیب بات تھی اس کی نظر میں...... وہ مجھے ایسے کیوں گھور رہا ہے؟ چاندنی نے بے کلی محسوس کی۔

☆☆☆

پیاری چاندنی!

آج بھی ہم ساتھ تھے۔ بہت بُرا ہو گیا۔ بہت بُرا۔ میں ہی ذمے دار تھا۔ تمہیں جلد از جلد سمجھ لینا چاہیے۔ اگر تم نے ''ہیر رانجھا'' میں پرفارم کیا تو سچ کا علم ہو جائے گا...... اور وہ تمہاری زندگی کا آخری سچ ہوگا۔

چکور۔''

☆☆☆

سکندر کے ساتھ ڈنر، چاندنی کے لیے ایک انوکھا اور سحر انگیز تجربہ تھا۔ کیوں؟ وہ خود بھی کوئی مفہوم پہنانے سے قاصر تھی۔ آرڈر سرو کرنے کے بعد گفتگو پھر ڈرامے کی جانب نکل گئی۔ اس سے پہلے دو چار باتیں آڈیٹوریم میں ہونے والے حادثے پر ہوئیں۔ چاندنی کشمکش میں تھی کہ سکندر کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ اسے وہ لمحہ اب تک یاد تھا جب اس نے پہلی بار سکندر کو دیکھا تھا تو اسے خیال آیا تھا کہ وہ پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکی ہے۔ لیکن

کہاں؟ فون پر بات کرتے وقت بھی ایک سوال کے جواب میں سکندر نے کہا تھا کہ وہ چاندنی کو بچپن سے جانتا ہے۔ ذومعنی بلکہ بامعنی جواب تھا۔

''ڈراما پر توجہ مرکوز رکھو، وہ حادثہ تھا اسے بھلا دو...... کرن بھی تقریباً ٹھیک ہے...... بہادر سہیلی ہے تمہاری۔'' وہ بولا۔

''ہاں...... ایکٹ ون اور ٹو کے تمام کالے مجھے ازبر ہیں۔''

''ہونہہ۔ میں نے تمہارے جو سین دیکھے ہیں وہ بھرپور ہیں۔ تمہیں کسی ڈائریکٹر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس خداداد ٹیلنٹ ہے جیسے کسی گلوکارہ کی فطری آواز ہوتی ہے۔ اس آواز کو تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔''

''تم پھر شروع ہو گئے۔'' چاندنی دلکش انداز میں مسکرائی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب تعریف...... وہ بھی کچھ زیادہ ہی۔''

''اول تو میں غلط نہیں کہہ رہا بلکہ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔ بچا کے رکھا ہے۔ آخر اور ڈنر بھی ہوں گے کہ نہیں؟''

''بہت باتونی ہو...... اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے بچپن سے جاننے کا دعویٰ کیوں کیا تھا؟''

''تمہیں محسوس نہیں ہوتا ہے؟''

''شک تو ہے لیکن یاد نہیں آتا۔''

''دماغ پر زور مت دو، بتا دوں گا۔''

''سکندر، مجھے اپنے کردار کے بعض نکات پوری طرح سمجھ نہیں آتے۔'' چاندنی نے کہا۔

''یہی تمہاری خوبی ہے۔ تم کاملیت پسند ہو...... فکر مت کرو میں سکھا تا رہوں گا لیکن ایک شرط ہے؟''

''ڈنر؟'' چاندنی پھر مسکرائی۔

''نہیں بھئی۔ ڈنر وغیرہ تو اب چلتے رہیں گے۔'' وہ ہنسا۔

''خوش فہمی؟''

''نہیں، خود اعتمادی۔'' سکندر کی سیاہ آنکھیں جیسے چاندنی کی روح میں اتر گئیں۔

''پھر کیا شرط ہے؟'' چاندنی نے بمشکل اس کی مقناطیسی نظر سے نظر پھیری۔

''تم کسی کو بتاؤ گی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''میں نہیں چاہتا کہ ضیا اسد تک یہ بات پہنچے کہ میں کسی کو فیور دے رہا ہوں۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' چاندنی نے کہا۔ اسے خیال گزرا کہ خفیہ رومانس شروع ہو چکا ہے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ چاندنی کو یقین تھا کہ بات بھی کچھ ایسی ہی ہے...... واقفیت کی جڑیں کہیں بچپن میں پیوست ہیں۔

''خفیہ کوچنگ کا معاوضہ؟'' چاندنی نے شرارت بھری نظروں سے سکندر کو دیکھا۔

''ڈنر!'' وہ مسکرایا۔ ''اور پھر ڈنر......''

چاندنی کی سُریلی ہنسی گونجی اور سکندر مبہوت رہ گیا۔

''کیا ہوا؟''

''بس ہنستی رہو۔'' وہ دیکھتا رہا۔

''کیا پاگل پن ہے؟'' چاندنی نے ہنسی کو بریک لگائے۔

''اگر تمہیں وقت ملے تو تھوڑا وقت مجھے دے دیا کرو۔ کیا یہ ممکن ہے؟'' پہلی بار اس کی آنکھوں میں اعتماد کی جگہ آس کی جھلک نظر آئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ چاندنی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ چاندنی کا جسم سنسنا اٹھا۔ اس نے نگاہ نیچے کی اور نہایت نرمی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سکندر کو دیکھا۔ چاندنی نے کچھ بے سکونی محسوس کی۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور لگتا تھا کہ بہت کچھ جانتی ہے۔ وہ خاموش رہی...... وہ سکندر کے چہرے پر تکلیف کے اثرات دیکھ رہی تھی۔

''چاندنی، آئی ایم سوری...... میں جلد بازی کر گیا۔ میں بے بس ہو گیا تھا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔'' اس نے میز کی کٹلری میں سے تیز دار چھری اٹھائی اور اس ہاتھ کی انگلیوں پر چلا دی جو اس نے چاندنی کے ہاتھ پر رکھا تھا۔

''سکندر!'' وہ چیخ اٹھی اور اس کا چھری والا ہاتھ پکڑ لیا۔ چاندنی نے اطراف میں دیکھا، اس کی چیخ آرکسٹرا کے شور میں چند لوگ ہی سن سکے تھے اور دوبارہ طعام کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

سکندر کی دو انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا اور چاندنی کی دو آنکھوں سے آنسو...... وہاں رنگ سرخ تھا، یہاں نقرئی......

''میں نے کب انکار کیا تھا۔ تم...... تم...... م...... اٹھو یہاں سے......'' اس نے وہاں رکھے ڈبے سے تین چار ٹشو کھینچے۔ سکندر نے ایک ٹوٹ پلیٹ کے نیچے دبایا اور دونوں باہر نکل گئے۔

☆☆☆

''تم مجنوں ہو گیا؟'' چاندنی نے جو ہاتھ چھڑایا تھا، اسی سے ٹشو کی مدد سے سکندر کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ دونوں کار میں بیٹھے تھے۔

''تمہاری خاموشی سے مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔''

''سکندر تمہیں علم ہے کہ ڈراموں کے علاوہ آج تک کسی نے مجھے اکیلے میں چھونے کی جرأت نہیں کی۔'' چاندنی نے کہا۔

''مجھے یقین ہے۔''

''میں خاموش اس لیے تھی کہ...... کہ......'' وہ پھر خاموش ہو گئی۔

سکندر نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ اپنے ساتھ تمہاری زندگی بھی خطرے میں ڈال دوں۔'' وہ بولی۔

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''اسٹیج پر لائٹس کا جھومر یا فانوس گرا تھا، وہ حادثہ نہیں تھا۔'' وہ پھر آبدیدہ ہو گئی۔ سکندر کا دل پگھل گیا۔ وہ چاندنی کے آنسو صاف کرتے کرتے تھم گیا۔ تاہم وہ چاندنی کا انکشاف سن کر دنگ رہ گیا۔

''سکندر وہ...... وہ......''

''تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔'' اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

''عجیب سی بات ہے...... سمجھ نہیں آتا...... تم جانتے ہو کہ یہ اسکالر شپ میرے لیے کتنی اہم ہے اور اسکالر شپ کے بغیر میں انگلینڈ جا نہیں سکتی۔'' اس نے گہری سانس لی اور تمام رُوداد اس کے گوش گزار کر دی۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ دونوں سنجیدہ تھے۔

''پولیس سے رابطے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ان کا ردِعمل بھی ضیا اسد کے مانند ہو گا۔ یعنی مذاق ہو رہا ہے...... یا حادثہ ہے...... وغیرہ وغیرہ...... ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم پُرسکون رہو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ گتھی سلجھ جائے۔'' سکندر نے دلاسا دیا۔

''شکریہ سکندر۔''

''میں ابھی آیا۔'' وہ گاڑی سے اتر کر ہوٹل کی جانب چل پڑا۔

دفعتاً چاندنی کی نگاہ پارکنگ میں موجود ایک شناسا گاڑی پر پڑی۔ غصے کے ساتھ اسے خوف کا بھی احساس ہوا۔ گاڑی کے ساتھ سلیم کھڑا تھا۔

یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا ہمارا تعاقب کر رہا تھا؟ چاندنی سخت بدمزگی محسوس کر رہی تھی۔

سلیم نے بھی چاندنی کو دیکھ لیا تھا۔ تاہم کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہے۔ چاندنی نے ایک ہنڈا کار کو پارکنگ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس میں سے برآمد ہونے والی رنگ برنگی تتلی کا رخ سلیم کی طرف تھا۔ وہ بھی اسی جانب متوجہ تھا۔ مذکورہ لڑکی نے مغربی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہوٹل کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

چاندنی نے اپنی چھٹی حس اور فیصلے پر فخر محسوس کیا۔ یقیناً سلیم چاندنی کی جانب سے مایوس ہو کر کسی اور طرف چل پڑا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے ''ڈرامے'' چاندنی کو پھنسانے کے لیے تھے۔ ترکِ مے نوشی بھی ڈرامے کا حصہ ہو سکتی تھی۔ بہت ممکن تھا اگر چاندنی اس کی باتوں میں آجاتی تو وہ اس مرتبہ اسے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنا ڈالتا۔

''کہاں کھوئی ہوئی ہو؟'' سکندر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

چاندنی نے اسے سلیم کے بارے میں بتایا۔

''یعنی مشکوک افراد میں سے سلیم کا نام نکال دیا جائے؟''

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے...... تم کہاں گئے تھے؟''

سکندر نے انگلیوں کی بینڈ تیج دکھائی۔

''تم چوٹی ہو۔''

''تمہارے لیے۔'' سکندر نے تکلف کو بالائے طاق رکھا۔

چاندنی کی پلکیں ازخود جھک گئیں۔

''جھوٹ کم بولا کرو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''پتا ہے تمہیں کب سے جانتا ہوں؟''

''ہاں!'' چاندنی نے بے ساختہ اس کی چمک دار آنکھوں میں دیکھا۔

''تمہیں ایس۔ ای ہائی اسکول یاد ہے؟''

چاندنی کے ذہن نے ماضی کی جانب سفر شروع کیا۔ یادداشت کے دریچے کھلتے چلے گئے۔

''اوہ...... تو...... وہ گندا سا لڑکا...... جو ہفتے میں کم ازکم ایک روز ضرور بینچ پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔'' چاندنی مسکرائی۔

سکندر نے قہقہہ لگایا۔ ''ہاں، اور وہ حسین، نازک سی گڑیا، جو ہر کلاس میں اول آیا کرتی تھی۔''

''آؤ کچھ دیر سڑک پر ٹہلتے ہیں...... کیا یاد دلا دیا؟ اسکول کی باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، چلو۔''

''تم عقبی نشست پر ہوتے تھے؟''

''اور تم پہلی نشست پر؟''

''عقبی نشست پر کیوں؟''

''تم پر نظر رکھنے کے لیے۔''

''مجنوں سے کوئی رشتے داری ہے تمہاری؟''

''ہے تو...... ٹھیک طرح یاد نہیں...... ابا جان کچھ بتاتے تھے۔'' سکندر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اور تمہاری لیلیٰ سے کوئی......''

''جی نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ......'' سکندر کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ اتفاقاً ہی اس کی نظر سامنے اٹھی تھی۔ ہیڈ لائٹس کے درمیان جو گیپ اور سڑک سے بلندی تھی۔ اس کی تیز نگاہ نے بھانپ لیا کہ وہ کوئی ٹرک تھا۔ اس کی رفتار نے سکندر کی چھٹی حس کو شہو کا دیا تھا اور جب ٹرک کا رخ بدلا تو شک و شبے کی گنجائش ختم ہو گئی۔ وہ دونوں تیز روشنی میں نہا گئے۔ چاندنی نے بھی خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بدحواسی میں گرچہ ٹرک کو ڈاج دینے کے لیے غلط سمت بھاگنے کی کوشش کی۔ تاہم سکندر نے بروقت اسے دونوں شانوں سے تھام لیا اور اسے لے کر بائیں جانب کھڑی کار سے ٹکرایا۔ اس نے خیال رکھا تھا کہ چاندنی کا کار سے براہِ راست تصادم نہ ہو۔ لمحوں کے فرق سے ٹرک انہیں چھوتا ہوا گزر گیا۔ ان دونوں کو ہلاک کرنے کی کوشش میں اسے کار کے ساتھ بھڑنا پڑتا، جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چاندنی کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر سکندر کی مضبوط بانہوں میں سما گئی۔

☆☆☆

چاندنی مناسب موقع کے انتظار میں تھی۔ وقت آتے ہی اس نے بیک اسٹیج کا دروازہ کھولا اور لاکر روم میں چلی گئی۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اپنی مدد آپ کے تحت اس نے پہلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔

سب سے پہلے چاندنی نے اپنا لاکر کھولا پھر سیما کا نمبر تھا۔ اس نے دو لاکر اور کھولے اور بند کر دیے۔ وہ کمرا کراس کر کے کاسٹ بلیٹن بورڈ کے قریب آئی۔ لاکرز کی لسٹ دیکھنے کے بعد اس نے سلیم کے لاکر کا نمبر دیکھا۔ 111۔ لاکر نمبر ایک سو گیارہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ وہ لاکر بند کرنے ہی والی تھی کہ معاً اس کی نظر زردی مائل کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی۔ اگرچہ اسے یہ سب کچھ کرتے ہوئے احساسِ جرم ستا رہا تھا۔ تاہم وہ مجبور تھی۔

چاندنی نے کاغذ کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ ٹکڑا اٹھاتے ہی اسے پتا چل گیا کہ اس نے کیا اٹھایا ہے۔ چاندنی نے تیزی سے اسے پلٹ کر دیکھا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کا گلا گھونٹا۔ وہاں ایک درجن کے قریب چکور کی تصویریں تھیں...... کچھ خانے خالی پڑے تھے۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ چکور کی تصویروں کو گھور رہی تھی۔

سلیم...... سلیم...... سلیم...... م...... چاندنی کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے دوبارہ نمبر چیک کیا۔ نمبر ایک سو گیارہ۔ اس کا دل تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔

''جلد بازی مت کرو۔'' اس نے خود سے کہا۔ وہ واپس بلیٹن بورڈ کے پاس آئی اور احتیاط سے لاکرز کے نمبر چیک کیے۔ سلیم شاہ...... نمبر 112۔

وہ 111 کھول بیٹھی تھی۔ سلیم کا نمبر 112 تھا۔ اور 111 نمبر جمیل کا تھا۔ اسٹیکر جمیل کے لاکر میں سے برآمد ہوئے تھے۔ چاندنی نے ایک بار خوب اچھی طرح چیک کیا۔

کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ''چکور'' جمیل تھا۔

لیکن ایک بہت بڑا سوال سر اٹھا رہا تھا۔ یہ تمام حرکتیں جمیل کیوں کرے گا؟ کیا جواز ہو سکتا ہے اس کے پاس؟ نہیں، کوئی...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چاندنی کا دل و دماغ جمیل کو ملزم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اسے بچپن سے جانتی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ براہِ راست جمیل سے بات کرے گی۔ چاندنی نے بیگ بستر پر پھینکا اور فون کی طرف بڑھی، ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بول پڑی۔

''ہیلو؟'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ہیلو چاندنی۔'' کرن کی آواز تھی۔

''اوہ، کیسی ہو؟'' چاندنی نے سسکی لی۔

''چاندنی، کیا بات ہے؟''

''تمہیں یاد ہے کہ ایک بار جمیل نے کہا تھا کہ وہ ثابت کر دے گا کہ ''چکور'' کے پیچھے سلیم ہے؟'' چاندنی نے کہا۔

''ہاں، پھر؟''

''مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ میں خود تو ہاتھ پر ہاتھ

دھرے بیٹھی ہوں، پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔''
''کیسا فیصلہ؟''
''میں چھٹی کے بعد آڈیٹوریم میں بیک اسٹیج پر گئی اور لاکرز چیک کیے اور مجھے چکور کے اسٹیکرز مل گئے۔''
''واؤ۔'' کرن کی آواز آئی۔ ''مطلب وہ سلیم ہی ہے؟''
''نہیں۔'' چاندنی کی آواز لڑکھڑا گئی۔
''کیا مطلب؟''
''اسٹیکرز جمیل کے لاکرز میں تھے۔''
وقفے کے بعد کرن کی آواز آئی۔ ''ناقابلِ یقین......''
''لیکن یہی حقیقت ہے۔'' چاندنی نے کہا۔
اسی وقت موبائل گنگنایا۔
''کرن، میں تھوڑی دیر میں کرتی ہوں...... ایک اور کال آئی ہے۔'' چاندنی نے کہا۔
''او کے۔''
''فون بزی مل رہا تھا اس لیے میں نے موبائل پر کرلیا۔ میں جانتا ہوں تم لوگوں سے موبائل پر بات کرتی ہو۔'' جمیل نے کہا۔
''کیا بات ہے؟''
''بات کرنی ہے۔''
''او کے۔'' چاندنی نے کہا۔ ''مجھے بھی کچھ بات کرنی ہے۔''
''ملاقات کرنی ہے، فوری ملاقات...... بہت ضروری ہے۔''
''بالمشافہ؟'' چاندنی بولی۔ ''فون پر نہیں ہوسکتی؟''
''نہیں، یہ پیچیدہ معاملہ ہے...... نہایت اہم۔'' وہ بولا۔ لہجے کی بے چینی برقرار تھی۔
''جمیل، مجھے اسٹیکرز کا پتا چل گیا ہے۔''
''کیا؟''
''ہاں، مجھے اسٹیکرز تمہارے لاکرز سے ملے ہیں۔'' چاندنی نے کہا۔
دوسری طرف سے آہ بھرنے کی آواز آئی۔ ''میں وضاحت کرسکتا ہوں، اسی لیے فون کیا تھا۔ میں نے سچائی کا پتا چلا لیا ہے...... اس وقت آڈیٹوریم میں ہوں...... جلدی پہنچو۔''
''فون پر کیوں نہیں؟'' چاندنی نے اعتراض کیا۔
''نہیں، تمہیں کچھ دکھانا ہے...... مجھ سے یہاں ملو...... جتنی جلدی ہوسکے...... میں انتظار کررہا ہوں۔''
''لیکن......'' چاندنی کی بات ادھوری رہ گئی۔ جمیل نے لائن کاٹ دی تھی۔ چاندنی نے کرن کا نمبر ملایا۔
''کیا مسئلہ ہے؟'' کرن نے فوراً سوال کیا۔
چاندنی نے اسے جمیل کے فون کے بارے میں بتایا۔
''او کے، میں دس منٹ میں تمہیں لینے آرہی ہوں۔'' کرن نے کہا۔
''شکریہ۔''
چاندنی نے تیاری شروع کردی۔ چند منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی پھر بجی، چاندنی نے فون اٹھایا۔
''اوہ ڈیئر، ویری سوری۔'' کرن نے کہا۔ ''مما کار لے گئی ہیں، مجھے پتا نہ تھا۔''
''کوئی بات نہیں، پریشان مت ہو...... میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں گی۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔'' چاندنی نے اسے اطمینان دلایا۔
''اگر مما جلدی آگئیں تو میں آجاؤں گی۔'' کرن بولی۔
''ٹھیک ہے، لیکن فکر مند مت ہونا۔''

☆☆☆

چاندنی کالج پہنچی تو رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ پارکنگ میں ٹیچرز کی چند کاریں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ یہ ایک قدرے سرد رات تھی، چاند کی روشنی سے عاری، چاندنی نے جیکٹ کے بٹن بند کرلیے۔ آڈیٹوریم بڑی سی عمارت کے عقب میں تھا۔
خوف کی لہر نے چاندنی کے بدن میں سرائیت کی...... ''نہیں، نہیں...... جمیل کو وہ خوب جانتی ہے۔ وہ جیسا بھی ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' اس نے خود کو اطمینان دلایا۔
وہ مضبوط قدموں کے ساتھ چلتی رہی۔ بیک اسٹیج کی لائٹ آن کرکے اس نے جمیل کو پکارا۔ ''جمیل! کہاں ہو؟''
''جمیل!'' چاندنی نے آواز مزید بلند کی۔ جواب ندارد۔
چاندنی نے باہر آکر ''ہاؤس لائٹس'' آن کیں، نشستیں خالی پڑی تھیں۔
''ویری فنی، جمیل۔'' وہ زور سے بولی۔ ''تمہاری حرکتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ وہ واپس اسٹیج پر آئی۔ اسٹیج ڈور کے پاس اسٹول پر ایک اسکرپٹ رکھا تھا۔ چاندنی نے

اسے اٹھا کر نام پڑھا۔ وہ جمیل کا اسکرپٹ تھا۔
یعنی وہ یہاں آیا تھا۔ کیا وہ یہیں کہیں ہے؟ یا یہ کوئی ٹریپ ہے۔ خوف کے سائے ایک بار پھر اس کے اردگرد منڈلانے لگے۔
''جمیل، کہاں ہو؟'' اس نے گھوم پھر کر دیکھا۔ معاً اسے لاکر روم کا خیال آیا...... بظاہر وہ بھی خالی تھا۔ وہ دروازے کی طرف مڑ کر لائٹ بند کرنے والی تھی۔ معاً آنکھ کے کونے سے اس نے سیڑھی کے قریب کپڑوں کا بنڈل دیکھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ کون اپنے کپڑے چھوڑ کے جاسکتا ہے؟ وہ قریب چلی گئی۔ کپڑوں کے ڈھیر کا انداز کچھ غیر فطری سا تھا۔ وہ کسی کردار کا کاسٹیوم نہیں تھا۔ جینز اور شرٹ۔
وہ کوئی بے حس و حرکت بندہ تھا۔ وہ عجیب انداز میں پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ جسم کے نیچے دبا تھا۔ سر ایک جانب مڑا ہوا تھا۔ گردن ایک غیر معمولی زاویے پر خم کھا گئی تھی۔ چاندنی کو لگا جیسے وہ اوپر سے گرا ہے۔ وہ گھوم کر اس کے چہرے کی طرف آئی۔
چیخ روکنے کی کوشش بے معنی تھی۔ ''جمیل...... ل...... ل......''

☆☆☆

''پھر وہی حادثہ؟'' چاندنی کو رنج و غم نے گہنا دیا تھا۔
''ہاں، پولیس کے مطابق وہ کیٹ واک'' سے گر کر گردن تڑوا بیٹھا تھا۔
''مجھے اعتبار نہیں ہے۔'' چاندنی نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ''آخر اسے اوپر جانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''کون جانتا ہے؟'' کرن نے اداس لہجے میں کہا۔
''شاید کوئی کبھی نہ جان سکے۔'' کرن نے دوسرا فقرہ سرگوشی کے انداز میں ادا کیا۔ اسے یاد تھا جب جمیل کی بے نور آنکھوں سے اس کی پرنور نظریں چار ہوئی تھیں...... وہ حواس کھو بیٹھی تھی...... اسے نہیں پتا وہ کب تک چیختی رہی اور بال نوچتی رہی...... چوکیداروں نے اسے جمیل کی لاش کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے پایا تھا۔
''سوری، چاندنی...... مجھے آنے میں دیر ہوگئی اور یہ حادثہ جانکاہ تمہیں اکیلے جھیلنا پڑا۔'' کرن نے کہا۔
''میں بات کرنے کی حالت میں نہیں ہوں...... تم ماں کے پاس جاؤ...... نرم الفاظ میں حادثے کے بارے میں بتانا اور میری خیریت کی اطلاع کر دینا۔'' چاندنی نے درخواست کی۔
''ہاں، میں جاتی ہوں۔''
''شکریہ، شاید کل ملیں۔''
کرن کے جانے کے بعد چاندنی سوچنے لگی کہ پے در پے ہونے والے خوفناک واقعات اور دھمکیوں سے تو نجات مل گئی ہے۔ اگرچہ اسے دکھ تھا کہ جمیل یہ کیوں کر رہا تھا۔
جمیل تم یہ کیوں کرتے رہے۔ کیا تم مجھ سے نفرت کرتے تھے؟ تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟ تم کیا بتانا چاہتے تھے؟ یا مارنا چاہتے تھے؟

☆☆☆

ریہرسل ایک ہفتے بعد اسٹارٹ ہوئی، چاندنی کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زبردستی وہاں گھس آئی ہے۔ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ اسٹیج اجنبی کیوں لگ رہا ہے؟ بلکہ اسے ہر ایک اجنبی لگ رہا تھا۔
''چاندنی...... سوری فار ویٹ۔'' سلیم نے کہا۔
''شکریہ۔'' چاندنی نے سرگوشی کی۔
''کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' کرن نے سوال کیا۔
''بیڈ، ویری بیڈ۔'' چاندنی نے جواب دیا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ جمیل مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ کاش اس منحوس حادثے سے پہلے میری اس سے بات ہو جاتی۔ وہ بہت بے چین تھا کچھ بتانے کے لیے۔'' چاندنی نے سرد آہ کھینچی۔
ضیا اسد کی آواز نے سب کو متوجہ کیا۔ چند رسمی کلمات کے بعد اس نے کام کے آغاز کا اشارہ کیا۔
آہ کیا زندگی ہے۔ چاندنی نے حیرت محسوس کی۔ کچھ بھی ہو جائے شو ہونا چاہیے، اس نے گہری سانس لے کر اپنے مکالموں کی طرف توجہ دی۔ لیکن اس کے ذہن نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ سکندر بھی اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ ورنہ وہ اسی کے لیے مکالمے ادا کر دیتی۔
کرن بغور اپنی سہیلی کو دیکھ رہی تھی۔
''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' کرن نے کہا۔
''میں نہیں کر سکتی...... نہیں کر سکتی۔'' چاندنی کی آواز ٹوٹ گئی۔
''میں سمجھ سکتی ہوں۔ اوپر لائنس بھی میں تین مرتبہ ٹھیک نہیں کر سکی اور منیجر سے ڈانٹ کھانی پڑی۔ بہت برا ہوا...... یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔'' کرن نے غمگین آواز میں کہا۔

''ڈراما چلنا ہے تو ضرور چلے، لیکن میں نہیں کر سکتی۔''
چاندنی نے فیصلہ سنایا۔ ''اگر مجھے پہلے احساس ہو جاتا تو جمیل آج شاید زندہ ہوتا۔''
''تم خود کو الزام مت دو۔'' کرن نے کہا۔
چاندنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
ضیا اسد کی آواز آئی۔ وہ چاندنی کو پکار رہا تھا۔
''میں نے ایک بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔'' پردے کی جانب جاتے ہوئے چاندنی نے کرن سے کہا۔
کرن نے افسردگی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

''مسٹر ضیا!'' چاندنی نے اسے پکارا۔ ''مجھے ایک اہم بات کرنی ہے۔''
''ہمیں تاخیر ہو رہی ہے، چاندنی...... ناٹ ناؤ۔''
''چھوٹی سی بات ہے۔''
''ہم پھر کر لیں گے۔'' ضیا اسد نے معذرت کی۔ ''کل صبح تم مجھ سے مل سکتی ہو۔'' یہ کہہ کر ضیا اسد ایک دروازے میں غائب ہو گیا۔
''کیا تم ڈراما چھوڑ رہی ہو؟'' کرن نے استفسار کیا۔
''کرن تمہیں پتا ہے کہ میں نہیں کر سکتی۔'' چاندنی کی آواز لرز اٹھی۔
''چاندنی، میں سمجھتی ہوں میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کر رہی ہو...... تمہیں ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔''
''میں آج رات ہی ضیا اسد کو مطلع کر دوں گی۔'' چاندنی نے کرن سے کہا۔
''کیا اطلاع ہے؟''
دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سلیم منہ بنائے کھڑا تھا۔ غالباً اس نے سن لیا تھا۔
''اس حادثے کے بعد بھی تم پرفارم کر رہی ہو، یہ تمہاری بہادری اور کمٹمنٹ ہے۔'' اس نے سراہا۔
''سلیم پلیز......''
''تو...... تو...... میرا واقعی یہی مطلب ہے، تم کیا بتانا چاہتی ہو ضیا اسد کو؟''
چاندنی نے فرش کی جانب دیکھا۔ ''کچھ خاص نہیں۔''
''بتا دو، چاندنی...... ویسے بھی جلد یا بدیر اسے پتا چل ہی جائے گا۔'' کرن نے حوصلہ دیا۔
''ہاں، یہ چھپنے والی بات نہیں ہے۔'' چاندنی نے گہری سانس لی۔ ''میں ڈراما چھوڑ رہی ہوں۔''
''بہت خوب۔'' سلیم کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ''یہ ایک ''جوک'' ہے۔ کیوں؟''
''نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔'' چاندنی نے یقین دہانی کرائی۔ ''میرے خیال میں جمیل بھی یہی چاہتا تھا۔''
''تمہارا دماغ چل گیا ہے۔'' سلیم کی آواز بلند ہو گئی۔ ''ایک حادثے کی وجہ سے تم ایک اہم ترین ڈراما چھوڑ دو گی؟''
چاندنی نے سر اثبات میں ہلایا لیکن خاموش رہی۔ وہ حیران تھی کہ اس کے فیصلے نے سلیم کو کیوں مشتعل کر دیا ہے؟
''اوہ، اب سمجھا۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''تم سے برداشت نہیں ہو رہا...... چاندنی، تم اس وقت مرکزِ نگاہ نہیں ہو۔ ہر کوئی جمیل کی بات کر رہا ہے۔ تمہاری طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔ یہی تم سے برداشت نہیں ہو رہا، تم واپس توجہ کا مرکز بننا چاہتی ہو اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے شاندار چال چلی ہے تم نے۔''
چاندنی کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا ہو۔ ''کتنا گھٹیا ذہن ہے تمہارا...... کتنے سستے خیالات ہیں......'' چاندنی نے تنفر کے ساتھ کہا۔
''لیکن یہی حقیقت ہے۔'' سلیم نے کڑوے لہجے میں کہا۔
''اسے اکیلا چھوڑ دو، سلیم۔'' بالآخر کرن نے مداخلت کی۔
''وہ کیوں؟'' سلیم پھٹ پڑا۔ ''چاندنی اسٹار ہے۔ اس کے بغیر ڈراما اسٹیج ہی نہیں ہو گا۔ چاندنی، آپ سیٹ ہے۔ خوف زدہ ہے...... چاندنی، کیا تم جانتی ہو کہ ہر کوئی تمہاری خود غرضی سے بدمزہ ہو گا۔ کیونکہ ہر ایک متاثر ہو گا۔ تم چھوڑو گی تو ڈراما نہیں ہو گا۔ اس کا مطلب بہت سارے لوگ متاثر ہوں گے۔ چاہے وہ فنکار کے بجائے ٹیکنیکل اسٹاف ہی کیوں نہ ہو۔''
چاندنی، اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ وہ اتنا سخت اور بے بنیاد انداز اختیار کرے گا۔ چاندنی کی گھنیری پلکوں پر موتی سے لرز رہے تھے۔ اس نے اس طرح کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔
''تمہیں، ہم سب کی کیوں پروا ہو گی؟'' وہ بھڑک اٹھا یا پرانی بھڑاس نکال رہا تھا۔ ''تمہیں صرف خود سے مطلب ہے...... تمہیں اس بات سے غرض ہے کہ تمہارے لیے کیا اہم ہے؟ تم بالکل بدل گئی ہو...... تم چاندنی نہیں

ہو...... کوئی اور ہو...... کہاں گئے تمہارے خواب؟‘‘

’’خاموش ہو جاؤ۔‘‘ کرن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

سلیم نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ چاندنی کو گھور رہا تھا جو سخت روہانسی ہو چکی تھی۔

’’تمہیں نہیں پتا کہ ڈراما کینسل ہو جائے گا۔ ’ہیر‘ کا رول کون کرے گا۔ سیما اسپتال میں ہے۔ اتنے سارے لوگ اتنے دنوں سے محنت کر رہے ہیں، سب مٹی میں مل جائے گی۔ لوگ خاص طور پر یہ ڈراما دیکھنے آئے ہیں جو سال میں ایک کالج کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس مرتبہ ’’گرین ہلز‘‘ کو یعنی ہمیں منتخب کیا گیا ہے...... کون جانے پھر ہمارا نمبر کب آئے گا؟‘‘

’’تم اسے اکیلا چھوڑ دو۔‘‘ کرن چیخ پڑی۔

’’اگر یہاں کوئی اور ’ہیر‘ نہیں ہے تو یہ اس کا قصور نہیں ہے۔ تمہیں اس کی حالت نظر نہیں آ رہی......‘‘ کرن حفاظتی بلڈوگ کے مانند دونوں کے درمیان کھڑی ہو گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ چاندنی کو جمیل کے علاوہ کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سلیم کی باتوں سے انکار ممکن نہیں تھا، نیت کچھ بھی رہی ہو۔

چاندنی نے آنسو پونچھے۔ ’’وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔‘‘ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’ڈرامے سے نکل جانا میرے لیے ممکن نہیں...... صدمے کے باعث مجھے اس طرح سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میری وجہ سے بہت سے لوگ متاثر ہوں گے۔ اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔‘‘

’’لیکن چاندنی......‘‘ کرن نے کچھ کہنا چاہا۔

’’او کے، میں کرلوں گی۔ میں یہ کرنے سے مر نہیں جاؤں گی۔‘‘ چاندنی نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

☆☆☆

چاندنی نے ڈیجیٹل کلاک پر چمکتے نمبروں پر نظر ڈالی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے انگڑائی لی۔ اس وقت کیسے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید کوئی آواز تھی۔ اس نے سماعت پر زور دیا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

چاندنی نے کروٹ بدلی۔ تاہم اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ٹھنڈا پانی پینے کا ارادہ کر کے وہ اٹھی۔ سرد پانی اسے پُرسکون کر دیتا تھا۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی سیڑھیوں کے ذریعے نیچے کچن میں آئی۔ پانی پینے کے بعد اس نے ریفریجریٹر کا دروازہ بند کیا تو اس کی نظر کچن ڈور پر پڑی۔ دروازے کی زیریں جھری میں کوئی سفید چیز موجود تھی۔ وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔

ایک اور نوٹ!

یہ کیا اسرار ہے؟ جمیل تو اب اس دنیا میں نہیں...... تو پھر یہ کیا ہے اور کس نے رکھا؟ چاندنی نے اعصابی تناؤ محسوس کیا تاہم وہ آگے بڑھ کر جھکی اور کاغذ کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ کاغذ پر چند سطور پرنٹ تھیں۔ زیریں حصے پر ’’چکور‘‘ کی تصویر بنی تھی۔ کاغذ کا ٹکڑا چاندنی کی انگلیوں میں لرز اٹھا۔ وہ زندہ تھا، یعنی اسے تنگ کرنے والا جمیل نہیں تھا؟

پیاری چاندنی!

حیران ہو؟

تم نے سمجھا کہ مسئلہ حل ہو گیا لیکن یہ تمہاری غلطی تھی، بہت بڑی غلطی۔ جمیل نے بھی غلطی کی۔ اسی وجہ سے خوامخواہ مارا گیا...... میں اب بھی تمہارے ناظرین میں شامل ہوں۔ تمہارے پاس تھوڑا وقت رہ گیا ہے!

’’چکور‘‘

چاندنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بدن کی لرزش ختم ہو گئی۔ ’’چکور‘‘ نے جمیل کو مارا۔ جب وہ حقیقت جان چکا تھا اور چاندنی کو بتانے جا رہا تھا۔ چاندنی کو اس کے آخری فقرے اور بے قراری یاد آئی۔ بلاشبہ وہ ’’چکور‘‘ کے راز سے واقف ہو گیا تھا۔ اس کی آگہی کی قیمت اسے جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ اور اب چاندنی کا نمبر ہے۔

چاندنی کا جسم پھر لرزنے لگا۔ تاہم اب وہ غصے کے باعث لرزاں تھی۔ ڈر، خوف، ہراس سے کیا ملا؟ سیما زخمی ہو گئی، جمیل مارا گیا، پارکنگ میں سلیم اور جمیل کی ہاتھاپائی، خود چاندنی پر قاتلانہ حملے ہوئے اور پرنالا اب بھی وہیں گر رہا تھا۔ چاندنی کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جمیل کے ناحق خون کے لیے لڑے گی۔ ڈر کا سامنا کرنے سے ڈر غائب ہو جاتا ہے۔ ڈر ڈر کے مرنے سے بہتر ہے کہ خوف سے فیصلہ کن جنگ کر لی جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ڈراما چھوڑنے کے بعد آئندہ کے لیے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ اس کا سامنا ایک قاتل سے تھا۔

چاندنی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کاغذ کے پرزے کیے اور ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ دروازے اور کھڑکی کے لاک چیک کیے اور واپس اپنی خواب گاہ میں چکور سے ملنے کا پروگرام بنا کر وہ اطمینان سے سو گئی۔

☆☆☆

چاندنی نے پردے کے پیچھے سے جھانکا۔ ناظرین کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ کالج کی فٹ بال ٹیم بھی نظر

آرہی تھی۔

''چاندنی، پچھلے ریکارڈ توڑ دینا۔'' کسی نے سرگوشی کی۔

چاندنی گھومی۔ سکندر قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''شکریہ...... میں نروس ہوں۔'' وہ بولی۔

''میں جانتا ہوں نروس ہو، یہ بھی جانتا ہوں کہ ڈراما شروع ہوتے ہی تم سب کچھ بھول جاؤ گی اور جانتا ہوں کہ تم زندگی کی بہترین پرفارمنس پیش کرو گی۔''

''اور کیا جانتے ہو؟''

''باقی ڈرامے کے بعد...... گڈلک۔''

''دور نہ جانا۔''

''نہیں، دور نہیں جاؤں گا...... دور لے جاؤں گا۔''

اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت چمکی۔

☆☆☆

ڈرامے میں چاندنی نے ناقابلِ فراموش فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ کون ہے اور وہ سلیم کے بالمقابل اداکاری کر رہی ہے۔ وہ کردار کی روح میں اتر گئی تھی۔ تالیوں کے بے پناہ شور میں پردہ گرا۔

دوسرے ایکٹ کے لیے پردہ اٹھا تو چاندنی نے کاسٹیوم تبدیل کر لیا تھا۔ جمیل کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ دوسرا ایکٹ اس نے جمیل کے نام پر شروع کیا۔ جمیل اسے ہمیشہ کے لیے مقروض کر گیا تھا۔ وہ اداکاری بھی ترک نہیں کرے گی۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے...... جمیل کے لیے وہ نامعلوم قاتل سے لڑے گی۔

دوسرا ایکٹ بھی پہلے کے مانند اختتام پذیر ہوا۔ چاندنی فوراً ہی بیک اسٹیج پر چلی گئی۔ اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ آج وہ جلدی گھر آئے گی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بیگ لینے کے لیے لاکر روم کی طرف قدم بڑھائے۔ اسے خدشہ تھا کہ دیر نہ ہو جائے۔ بیگ لے کر وہ فوراً ہی روانہ ہو گئی۔

ڈنر کے بعد ہی اسے اطمینان نصیب ہوا۔ اپنے کمرے میں آ کر بیگ اس نے بستر پر الٹ دیا۔ کتابیں، نوٹ بکس اور کاغذات وغیرہ بستر پر بکھر گئے۔ وہ ہسٹری کی کتاب دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نگاہ سفید رنگ کے لفافے پر پڑی۔ جس پر چکور کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

نفرت کے احساس کے ساتھ اس نے لفافہ اٹھا کے چاک کیا اور نوٹ کی تحریر پڑھنا شروع کی۔

پیاری چاندنی!

تمہیں میرا نیا سرپرائز کیسا لگا؟

ایک عورت

ایک عورت اپنے دو بچوں کو ساتھ لے کر ایک سہیلی سے ملنے گئی۔ چھوٹے بچے کو دیکھ کر سہیلی نے کہا۔ ''اس کی آنکھیں بالکل ماں کی طرح ہیں۔''

ماں بولی۔ ''اور ماتھا باپ کا ہے۔''

''اور پاجامہ بڑے بھائی کا ہے۔'' اس کے بڑے بچے نے کہا۔

ناصر شیخ...... مانسہرہ

تراش خراش

ایک سپاہی دوسرے سے۔ ''تم پولیس میں بھرتی کیوں ہوئے؟''

دوسرا سپاہی بولا۔ ''میری بیوی نہیں ہے اور میں مرنا چاہتا تھا اور تم؟''

پہلا سپاہی۔ ''میری بیوی تھی اور مجھے سکون کی موت چاہیے تھی۔''

میمونہ عزیز...... کراچی

مجھے یقین ہے کہ تم ابھی تک بے خبر ہو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تمہارے ایک اور دوست کو ختم کر چکا ہوں۔ وہیں، آڈیٹوریم میں...... ڈریسنگ روم بہترین جگہ ہے، اس کام کے لیے۔ تم نے میری باتوں پر کان نہیں دھرے...... میں سمجھ رہا تھا کہ تم ڈراما چھوڑ دو گی۔ تم نے ایسا نہیں کیا، لہٰذا، یہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں اوپننگ نائٹ پر بھی موجود رہوں گا۔ تمہیں ختم کرنے کے لیے یہ ایک بہترین وقت ہوگا۔

چکور۔

چاندنی نے پہلے کے مانند کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ مردود نے اب کس کو ہلاک کر دیا ہے؟ کون ہو سکتا ہے؟ تحریر کے مطابق مرنے والا اس کے دوستوں میں سے ہے؟

چاندنی خوف کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہی تھی۔ اس نے ایک اور دوست مار دیا ہے؟ ڈریسنگ روم کا ذکر اس نے پہلے بھی کیا تھا۔ لیکن ڈریسنگ روم میں ریہرسل کے دوران میں کئی گھنٹے صرف ہوئے تھے اور وہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ نارمل تھا۔ سب نارمل تھا۔ نارمل تھا۔

''اوہ نو......'' چاندنی اچانک گھبرا گئی۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

لفافہ، اس کے لاکر والے بیگ میں تھا۔ قاتل جانتا تھا کہ وہ دوسرا ایکٹ ختم ہونے سے پہلے لاکر روم کا رخ نہیں کرے گی۔ لہٰذا ''نوٹ'' اسے کل صبح ملے گا۔ اس وقت تک رات میں وہ اپنا کام کر کے جا چکا ہوگا جبکہ چاندنی نے نوٹ رات میں ہی پڑھ ڈالا تھا۔ چاندنی کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ شروع ہو گئی...... یعنی غالب امکان تھا کہ قاتل ابھی اپنے منصوبے پر عملدرآمد شروع نہ کر سکا ہو۔ چاندنی کی وجہ سے ایک اور جان خطرے میں تھی۔

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ قاتل اس کے دوستوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔

''اُف...... ف......'' چاندنی کو کرن کا خیال آیا۔ چاندنی نے پھرتی سے فون اٹھا کر کرن کا نمبر ملایا۔

ٹرن...... ن......

ٹرن...... ن...... ٹرن...... ن...... چاندنی نے موبائل نمبر ملایا۔ وہ بند پڑا تھا۔

''اوہ...... خدایا۔''

گھر کا فون کسی نے نہیں اٹھایا تھا۔ کیا گھر پر کوئی نہیں تھا؟

کرن، اس وقت کہاں ہو سکتی ہے؟ وہ کریو ممبر بھی تھی۔ وہ یا کوئی اور ممبر رات میں اسپاٹ لائٹس چیک کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً کالج آڈیٹوریم چلے جاتے تھے۔ تاکہ صبح میں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو لیکن یہ ایک امکان تھا۔ ممکن ہے کہ وہ گھر والوں کے ساتھ نکل گئی ہو۔ لیکن موبائل کیوں بند ہے؟ چاندنی کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تاہم اس نے آڈیٹوریم جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اگرچہ اس میں خطرہ تھا۔ کیونکہ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو اس میں استعمال کرنے کی ہمت نہ تھی۔ البتہ چوکیدار اور اسٹاف ٹاؤن کے چند ممبر وہاں ضرور ہوں گے۔ چوکیدار بھی چار عدد تھے۔ ایک ایک دونوں گیٹوں پر ہوتے تھے اور دو عمارت کے گرد گھومتے رہتے تھے۔ جب سے شہر میں آپریشن شروع ہوا تھا، گارڈز کی تعداد ایک کے بجائے چار کر دی گئی تھی اور چاروں مسلح رہتے تھے۔

چاندنی اللہ کا نام لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ نکلتے نکلتے فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت چاندنی کو فون کی گھنٹی بری لگی تھی۔ ہر پل قیمتی تھا۔ اس نے دعا کی کہ کرن کا فون ہو لیکن وہ سکندر تھا۔

''سکندر!'' چاندنی نے گھبراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ عام طور پر وہ اس کی آواز سن کر خوش ہو جایا کرتی تھی لیکن اس وقت نہیں۔ اس وقت کوئی اور ہی مرحلہ درپیش تھا۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' سکندر کی آواز میں تشویش تھی۔

''ہاں، لیکن مجھے جانا ہے۔''

''تم پریشان کیوں ہو؟ کہاں جانا ہے؟''

''نہیں، ہاں، میں ٹھیک ہوں۔''

''آئی ایم سوری، میں تمہاری پرفارمنس نہ دیکھ سکا۔''

''کیا؟ اچھا، کوئی بات نہیں سکندر...... لیکن مجھے ضروری جانا ہے۔'' چاندنی بے چین ہو رہی تھی۔

''فائن۔'' وہ بولا۔ ''سات بج رہے ہیں، کیا میں رات میں مل سکتا ہوں؟''

چاندنی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

''میرا مطلب ہے۔ مجھے ضروری کام کرنا ہے۔'' چاندنی نے کہا۔

''کیا میں مدد کر سکتا ہوں؟''

''پتا نہیں...... مجھے جانا ہے۔''

''اوکے۔'' سکندر کی آواز میں دل شکنی کا پہلو نمایاں تھا۔ تاہم وہ بچہ نہیں تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ فون بند کر کے وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ادھر چاندنی نے بائے کہہ کر فون بند کیا تو احساسِ جرم کا احساس ہوا۔ اسے سکندر کی تکلیف کا ادراک ہو گیا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اسے خیال ہی نہ آیا کہ سکندر کو بتا دیتی کہ بات کیا ہے۔ وہ بھی پہنچ جاتا تو بات کچھ اور ہوتی۔

لیکن پھر وہی خیال سرسرایا جو حالات کی پیداوار تھا۔ وہ اپنے سائے پر بھی شک کرنے لگی تھی۔ کس پر بھروسا کرے کس پر نہ کرے۔ اس نے آنکھیں بھینچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

کرن خطرے میں ہے، کرن خطرے میں ہے......

اس نے ذہن میں دہرایا اور دل کڑا کر کے نکل پڑی۔ ماں کے لیے احتیاطاً اس نے ایک پیغام چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

وہاں پارکنگ میں کرن کی کار نظر نہیں آئی۔ چاندنی کو امید پیدا ہوئی کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ دل مضبوط کر کے بڑھتی رہی۔

آڈیٹوریم کی لائٹ کھول کر اس نے کرن کو آواز دی۔ وہاں تمام نشستیں خالی پڑی تھیں۔ کوئی جواب نہ آیا۔ کیا وہ اوپر ''کیٹ واک'' پر لائٹنگ سسٹم کے ساتھ مصروف ہے۔ اس نے سر اٹھا کر بلندی پر مختلف فولادی تختوں (کیٹ واک) اور لوہے کی راڈوں کو دیکھا۔ جگہ جگہ اسپاٹ لائٹس بھی نظر آرہی تھیں۔ جو فانوس نما لائٹس ٹوٹ کر گری تھیں، ان کی جگہ نئی نصب کردی گئی تھیں۔

''کرن!''

دفعتاً گرے ہوئے پردے کے عقب سے گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔

''کرن؟ کرن؟''

جواب ندارد۔ خوف پھر غالب آنے لگا۔ چاندنی نے مضبوطی سے ایک کرسی کی پشت تھام لی۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔'' کوئی اس کے دماغ میں چلایا۔

''نکلو، بھاگ جاؤ۔''

''کرن خطرے میں ہے۔'' چاندنی نے خود کو یاد کرایا۔

چیخ سن کر اس کے ہاتھ سے فلیش لائٹ گر گئی تھی۔ وہ اس نے دوبارہ اٹھائی اور پردے میں جگہ بنا کر بیک اسٹیج پر آگئی۔ چاندنی نے وہاں کی لائٹ آن نہیں کی بلکہ فلیش لائٹ کو بھی مدھم رکھا تھا۔ بلی کی چال چلتی ہوئی بڑھتی رہی۔ آنکھیں اور کان، کچھ دیکھنے یا سننے کے لیے مرتکز تھے۔

''کرن؟''

نہایت مدھم سی ''آہ'' اسے سنائی دی۔ وہ رک گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ساکت کھڑی آواز کی سمت کا تعین کررہی تھی۔ اس نے سماعت پر زور دیا۔ معاً ویسی ہی مدھم تکلیف دہ آواز پھر سنائی دی۔ غالباً جو بھی تھا، اس نے چاندنی کی آواز سن لی تھی۔ تاہم کسی وجہ سے وہ جواب نہیں دے پارہا تھا۔ تاہم اس مرتبہ چاندنی نے آواز کی سمت کا اندازہ لگا لیا اور اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ کیونکہ آواز اوپر سے آئی تھی۔

چاندنی نے فلیش لائٹ کی بیم کا رخ اوپر کی جانب کیا۔ تاہم روشنی کی دھار میں اتنی جان نہیں تھی کہ بلندی تک جاسکتی۔ اوپر ایک چھوٹا سا کمرا بنا تھا۔ کمرے کے ساتھ ایک دھاتی سیڑھی منسلک تھی۔ جو نیچے فرش تک آئی ہوئی تھی۔ سیڑھی کے ذریعے کمرے تک، پھر وہاں سے کیٹ واک اور جنگلوں کی مدد سے چھت پر پھیلے ہوئے لائٹ سسٹم تک پہنچا جاتا تھا۔

چاندنی نے فلیش لائٹ کا رخ نیچے کرلیا۔ سیڑھی کے ذریعے اسے اوپر جانا ہی ہوگا۔ جو کوئی بھی تھا، وہ اوپر کمرے میں ہی تھا۔ معاً اس کی نگاہ اپنے قدموں کے قریب پڑی...... وہاں بڑا سا دھبا نظر آرہا تھا۔ چاندنی نے لائٹ کا زاویہ تبدیل کیا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ سرخ رنگ کا خون تھا گہرے سرخ رنگ کے خون کا دھبا۔ اسی وقت اوپر سے پھر کربناک آواز آئی۔ چاندنی دہشت کا گلا گھونٹتے ہوئے اوپر جانے کا فیصلہ کررہی تھی۔ معاً پہلی مرتبہ مدھم الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ آواز نحیف اور کمزور تھی۔ وہ بمشکل سن پائی۔

''کوئی ہے...... مدد کرو...... میری مدد......'' چھت اور کمرے کی بلندی کے حساب سے سیڑھی بھی بلند اور عمودی تھی۔ چاندنی نے فلیش لائٹ جیکٹ کی جیب میں اڑسی اور سنبھل کر مضبوط گرفت کے ساتھ اوپر چڑھنا شروع کیا۔

آدھا راستہ طے کرنے کے بعد وہ رک گئی۔ ''نیچے مت دیکھنا۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔ گہری گہری سانسیں لے کر اس نے پھر بلندی کا سفر شروع کیا۔ اس کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ وہ رک رک کر قدم بہ قدم اوپر جارہی تھی۔

پھر کسی نے مدد کے لیے آواز نکالی۔ اس مرتبہ آواز کچھ واضح تھی۔ چاندنی نے نصف سے زائد فاصلہ طے کرلیا تھا۔ وہ رک گئی اور سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے پیٹ کے عضلات کھنچنے لگے تھے۔ ہتھیلیاں پسیج گئی تھیں۔ پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے تھے۔ بلندی کا خوف اس کی نفسیات میں شامل تھا۔ اگر وہ نیچے دیکھ لیتی تو اسے گرنا ہی گرنا تھا۔ یہاں سے واپس جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بالآخر وہ کیبن نما کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ، عام دروازوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا اور کھلا ہوا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ چاندنی، پیٹ تک سیڑھی پر اونچی ہوئی اور ہانپتے ہوئے خود کو اندر کمرے میں گرا دیا۔ ٹانگیں بھی اندر کیں اور دیوار سے ٹیک لگا کر سانس بحال کرنے لگی۔

تاریکی...... سکوت...... چاندنی نے فلیش لائٹ آن کرکے کمرے کا جائزہ لیا۔ حیران کن طور پر چھوٹا سا کمرا مختلف قسم کے سامان سے لبریز تھا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ باہر کی واک کے جانب کھلتا تھا جو کمرے کو تقسیم کررہا تھا۔ دوسری جانب سے اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔

''کوئی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ جواب میں ناقابلِ فہم کراہ سنائی دی۔ چاندنی چاروں ہاتھ پیروں کے بل اسٹوریج کیبنٹ کے گرد گھومی اور خود کو سلیم کے سامنے پایا۔

☆☆☆

چاندنی نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔
"میں ٹریپ ہوگئی ہوں۔" اسے احساس ہوا۔
"سلیم اسے ٹریپ کر چکا تھا۔"
وہ منہ کھولے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلیم کو گھور رہی تھی۔ وہ بھی خاموش تھا۔
"سلیم!" وہ چلا اٹھی۔ "سلیم؟"
معاً اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ سلیم حرکت نہیں کر رہا ہے۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی نہیں تھیں...... نہ وہ پلکیں جھپک رہا تھا۔
چاندنی کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔
"سلیم......؟"
جواب میں ہلکی سی آہ نکلی، چاندنی نے روشنی کا دائرہ گھما کر جائزہ لیا اور دنگ رہ گئی۔ سلیم کے ہاتھ پیر رسی سے جکڑے ہوئے تھے۔ پیشانی پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ بال خون میں بھیگ کر چپک گئے تھے۔
"سلیم، کیا ہوا؟ کس نے کیا یہ سب کچھ؟"
اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ "چاندنی! تم نے مجھے یہاں بلایا تھا؟" اس نے بمشکل فقرہ مکمل کیا۔
"میں نے بلایا تھا؟ کیا کہہ رہے ہو؟"
"ہاں...... تم نے...... مجھے اس کمرے...... میں انتظار کرنے کے لیے کہا تھا...... پھر میرے ساتھ کب کیا ہوا؟ مجھے یاد نہیں۔"
"سلیم، میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔ میں تو کرن کو ڈھونڈنے آئی تھی۔"
"پلیز، مجھے آزاد کردو۔" اس نے التجا کی۔
"ہاں، میں رسیاں کھولتی ہوں۔" چاندنی نے ہاتھ بڑھائے تاہم اس کے ہاتھ خلا میں رک گئے۔
کہیں سلیم ہی تو "چکور" نہیں ہے؟
نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس نے سوچا...... وہ کیوں خود کو بری طرح زخمی کرے گا اور کیسے خود کو باندھے گا۔ زیادہ خون بہنے سے اس کا چہرہ زردی مائل ہو رہا تھا۔ آنکھیں پھر بند ہوگئی تھیں۔ نہیں، قاتل کا اشارہ سلیم کی طرف تھا۔ سلیم بھی چاندنی کا دوست رہا تھا بلکہ دشمن تو وہ اب بھی نہیں تھا۔ چاندنی کی غیر متوقع آمد کے باعث قاتل کا کام ادھورا رہ گیا۔ یعنی وہ سلیم کو بچانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ معاً اسے لگا کہ اس کے دل نے حلق کی جانب سفر شروع کر دیا ہے۔ اگر قاتل اپنا کام ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہوا تو وہ یقیناً یہیں کہیں چھپا ہے...... شاید آڈیٹوریم میں......
یا پھر شاید اسی کمرے میں؟
چاندنی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔
"سلیم ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس نے رسیوں پر زور آزمائی کی جو ناکام ہوگئی۔
"کاٹنا پڑے گا کسی چیز سے؟"
"ادھر...... کونے میں آری کا بلیڈ پڑا ہے۔" سلیم نے بتایا۔ چاندنی کی آمد سے اسے حوصلہ ملا تھا۔ چاندنی نے تھوڑی سی کاوش کے بعد فٹ بھر لمبا آری کا بلیڈ ڈھونڈ لیا۔ جس کے دونوں طرف باریک دندانے تھے۔
ابھی چاندنی نے آری کا بلیڈ رسی پر رکھا ہی تھا کہ نیچے اسٹیج پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔
"ش...... شش...... شش......" چاندنی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور پھرتی سے فلیش لائٹ آف کر دی۔
"وہی ہے۔"
"کون؟" سلیم بڑبڑایا۔
"شش...... ش......" چاندنی کی سماعت آہٹوں پر مرکوز تھی جو قریب آتی جا رہی تھیں۔ آہٹ عین کمرے کے نیچے آکر رک گئی۔ جو کوئی بھی تھا آہنی سیڑھی کے پاس کھڑا تھا۔
چاندنی نے شدت سے کسی ہتھیار کی ضرورت محسوس کی۔ آری کا بلیڈ لچک دار تھا۔ بطور ہتھیار موزوں نہیں تھا۔ نیچے کسی نے سیڑھی پر قدم رکھا۔
"سلیم، یہاں کوئی ہتھیار نما چیز ہے؟" چاندنی نے سوال کیا۔
"پتا نہیں...... شاید میں نے ایک ہتھوڑا دیکھا تھا اور...... جہاں سے تم نے آری کا بلیڈ اٹھایا ہے، وہاں کوک کی چند خالی بوتلیں پڑی تھیں۔" وہ خاموش ہوگیا۔
چاندنی نے سوچا کہ فلیش لائٹ روشن کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لائٹ آف رکھنے سے بھی کچھ حاصل نہ تھا۔ جو بھی تھا، وہ اوپر ہی آرہا تھا۔ جتنی دیر میں وہ اوپر پہنچتا، چاندنی کے پاس اتنا ہی وقت تھا...... ہتھوڑا پتا نہیں کہاں ہوگا۔ پہلے کوک کی بوتلیں قابو کرو...... چاندنی نے فلیش لائٹ آن کر دی اور تیزی سے بوتلیں اٹھالائی۔ تین بوتلیں ہاتھ لگی تھیں۔
اس کے کان آہٹ پر تھے اور وہ حتی الامکان تیزی سے ہتھوڑا تلاش کر رہی تھی۔ سیڑھی پر آہٹیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ چاندنی نے لائٹ آف کر کے ہتھوڑے کی تلاش بند کر دی۔ فلیش لائٹ اور دو بوتلیں اس نے سلیم کے پہلو میں رکھ دیں۔ تیسری بوتل اس نے گردن کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لی اور وہ اندھیرے میں سلیم کے پاس بیٹھ کر انتظار

کرنے لگی۔ وہ بڑے اعصاب شکن لمحے تھے۔

آہٹیں یا سیڑھی چڑھنے کی آوازیں قریب تر ہوتی گئیں پھر خاموشی...... خاموشی کا لمبا وقفہ......

اچانک سکوت کا پردہ چاک ہوا۔ کمرے کا دروازہ چرچرایا اور کھل گیا۔ دروازے میں کوئی کھڑا تھا۔ دروازے کی بلندی چھوٹی تھی لہٰذا وہ سیڑھی پر کھڑا تھا۔ جوتوں سے اوپر کا کچھ حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔

''چکور!'' چاندنی کے ذہن نے نعرہ لگایا۔

چاندنی نے سانس تک روک لی۔

☆☆☆

''چاندنی! تم ہو؟'' کرن کی آواز آئی۔

''کرن!'' چاندنی چلائی۔ وہ تقریباً رو پڑی تھی۔ چاندنی کا اعصابی تناؤ ختم ہو گیا۔ وہ حالاتِ سکوت میں سسکیاں لے رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' کرن نے استفسار کیا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''ابھی نہیں بتا سکتی۔ ہم لوگ خطرے میں ہیں۔'' چاندنی نے کہا۔ ''وہاں نیچے کوئی ہے؟''

''نہیں'' کرن نے جواب دیا۔ ''میں پرسوں یہاں کام کرنے آئی تھی تو حساب کی کتاب یہاں بھول گئی تھی۔ کل مجھے ضرورت پڑی تو وہ ملی نہیں...... پھر مجھے یاد آیا کہ اسے کہاں ہونا چاہیے...... تم کس خطرے کی بات کر رہی ہو؟ کیا نیچے کوئی ہے؟''

''پتا نہیں...... یہاں سلیم ہے اور وہ زخمی ہے۔ اسے ہماری مدد چاہیے۔'' چاندنی نے بتایا۔

''سلیم؟'' کرن کیبن کے اندر آ گئی اور لائٹ آن کی۔ اچانک روشنی سے چاندنی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کرن کے ہاتھ میں بھاری فلیش لائٹ تھی۔ ''سلیم یہاں کیسے؟ اسے کس نے باندھا؟'' کرن کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔

''چکور...... کرن یہ سب ''چکور'' کا کیا دھرا ہے...... وہ نیچے کہیں آڈیٹوریم میں چھپا ہوا ہے۔ سلیم کو کھولو اور نکلو یہاں سے......'' چاندنی نے بے قراری ظاہر کی۔

''کھولنے کی کیا ضرورت ہے...... یہ بندھا رہے گا تو مسئلہ نہیں کھڑا کرے گا۔'' کرن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیا......؟'' چاندنی کو اپنی سماعت پر شک ہوا۔

''میں نے کہا نا، بھول جاؤ سلیم کو۔'' کرن نے آگے بڑھ کر ہاتھ بلند کیے اور وزنی فلیش لائٹ سے سلیم کے معتوب سر پر ضرب لگائی۔ چاندنی کی چیخ نکل گئی۔ سلیم کی پتلیاں اوپر گھوم گئیں اور سر ڈھلک گیا۔

''کرن!'' چاندنی کی آواز میں دہشت تھی۔

''کیوں......؟''

کرن کاسٹیوم کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ چہرہ چاندنی کی جانب تھا۔ ''چاندنی، میں تمہارے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں کے بارے میں...... میں اور تم...... ہماری تمہاری دیرینہ دوستی کے بارے میں۔'' کرن نے سرد آواز میں کہا۔

چاندنی کی چھٹی حس نے بے چینی کا اظہار کیا۔ پل پل، دن بدن، نئے حادثے، انوکھے واقعات...... نامعلوم اسرار...... چاندنی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ اس عجیب تر کہانی کا انجام سر پر ہے۔

''ہم کوئی بھی بات کر سکتے ہیں۔'' چاندنی نے احتیاط سے کہا۔ ''لیکن پہلے ہمیں نیچے جانا چاہیے۔''

''میں یہاں آرام سے ہوں۔'' کرن نے بے نیازی سے چاندنی کی تجویز رد کر دی۔ ''تم بھی یقیناً آرام سے ہو، کیونکہ ہم پھر ساتھ ہیں...... ہمیں شروع سے ساتھ رہنے کی عادت ہے۔''

چاندنی کے دماغ میں کھلبلی سی مچی...... تاہم مزید وضاحت کے لیے اس نے سوال کیا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''وہی پرانے دن، صرف میں اور تم...... کرن اور چاندنی، بہترین سہیلیاں...... جو ہر جگہ، ہر کام میں ساتھ رہی ہیں...... ہمیشہ۔''

چاندنی نے پُرتشویش نگاہ بے ہوش سلیم پر ڈالی۔

''ہم سب اچھے دوست رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں، تمہارے نزدیک میرا نمبر ہمیشہ پہلا ہی تھا۔'' کرن نے کہا۔ ''اور میرے لیے تم ہی بہترین سہیلی تھیں، سب سے قریب۔''

''اب بھی ایسا ہی ہے...... میں کبھی نہیں۔'' چاندنی نے کہا۔ تاہم اسے لگا کچھ دیر پہلے ذہن میں پیدا ہونے والا بدترین اور ناقابلِ یقین خدشہ حقیقت کے آہنگ میں ڈھلنے والا ہے۔

''چاندنی! تم سمجھ رہی ہو۔'' کرن نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک شیٹ برآمد کی اور چٹکی کے درمیان پکڑ کر چاندنی کے سامنے کی۔

چاندنی کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ ''نہیں، اوہ...... نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔''

کرن کے ہاتھ میں اسٹیکرز کی شیٹ تھی۔
چکور کے اسٹیکر۔

☆☆☆

''یہ تمہیں کہاں سے ملے؟'' چاندنی کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔
''یہ میرے ہیں۔''
''کک... کیا... تم... کرن، تم؟'' چاندنی ہکلائی۔
''ہاں، میں ''چکور'' ہوں۔ میں جانتی تھی کہ تم کبھی مجھ پر شک نہیں کرو گی۔ میں نے بھی خود کو مردکی حیثیت سے پیش کیا۔ کیونکہ ہر کوئی تم پر مرتا ہے۔ یہ محفوظ ترین طریقہ تھا۔''
چاندنی کی چھٹی حس کچھ دیر قبل خطرے کا اعلان کر رہی تھی لیکن چاندنی اس ''اشارے'' پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ حقیقت کھلنے کے بعد اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔
''سیما پر وارڈ روب...؟''
''ہاں، میں نے گرایا تھا لیکن تم پر نہیں... مجھے معلوم تھا کہ اس روز تم وہاں نہیں ہو... کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مقصد تو صرف تمہیں خوف زدہ کرنا تھا۔'' کرن نے کہا۔
''سلیم کو تم نے یہاں بلایا تھا؟''
''ہاں، میری اداکاری اتنی بری نہیں ہے لیکن آوازوں کی نقل میں مجھے قدرتی مہارت ہے... لہٰذا وہ یہی سمجھا کہ تم نے اسے یہاں پہنچنے کے لیے کہا ہے۔'' کرن نے جواب دیا۔
''جمیل کے ساتھ تم نے کیا کیا؟'' چاندنی نے جھرجھری لی۔
''مجبوری تھی... وہ زیادہ ہی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے لاکر سے اسٹیکرز دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چاندنی، اسٹیکرز تمہیں جمیل کے لاکرز سے اسی لیے ملے تھے کہ وہ انہیں میرے لاکر سے نکال چکا تھا... میرا کام آسان ہو گیا، تم سمجھیں کہ جمیل تمہیں تنگ کر رہا ہے۔''
''کرن، گھر پر سیڑھی والی بات بالائے فہم ہے، کیا تم نے کسی اور کو بھی ساتھ ملایا ہوا تھا؟'' چاندنی نے استفسار کیا۔
''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا... تم بھول گئیں کہ میں گاڑی ٹھیک جگہ پارک کرنے کے بہانے کچھ دیر کے لیے باہر گئی تھی... سیڑھی المونیم کی تھی اور پہلے سے میری نظر میں تھی... ہوا تیز چل رہی تھی۔ میں نے اس پر اسٹیکر چپکایا اور کمرے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہوا سیڑھی کو گرا دے گی، کیونکہ میں نے اسے غیر متوازن رکھا تھا۔ فرض کرو ایسا نہ ہوتا، تب بھی دن میں کسی وقت بے جگہ سیڑھی دیکھ کر تم وہاں جاتیں اور غالب امکان تھا کہ چکور کا اسٹیکر تمہیں دکھائی دے جاتا۔ بس کرو، بہت سوال کر لیے تم نے۔'' کرن نے ٹوکا۔
''اہم ترین سوال تو رہ گیا۔'' چاندنی نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا... کسی کا خون کرنا معمولی بات نہیں ہے؟''
''محبت سب کچھ کر سکتی ہے۔''
''یہ محبت کا منفی اور تاریک پہلو ہے... مزید یہ کہ میں آج بھی تمہیں اپنی سب سے بہترین سہیلی یا دوست سمجھتی ہوں۔'' چاندنی کے لہجے میں تلخی در آئی۔ ''میرے لیے تمہاری اہمیت ہمیشہ کے مانند تھی۔''
''نہیں... تم آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہو رہی تھیں اور اسکالرشپ ملنے پر تم مجھے اکیلا چھوڑ جاتیں۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے میں نے ہر ترکیب آزمائی کہ کسی طرح تم ڈر کر ڈراما چھوڑ دو لیکن تمہیں اپنے خواب عزیز تھے۔''
''کرن تم پاگل ہو۔''
''ہاں، چکور پاگل ہوتا ہے، چاند راتوں میں اس کا پاگل پن نہیں دیکھا کیا؟''
''یہ محبت نہیں، خود غرضی تھی کہ تم نے مجھے آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی... محبت تو قربانی مانگتی ہے۔'' چاندنی نے کرن کو آئینہ دکھایا۔ ''لیکن تم تو دوستی اور محبت کی حقیقت سے ناآشنا ہو... اگر تم مجھے رکنے کے لیے کہتیں تو تمہارے لیے میں اپنے خواب بھول جاتی۔''
''تم نے ڈراما شروع کر دیا۔'' کرن نے بھنا کر کہا۔
''دراصل تم لاجواب ہو گئی ہو۔'' چاندنی نے غصے سے کہا۔
''میں بحث کرنے نہیں آئی۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں سمجھی تھی کہ میں تمہیں ہراساں کر کے روکنے میں کامیاب ہو جاؤں گی اور ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔''
''کیا اچھے دوست ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں؟ بچے بھی ملازمت کی خاطر والدین سے جدا ہو کر ملک چھوڑ دیتے ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں، فاصلوں سے محبت اور دوستی کم نہیں ہوتی۔ کرن تمہاری سوچ نے مجھے گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔''
''بس کرو... تم بہت بول چکی ہو۔ صرف یہ سوچو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والی ہوں؟'' کرن کے تاثرات یکسر بدلے ہوئے تھے۔
''مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ مار دو گی... صرف یہ بتا دو کہ سلیم کو یہاں کیوں بلایا تھا؟''

''تم نے ''چکور'' والا پرچہ پڑھا نہیں...... تمہیں اور کالج کو کل دن میں سلیم کے بارے میں پتا چلتا تو شاید تم ڈراما چھوڑ دیتیں...... لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اس وقت یہاں کیسے آ گئیں...... تم نے جب آڈیٹوریم میں مجھے آوازیں دیں تو مجھے تعجب ہوا تھا۔ تاہم اس طرف آنے سے پہلے میں نیچے اتر گئی، کل تم دونوں یہاں ایک ساتھ دریافت کیے جاؤ گے۔ اسٹیکرز میں سلیم کی جیب میں رکھ دوں گی۔ تم دونوں کی سابقہ دوستی کا تقریباً سب کو علم ہے اور سلیم کی حالیہ شرارتوں کا بھی۔ لہٰذا، میں نہیں سمجھتی کہ میرے لیے کوئی مشکل کھڑی ہوگی۔ ویسے بھی ہم تو ہمیشہ بہترین دوست رہے ہیں......'' کرن کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ نظر آئی۔

''اہم بات یہ ہے کہ سلیم کو تم نے یہاں بلایا تھا۔''

''ہم، اب بھی بہترین دوست ہیں۔'' چاندنی نے دماغ ٹھنڈا رکھا۔

''میرے سامنے اداکاری نہیں چلے گی، وہیں کھڑی رہو۔'' کرن نے سخت لہجے میں کہا۔

اچانک چاندنی کا خوف، غصے میں تبدیل ہو گیا۔ تاہم اسے ادراک تھا کہ وہ ایک غلط جگہ پر ''قاتل'' کے ساتھ پھنس گئی ہے۔ دوست اگر دشمن بن جائے تو زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

''ڈرامے کا کتنا حقیقی اینڈ ہونے والا ہے۔ رومیو اور جولیٹ کے مانند تم دونوں بھی آخری منظر میں مرنے والے ہو۔''

کرن، وزنی فلیش لائٹ کو بلند کر کے اپنی عزیزہ کی طرف جھپٹی۔

☆☆☆

چھوٹے سے کمرے میں آنکھ مچولی کھیلنے کی گنجائش ہی نہیں تھی، چاندنی نے بمشکل کرن کی ضرب سے بچنے کی کوشش کی...... سر بچ گیا، مگر بازو میں اذیت کی لہر اٹھی۔ وہ دروازے تک پہنچ کر اسے کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ اتنی بلندی سے نیچے نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ وہ اگر بہت ہمت اور تیزی کا مظاہرہ کرتی تو بمشکل سنبھل کر سیڑھی پر چلی جاتی...... اس کے لیے بھی اسے کم از کم تیس سیکنڈ درکار تھے۔ اس کے بعد وہ اترنا شروع کرتی جبکہ کرن عقب میں چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اسے چاندنی کے سر پر ضرب لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ایک دھکا، چاندنی کو نیچے پھینک دیتا۔

چاندنی نے بروقت پلٹ کر دیکھا اور جھکائی دے کر دوسرے دروازے کی طرف دوڑی۔ دروازہ کھولتے ہی کیٹ واک پر نظر پڑی اور وہ لرز اٹھی۔ کیٹ واک پر جانا چاندنی کے لیے ایسا ہی تھا جیسے تنی ہوئی رسی پر چلنا۔

کرن کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ چاندنی کے خوف سے واقف تھی۔ کوئی چوائس نہیں تھی۔ چاندنی کے تصور میں تین چہرے ابھرے۔ جمیل، سکندر اور سلیم...... جمیل، اس کی وجہ سے مارا گیا، سکندر اس کی محبت تھی...... اور سلیم شاید...... شاید وہ سلیم کو بچا لے...... عقب میں دیکھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ چاندنی نے کیٹ واک پر قدم رکھ دیے۔ خوف سے مرنے سے بہتر ہے کہ لڑ کر مرو...... قدم آگے بڑھاتے ہی اسے لگا کہ وہ بلندی سے نیچے کی جانب گر رہی ہے۔ اس نے مضبوطی سے پتلی ریلنگ کو جکڑ لیا۔ تاہم اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

اس کے ایک ہاتھ میں درد ہو رہا تھا، تاہم دونوں جانب کی ریلنگ کو تھامنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔ ہانپتے، لرزتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھائے۔ اس نے نیچے کی جانب دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

☆☆☆

معاً اسے احساس ہوا کہ کیٹ واک کا تنگ فولادی تختہ اختتام پذیر ہے۔ سامنے دیوار قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اختتام سر پر تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور فوراً جھک گئی۔ کرن کے جان لیوا وار سے وہ پھر بچ گئی تھی۔ لیکن کب تک...... سیکنڈوں کا کھیل باقی تھا۔ وار بچانے کی کوشش میں وہ غیر متوازن ہوئی...... فرشتۂ اجل کی سرگوشی سنائی دی۔ ریلنگ سے لپٹنے کی کوشش میں وہ گرتی چلی گئی۔ اس کا ہاتھ ریلنگ سے پھسلا، وہ کیٹ واک کے تختے پر پیٹ کے بل گری تھی۔ جب تک سانس، تب تک آس، وہ چاروں ہاتھ پیروں کے ساتھ تختے سے لپٹ گئی۔ کرن فاتحانہ انداز میں قہقہہ زن تھی۔ چاندنی کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

کرن نے لاتیں مار کر اسے نیچے گرانے کی کوشش کی۔ تختے سے لپٹے رہنے کے لیے چاندنی نے تمام قوت صرف کر دی تھی۔

''بہت جان ہے۔'' کرن نے کہا۔ بے ہوش ہونے کے بعد تو یہ جگہ چھوڑ کر نیچے جانا ہی پڑے گا۔ اس نے وزنی فلیش لائٹ کا وار کرنے کے لیے ہاتھ اوپر کیے۔ کیٹ واک اور بلندی کرن کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ لہٰذا اسے ریلنگ پکڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

موت اور زندگی کے درمیان ایک لمحہ حائل تھا۔ چاندنی نے آنکھیں بند کر کے دو الفاظ کہے...... اللہ، ماں......

لمحہ گزر گیا۔
دوسرا لمحہ......
تیسرا لمحہ......
چاندنی نے آنکھیں کھول دیں۔ کرن کیٹ واک کے دوسرے سرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ چاندنی نے سر گھمایا۔ دروازے کے قریب کیٹ واک کے سرے پر سکندر کھڑا تھا۔
''اسے چھوڑ کر واپس آجاؤ۔'' سکندر نے نرمی سے کہا۔
''دفع ہو جاؤ۔'' کرن گویا پھنکاری۔
''واپس آجاؤ۔'' سکندر نے آگے بڑھنا شروع کیا۔
''میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔''
''پاگل مت بنو، یہاں...... تین افراد کو مار کر تمہارا کیا حشر ہوگا؟'' سکندر آگے بڑھتا رہا۔
''واپس جاؤ۔'' کرن نے بھی دو قدم بڑھائے۔
دونوں چند فٹ کے فاصلے پر آمنے سامنے تھے۔
کرن نے وار کیا۔ سکندر نے اطمینان سے جھکائی دے کر سر بچایا۔
''آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اسے پھینک دو اور واپس چلو۔ میں جمیل، سلیم یا چاندنی نہیں ہوں...... کیوں مفت میں جان گنوانا چاہتی ہو۔'' سکندر کے لہجے کی نرمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چہرے پر بے پناہ اعتماد تھا جیسے یہ کوئی بچکانا کھیل ہو۔
کرن کے تاثرات بھی تبدیل ہو گئے۔ اسے احساس ہوا کہ چاندنی کے پاس سے ہٹ کر اس نے غلطی کی تھی۔ سکندر کے نرم انداز نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ سکندر سے نمٹ کر چاندنی کو دیکھے گی۔ چاندنی تو بری طرح پھنس چکی تھی۔
''کیا سوچ رہی ہو؟'' سکندر مسکرایا۔ جواب میں کرن نے چیخ مار کر پوری قوت سے وزنی فلیش لائٹ گھمائی۔ سکندر نے تو بہ آسانی وار بچا لیا۔ تاہم زیادہ زور لگانے سے کرن کا توازن بگڑ گیا۔ دوسرے وار بچاتے ہی سکندر کی ٹانگ اس کے پیٹ میں لگی۔ فلیش لائٹ ہاتھ سے چھوٹ کر ایک جانب پرواز کر گئی۔ خود کرن بھی جان بچانے کے لیے خود کو کیٹ واک پر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ چاندنی نے دیکھ لیا تھا کہ کرن جو کچھ کرتی آئی تھی، وہی اس کے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ اب بذاتِ خود کیٹ واک پر جمے رہنا اس کے لیے محال ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ دفعتاً سکندر نے جھک کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا اور کشاں کشاں واپس اوپر کھینچ لیا۔

☆☆☆

سکندر نے سلیم کی رسیاں کھول کر انہی سے کرن کو جکڑ دیا تھا۔
''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟'' چاندنی نے محبت آمیز نظروں سے سکندر کو دیکھا۔
''کیسے دیکھ رہی ہو؟'' سکندر کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
''بتاؤ ناں!''
''بات یہ ہے کہ میں نے سوچا کہ رستہ میرا دیکھتی ہو گی...... کیوں نہ اس سے کہیں بن پہنچوں......''
''اتنی دیر سے؟''
''اگر تم بتا دیتیں کہ کہاں جا رہی ہو تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔''
''ہاں، سوری۔''
''چاندنی، تم فون پر بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ میں سوچتا رہا کہ تم کہاں جا سکتی ہو...... بس اندازہ لگایا اور یہاں چلا آیا...... ورنہ ساری زندگی......''
''ساری زندگی...... کیا؟'' چاندنی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''چھوڑو......''
''نہیں بتاؤ۔'' چاندنی بچوں کے مانند ٹھنکی۔
''کیا کرتا...... ساری زندگی کے لیے احساس کی تلخیاں بڑھا لیتا۔ زیست اور بھی بے کیف بنا لیتا...... شعورِ غم کو جگا لیتا...... تشنگیِ غم بڑھا لیتا...... یادوں کے مجسمے بنا لیتا...... بت کدے شبستاں میں سجا لیتا...... غنچوں پہ بھی کچھ اشک بہا لیتا...... ذرّوں کو بھی پلکوں سے اٹھا لیتا...... رہتا نہ دن آسودہ...... اور نہ شب سہانی...... بے کیف گزر جاتی جوانی میری......''
''کافی ہے...... بس کرو...... عجیب آدمی ہو۔''
''کیا بات عجب ہے...... محض سرگشتہ شوق ہی تو ہو کے دیکھا ہے...... حیرانی چشم آزما کے دیکھا ہے......''
چاندنی نے بے ساختہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
پھر خود ہی جھینپ کے ہٹا لیا۔
''خود بھی کچھ ہو گی؟''
کچھ کہنے کے بجائے چاندنی نے اپنا سر سکندر کے سینے پر رکھ دیا۔

اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری تاجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں ۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں ۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہِ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں ۔

حمیدہ نعمان ۔ اسلام آباد

○ کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایسی پریشانی سے دوچار ہو جاؤں گی کہ جس کے لئے مجھے اپنی عقل جواب دیتی محسوس ہوگی اس مرحلے پر آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرا نکاح آج سے چار سال قبل میرے ماموں زاد کے ساتھ ہوا تھا جو اسپین سے ڈیڑھ سال قبل وہ آئے اور رخصتی ہوگئی مگر وہ ازدواجی زندگی سے معذور تھے ۔ بہر حال بہت مشکل وقت تھا ..... میں نے ان کا پردہ رکھنا چاہا مگر شاید میں اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی ہوں مجھے ڈپریشن ہونے لگا ہے مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اس صورت میں حال میں جدا نہیں ہو سکتے ان کی والدہ مجھ سے شدید محبت کرتی ہیں میں اپنے گھر میں ہی رہتی ہوں اور آہستہ آہستہ ڈپریشن کی مریض بنتی جا رہی ہوں میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے اور میں اس صورت حال سے نکل آؤں اس ضمن میں مجھے ذہنی سکون کے لئے کوئی اسم الٰہی بتائیں اور میرے لئے کوئی ایسی لوح تجویز کر دیجئے کہ جس سے مجھے فیصلے کی قوت مل جائے آپ کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا ۔

☆ عزیز بیٹی ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور استقامت دے آپ اپنی والدہ کو یہ ساری صورت حال بتا دیجئے اس قسم کی صورت حال درپیش آنے پر شریعت کچھ شرائط کے ساتھ خلع کا حق دیتی ہے ۔ "یاکریم یاسلام" ہر نماز کے 135 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کیجئے اول آخر 9 مرتبہ درود شریف ۔ ذہنی سکون اور ڈپریشن سے نجات کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح اسم ذات ارسال کی جا رہی ہے دعاؤں کا شکریہ ۔

میمونہ شفیق ۔ راولپنڈی

○ محترم ! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے میں اپنی بیٹی کے مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوں میری بیٹی کی عمر 28 سال ہو رہی ہے لیکن رشتے کا کوئی سبب نہیں بن رہا ہے بہت کوششیں کی ہیں لیکن کوئی بات نہیں بنتی ہے یہاں پر ایک مولوی صاحب سے پتا کرایا تو انہوں نے علاج تو کیا اور اس سے ایک دو رشتے آئے مگر بات نہیں بنی ۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسی دعا یا لوح دیدیں کہ جس سے میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے اور وہ اپنے گھر میں آباد ہو جائے اس سے چار سال چھوٹی بیٹی کی منگنی طے ہو چکی ہے لڑکے والے بار بار شادی کا تقاضا کرتے ہیں مگر بڑی کا کوئی بندوبست ہو تو چھوٹی کو رخصت کریں ، بہت پریشان ہوں کوئی راہنمائی کیجئے ۔

☆ عزیز بہن ! اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھئے وہ بڑا ہی مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ اچھا رشتہ ملے گا "یاکریم یالطیف یافتاح" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف ۔ بیٹی کی شادی کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے ۔

گل رعنا ۔ جرمنی

○ محترم ! اس خط کی غرض و غایت یہ ہے کہ میری بہن کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت عطا نہیں ہوئی حالانکہ طبی اعتبار سے دونوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت کی وجہ سے یقیناً اس تاخیر کا کوئی بہتر سبب ہی ہوگا ۔ آپ سے اس ضمن میں روحانی علاج اور دعا کی درخواست ہے ۔ جس طرح آپ نے میرے امیگریشن کے معاملے میں میری راہ نمائی کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیابی عطا کی تھی اسی طرح

حصول دعا پھر حاضر ہیں۔ آپ کی محبت کرنے والی بیٹی۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ محبتوں کو قائم رکھے۔ اولاد کے لئے ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یاوارث یامصور یاخالق" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف آپ کی فرمائش پر اولاد کے لئے نقش علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

جبیں افضل۔ لندن یوکے

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے آپ جس طرح لوگوں کی دینی راہ نمائی کر رہے ہیں اس کا اجر تو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے ہم سب تو بس آپ کو دعاؤں کے نذرانے ہی بھیج سکتے ہیں میری بیٹی کا معاملہ ہے اس کو یہاں پر کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا بلکہ یوں کہئے کہ وہ شادی کے نام سے الرجک ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار محبت میں ناکام ہو چکی ہے حالانکہ ہم نے اس کی مرضی پر سر جھکا دیا تھا مگر وہ لڑکا نہایت مطلب پرست نکلا۔ اس کا مقصد سوائے دولت کے کچھ نہیں تھا جب اس پر یہ حقیقت کھل گئی تو وہ اس سے متنفر ہوگئی اور اب اس نے سوچ لیا ہے کہ اب کبھی بھی شادی نہیں کرے گی۔ عمر بیتی جارہی ہے ہم اس کو سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں مگر وہ نہیں مانتی۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بے راہ روی ایک عام بات ہے بڑے وقت سے ڈر لگتا ہے آپ سے درخواست ہے کہ آپ شادی کے لئے کوئی اسم اور لوح تجویز فرما دیجئے تاکہ وہ ہنسی خوشی راضی ہوجائے۔ یہ آپ کا ایک ماں پر بے حد احسان ہوگا۔ آپ کی بہن۔

☆ عزیز بہن! دعاؤں کا شکریہ، اللہ تعالیٰ ہر بیٹی کو برے تجربے سے محفوظ اور مامون رکھے۔ (آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یالطیف یارافع یاحمید" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف شادی کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے۔

شگفتہ حیدر۔ لاڑکانہ

○ محترم! میرے بیٹے کو بیرونِ ملک جانے کا بہت شوق ہے کئی بار متعدد جگہ اپلائی کر چکا ہے مگر بات نہیں بنتی ہے ذمے داریاں کافی ہیں اور اگر یہ کام ہو جائے گا تو ہمارے قرض بھی ادا ہو جائیں گے اور بچیوں کی شادی کے معاملات بھی بے حد آسان ہوجائیں گے۔ یہاں کل آمدنی آٹھ ہزار سے زائد نہیں باوجود محنت کے معاشی ترقی میسر نہیں آتی ہے اس لئے ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ اگر بیرونِ ملک ملازمت مل جائے تو ہمارے مسائل حل ہوجائیں گے آپ سے اس معاملے میں مدد اور راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ہم سب کی تمام نیک اور جائز خواہشات پوری فرمائے۔ اور اپنے خزانۂ رحمت سے وافر طیب رزق عطا فرمائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یارافع یاوہاب" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر لوحِ تسخیر خاص برائے بیرونِ ملک سفر کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

سحرش بتول۔ ناروے

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ (آمین) میرے ہاں اللہ کی رحمت سے چار بیٹیاں ہیں ہم ایک اور بے بی پلان کرنا چاہ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اس مرتبہ ہمیں اولادِ نرینہ سے نوازے۔ بہنوں کو بھی بھائی کا بہت شوق ہے اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت نہایت فراوانی سے عطا کی ہے کمی تو بس یہی ہے۔ شاید اس لئے کہتے ہیں کہ انسان ناشکرا ہے طلب میں ہمیشہ ہاتھ بڑھائے رہتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہماری آرزو کے لئے اللہ سے دعا کردیجئے اور کوئی روحانی علاج بھی تجویز کردیجئے آپ کے لئے دعا گو۔ آپ کی بہن۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ حکیم و دانا قادر مطلق سے التجا ہے کہ وہ ہر والدین کی بیٹے کی آرزو پوری فرمائے (آمین) در حقیقت یہ بھی نکتہ قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کوئی حد نہیں ہے ہمیشہ اس کے آگے دست طلب دراز رکھیں۔ کیونکہ وہ مانگنے والوں کو پسند کرتا ہے اور شکر گزاروں کو زیادہ نوازتا ہے "یاوارث یاقوی یامصور" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ اولادِ نرینہ کے لئے آپ کی فرمائش پر علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

یاسمین اسحاق۔ ٹھٹھہ سندھ

○ محترم! میرے والد کے انتقال کے ساتھ مسائل شروع ہوگئے ہیں ہماری اچھی خاصی جائیداد اور زرعی رقبہ ہے اور اسی وجہ سے مصیبتوں میں پڑ گئے ہیں۔ سگے بھائیوں اور بہنوں میں آپس میں جائیداد کی تقسیم کے لئے جھگڑے پڑ گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم لوگ کیا کریں کس دعا سے اپنی محبتیں واپس لائیں اور سب دوبارہ سے ایک جیسے ہوجائیں آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ سب کو محبت کی دولت عطا فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ مال اور اولاد سے بندے کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کے دلوں میں نرمی جگائے۔ (آمین) "یاسلام یاعزیز" ہر نماز کے بعد 131 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ خیر و برکت اور کامیابی کیلئے لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔

راحیلہ منور۔ وہاڑی

○ محترم! میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں مجھ سے دو سال پہلے میری بہن کی منگنی ہوئی تھی لڑکا باہر تھا اس لئے انہوں نے ٹائم دو سال کا لے لیا اسی دوران میرے لئے ایک مناسب رشتہ آگیا اور یوں میری شادی میری باجی سے پہلے ہوگئی مگر اب چھ سال کا طویل عرصہ

گزر جانے کے باوجود وہ لوگ شادی میں ٹال مٹول کر رہے ہیں جبکہ لڑکا بھی واپس آگیا ہے اور یہاں آ کر اس نے اپنا ایک بہت اچھا جنرل اسٹور کھول لیا ہے جس کی آمدنی بھی معقول ہے مگر اس کے باوجود وہ لوگ شادی کے معاملے میں نہ جانے کیوں دیر لگا رہے ہیں ایک مرتبہ ہم نے تنگ آ کر منگنی توڑنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا مگر انہوں نے منت سماجت کر کے ابو کو منا لیا مگر اب پھر ایک سال گزر گیا ہے ان کی طرف سے خاموشی ہے ہمیں بتائیے کہ ہم کیا کریں باجی کہتی ہیں کہ وہ بدل گیا ہے نصیب ہے اب پھر ہو یا نہ ہو شادی یہیں ہونے دو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ ہم لوگ سخت پریشانی میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے کا روحانی حل بتائیں ہمیں بتائیں وظیفہ یا نقش جو بھی آپ مناسب سمجھیں عطا کر دیجئے تاکہ یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو جائے۔ اس کی وجہ سے باجی کی صحت بھی بہت گر گئی ہے والدین علیحدہ پریشان ہیں۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ رشتوں کو قائم رکھنے والا اور گھر آباد کرنے والا ہے آپ کی باجی کا گھر بھی انشاء اللہ ضرور بسے گا۔ ہر نماز کے بعد 124 مرتبہ "یالطیف یاجامع یافتاح" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ شادی کے لئے لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے حسب توفیق بروز جمعہ صدقہ دیا کیجئے۔ [illegible] کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

اقدس جبار۔ پشاور

○ محترم! میرے شوہر بات بات پر ناراض ہوتے ہیں گھر والوں سے ملنے نہیں دیتے اور بعض اوقات میرے والدین اور گھر والوں کے لئے اس قدر نازیبا گفتگو کرتے ہیں کہ بس کیا بتاؤں حالانکہ ان کی ... ہر طرح سے خدمت کرتی ہوں۔ تمام سسرال والوں کا خیال رکھتی ہوں صبح نماز فجر سے اٹھتی ہوں تو بارہ بجے سے پہلے لیٹنا نصیب نہیں ہوتا سب کی خدمات کے باوجود کوئی خوش نہیں ہے ان کی بہنیں ایک، ایک ہفتہ آ کر رہتی ہیں لیکن بہو کو اپنے گھر جانے کی اجازت نہیں ہے سوائے عید بقر عید کے دو چار گھنٹوں کے سوا سارا سال والدین سے ملاقات نہیں ہوتی کیا اس معاشرے میں بہوؤں کے کوئی حقوق نہیں؟ میرے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں مگر شاید ان کے دل میں بیوی کے بجائے ایک نوکرانی جیسی عزت اور احترام کی بھی مستحق نہیں؟ ملازمہ کو کم از کم ہفتے میں ایک چھٹی تو مل جاتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا حل بتائیے کہ میری مشقتوں میں کمی آ جائے اور سسرال والے مجھے ایک بہو کا مرتبہ دیں شاید میرا خط بہت سی بہوؤں کے لئے راہ نمائی کا باعث بن جائے آپ کی دعاؤں کی منتظر۔

☆ پیاری بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت، استقامت بخشے اور ہر بیٹی کو اچھی بہو بننے کا حوصلہ اور ہنر بخشے۔ (آمین) آپ ہر نماز کے بعد "یارافع یاحمید" ایک تسبیح پڑھ لیا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف خیر و برکت اور بہتری کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔

میمونہ اکرم۔ آزاد کشمیر

○ محترم! میری بیٹی کو عرصہ 2 سال سے بخار ہے ہر طرح کا علاج کروا چکے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو رہا یہاں پر ایک صاحب کو دکھایا تو انہوں نے آسیب کا چکر بتایا ہے۔ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ اس پر کوئی میڈیسن اثر نہیں کر رہی ہیں۔ آپ میری بیٹی کے متعلق استخارہ کر کے بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے۔

☆عزیز بہن! آپ کی بیٹی کو معدے کا انفیکشن ہے جس کی وجہ سے بخار نہیں ٹوٹ رہا۔ اس کا علاج کروائیے۔ لوح شفاء ارسال ہے۔

شہناز عبدالغفور۔ ملتان

○ میں فرسٹ ائیر کی طالبہ ہوں ہم چھ بہن بھائی ہیں پانچ بہنیں ایک بھائی ہے میرا تعلق غریب گھرانے سے ہے ہمارے والدین نے غربت کے باعث ہمیں میٹرک تک تعلیم دلوائی ہم دو بہنیں ایک اسپتال میں جاب کرتی ہیں بھائی ہمارا مزدوری کرتا ہے اور ابو ضعیف ہیں محترم ایک تو ہمارا کاروبار صحیح نہیں چل رہا دوسرے میری بہنوں کی شادی میں رکاوٹ ہے کوئی رشتہ آتا ہے ایک بار ہو کر جاتے ہیں تو دوبارہ نہیں آتے گھر کے حالات بہت زیادہ خراب ہیں ان حالات کی وجہ سے ہر وقت گھر میں جھگڑا رہتا ہے ہم بہنیں کما کر والدین اور اپنا پیٹ پال رہی ہیں بھائی کوئی مدد نہیں کرتا .... بلکہ .... وہ ہر وقت لڑتا رہتا ہے ان حالات کی وجہ سے امی ہر وقت بیمار رہتی ہیں ہم دونوں بہنیں ہاتھ پاؤں بہت مارتی ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہیں بنتا محترم آپ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ یا لوح بتائیں جس سے ہمارا کاروبار صحیح ہو جائے اور بہنوں کی شادی کا بھی مسئلہ حل ہو جائے آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات پر مکمل بھروسا رکھیں اس کی ذات مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ آپ کے حالات پر ضرور رحم فرمائیں گے۔ آپ سب نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ ہر نماز کے بعد "یاوہاب" بکثرت

پڑھیں۔لوح سبع ستارگان ارسال ہے۔
عندلیب۔ملتان

○ محترم! ہمارا جوتوں کا کارخانہ ہے الحمدللہ بہت اچھا چلتا رہا ہے لیکن آٹھ دس ماہ سے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ہر چیز الٹی ہورہی ہے کاریگر بھاگ رہے ہیں آرڈر کینسل ہورہے ہیں پے منٹس پھنس رہی ہیں خود میرے میاں کہتے ہیں کہ کام پر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا ہے بخار علیحدہ رہنے لگا ہے۔ہمیں تو لوگ یہ بتاتے ہیں کہ کسی حاسد نے ہم پر جادو کروادیا ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ اس صورت حال سے نکلنے کے لئے ہمیں کوئی اسم الٰہی تلقین کریں اور کوئی روحانی تحفہ عنایت کیجئے ہم بہت پریشان ہیں گیارھویں شریف میں شرکت کے لئے پانچ سو روپے کا منی آرڈر ارسال کررہی ہوں ہمارے لئے دعا بھی کیجئے گا گیارھویں شریف کے لئے ہماری جانب سے سوالاکھ مرتبہ کلمۂ طیبہ بھی شامل فرمالیجئے گا۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

☆عزیز بہن! مصائب اور مشکلات سے گھبراتے نہیں جب جادو حسد کا شبہ ہونے لگے تو بکثرت آیت الکرسی اور معوذتین پڑھا کریں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی برکت سے ہر مسلمان کو بچانے والا ہے آپ ہر نماز کے بعد "یاسلام یاحفیظ یافتاح یاوہاب" 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔کاروباری خیروبرکت اور ترقی کے لئے لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے گیارھویں شریف میں شرکت کا شکریہ اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنا فضل وکرم فرمائے۔(آمین)
بینا اکرم۔کراچی

○ محترم بھائی جان! آپ کا کالم پڑھ کر بے حد سہارا ملتا ہے میں بھی آج حاضر ہوگئی ہوں میرے شوہر کو ان کے کاروباری حریف نے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسادیا ہے اللہ کا شکر ہے کہ میرے شوہر نے بھی بددیانتی نہیں کی مگر اس نے ایسا ہیر پھیر سے کام لیا کہ ہمارا ایک ملازم اس سے مل گیا اور اس نے ہمیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔آپ ہمیں کوئی ایسی تعلیم دیں کہ جس سے اس جھوٹے مقدمے سے جان بھی چھوٹ جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کاروباری نقصانات بھی نہ ہوں۔میرے میاں ان حالات سے اس قدر بددل ہوگئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ جونہی مقدمات سے جان چھوٹی وہ ملک سے باہر جاکر قسمت آزمائی کریں گے۔بہت پریشانی ہے کوئی حل عنایت کریں۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ سب کو استقامت عطا فرمائے (آمین) "یارحمٰن یاسلام یاحسیب یافتاح" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف' مقدمات کے جلد فیصلے اور خیروبرکت کیلئے فتح نامہ ارسال کیا جارہا ہے حسب توفیق صدقہ دیجئے گا۔